METHODOLOGY OF HISTORY

فنِ تاریخ نویسی

ہومر سے ٹائن بی تک

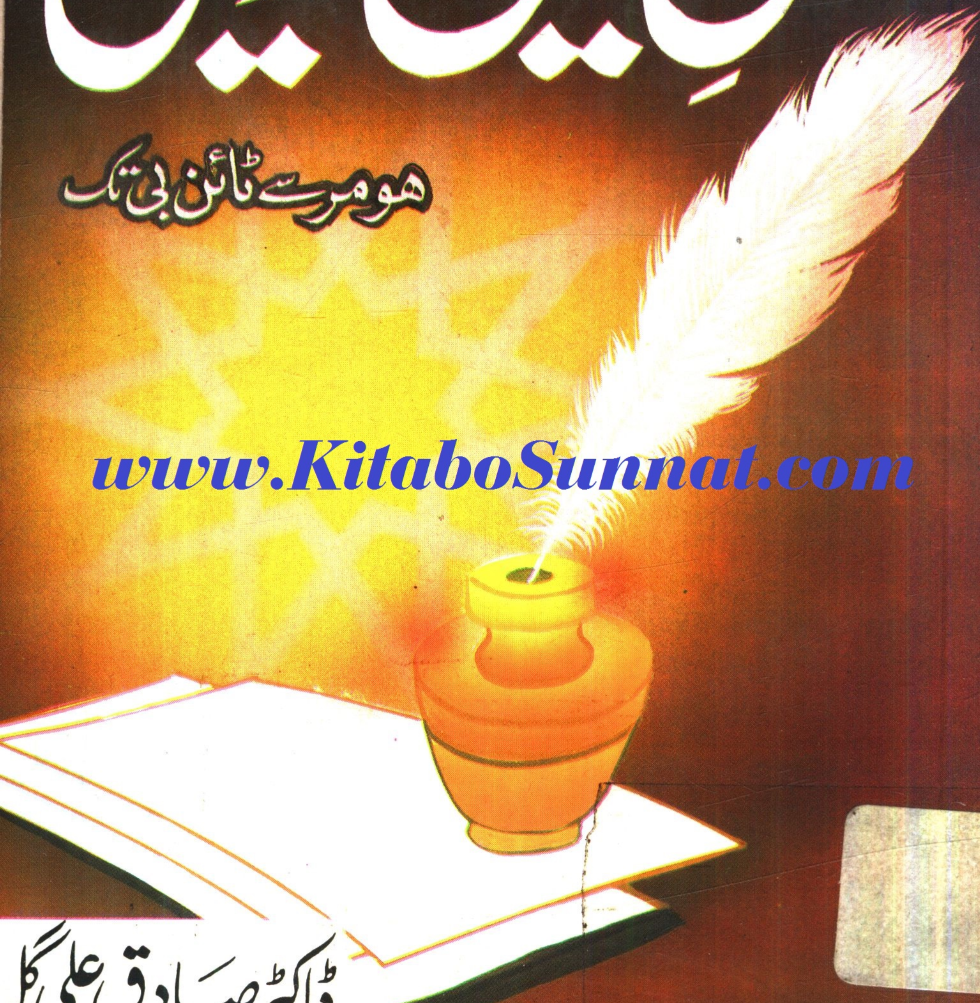

www.KitaboSunnat.com

ڈاکٹر صادق علی گل

چیئرمین شعبہ تاریخ جامعہ پنجاب لاہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- **کتاب وسنت ڈاٹ کام** پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- **مجلس التحقیق الاسلامی** کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- **دعوتی مقاصد** کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

Institute of Islamic Studies · LIBRARY · Punjab University. Lhr.
2315

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

يَرۡفَعِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَالَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجٰتٍ ؕ (سورة مجادله، اٰية ۱۱)

اللہ اونچے کرتا ہے ایمان والوں اور علم والوں کے بڑے درجے۔

هَلۡ يَسۡتَوِى الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ؕ (سورة زمر، اٰية ۹)

کیا برابر ہوتے ہیں علم والے اور بے علم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

DATA E...

فنِ تاریخ نویسی

ہومر سے ٹائن بی تک

Institute of Islamic Studies LIBRARY Punjab University Lhr.

ڈاکٹر صادق علی گل

شعبہ تاریخ جامعہ پنجاب، لاہور

پبلشرز ایمپوریم احاطہ شاہ ہریاں اردو بازار لاہور

فون ۷۳۵۸۹۹۷

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

اشاعت سوم ———— اپریل ۲۰۰۲ء
ناشر ———— افتخار احمد
پرنٹرز ———— ناصر باقر پرنٹرز لاہور
کمپوزنگ ———— نعیم کمپوزنگ سنٹر مچھلی منڈی لاہور

قیمت ———— ۱۴۰/= روپے
لائبریری ایڈیشن ———— ۲۰۰/= روپے

ISBN - 969-482-004-9

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

23219

انتساب

دُرِ شہوار

اور

علی نافع

کے

نام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مندرجات

صفحہ نمبر

پیش لفظ

پہلا باب

تاریخ کی تعریف

1- لفظ تاریخ 1
2- تاریخ کی تعریف 2
3- حوالہ جات 19

دوسرا باب

مطالعہ ء تاریخ

1- وسعت تاریخ 21
2- تاریخ کی افادیت 26
i- رجعت پسند 32
ii- قدامت پسند 32
iii- آزاد خیال 33
iv- مذہبی طبقہ 33
3- تاریخ کے مقاصد 39
4- حوالہ جات 46

تیسرا باب

تاریخ بحیثیت سائنس

1- تعریف 47
2- مطابقت 48

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

-3 مسئلہ تاریخ کا خاکہ 56

-4 حوالہ جات 61

چوتھا باب

نظریہ تاریخ: عہد قدیم سے سائنسی دور تک

-1 تصور نظریہ 62

-2 نظریات کی اقسام 63

-i رومانی 63

-ii عملی 64

-iii فکری 64

-3 نظریہ کا عمومی جائزہ 65

-4 یونانیوں کا نظریہ تاریخ 68

-i ہومر 69

-ii کے نوفینس 70

-iii کیڈموس 71

-iv ہیکٹس 71

-v ہیلنکیئس 72

-vi ہیروڈوٹس- 72

-vii تھیوسی ڈائیڈز 74

-viii زینوفون 76

-ix الفیوروس 76

-x تھیوپومپوس 76

-xi پولی بیوس 77

-xii پوسیڈونیوس 78

-xiii پلوٹارک 79

-5 دور رومہ 80

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

i- گائس جولیس سیزر	81
ii- کونٹس کرٹئس روفس	82
iii- لوی	82
iv- ٹیسی ٹس	84
6- دور اعتقاد	85
i- سینٹ اگسٹائن	85
7- دور روشن	87
i- پوگیو براشیولینی	88
ii- فلیوس بلونڈس	89
iii- نکولو میکاولی	89
iv- فرانسکو گیوشادینی	89
v- پولی ڈور ورجل	89
vi- جوشم فان واٹ	89
vii- رینانس	89
viii- والٹیئر	90
8- دور عقلی سے سائنسی دور تک	91
9- حوالہ جات	101

پانچواں باب

تاریخ اور مسئلہ اسباب

1- تعریف	103
2- اقسام اسباب	105
i- ضروری اسباب	105
ii- کافی اسباب	105
iii- فوری اسباب	107
iv- دور رس اسباب	107

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

v- اختصاری اسباب 107

vi- مافوق الفطرت اسباب 108

vii- ڈرامائی اسباب 109

3- تلاش اسباب 109

4- حوالہ جات 115

چھٹا باب

اقسام تاریخ

1- سوانحی تاریخ 117

2- سیاسی تاریخ 118

3- معاشی تاریخ 124

4- جنگی تاریخ 131

5- مذہبی تاریخ 134

6- ذہنی تاریخ 141

7- تاریخ اسلام 144

8- تاریخ یورپ 148

9- تاریخ نسواں 150

10- تاریخ تمدن 152

11- تاریخ آرٹ 156

12- تاریخ فلسفہ 158

13- ڈپلومیٹک تاریخ 159

14- سائنس کی تاریخ 161

15- تیسری دنیا کی تاریخ 163

16- حوالہ جات 166

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتواں باب

دستاویزات

-1 آغاز فن تحریر 169
-2 دستاویز کا مفہوم 173
-3 مادی آثارات 174
-4 غیرمادی آثارات 174
-5 تحریری آثارات 174
-6 دستاویزات کی اہمیت: دستاویزات کے بغیر تاریخ کا کوئی وجود نہیں 175
-7 دستاویزات کی اقسام 180
-i سرکاری دستاویزات 180
-ii غیر سرکاری دستاویزات 181
-8 رسمی سرکاری دستاویزات 181
-i معاہدات 181
-ii پروانہ استحقاق 183
-iii عطیات 184
-iv عدالتی ریکارڈ 185
-v رٹ 186
-vi رپورٹیں 187
-vii اعلانات 189
-9 غیر سرکاری دستاویزات 190
-i وصیت نامہ 190
-ii اقرار نامہ 192
-iii بہی کھاتے 192
-10 غیر رسمی غیر سرکاری دستاویزات 193
-i روزنامچے 194
-ii سیاحت نامے 195
iii خود نوشت سوانح عمریاں 197
-iv سوانح عمریاں 199

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

v- خطوط 200

vi- ڈائریاں 202

vii- یادداشتیں 202

viii- حوالہ جات 203

آٹھواں باب

تاریخ کے امدادی و ذیلی علوم

1- حکمت عملی 207

2- جغرافیہ 217

3- ارضیات 224

4- آثار قدیمہ 225

5- میوزیالوجی 228

6- مسکوکات 232

7- مصوری 233

8- خطاطی 233-A

9- کتبہ کاری 241

10- علم قدیم طرز تحریر 243

11- علم سیل 247

12- علم الانساب 248

13- سوشیالوجی 253

14- کرونالوجی 254

15- حوالہ جات 256

نواں باب

تنقید نگاری

1- تعریف 258

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

2- تنقید کیا ہے؟ 260

3- اصول تنقید 267

4- تنقید نگاری کے فرائض 268

5- نقطہء نظر 270

6- حوالہ جات 271

دسواں باب

مصنف و تصنیف

1- داخلی تنقید 274

2- مثبت تنقید 274

3- منفی تنقید 274

4- مصنف کا تجزیہ 275

5- مورخ اور تعصب 281

6- خارجی تنقید 285

7- نصابی تنقید 286

8- تصنیف کی خارجی تنقید و تجزیہ 289

9- حوالہ جات 292

گیارھواں باب

مواد کی ماہیت و مسائل

1- اتفاقات 294

2- تحریفات 294

3- تحریری ریکارڈ 295

4- تعصب و تنگ نظری 295

5- ڈرامائی واقعات 295

6- پسندیدگی و ناپسندیدگی 296

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

7- تاریخ کی مصنوعی اور غیر منطقی تقسیم	297
8- حوالہ جات	299

بارھواں باب

اصول تحقیق

1- موضوع	301
2- اسلوب	306
3- قوت متخیلہ	307
4- وسیع مطالعہ	308
5- محنت و استقلال	308
6- فن تحریر	309
7- زبان	310
8- پیراگراف	311
9- عنوان	312
10- ترتیب	312
11- ماخذوں کی تقسیم	314
12- نکتہ چینی میں احتیاط	315
13- تمہید و اختتام	316
14- نظر ثانی	317
15- حوالہ جات	319

تیرھواں باب

منطق، تجزیہ نگاری و تاریخی تحقیق

1- تحقیقی منطق کا مفہوم	321
2- تجزیہ نگاری اور نظریاتی منطق	323
3- تحقیقی منطق کے مقاصد	324

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

4- تاریخی تحقیق و تجزیہ نگاری کی منطق کی خصوصیات 324

5- تحقیقی مواد کے ماخذ 325

i- ابتدائی ماخذ 325

ii- ثانوی ماخذ 325

6- تاریخی تجزیہ نگاری 326

7- حوالہ جات 330

چودھواں باب

تاریخی حقائق اور تحقیق

1- اسلوب حقائق نگاری 331

2- تاریخی حقائق کے مقاصد 334

3- حقائق کا تعین 336

4- حقائق اور مشکلات 340

5- حوالہ جات 343

پندرھواں باب

فلسفہ تاریخ

حوالہ جات 348

کتابیات (اردو) 349

Bibliography 350

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

23219

پیش لفظ

یہ کتاب بنیادی طور پر طالب علموں کی ضروریات کے پیش نظر لکھی گئی ہے۔ اس موضوع پر یہ پہلی کاوش نہیں ہے۔ ممکن ہے اردو زبان میں اس موضوع پر پہلے بھی کچھ ورطۂ تحریر میں آ چکا ہو' لیکن قومی زبان میں فن تاریخ نویسی پر اپنی نوعیت کی پہلی مبسوط کتاب کہی جا سکتی ہے۔ مورخین' مفکرین اور ناقدین کی تعداد کے اعتبار سے غالباً" میرا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ میں نے جن مورخوں' مفکروں اور ناقدوں کو چنا ہے اور ان کے خیالات و تصورات اس کتاب میں جس تفصیل سے پیش کیے ہیں' اس اعتبار سے یہ دعویٰ اتنا بے بنیاد بھی نہیں ہے۔

تاریخ نویسی کے موضوع پر اردو میں یہ میری دوسری کتاب ہے۔ پہلی کتاب "سرگذشت تاریخ" آج سے بائیس برس قبل خلاصتہ" محدود موضوعات پر ایک عام سی کوشش تھی جسے تاریخ کے طلباء نے اس کی اہمیت سے کہیں زیادہ پذیرائی بخشی۔ تاریخ نویسی پر یہ کتاب وسیع اور دقیق موضوعات پر نہایت مدلل انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس کی حقیقی حیثیت' اہمیت اور جامعیت کا اندازہ کتاب کے مکمل مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ علمی اعتبار سے جو موضوعات اور مطالب جس نظم و ترتیب سے اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں' غالباً" عام تاریخی کتابیں اس سے محروم ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ صرف اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ ہر باب میں اہم انگریزی اور اردو تاریخی' ادبی اور علمی ماخذوں سے وسیع استفادہ کیا گیا ہے۔ نیز ہر باب کے آخر میں حوالہ جات کی فہرستیں بھی درج ہیں۔

یہ کتاب تاریخ کی تاریخ ہے اور اس کا اصل موضوع تاریخ نویسی کے وہ اصول و ضوابط ہیں جن کا جاننا ہر پیشہ ور مورخ کے لیے ضروری ہے۔ ان اصولوں کی عدم موجودگی میں تاریخ نہیں بلکہ قصے کہانیاں، افسانوں کے مجموعے اور داستانیں جنم لیں گی۔ اس کتاب میں کچھ عظیم مورخ چن لیے گئے ہیں اور انہیں زمانی ترتیب سے پیش کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے تنقید نگاری سے زیادہ تاریخ نگاری کے اصولوں کا مطالعہ کار آمد ہے۔ بایں سبب میں نے تاریخ کے مطالعہ کے لیے بنیادی سوالوں اور اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے جو زمانی و مکانی قیود سے ماورا ہر جگہ اور ہر عہد میں دہرائے جاتے ہیں۔ مثلاً" مورخ' فلسفہ' توجیہات' دستاویزات' تاریخی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ماخذوں کی ماہیت و اہمیت' تاریخی نظریات' تجزیہ نگاری' تنقید نگاری اور حقائق نگاری کی بنیادی قدروں کا تاریخ سے کیا رشتہ ہے؟ یا کہ تاریخ کے امدادی' ذیلی' معاشرتی' اور طبعی علوم کا پوری انسانی تاریخ میں کیا مقام ہے؟ نیز یہ کہ ایک دیانت دار یا غیر منصف مورخ تاریخ کو کیا حیثیت دیتا ہے؟ اس سلسلے میں تاریخ کے عہد قدیم سے عہد جدید تک مورخین کے نظریات آ جاتے ہیں۔ کتاب کی تدوین کے وقت اس قسم کے سوالات میرے پیش نظر تھے اور اسی لیے میں نے ہومر سے لے کر ٹائن بی تک کے نمائندہ مورخوں کو لے کر تاریخ نویسی کے متعلق مختلف نقطہ ہائے نظر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں یہ بات واضح کرتا چلوں کہ یہ کتاب تاریخ نویسی کے تنقیدی نظریات کے ارتقاء کی تاریخ نہیں بلکہ اس میں مختلف اصول پیش کرتے وقت میں نے مغربی تاریخ سے متعلق بحثوں کو زیادہ تر نظرانداز کر دیا ہے اور محض اصولوں کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ اس کتاب میں بعض ایسے تاریخی واقعات خاصی تعداد میں شامل کیے گئے ہیں جو دوسری تاریخی کتب میں بہت کم ملتے ہیں۔ ایک بات جس کا مجھے بطور خاص ذکر کرنا چاہیے۔ یہ ہے کہ بحث و نظر میں کسی مذہبی یا قومی انتساب کی بنا پر راست بازی کے تقاضوں کو کہیں نظرانداز نہیں کیا گیا اور اس کے شواہد آپ کو ہرباب کی بحث میں ملیں گے۔ میں نے اس بحث سے پرہیز کیا ہے کہ کیا تاریخ کی تدوین کے لیے کوئی نظام فکر یا فلسفہء زندگی ضروری ہے؟ مگر تاریخ بعض میلانات و رجحانات کی عکاسی ضرور کرتی ہے۔ اور یہ میلانات و رجحانات کسی نہ کسی فلسفہء زندگی یا نظام فکر کی پیداوار ہوتے ہیں۔ خواہ مورخ انہیں شعوری طور پر سمجھتا یا لاشعوری طور پر ہی قبول کرتا ہو۔ اس کی تاریخ نویسی پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ مورخین کو ایسے نظریات تاریخ پر منطبق نہیں کرنے چاہئیں۔ تاریخ نویسی کے لیے اس امر میں احتیاط لازم ہے۔

کتاب میں بعض خالص فنی اصطلاحات و موضوعات تھے جن کے دقائق کا اردو میں انتقال نہایت دشوار تھا۔ میں نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ کتاب کو زیادہ سے زیادہ قابل فہم انداز میں پیش کیا جائے۔ اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں' اس کا فیصلہ قارئین پر ہے۔ تاہم میرے لیے یہی امرباعث طمانیت ہے کہ میں نے اپنی سعی و مقدرت کے مطابق اردو زبان میں "فن تاریخ نویسی" لکھ کر قومی زبان اور تاریخ کی حقیر سی خدمت انجام دی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب معاشرتی علوم (Social Sciences) کے محققین' مورخین اور طلباء کے لیے غور و فکر کا موقع مہیا کرے گی۔ انہیں معلوم ہو گا کہ عہد قدیم سے عہد جدید تک مشاہیر اہل قلم تاریخی علوم پر کس انداز میں غور و فکر کرتے رہے ہیں۔ یوں وہ اپنی قومی اور ملکی تاریخ و تہذیب کے متعلق مستقل تصانیف کی ترتیب پر توجہ مرتکز کر سکیں گے۔ یہ کتاب شاید ماہرین کی توقعات پر پوری نہ اتر سکے۔ ان سے استدعا ہے کہ وہ اگر کوئی کمی یا خامی محسوس کریں تو مصنف کو اطلاع دیں جو شکریے کے ساتھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرے ایڈیشن میں بوقت نظر ثانی ان کے قیمتی مشورے پیش نظر رکھے گا۔

میرے مضامین کا یہ مجموعہ جناب افتخار احمد بٹ اور جناب ملک محمد افتخار خاں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان حضرات نے مجھ سے رابطہ کیا اور کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں اصرار کیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے مجھے ہر قسم کی ضروری مطبوعات مرحمت فرما کر ہمت افزائی بھی فرمائی اور اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا۔ ان کے پر خلوص جذبات کے لیے میں خاص طور پر مشکور ہوں۔

آخر میں، میں اپنی شریک حیات پروفیسر نیر سلطانہ کے صبر کا بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے دورانِ تالیف میری مصروفیات کے سبب روایتی بیگمات کی طرح کبھی تنگیء وقت کا شکوہ نہیں کیا۔ انہوں نے کتاب کو منظم و مکمل کر کے ایک تخلیقی روپ بخشنے میں نہ صرف میری معاونت کی بلکہ انتہائی جانفشانی اور محنت سے کتاب کے پروف بھی پڑھے اور ان کی ضروری تصحیح بھی کی۔ اگر یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر آپ کے سامنے ہے تو یہ انہی کا کارنامہ ہے۔

؎ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

23 مارچ 1993ء   صادق علی گِل

شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی، نیو کیمپس۔ لاہور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلا باب

تاریخ کی تعریف

DIFINITION OF HISTORY

لفظِ تاریخ

لغوی طور پر لفظ تاریخ سے مراد ایک دن رات' مہینے کا ایک دن یا کسی چیز کے ظہور کا وقت یا ایسا فن یا کتاب ہے جس میں مشہور آدمیوں اور بادشاہوں کے وقائع' حالات' پیدائش و وفات یا کسی عہد کے وقائع' روایات' قصے' افسانے اور جنگ نامے درج ہوں[1]

عمومی لحاظ سے لفظ تاریخ سے مراد قوموں کے عام وقائع کا بیان یعنی شرح وقائع کا بیان بہ ترتیب سالیانہ (Annals) ہے۔ یہ لفظ کسی عصر خاص کی ابتدا کا تعین (Era)' حساب حوادث کے وقت (Date) کا تعین بترتیب تاریخی وقائع استعمال ہوتا ہے مثلاً مسلمانوں کے ہاں تاریخ ہجری کا آغاز "سن ہجری" پیدائش دنیا کی تاریخ "تاریخ العالم" حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کی "تاریخ مسیح" اور خلقت عالم کی تواریخ وغیرہ۔ یہ لفظ بہت سی تاریخی کتابوں کے نام کا بھی جزو ہے۔ مثلاً تاریخ الطبری' تاریخ بغداد' تاریخ مکہ' تاریخ مدینہ' تاریخ لاہور' تاریخ اندلس' تاریخ السند اور تاریخ الحکماء وغیرہ[2]

عربی زبان میں لفظ تاریخ زمانہ (Era) حساب اور تعین وقت (Date) کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لفظ تاریخ مادہ و۔ ر۔ خ سے مشتق ہے جو سامی زبانوں میں مشترک ہے مثلاً عبرانی زبان کے لفظ یا ر ے ا خ "چاند" اور ییرح۔ "مہینہ" میں یہی مادہ موجود ہے۔ اسی مشابہت کی بنا پر قیاس کریں تو لفظ تاریخ کے معنی ہوں گے "مہینے کا تعین کرنا" چنانچہ ایک طرف تو لفظ تاریخ کے معنی کسی واقعہ کے ہونے کا زمانہ معین کرنا اور روداد وقائع ہے۔ اور دوسری طرف وقائع کے وقتوں (Dates)' اعصار (Era) اور ترتیب زمانی کا تعین (Chronology) یعنی تاریخ وار سلسلہ ترتیب سے واقعات کا تعین کرنا ہے۔

فارسی زبان میں لفظ تاریخ "ماہ و روز" کا معرب ہے۔ یعنی ماہ (چاند) اور روز (دن) سے مراد ہے۔ اس میں بھی ایک مبہم سا احساس پایا جاتا ہے کہ اس لفظ کو مہینے کی ابتداء کے تعین سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ ممکن ہے اس نظریئے کا اس روایت سے تعلق ہو (جو متعدد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مورخین نے بیان کی ہے[1]) جس کی رو سے اسلامی سن کو ہجرت کے سال سے شروع کرنے کا مشورہ حضرت عمرؓ کو الہرمزان نے دیا تھا۔

انگریزی زبان میں یہ لفظ ہسٹری (History) کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جو لاطینی زبان کے لفظ ہسٹوریا (Historia) سے مشتق ہے جس سے مراد کسی واقعہ کی تفتیش و تحقیق کرنا ہے۔

عام طور پر لفظ ہسٹری (History) سے مراد کسی قوم' معاشرہ اور ادارے کے وقائع خاص کا صحت وجوہات کے ساتھ ترتیب وار تحریری ریکارڈ ہے۔

یونانی زبان میں یہ لفظ ایڈنئے (Eidenai) کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جس سے مراد کسی واقعہ کی بصیرت و ادراک حاصل کرنا ہوتا ہے۔

جرمن زبان میں یہ لفظ گشئے (Geschichte) تین قسم کے مفہوم ادا کرتا ہے۔

ا۔ کسی واقعہ کا وقوع پذیر ہونا۔

۲۔ وہ سلسلہء تحقیق جس کی بدولت وقائع کا علم ہو اور

۳۔ معلوم شدہ وقائع کا بیان ہے[2]

فرانسیسی زبان میں یہ لفظ ہسٹر (Istor, Histor) کے طور پر استعمال ہوا ہے جس سے مراد ماضی کی کسی چیز یا واقعہ کے بارے میں جاننا اور معلومات رکھنا ہے۔

اس لفظ کے حقیقی معنی دانا' حکیم اور عاقل کے بھی ہیں۔

لفظ تاریخ کی تشریحات جاننے کے بعد اب ہم تاریخ کی تعریف کے موضوع پر بحث شروع کرتے ہیں۔

تاریخ کی تعریف (Definition of History)

لفظ تاریخ کی مختلف زاویوں اور پہلوؤں سے تشریح و توضیح کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ماہیت' مفہوم اور تعریف کو جانا جائے۔

ماضی کے حالات و واقعات معلوم کرنے اور اس کے مطالعہ کا شوق دیگر علوم کے مقابلہ میں زیادہ پرانا ہے۔ انسان جب لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا تھا اس وقت سے ماضی کی نشانیوں کا متلاشی ہے۔ انسان کو اپنے گرد و پیش کے حالات سے اس وقت سے دلچسپی ہے جب کہ وہ جنگلوں میں وحشیانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ درختوں اور غاروں میں رہتا تھا۔ اس وقت بھی ماضی کی نشانیوں کو بغور دیکھتا اور ان سے مدد لے کر بہتر زندگی کے طریقے معلوم کرتا تھا۔ ہم یہاں پر یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ تاریخ کے بارے میں انسان کا علم اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ وہ خود۔

دوسرے الفاظ میں تاریخ نے انسان کے ساتھ ہی جنم لیا ہے انسان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"انسانی معاشرے یا اس کے کسی حصے کے آغاز' ارتقاء' ترقی اور تنزل کے بارے میں معلومات کا علم تاریخ کہلاتا ہے۔"

تاریخ کا آغاز اس وقت ہوتا ہے۔ جب انسان معاشرتی حالات میں داخل ہوتا ہے۔ جب تک انسان دور فطرت میں رہتا تھا اسے دوسروں کی کچھ پروا نہ تھی۔ اس کی صرف ایک ہی ضرورت تھی کہ وہ کسی طرح اپنی بھوک مٹائے۔ دور وحشت کی انسانی حالت حیوانی حالت سے ملتی جلتی تھی۔ جب دور وحشت کا خاتمہ ہوا' انسانی معاشرہ وجود میں آیا اور باہمی ضروریات کے لئے انسان آپس میں ملے تو انسانی تاریخ کا آغاز ہوا۔ انسان نے ترقی کی' آگے بڑھا' یوں گاؤں' شہر' ملک' قومیں تمدن اور تہذیبیں وجود میں آئیں' پروان چڑھیں' پھلی پھولیں' زوال پذیر ہوئیں اور تباہ ہوئیں۔

جوں جوں انسان نے تہذیب و ثقافت میں قدم آگے بڑھائے' اس کا ماضی کے حالات دریافت کرنے کا شوق بڑھتا گیا کیوں کہ اس کی بدولت وہ ترقی کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ آنے والی نسلیں کہیں اس کے قیمتی تجربات سے محروم نہ ہو جائیں؟ ان قیمتی تجربات کو محفوظ کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں اور فن تحریر ایجاد ہوا۔ پہلے تو قیمتی تجربات سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے۔ اس کے بعد پتھروں' درختوں کی چھالوں' جانوروں کی کھالوں' پتوں اور پھر صفحۂ قرطاس پر اتارے جانے لگے۔ آریوں کی وید' زرتشتوں کے زند و اوستہ حضرت موسیٰؑ کے فرامین' زبور' توریت' حمورابی کے قوانین' فراعین کے اہرام اور اشوک کی لاٹیں قدیم تاریخیں ہیں جو انسانوں کے تاریخی ذوق و ورثہ کا پتہ دیتی ہیں۔

انسانی تہذیب و تمدن کا یہ سلسلہ قریباً دس ہزار سالوں پر محیط ہے۔ لہٰذا تاریخ کا علم انسانی زندگی کے ماضی کے حالات و واقعات کو ہمارے سامنے لاتا ہے اور ان حالات کو معلوم کر کے ہم اپنی زندگی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

"علم تاریخ راہ حیات کی وہ گاڑی ہے جو مختلف زمانوں کی تہذیبوں کے راستوں سے گزرتی ہوئی ان کی ابتداء و انتہا اور ارتقاء سے آگاہ کرتی ہے۔
"

ڈچ مورخ ہوزنگ کے مطابق:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں سے ماضی کی تہذیب کا عکس نظر آتا ہے۔"

چونکہ تاریخ ماضی کے تسلسل کو برقرار رکھتی ہے اس لیے ماضی کی یادداشتیں' آثار' عمارتیں' نوادرات' اشیاء اور افکار و نظریات معاشرتی ترقی و ارتقاء کے لیے یہ ضروری ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ:

"اگر کسی قوم کی تاریخ گم ہو جائے تو وہ خود کو بے سہارا اور تنہا محسوس کرتی ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ ہر قوم ماضی کے اثرات میں اپنی جڑیں تلاش کرتی ہے۔ جس قوم کی تاریخ جتنی زیادہ قدیم ہو گی اتنی ہی زیادہ اس کے لیے باعث فخر و مباہات ہو گی۔ کینتھ برک کا کہنا ہے کہ:

"تاریخ سے مراد انسان کے ماضی کی معاشرتی و سیاسی سرگرمیوں کی کہانی ہے۔"

سر والٹر ریلے[5] نے تاریخ کی تعریف کے بارے میں لکھا تھا کہ:

"تاریخ کی غرض و غایت یہ ہے کہ ہمیں مثالوں کے ذریعے ماضی کے دور سے ایسی عقل و دانش سکھائے جو ہماری خواہشات و اعمال کی رہنما بن سکے۔"

تاریخ کے عمومی مفہوم دو ہیں۔ اول یہ کہ زمانہ ماضی اور جو کچھ اس میں گزرا ہے۔ دوسرا یہ کہ زمانہ ماضی کا ریکارڈ یعنی وہ سب کچھ جو انسانوں نے عہد ماضی میں کیا' کہا اور لکھا ہے۔ ادر برک ہارٹ کے الفاظ میں:

"جو کچھ ایک دور کے متعلق دوسرے دور کے نزدیک لکھ رکھنے کے قابل ہے[6]۔"

یہ دونوں مفہوم بڑی حد تک یکساں ہیں۔ ماضی کے وجود کا مطلب یہی ہے کہ جو کچھ اس کے متعلق ریکارڈ کر دیا گیا یا جس حد تک ہم ماضی کے حالات سے باخبر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ریکارڈ کے بغیر زمانہ ماضی کے وجود کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر اٹلی کے فلسفی مورخ بنی ڈیٹو کروچے نے دعویٰ کیا کہ:

"پوری تاریخ اصل میں معاصرانہ تاریخ ہے۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس مفہوم کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ماضی اپنے وجود کے لیے ہم پر انحصار نہیں کرتا بلکہ وہ بجائے خود موجود ہے اور موجود تھا مگر مورخین اس کے متعلق ریکارڈ مرتب کرنے میں ناکام رہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی جنگل میں کوئی درخت گر جائے مگر وہاں اسکو دیکھنے اور گرنے کی آواز سننے والا کوئی نہ ہو۔

تاریخ یکایک زندہ نہیں ہو جاتی بلکہ مورخ اپنی تحریر و نگارش سے اسے دریافت کرتا ہے' اور نامیاتی وجود بخشتا ہے۔ جب مورخ نئی معلومات کی فراہمی میں سرگرم ہوتا ہے تو ماضی کے پوشیدہ اسرار ظاہر کرتا ہے۔ اور ماضی کے معمات حل کرتا ہے یوں ہمارے علم ماضی کے خلاء کو پر کرتا ہے۔ مورخ کی اس کاوش کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے ماضی کی تخلیق کی۔ البتہ وہ ماضی کی روشنی میں نئی دنیا اور نئی چیزوں کے انکشافات و دریافت کا یقیناً ذمہ دار و پیش رو ہو جاتا ہے۔ جو کچھ عہد ماضی میں پیش آنا تھا' وہ پیش آ چکا تھا۔ اور اس سے جو نتائج برآمد ہونا تھے وہ تو مورخ کے بغیر بھی برآمد ہو چکے تھے مگر مورخ اپنی کاوشوں سے مردہ اور گم گشتہ ماضی کو زندہ و روشن کرتا ہے۔ مثلاً تقسیم ہند کے کچھ عرصہ بعد جب ریڈ کلف ایوارڈ رپورٹ اور ماونٹ بیٹن تقسیم اسکیم کی [illegible] منظر عام پر آئیں تو پتہ چلا کہ ہندو انگریز گٹھ جوڑ نے کس قدر پاکستان کی علاقائی سالمیت کو نقصان پہنچایا۔ جب تک یہ رپورٹیں شائع نہ ہوئیں کسی کو کچھ علم نہ تھا۔ رپورٹیں شائع ہونے کے بعد مورخین کو وہ سب کچھ جان لینے کا موقع ملا جو ہندو انگریز گٹھ جوڑ نے رپورٹوں میں ردو بدل کر کے کیا۔ اس وقت وہ یہ واضح کرنے کے قابل ہوئے کہ ۹ اگست ۱۹۴۷ء کو جو فیصلے علاقائی تقسیم کے بارے میں ہوئے اور پھر جو کچھ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد پیش آیا کس قدر مختلف تھا۔ جبکہ وفود نے جو کچھ کرنا تھا بہت پہلے کر چکے تھے مگر اس نے تاریخی صورت رپورٹوں کی اشاعت کے بعد اختیار کی۔ اس سے قبل مسلمانان پاکستان کو ہندو۔ انگریز کے باہمی گٹھ جوڑ سے علاقائی ردو بدل اور نقشہ پاکستان سے تحصیل اجنالہ' فیروز پور اور گرداسپور کے اخراج کا سرسری علم تھا مگر ان رپورٹوں کی اشاعت کے بعد حقیقت پسندی کے ساتھ قومی نقطہ نگاہ کے دور کا آغاز ہوا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب کوئی مورخ زمانہ ماضی کی کوئی گم شدہ حقیقت دریافت کرتا ہے یا اس دور کے کسی تاریک گوشے پر روشنی ڈالتا ہے تو وہ زمانہ ماضی کا ڈھانچہ حقیقتاً از سرنو تیار کرتا ہے۔ تاریخ وہاں پر پہلے سے موجود تھی۔ جو کچھ پیش آنا تھا وہ آ چکا تھا۔ خواہ انسانوں کی یادداشتیں اس سے باخبر تھیں یا نہ تھیں۔ سوئی اور دبی ہوئی یادوں کو جگایا اور جھنجھوڑا جا سکتا ہے۔ شعور کو حرکت میں لایا جا سکتا ہے۔ زمانہ ماضی کے خاکے میں رنگ بھر کر تصویر کو مکمل کیا جا سکتا ہے۔ اور تصویر بدلی جا سکتی ہے جب کوئی مورخ یہ کارنامہ انجام دیتا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس نے تاریخ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سازی کی ہے۔ لہٰذا اب تاریخ کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ:

"تاریخ زمانہ ماضی ہے اور زمانہ ماضی کی یاد بھی ہے۔"

تاریخ کی ہیت کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ دو عناصر سے بنتی ہے یعنی (ا) ماضی کا ورثہ اور (۲) حال کی وہ قوت تخیل جو ماضی کی تشکیل کرتی ہے۔ انسان ماضی کے وقائع میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا کیونکہ جو واقعات وقوع پذیر ہو چکے ہیں وہ گزر چکے ہیں۔ اور گزرے ہوئے واقعات میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ سوائے اس کے کہ مورخ جھوٹ اور غلط بیانی کا سہارا لے کر انھیں بدل دے اور حقائق ماضی کا خون کر دے اور ماہیت تاریخ کو بدل دے۔ جارج میکالے ٹریویلین نے اسی نقطہ نگاہ کو پیش کرتے ہوئے لکھا:

"ماضی کا سب سے بڑا سبق اور تاریخ کا اعلیٰ ترین موضوع انسان کا ارتقاء نہیں بلکہ وہ ہے جو کچھ اس نے حاصل کیا۔"

تاریخ میں ہم صرف انہی حالات و واقعات کا مطالعہ کرتے ہیں جن کا تعلق انسانی سرگرمیوں سے ہوتا ہے۔ اس میں دیوی، دیوتاؤں اور مافوق الفطرت واقعات و سرگرمیوں کو شامل تفتیش نہیں کرتے۔ ایسے موضوعات تاریخ ادبیات کے حوالے کر دیتے ہیں۔ مورخ نیچرل علوم مثلاً ارضیات، فلکیات، طبیعیات، کیمسٹری، علم طب، علم حیوانات اور علم نباتات وغیرہ کی تفتیش و تحقیق میں مبتلا نہیں ہوتا اور نہ ہی کائنات میں وقوع پذیر ہونے والے ہر واقع اور شئے کے انباروں اور ڈھیروں کی غیر ضروری تحقیق کی پریشانی مول لیتا ہے بلکہ وہ نیچرل اور ذیلی علوم کو ان کے ماہرین کے سپرد کر دیتا ہے خود ماضی کی قابل قدر انسانی سرگرمیوں کی تحقیق کا ذمہ لیتا ہے کیونکہ بیک وقت کوئی فرد بھی تحقیق و تفتیش کے تمام علوم اور ان کی شاخوں پر عبور حاصل نہیں کر سکتا۔ تمام علوم اپنے اپنے حقائق کا مطالعہ کرتے ہیں۔ علم نباتات پودوں اور درختوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ علم حیوانات حیوانات کا، علم النجوم ستاروں کا، نفسیات ذہن کا وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح علم تاریخ ماضی کے حقائق سے ایسے اصول و نتائج وضع کرنے کی کوشش کرتا ہے جو ان تمام حقائق پر حاوی ہوں۔ مثلاً علم نباتات کسی خاص پودے کی نشوونما کے اسباب و قوانین دریافت کرنے میں اتنی دلچسپی نہیں رکھتا جتنی کہ نشوونما کے عمومی (General) قوانین معلوم کرنے میں۔ اسی طرح علم تاریخ کسی طبعی علم میں دلچسپی نہیں رکھتا بلکہ اس کی خاص دلچسپی ازمنہ ماضی میں انسانی معاشرتی ترقی بطور اس کا ارتقائی سلسلہ ہے۔ تاریخ ہر دور کی اقوام کے تجربات کا نچوڑ لیے ہوتی ہے۔ اور ان تجربات سے ہر دور کی اقوام فائدہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اٹھاتی چلی آ رہی ہیں۔ لیوی کے بقول:

"مطالعہ تاریخ بیمار ذہنوں اور قوموں کے لیے اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے۔"

اور ٹیسی ٹس کے مطابق:

"تاریخ کا علم اس لیے ضروری ہے کہ یہ اخلاق و کردار کی تعمیر کرتا ہے اور ماضی کی حقانیت کا ذریعہ ہے۔"

چونکہ مورخ کے پاس ماضی میں انسانی سرگرمیوں کا خاصا وسیع ذخیرہ ہوتا ہے۔ اور وہ ماضی کے معاشرے سے آشنا ہوتا ہے۔ اور ماضی کے افکار و احساسات میں داخل ہو کر ماضی کی حقیقت کو گرفت میں لیتا ہے۔ مطالعہ تاریخ سے ہم بھی اس منزل پر پہنچ جاتے ہیں اور اسی طرح سوچنے لگتے ہیں جس طرح ماضی کے لوگ سوچتے تھے۔ سر چارلس اومن تاریخ کے بارے میں اپنے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے یوں نتائج اخذ کرتا ہے:

"میرا خیال ہے کہ لفظ تاریخ محض انسان کی ظاہری حالت سے ہی تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کا تعلق تو انسان کی ان سرگرمیوں سے بھی ہے (ماضی) جنہیں ہماری تحقیق کا موضوع ہونا چاہئے۔"

حال کی آنکھوں سے ماضی پر نظر ڈالنے کی پابندیوں کے متعلق اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بات سب سے بڑھ کر دل میں گھر کر جانے والی ہے خواہ ہم کتنی ہی کوشش کر دیکھیں یعنی ہمارے بس میں جو کچھ ہے اس میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔ ہم ماضی کو حال کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ماضی کی تہذیب و تمدن اور زبان کو اپنا لباس پہناتے ہیں۔ ان چیزوں کو پسندیدہ سمجھتے ہیں جو ہمارے نزدیک پسندیدہ ہیں اور انہی واقعات کو اہمیت دیتے ہیں جو ہمارے نزدیک اہم ہیں اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "کیوں ہر نسل از سر نو ماضی کی تاریخ لکھتی ہے؟" آپ سوچیں کہ پاکستانی مورخوں نے دو قومی نظریہ کی ترتیب کے لیے کن کن نئی تعبیرات کے چکر کھائے ہیں یا امریکی مورخوں نے تاریخ کی نئی ترتیب کے لیے کیا کیا تعبیرات اپنائیں؟ اس سلسلہ میں کہا جا سکتا ہے کہ:

"تاریخ مورخوں کے نقطہ نگاہ پر مبنی تعبیرات کا نام ہے۔"

اب ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ "تاریخ ایک داستان سرائی ہے" اگرچہ یہ سب سے اہم پہلو تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں مگر ابتدائی پہلو ضرور ہے۔ داستان سرائی تاریخ کا ابتدائی کردار تھا اور تاریخ کا یہی کردار اب تک سب سے زیادہ ممتاز رہا ہے۔ اگر تاریخ داستان سرائی بھول جائے یا اس سے تغافل برتے تو تاریخ کا یہ پہلو ختم ہو جائے گا۔ جس سے یہ بڑی حد تک سند و اعتبار کی حیثیت کھو بیٹھے گی۔ ایلیڈ[9] اور اوڈیسی میں داستان سرائی اور تاریخ اس طرح باہم مل گئے ہیں کہ مورخ آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ یہ کتابیں ادب کی ہیں یا تاریخ کی ہیں۔ یقیناً ان میں دونوں پہلو موجود ہیں۔ بابائے تاریخ ہیروڈوٹس نے یونانیوں اور ایرانیوں کے درمیان جنگوں کی بڑے جوش و خروش سے داستان سرائی کی ہے۔ تھیوسی ڈائیڈز[11] نے بھی ہمیں پیلو پونیشن[12] کی جنگ کی داستان سنائی ہے۔ لوی اور ٹیسی ٹس جیسے عظیم القدر رومی مورخ بھی داستان سرا تھے۔ والٹیئر، گبن، کارلائل اور میکالے جیسے ممتاز مورخوں نے بھی تو داستانیں بیان کی ہیں۔ لارڈ میکالے کا کہنا ہے کہ:

> "تاریخ بیان کا ایک فن ہے۔ اس سے انسانی تاثرات میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ تصور کے سامنے تصویریں آتی ہیں۔ لیکن ضروری ہے کہ مختلف واقعات کو ہنر مندانہ طریق پر انتخاب کیا جائے اور انہیں مناسب ترتیب سے پھیلا دیا جائے اور اپنے دماغ سے کچھ ایجاد و اختراع نہ کی جائے۔"

تاریخ یقیناً داستان سرائی ہے لیکن یہ خود ساختہ داستان نہیں۔ اس میں وہ داستان بیان کی جاتی ہے جو زمانہ ماضی کے حالات پر مبنی ہو، یا مورخ اپنی چھان بین سے ماضی کے واقعات دریافت کر کے انہیں از سرنو مرتب کر دے۔ بلاشبہ ہم ماضی کو اس صورت میں بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں جب ہمارے پاس ماضی کے حوادث و واقعات کا وسیع مواد موجود ہو۔ ماضی کے معاشرے کے خیالات کو اسی لحاظ سے سمجھا اور دیکھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

> "تاریخ کا مطالعہ زمانے کے خیالات کا مطالعہ ہوتا ہے۔ ہر ایک زمانے کے خیالات آئینے کی مانند ہوتے ہیں جن میں سے اس وقت کے لوگوں کی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔"[13]

مطالعہ تاریخ کے حق میں سب سے زیادہ امید افزاء اور قابل یقین حقیقت اس نظریہ میں پوشیدہ ہے کہ:

> "ہمارا حال ہمارے ماضی کا مجموعہ برائے عمل ہے اور ماضی کو سمجھنے کے لیے ...

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انسان کا ماضی اس لامحدود اور بے کراں کائنات میں وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا ہے۔ لہٰذا ہم تاریخ کو ماضی کے واقعات کی سرگذشت کا نام دے سکتے ہیں۔ ہم اپنے عہد کی اصلاح و تعمیر کا ماضی کی یادوں کے ساتھ رشتہ قائم کرتے ہیں۔ جیسا کہ گوئٹے نے ایک دفعہ کہا:

"ہم سب ماضی کے سہارے زندہ رہتے ہیں اور اس ماضی کی وجہ سے تباہ ہوتے ہیں۔"

سرجان سیلے (Sir John Seeley) نے تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے اسے ماضی کی سیاست (Past Politics) قرار دیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ انسانی عقل و شعور اور اعمال و کردار کا آئینہ ہے جسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ نہ دیکھا جائے کہ لوگوں نے کیا کیا اور کیا سوچا؟ بلکہ یہ دیکھا جائے کہ انہوں نے کیونکر کیا اور کیوں ایسا سوچا؟ **والٹیئر** نے کہا تھا:

"تاریخ ہمیشہ معقولیت (Rationality) کی راہنمائی کرتی ہے۔"

اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو تاریخ ذہنی و فکری ارتقاء کا زینہ معلوم ہوتی ہے اور تب یہ مفکروں، فلسفیوں، مصلحوں، سائنس دانوں اور مورخوں کا آئینہ خانۂ افکار دکھائی دیتی ہے۔ تاریخ کا یہی وہ روشن پہلو ہے جو ہمارے لیے زیادہ جاذب توجہ اور نایاب و شاداب نظر آتا ہے۔ یہاں پر مورخ محض واقعات بیان کرنے کی بجائے ان پر غور و فکر کرتا ہے۔ اور ان کا تجزیہ کر کے ان سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ انیسویں صدی میں فلسفہ اثبات (Positivists) کے پیرو کاروں نے تاریخ کو نیا نظریہ دیا ان کے مطابق:

"حوادث و واقعات کی تہوں میں وجوہات کام کر رہی ہیں۔ تاریخ کا کام یہ ہے کہ وہ ان وجوہات کو دریافت کرے۔"

قوموں کی بلندی اور پستی کے جس قدر اسباب ہوتے ہیں تاریخ ان کا تجزیہ پیش کرتی ہے کہ کس طرح ایک قوم ایک وقت میں گوشہ گمنامی میں روپوش ہوتی ہے۔ اور پھر وہ کیونکر بتدریج منازل ارتقاء طے کرتی ہوئی منظر تاباں پر آتی ہے اور پھر کس طرح بگڑتے بگڑتے ایسی روپوش ہوتی ہے کہ کسی کو خیال تک نہیں آتا کہ یہ بھی کبھی زندہ قوم تھی:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"تاریخی واقعات ان تبدیلیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں جو مختلف وقفوں' زمانوں یا مختلف ادوار میں لوگوں کے خیالات و افکار میں رونما ہوتی ہیں[14]-"

مختلف زمانوں میں مختلف افراد' طبقے اور قومیں معاشرتی' سیاسی' مذہبی' اقتصادی یا تہذیبی لحاظ سے جو انداز فکر اختیار کرتی ہیں' واقعات تاریخ انہی کا نچوڑ و مجموعہ ہوتے ہیں۔ جس سرعت کے ساتھ قوموں اور ملک کی کشمکش کے انقلابی حادثات و واقعات رونما ہوں گے' اسی رفتار کے ساتھ تبدیلیاں وقوع پذیر ہوں گی اور اسی تسلسل کے ساتھ تاریخ جنم لے گی۔

ان حقائق کے پیش نظر تاریخ کی تعریف یوں ہو گی:

"تاریخ محض حوادث و واقعات کا نام نہیں بلکہ انسان کی اس طویل اور عجیب و غریب داستان کی وجوہات کا نام ہے جو اس کی تخلیق کے ساتھ ہی شروع ہو گئیں تھیں۔"

گویا تاریخ کا مبداء خلق عالم ہے اور زمین کا چپہ چپہ تاریخ کا ایک بے پایاں دفتر اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے انسانوں کے خیالات بدلتے گئے یا ان کی فکر کا معیار بلند ہوتا گیا اور وہ ہر لحاظ سے ترقی کی منزلیں طے کرتے گئے ویسے ہی واقعات تاریخ کی شکل' روایات اور ریکارڈ میں اضافت ہوتی گئی۔ مقصد یہ ہے کہ انسان روز اول سے اپنے خیالات اور اپنی ضروریات کے مطابق اپنی تاریخ خود مرتب کرتا چلا آ رہا ہے۔ اور جیسے جیسے وہ ذہنی اور مادی طور پر ترقی کرتا گیا۔ اس کی تاریخ میں متنوع واقعات کا اضافہ ہوتا رہا۔

یہ حقیقت ہے کہ تاریخ اعادوں' جدتوں' یکسانیوں اور اختلافات سے لبریز ہے کیوں کہ تاریخ کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کے ایک نامکمل ریکارڈ سے زیادہ کچھ نہیں اور وہ انسان ایک دوسرے سے مشابہ بھی ہیں اور مختلف بھی۔ ول ڈیورانٹ (Will Durant) کے الفاظ میں:

"اکثر تاریخ قیاس آرائی پر مبنی ہے اور باقی ماندہ کی بنیاد تعصب پر ہے[15]۔"

بعض اوقات ماضی کے کسی واقعہ کے بارے میں ہمارا علم نامکمل' امکانی طور پر غلط' متضاد شہادتوں اور متعصب مورخوں کے بیانات کے باعث مبہم ہوتا ہے۔ جسے ہم اپنے مذہبی اور قومی تعصب و جانبداری سے مزید مسخ کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ مورخ اپنے ملک' قوم عقیدے یا طبقے کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

23219

جانبداری سے بالا تر ہونے کا دعویدار ہوتا ہے' وہ بھی مواد کے انتخاب اور الفاظ کے استعمال میں غیر محسوس اونچ نیچ کے ذریعے ڈھکے چھپے انداز میں اپنی پسند یا ناپسند کا اظہار کر دیتا ہے۔ بقول ول ڈیورانٹ:

> "مورخ ہمیشہ واقعات اور انسانوں کے بے کراں ہجوم میں سے جس کی بے انتہا پیچیدگی کا نہ تو وہ احاطہ کر سکتا ہے نہ ہی ادراک۔ شخصیات و حقائق کی ایک قابل عمل اقلیت کا جلد بازی میں انتخاب کر کے نتائج کو بے حد سادہ انداز میں پیش کرتا ہے[۱۶]۔"

کروچی کا مقولہ ہے کہ "انسان ماضی کی تاریخ کو بھی حال کی نظر سے دیکھتا ہے[۱۷]۔"

موجودہ دور میں اس قدر تیزی سے تبدیلی رونما ہو رہی ہے کہ ماضی کے واقعات و تجربات سے اخذ کردہ نتائج کی مستقبل میں افادیت مزید مشکوک ہو جاتی ہے۔ ہر روز کسی نئی ایجاد' نئے طریقے نئے نظریات یا نئی صورتحال کے پیش نظر انسانی رویوں اور نظریات کی از سرنو ہم آہنگی پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ ول ڈیورانٹ کے بقول:

> "ہمارا حال ہمارے ماضی کا مجموعہ برائے عمل ہے اور ہمارا ماضی سمجھنے کے لیے پھیلا ہوا زمانہ حال ہے[۱۸]۔"

تاہم ایک حقیقت ہمارے پیش نظر رہنی چاہیۓ کہ ماضی کے حوادث و واقعات کے متعلق ہمارا علم مکمل نہیں۔ یہ محض ایک فکری مغالطہ ہے کہ ہمیں پوری انسانی تاریخ کے بارے میں مکمل علم ہے۔ ممکن ہے سمیری یا مصری تہذیبوں سے پہلے بھی کئی تہذیبیں موجود ہوں اور ہمیں ان کا علم نہ ہو۔ ابھی تو ہم نے تہذیب و تمدن کے بارے میں جاننا شروع کیا ہے اور جزوی علم کی بنا پر عملی اقدامات اٹھاتے ہیں۔ تاریخ کا یہ ایک عبوری دور ہے۔ سائنس اور سیاست کی مانند تاریخ میں بھی اضافیت کا دور دورہ ہے اس لیے ہم تاریخ کی بنا پر اخذ کردہ نتائج کو حتمی قرار نہیں دے سکتے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی مورخ ایک سو صدیوں کے حوادث و واقعات کا نچوڑ سو صفحات کے نتائج کی صورت میں پیش کرے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

> "مطالعہ تاریخ سے ہمیں انسانی فطرت' اس کے طرز عمل اور اس کے مستقبل کے امکانات کا جائزہ ملتا ہے۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ٹیرلنیس تاریخ کی نہایت جامع اور مدلل تعریف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مطالعہ تاریخ کی قابل یقین حقیقت اس امر میں پنہاں ہے کہ:

"میں انسان ہوں اور جو کچھ انسان سے متعلق (تاریخ میں) ہے اسے اپنے آپ سے بیگانہ نہیں سمجھتا۔"

پندرھویں صدی میں جب یورپ میں احیائے علوم کی تحریک شروع ہوئی تو تاریخ کے مطالعہ کو بہت تقویت پہنچی۔ تاریخ چونکہ مذہبی پیشواؤں کے مراتب و مقاصد کے منافی تھی۔ اس لیے پادریوں نے تاریخ کی شدید مخالفت کی۔ لہٰذا تاریخ یورپ کے اسکولوں کے نصاب میں شامل نہ ہو سکی۔ مارٹن لوتھر نے پوپ اور پادریوں کے اقتدار کے خلاف جب علم بغاوت بلند کیا تو اس نے تاریخ کو اسکولوں میں خاص اہمیت دی۔ وہ کہتا تھا کہ:

"تاریخ ایک آئینہ ہے جس میں ہمیں اپنا چہرہ نظر آتا ہے۔"

ویویز (Vives) اسپین کا باشندہ تھا اور ایک اعلیٰ درجہ کا عالم تھا اس نے سولہویں صدی میں تاریخ کو اسکول کے نصاب میں شامل کرنے پر بہت زور دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ:

"جو قوم تاریخ سے بے بہرہ ہے۔ اس کے بوڑھے بھی بچے ہیں۔"

تاریخ ہمیں انسانی جذبات کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم انسانی تہذیب کی ارتقائی تصاویر دیکھتے ہیں۔ جرمن فلاسفر کرسچن وائز (Christian Weis) کے خیال کے مطابق:

"حال کو سمجھنے کے لیے ماضی کا مطالعہ ضروری ہے۔ ہمیں دور حاضر سے شروع کر کے ماضی کی طرف مراجعت کرنی چاہئے اور پھر حال کی طرف لوٹ آنا چاہئے۔"

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ سولہویں صدی کے آخر اور سترھویں صدی کے شروع میں یورپ نے تاریخ کو اتنی اہمیت دی کہ یہ علم ابتدائی درجات سے لے کر یونیورسٹی کے اعلیٰ درجوں تک پڑھایا جانے لگا۔ تاریخ عالم کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ قومی تہذیب و تمدن کو بھی خاص اہمیت دی گئی۔ اس علم کے مطالعہ سے طلباء میں نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت اور ان کا کردار بلند کرنے کی کوشش کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاتی تھی۔ اس مضمون کی اہمیت کو تمام مصلحین تسلیم کرتے ہیں۔ اٹھارویں صدی میں تاریخ کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ فرانس اور جرمنی میں فلسفہ تاریخ کے علماء پیدا ہوئے جنہوں نے تاریخ کو فلسفہ اور نظریہ ارتقاء کے ساتھ پیش کیا۔ انیسویں صدی میں تمام علوم کے ماہرین نے تاریخ کی اہمیت و افادیت کو تسلیم کر لیا تھا۔ بیسویں صدی کے شروع میں یورپ کے تمام ممالک میں علماء نے اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ تاریخ کو سائنٹیفک نظریہ کے مطابق پڑھایا جائے۔ ہربارٹ (Herbart) اور زلر (Ziller) نے اس بات پر زور دیا کہ تاریخ کو دیگر مضامین سے مربوط کر کے پڑھانا چاہئے۔ یہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

"مطالعہ تاریخ نظریہ کا مطالعہ ہے اور نظریات کبھی بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔"

ہر نظریہ ایک ایجاد کی مانند ہوتا ہے جو ماضی و حال کے واقعات کا ارتقائی نتیجہ ہوتا ہے اور وہ تاریخ کی تعمیر اور تہذیب کی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تاریخ میں حالات و واقعات زیادہ طاقتور ہوتے ہیں یا وہ عظیم انسان جو دوسرے افراد کے مقابلہ میں واقعات کی رفتار کو زیادہ سمجھ کر ان کا رخ موڑ دیتا ہے؟ جب وہ واقعات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں سنبھال لیتا ہے تو واقعات اس کی عظمت کی گواہی دینے لگتے ہیں اور وہ تاریخ کی روح رواں بن جاتا ہے جیسا کہ کارلائل کہتا ہے:

"تاریخ میں جو کچھ رونما ہوتا ہے وہ ان ہی عظیم شخصیتوں کے عمل کا نتیجہ ہے۔
اس لیے تاریخ ان عظیم انسانوں کی سوانح عمریوں سے زیادہ کچھ نہیں[19]۔"

کارلائل کا زمانہ شخصیت پرستی کا زمانہ تھا جس میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ شخصیتیں ہی تاریخ کی تعمیر و تشکیل کرتی ہیں اور معاشرہ میں بنیادی تبدیلیاں دراصل ان کے افکار و تعلیمات کی بدولت عمل میں آتی ہیں۔ اور یہی شخصیتیں تاریخ کے عمل کو متاثر کرتی ہیں۔ گوئٹے بھی تاریخ کے وجود میں عظیم ہستیوں کی اہمیت و خصوصیات کا قائل تھا اس کے نزدیک:

"تاریخ میں مصلحین، شعرا، فنکاروں اور خطیبوں کی وجہ سے زندگی کی لہر دوڑتی ہے۔ باقی تاریخ سوائے حماقتوں کے اور کچھ نہیں[20]۔"

گوئٹے اور کارلائل کے زمانوں میں تاریخ میں نمایاں مقام و اہمیت صرف حکمران طبقہ کو تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس وقت دنیا میں بادشاہی نظام حکومت رواج پذیر تھا اس وقت کے مورخین و شعراء کو ان حکمرانوں کے کارناموں کے علاوہ تاریخ کے لیے کوئی جاذب نظر مواد نہ ملا۔ انہوں نے واقعات کی تہوں میں خاموش معاشرتی، معاشی، سیاسی اور فکری سرگرمیوں کو نمایاں جگہ نہ دی۔ معاشرتی ارتقاء، تبدیلیوں اور تہذیبوں کی کہانیوں کو نظرانداز کر دیا اور یہ کام آنے والے مورخین کے لیے چھوڑ دیا۔

یہ بات درست ہے کہ ماضی میں بڑی بڑی شخصیتوں نے واقعات کا رخ بدلنے اور اشیاء کی ایجادات میں نمایاں کردار ادا کیا ہے مثلاً سر سید احمد خان، علامہ اقبال، قائداعظم محمد علی جناح، گیلیلو، نیوٹن، آئن سٹائن، لاک، ہابز، روسو، ماوزے تنگ، مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لعل نہرو، ونسٹن چرچل، جارج واشنگٹن، فرینکلن ڈی، روز و یلٹ، نپولین اور جمال عبدالناصر وغیرہ دور جدید کے چند نام تاریخ عالم سے ہماری توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ تب ان کے ضمیر، خیالات و تصورات شائد غیر تصورات، ارادے، فیصلے اور اعمال بھی تشریحات کے زمرے میں آ کر تاریخ کا جزو بنیں گے۔ یہاں پر تاریخ کی تعریف دور جدید کے عمومی رجحان کے مطابق بدل جائے گی اور کہنا پڑے گا کہ:

"تاریخ عوام کی ہوتی ہے۔"

یعنی لوگ ہی لوگوں کے بارے میں فیصلے کرتے ہیں اور وہی ان فیصلوں اور فیصلہ کرنے والی قوتوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ وہی معاشی و معاشرتی تاریخ کے لیے واقعات کو جنم دیتے ہیں۔ یہاں پر بڑی ہستیوں اور عوامی تاریخ کے درمیان فرق پڑ جاتا ہے۔ بڑی ہستیوں کی توجہ کا محور کوئی بڑی ہستی یا چند بڑی ہستیوں کے کردار و افعال اور حالات و واقعات ہوتے ہیں۔ یہ ایک یا چند بڑی شخصیتیں اپنی مضبوط قوت فیصلہ، مصمم ارادے، غیر معمولی حافظے اور اپنے افکار و اعمال سے تاریخ کا رخ تبدیلی کر دیتی ہیں۔ ان کے برعکس عوامی شخصیتیں عام افراد میں سے کوئی ایک فرد یا افراد کا ایک چھوٹا سا گروہ حالات کے تحت پیدا کر دیتی ہیں۔ جو کہ اپنے افعال و اقوال اور کردار و اعمال سے تاریخ کا رخ بدل دیتی ہیں۔ قائداعظم محمد علی جناح، ماوزے تنگ اور لینن وغیرہ کی شخصیات کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے جو اپنی اپنی قوم کے عظیم رہبر و نجات دہندہ ہیں۔ ایسی عوامی شخصیتیں بڑے بڑے شہنشاہوں اور بادشاہوں سے زیادہ عظیم و طاقتور ہوتی ہیں کیونکہ ان شخصیتوں کے اصول و کردار اور نظریات و افکار کے بہاؤ میں عوام بہ خوشی بہنے لگتے ہیں اس وقت:

"تاریخ کا مطالعہ عوام کے خیالات و افکار کا مطالعہ ہوتا ہے اس زمانے کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عوام کے خیالات اس آئینہ کی مانند ہوتے ہیں کہ جس میں سے اس عہد کے لوگوں کی تصویر نظر آتی ہے[21]۔"

بڑی شخصیتیں مرد و زن اپنی ذہانت' قابلیت اور جرات و بہادری کی بنا پر معاشرتی' معاشی اور سیاسی واقعات کا رخ تبدیل کر دیتے ہیں۔ واقعات کے بہاؤ پر کنٹرول اور اثر و رسوخ سے وہ تاریخ کے ریکارڈ پر اپنی ذات و ہستی کے نشانات ثبت کر دیتے ہیں۔ تاریخ ان شخصیتوں کے ناموں سے بخوبی آگاہ ہے۔ نپولین' سیزر' کنفیوشس' ایلزبتھ' جارج واشنگٹن' روز و یلٹ اور محمد علی جناح جیسی شخصیتوں نے اپنے عہد کے حالات و واقعات کو اپنے خیالات و افکار کے مطابق ڈھالا اور تاریخ کو اپنے گرد و پیش اور ماحول و حوادث کے مطابق جنم دیا[22]۔ غرض کہ تاریخ شخصی سوانح' فلسفہ اور سیاسیات کا سرچشمہ ہے۔ لارڈ ایکٹن تاریخ پر عظیم ہستیوں کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"زبردست اور حد درجہ اثر پیدا کرنے والی شخصیتیں خود اپنے لیے چوڑے سائے (تاریخ کے) صفحات پر ڈال دیتی ہیں۔ یہ بڑے آدمیوں کا خاص طریقہ ہے اور بڑا آدمی متعدد بے داغ مورخوں کے برابر قیمتی ہوتا ہے۔"

مورخ اپنی مجبوری سے بخوبی آگاہ ہے کہ نہ تو وہ تمام ریکارڈ کو سمیٹ سکتا ہے اور نہ ہی مکمل طور پر قلمبند کر سکتا ہے لہٰذا یہاں پر مورخ پسند اور انتخاب (Pick and choose) کی ترکیب استعمال کرتا ہے اس طرح:

"تاریخ ماضی کے پسندیدہ اور منتخب شدہ حقائق کا علم ہے۔"

کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یقیناً مورخ حقائق کے انتخاب میں تعصب سے بھی کام لیتا ہے اور تاریخ ذاتی تعصبات کا شکار ہو جاتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ "بعض اوقات تاریخ پسند و ناپسند کی داستان بن جاتی ہے۔" مثلاً سیاسی یا مذہبی تاریخ مرتب کرتے وقت مورخ ذاتی نظریات کا شکار ہو جاتا ہے اس طرح سے تاریخ تنگ نظری کا شکار ہو جاتی ہے۔ تاریخ کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی چیز کو ثابت کرے۔

...ل پیدا ہوتا ہے کہ حقائق و واقعات کی جانچ کا کیا اصول ہونا چاہیے؟ تو جواب ہے کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاریخی واقعات کا مجموعہ ذاتی نظریات' تعصب اور تنگ نظری سے مبرا ہو۔ یہی صحیح تاریخ ہو گی۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ ایک مورخ کسی خاص واقعہ کے بارے میں باخبر ہوتا ہے تو دوسرا بے خبر ہوتا ہے۔ بعض اوقات مختلف مورخین کے پاس ایک ہی واقعہ کے بارے میں مختلف قسم کا مواد پایا جاتا ہے۔ حقائق کے بارے میں متضاد مواد و معلومات تاریخ کے بنیادی اختلافات کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان تضادات کی بنا پر ماننا پڑے گا کہ "تاریخ تضادات کا شکار بھی ہے اور ایک ہی واقعہ کے بارے میں طرح طرح کے قصے اور داستانیں سنا کر حقیقت سے چشم پوشی کرتی ہے مثلاً حضرت عثمانؓ کی شہادت' خالد بن ولید کے ہاتھوں مالک بن نویرہ کا قتل اور محمد بن قاسم کی موت کے واقعات وغیرہ۔ غرضیکہ ہر مذہب کی مذہبی و سیاسی تواریخ سے ایسے لاتعداد واقعات بطور حوالہ پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جہاں پر تاریخ تضادات کا شکار ہے۔

ابن خلدون مقدمہ تاریخ میں تاریخ کو مسلسل جاری و ساری عمل کا نام دیتا ہے۔ اس کے مطابق ماضی و حال اور مستقبل ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ تاریخ میں مسلسل تغیر ہے ہر زمانے کی معاشرتی' سیاسی' اور تہذیبی اقدار بدلتی رہتی ہیں۔ ہر معاشرہ' نظام' ادارہ' قوم' حکومت' فکر' نظریہ ایک حالت پر قائم نہیں رہتا۔ یہ مسلسل شکست و ریخت اور تغیر و تبدل کا شکار ہیں۔

ویچو اپنی کتاب "جدید سائنس" میں تاریخ کو انسانی شعور اور سیاسی ارتقاء کا زینہ سمجھتا ہے۔ وہ تاریخ کو ایسا عمل قرار دیتا ہے کہ جس پر مذہب' معاشرے اور انسانی تہذیب کی بنیاد قائم ہے۔ کانٹ کے نزدیک تاریخی عمل قوانین فطرت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اس کے مطابق تاریخ سے انسان کے اعمال' اس کی ترقی اور فطرت کے اصولوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ چونکہ تاریخی عمل انسانی صلاحیتوں کے لیے ضروری ہے جس سے انسانی عقل و شعور کو ترقی ملتی ہے۔ قوانین فطرت اور تاریخی عمل کے ارتقاء کو مدنظر رکھتے ہوئے کانٹ نے "آفاقی تاریخ" کے نظریات اور اصول گردش پیش کیے جن کے مطابق تاریخ کا عمل جاری و ساری ہے۔ جرمن فلاسفر ہرڈر نے فلسفہ تاریخ کا نظریہ پیش کیا کہ انسانی فطرت ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی۔ یہ ماحول اور حالات کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔

ہرڈر تاریخ کو "انسان کی طاقت' عمل اور رجحانات کا فطری عمل" بتاتا ہے۔ جو جگہ' وقت اور ماحول کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ ہرڈر تاریخ میں ہر شئے کو فانی قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک کوئی ادارہ' معاشرہ' معاشرتی روایات و اقدار لازوال و ابدی نہیں ہوتیں۔ جب کسی نظام کو استحکام کے بعد زوال آتا ہے۔ تو آنے والی نسل کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ تمام پرانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روایات و اقدار کو مٹاتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے ذہن کی وسعتوں کے ساتھ نئی دنیا آباد کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ اس دوران امنگیں پرانے اور کمزور ڈھانچے سے نجات چاہتی ہیں۔ لیکن وقت کے ساتھ یہ اقدار و روایات بھی پرانی ہو جاتی ہیں۔ اس کی جگہ نئی نسل اور نیا معاشرہ تیار ہو جاتا ہے۔ یوں موت و حیات' عروج و زوال اور نئی و پرانی روایات و اقدار کا سلسلہ فنا کے عمل سے دو چار ہو کر جاری و ساری رہتا ہے۔

ہیگل کے نزدیک تاریخ کا عمل ایک اضدادی عمل ہے جو داخلی و خارجی قوتوں کی کشمکش اور زور آزمائی کے بعد فنا و تغیر کے نئے قالب و روح کے ساتھ جاری ہے۔ یہ عمل فطرت' کائنات' خدا' انسان' روح غرضیکہ کائنات کے ہر ذرے پر جاری ہے۔ انسان اس اضدادی عمل میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے ذریعے خدا اپنے منصوبوں کو پورا کرتا ہے۔

کارل مارکس کے نزدیک تاریخی عمل میں انسان کی سرگرمیوں اور تہذیب و تمدن کی ترقی معاشی ضرورتوں کی مرہون منت ہے۔ تاریخ مادیت اور طبقاتی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ مارکس کہتا ہے کہ "تاریخ محض واقعات ماضی کی کہانی نہیں بلکہ اقتصادی نظام اور عوامل پیدائش دولت میں تبدیلیوں کی کہانی ہے۔"

اسپنگلر تاریخ کو اصول گردش کے مطابق قوموں کی تہذیب و تمدن کے عروج و زوال کی کہانی گردانتا ہے جو نامیاتی عمل کی طرح پیہم رواں دواں ہے۔

اسپنگلر تاریخ میں آفاقی' ابدی اور کلی اقدار کا قائل نہیں وہ اصول فطرت اور تاریخ کو ایک مضبوط رشتہ میں جکڑا ہوا دیکھتا ہے ایسا مضبوط و آہنی رشتہ جسے توڑنا انسان کی قوت و طاقت سے باہر ہے۔

ٹائن بی تاریخ کو تہذیب و تمدن کے عروج و زوال کی کہانی بیان کرتا ہے کہ جو اصول للکار (Challenge) اور جواب للکار (Response) کے بتدریج عمل ارتقاء کے مطابق جاری ہے۔

کالنگ وڈ کے مطابق تاریخ نیچرل سائنس کی مانند ایک علم اور فکر ہے۔ وہ تاریخ کو تحقیق کی ایک قسم بتاتا ہے اور اسے سائنس کا درجہ دیتا ہے کیونکہ سائنس بھی ایک نظام فکر ہے جو تحقیق و تفتیش کا اطمینان بخش جواب دیتی ہے۔ لہٰذا تاریخ بھی اس دائرہ میں آتی ہے اور ماضی کی انسانی سرگرمیوں کا جواب دیتی ہے۔ کالنگ وڈ کا کہنا ہے کہ نظام فطرت کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ سائنس ہے اور انسانی افکار و حوادث کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ تاریخ ہے۔

کارلائل کا کہنا ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"یہ دیکھنا قابل رنج ہے کہ جسے تاریخ کہا جا سکتا ہے وہ ان روشن اور منور زمانوں میں بھی ویسی ہی ہے جیسے پہلے تھی- کیا آپ اس سے اس بڑے سوال کے جواب میں دھندلا سا سایہ بھی حاصل کر سکتے ہیں کہ آدمی کیوں کر جیتے تھے اور اپنے وجود کیوں کر قائم رکھتے ہیں یا کیا اقتصادی نقطہ نگاہ سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ انہیں کیا اجرتیں ملتی تھیں اور وہ اپنے ساتھ کیا لاتے تھے؟"

تاریخ کے آلات اعداد و شمار' واقعات ' نام اور تاریخیں ہوتی ہیں- لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ "تاریخ' ناموں ' واقعات' اعداد و شمار اور تاریخوں کے مجموعہ کا نام ہے-" یہ چاروں اجزاء تاریخ کے آلات ہیں- ماضی کے حوادث و واقعات کا نمائندہ ہیں- اگرچہ ماضی کا بہت سا ریکارڈ وقت کے ہاتھوں تلف ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود جو کچھ بچا ہے وہ ماضی کا فہم عطا کرنے کے لیے کافی ہے-

تاریخی شعور کی روشنی میں ہم نے مختلف علماء اور مفکرین کے تاریخ کی تعریف کے بارے میں خیالات پیش کیے- چونکہ کئی صدیوں سے مورخ اور فلسفی اس بحث میں پڑے ہوئے ہیں کہ تاریخ کے وظائف کیا ہیں؟ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ تنازعہ صرف اس لیے جاری رہا کہ تعریف کا تعین نہیں کیا گیا تھا- خود صدیوں تک مورخوں کی یہ کیفیت تھی کہ کوئی دو مورخ تاریخ کے مفہوم' تعریف اور وظیفہ پر متفق نہیں ہو سکتے تھے- ہر مورخ واقعات کو اپنے انداز میں پیش کرتا ہے- ایک مورخ جسے تاریخ کہتا دوسرا اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا- اس بحث پر آخری مثال ہم بابائے تاریخ ہیرو ڈوٹس کی پیش کر سکتے ہیں کہ جس نے تلاش حق میں مشرق و مغرب کے بہت سے ممالک کا سفر کیا- جو واقعات' جگہیں' اور چیزیں پسند آئیں ان کا ذکر کیا- جو زیادہ پسند آئیں ان کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا- اور جو چیزیں کم پسند آئیں یا پسند نہیں آئیں ان کا ذکر معمولی انداز میں کیا یا نظر انداز کر دیا' یہی حال ہماری تاریخ نویسی کا ہے اور یہی حال تاریخ کے مفہوم' تعریف اور وظیفہ پر متفق ہونے کا ہے- ہم ہیرو ڈوٹس کے اصول تاریخ نویسی پر آج تک عمل پیرا ہیں-

آخر میں کہوں گا کہ میرے نزدیک تاریخ ماضی' حال اور مستقبل کی ایک وحدت کا نام ہے- یہ انسانی عرفان و شعور کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے تاکہ انسانی شعور کے آغاز' ارتقاء اور تہذیب کے مقصد کو سمجھا جائے- انسانی سوچ کو بیدار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم آس پاس کے علاوہ پیچھے بھی دیکھیں تاکہ مستقبل کی روشنی نظر آئے- ہم آج میں رہ کر کل کو نہ بھولیں' نہ آنے والا کل اور نہ ہی گزرا ہوا کل-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلا باب

حوالہ جات

۱۔ مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات، (فیروز سنز، لاہور: ۱۹۶۷ء) ص، ۳۰۱

۲۔ ابن القفطی، تاریخ الحکماء۔ یہ کتاب علماء متقدین اور یونانی روایت کے عرب حاملین و متقدین کے تراجم اور ان کے مولفات کے بارے میں ہے۔

۳۔ ابو ریحان البیرونی آثار الباقیہ (Chronology of ancient nations) ترجمہ از زخاؤ (E.Sachau) (لندن: ۱۸۷۹ء) ص، ۲۹، ۷۹، الغوزی مفاتیح العلوم (فان فلوتن Van Vloten: ۱۸۷۹) البیرونی نے قدیم عربی مہینوں کے علاوہ قوم ثمود کے مہینوں کے نام بھی دیئے ہیں۔

۴۔ K. B. Smellie, Meaning of History, (London: 1957), P. 7

۵۔ سروالٹر ریلے ملکہ الزبتھ کے عہد کا مشہور مورخ **مکتشف** اور امیر آدمی تھا (۱۵۵۲ - ۱۶۱۸ء)

۶۔ جیکب برک ہارٹ (۱۸۱۸ - ۱۸۹۷ء)

۷۔ پاکستانی مورخین کا ایک گروہ دو قومی نظریہ کے ماخذ قرآن حکیم، محمد بن قاسم کی فتح سندھ اور برصغیر میں سب سے پہلے ہندو کے مسلمان ہونے کے وقت سے قیام پاکستان کی تخلیق تک کی مختلف تاویلیں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح دونوں قوموں کے ہیرو اور ولن (Villain) کے متعلق مختلف تعبیریں ہیں۔

۸۔ امریکی خانہ جنگی کے بارے میں امریکہ کی شمالی ریاستوں کے جنوبی ریاستوں کے بارے میں فتح و صلح کے نقطہ نگاہ مختلف ہیں۔ اسی طرح غلام حبشیوں کو مساوات کے درس کی تعلیمات، تعمیر نو پروگرام اور وحدت دنیا (One - World) کے بارے میں مختلف نقطہ نظر ہیں۔

۹۔ ٹرائے کے محاصرے کے بارے میں ہومر کی مشہور کتاب۔

۱۰۔ ہومر کی کتاب جس میں **اوڈیسیس** یا یولی سس کا ذکر ہے۔

۱۱۔ ایتھنز کا مشہور مورخ جس نے ایتھنز اور سپارٹا کی جنگوں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔ (۶۰ ۴ - ۳۹۹ ق م)

۱۲۔ پیلو پونیسیا یونان کے جنوبی حصے کا پرانا نام ہے جسے آج کل موریا کہتے ہیں۔ اس کے متعلق اہل ایتھنز اور اہل سپارٹا میں طویل جنگ ہوئی تھی جس کے تین دور تھے۔ تھیوسی ڈائیڈز نے اس جنگ کی تاریخ لکھی ہے۔

۱۳۔ پرمانند، تاریخ یورپ، (لاہور: سن ندارد) ص، ۲۷۹

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۴- انقلابات عالم مرتبہ ادارۂ تالیف و تصنیف، (شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور: ۱۹۶۰) ص ۱۳

۱۵- Will Durant, The Lesson of History, (California: 1968)

"تاریخ کیا سکھاتی ہے" مترجم ظفر الحسن پیرزادہ- ص ۱۰

۱۶- ول ڈیورانٹ- ص ۱۷

۱۷- Benedotto Croce, History as the Story of Liberty (Allen and Unwin New York, 1949) P. 19

۱۸- ول ڈیورانٹ، ص ۱۰

۱۹- Thomas Carlyle, On the Hero and Hero worship (Houghton Mifflin Co., New York, 1907), P. 1

۲۰- Emil Ludwig, Goethe, The History of a Man (G.P. Putnam's Sons, New York, 1928), P. 185

۲۱- Richard Robertson, History and Historian: An Introduction to the Study of History, (the Forum Series, St. Louis, 1978), P. 8

۲۲- Ibid, P. 9; Carl G. Gustavson, A Preface To History, (New York, 1955).

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرا باب

مطالعہ تاریخ

STUDY OF HISTORY

وسعت تاریخ Scope of History

تاریخ علم کا ایک ایسا سمندر ہے۔ جس میں دنیا جہان کے خیالات و نظریات کے دریا آکر گرتے ہیں۔ مشرق و مغرب کی تحریکوں' انقلابات' تخیلات' ماضی کے واقعات و حوادث اور فلسفہ و جمالیات کی داستانوں کا مخرج و منبع تاریخ ہے۔ اس محیط بیکراں کو عبور کرنے کے لئے خضر سا راہنما اور نوح سا نا خدا چاہئے۔ انسانی تاریخ اس وسیع کائنات میں ایک حقیر و مختصر دھبہ کی مانند ہے۔ انسانی ترقی کے طویل سفر کے دوران در پیش وسیع حوادث و واقعات اور امکانات و اطلاقات کے بارے میں آج بھی تاریخ ہمیں وہی جواب دیتی ہے جو پاسکل (Pascal) نے بہت عرصہ پہلے دیا تھا۔

> "اگر کائنات انسان کو نیست و نابود کر بھی دے تب بھی انسان اپنے پر فتح پانے والی ان کائناتی قوتوں سے عظیم تر ہو گا' کیونکہ اسے تو یہ علم ہو گا کہ وہ مر رہا ہے۔ جبکہ کائنات کو اپنی فتح کا کوئی علم نہیں ہو سکے گا۔"

تاریخ انسانی زندگی کی تفسیر ہے۔ ہر عہد کی تاریخ اس عہد کی انسانی زندگی کا حقیقت نما آئینہ ہوا کرتی ہے' جس کے ذریعے ہر عہد کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ یہ بات ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ ہر عہد کے سیاسی' معاشرتی' مذہبی' ادبی اور ثقافتی رجحانات و اثرات اپنے عہد کی ترجمانی کرتے ہیں۔ تاریخ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ محض واقعات کا اظہار ہی نہیں کرتی بلکہ واقعات کی تفصیل اور معاشرتی کیفیات کی تفسیر نہایت دیانتدارانہ خصوصیات کے ساتھ پیش کرتی ہے کہ جس کے توسل سے ہم پرانے زمانے کی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی شخصیتوں کے ساتھ اس طرح گھل مل جاتے ہیں جیسے ہم میں اور ان میں کوئی فاصلہ اور پردہ باقی نہیں رہتا۔ ہم یونان کی تاریخ' سقراط کی سیرت' اسکندر اعظم کی فتوحات' انقلاب فرانس کے واقعات اور نپولین کی جنگوں کے مناظر دیکھتے ہیں۔ کبھی عوام سے ملتے ہیں۔ کبھی امراء و

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روساء کی صحبتیں دیکھتے ہیں- بادشاہوں کی راز داری کا شرف حاصل کرتے ہیں- ہم ان کے راز دار بن جاتے ہیں اور اس راز داری کی بدولت ہمارے اور ان کے درمیان ایسے دوستانہ تعلقات و روابط قائم ہو جاتے ہیں کہ جن کے احساس سے ہمارا دل حد درجہ مسرور ہوتا ہے-

تاریخ ہمیں اقوام عالم کے اخلاقی و سماجی اصول و ضوابط' مختلف مذاہب' نظریات تہذیبوں کے عروج و زوال جنگوں' فتوحات' سازشوں اور عیاشیوں کی تفصیلات بتاتی ہے-تاریخ ایسا ہمہ گیر و وسیع مضمون ہے کہ اگر اسے خزینہ علوم کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کیونکہ اس کی آغوش میں تمام علوم سمائے ہوئے ہیں- بعض مورخین کے مطابق:

"تاریخ ان تمام حوادث کا مجموعہ ہے جواب تک ظہور میں آ چکے ہیں-"

غرضیکہ تاریخ زندگی کے ہر شعبے سے واقفیت بہم پہنچاتی ہے اور ان حقائق کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے جن کو فلسفی اور **سائنسدان** حل کرنے سے قاصر ہیں- جو قلبی سرور و مسرت مطالعہ تاریخ سے حاصل ہوتی ہے اس کو زوال نہیں آتا- بعض تاریخ پسند لوگوں کا کہنا ہے کہ مورخ اور تاریخ کے شائقین ہمیشہ جوان رہتے ہیں-

ہر علم و فن اور شے کی تاریخ ہے- حیوانات' نباتات' اور جمادات کے علاوہ افکار و جذبات مثلاً شاعری' ادب' ڈرامہ' فلسفہ' موسیقی' نقاشی' مصوری' عمارات اور ریاضی وغیرہ غرضیکہ تمام علوم و فنون کی تاریخ ہے- ان میں سے اکثر و بیشتر کی تاریخ انسان نے مرتب کر لی ہے بلکہ ان کے علاوہ کائنات اور اجرام فلکی کی تاریخ بھی انسان مرتب کر رہا ہے- چاند کی تسخیر اور دیگر سیاروں کے انسانی سفر کی داستانیں بھی قلمبند ہو رہی ہیں- غرضیکہ کائنات کا ہر ذرہ تاریخ رکھتا ہے اس لئے مورخ کی قلمرو میں ہے اور تاریخ میں شامل ہے-

تاریخ کے مضمون میں ایسی زبردست قوت پنہاں ہے کہ یہ اپنی قوت سے تعمیر کے حیرت انگیز کارنامے انجام دے سکتی ہے- اس کے مطالعہ سے ایسے محبان وطن پیدا ہوئے جنہوں نے ملک و قوم کی خاطر حیرت انگیز قربانیاں دے کر قوموں کی تقدیریں بدل دیں- وہ خود ملک اور قوم پر قربان ہو گئے لیکن اپنے ہم وطنوں کے لئے وہ کام کر گئے جو تاریخ میں سنہری حروف سے کندہ ہے اور ان کے ہم وطنوں کے دلوں پر نقش ہے اور ان کی نسلیں ان کی گن گاتیں رہیں گی-

تاریخ کا مبداء خلق عالم ہے- تاریخ کو ام العلوم کی حیثیت حاصل ہے اور اسے منبع علوم بھی کہتے ہیں- عمرانی علوم کی کوئی ایسی شاخ نہیں جسکا سلسلہ و تعلق تاریخ سے نہ ملتا ہو- قدیم یونانی مفکرین کا بھی یہی نظریہ تھا بلکہ انہوں نے تاریخ کو باقاعدہ سائنس کا درجہ دے رکھا تھا- بعض ادوار میں ادب بھی تاریخ میں شامل سمجھا جانے لگا اور نظم و نثر دونوں اس کا جزو بن گئے-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریک احیائے علوم تک بہت سے علوم تاریخ کا حصہ تھے۔ احیاء علوم کے دوران جب علوم کی سائنسی تاویلیں ہوئیں انھیں باقاعدہ تحقیق و تنقید کی میزان پر پرکھا گیا تو بہت سے علوم تاریخ کے دائرہ سے نکل کر باقاعدہ سائنس کی حدود میں داخل ہو گئے تو تاریخ بھی سائنسی علوم کی صف میں داخل ہو گئی اور یہاں سے تاریخ کا سائنٹیفک نظریات کا دور شروع ہوا۔

چونکہ تاریخ ماضی میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا مجموعہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے ماضی کے مختلف معاشرتی اداروں کی ابتداء' نشوونما' ترقی و تنزل' مختلف تحریکوں' انقلابوں' فلسفوں' مورخوں' علوم اور عظیم شخصیتوں کے بارے میں معلومات مہیا ہوتی ہیں۔ تاریخ واقعات کی صحت برقرار رکھتے ہوئے انہیں زمان و مکاں کی ترتیب کے ساتھ پیش کرتی ہے

تاریخ کے دامن میں معاشرے کے ہر طبقے کی قدریں پوشیدہ ہیں۔ یہ شریف و رذیل' امیر و غریب' زبردست و زیر دست' سخی و کنجوس' آقا و غلام' مالک و ملازم' اعلیٰ و ادنیٰ' وفادار و بے وفا' درویشوں' صوفیوں' پیروں' ادیبوں' جاگیرداروں' زمینداروں غرضیکہ سارے جہان کے انسانوں کے احساسات و جذبات کی حقیقتوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ اس کا دائرہ کار لا محدود ہے معاشرتی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو گا جو تاریخ کے زیر اثر نہ ہو۔

تاریخ ان علوم میں سے ہے جو انسانی زندگی' اس کے نظام اور اس کی تدریجی نشوونما سے بحث کرتی ہے انسانی زندگی ایک بہت ہی وسیع موضوع ہے۔ اس کی وسعت کی حد بندی نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی تاریخ کی وسعت و ہمہ گیری کو مقید کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ علم بھی ہے فلسفہ بھی اور فن بھی۔ مفکر کے لئے یہ ایک فن ہے جس میں مہارت حاصل کرنے کے لئے اس کے عملی اور فلسفیانہ پہلوؤں کا گہرا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے اس کے فن اور فلسفیانہ پہلو پر نظر رکھنے سے علم اور پختہ ہو جاتا ہے۔ جس شخص کے دل میں زندگی کی کلی اصلاح کا جذبہ ہو اور جزوی ترمیموں سے اس کی تسلی نہ ہو اس کے لئے تاریخ ایک اصول رہنما اور فلسفہ حیات ہے۔ تاریخ اس قدر وسیع اور پر پیچ ہے کہ اس میں اتنے زیادہ تضادات، نمونے اور منصوبے پائے جاتے ہیں کہ کسی ایک کا احاطہ بھی مشکل نظر آتا ہے۔ اور نہ ہی ہم تاریخی عمل میں یکساں قوانین تلاش کر سکتے ہیں کہ جن کو پوری عالمی تاریخ پر نافذ کر سکیں یہاں چند سوال پیدا ہوتے ہیں کہ کیا انسان شعور کے ساتھ تاریخ کو وضع و تعمیر کرتا ہے؟ یا تاریخ خود بخود انسانی کوششوں کے بغیر کسی تدریجی عمل کے تحت وضع و تعمیر ہوتی ہے؟ کیا تاریخ کے وضع و تعمیر کرنے میں ہمیں کوئی عمل دخل حاصل نہیں؟ کیا ہم تاریخی عمل کے محض ایک آلہ کار ہیں اور واقعات خود بخود وقوع پذیر ہو جاتے ہیں؟ اس نظریہ تاریخ کے بارے میں جرمنی کا مشہور چانسلر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بسمارک یوں اظہار خیال کرتا ہے کہ:

"ہم سب باہم ملکر دنیا کا مقابلہ کر سکتے ہیں مگر تاریخ تعمیر نہیں کر سکتے۔ جب تاریخ تعمیر ہو رہی ہوتی ہے تو اس دوران ہمیں انتظار کرنا ہو گا۔ ہم کسی پھل کو چراغ کی گرمی کے ذریعہ زیادہ تیزی سے نہیں پکا سکتے' اور اگر ہم پکنے سے پہلے ہی اسے توڑ لیتے ہیں تو اس کی نشوونما میں حائل ہوتے ہیں اور اسے ضائع کرنے سے زیادہ کچھ نہیں کرتے۔"

تاریخ ایک مسلسل ارتقائی عمل ہے۔ جس میں انسانی شعور کا بچپن' عرفان' اور تہذیب کی کہانی پوشیدہ ہے۔ یہ مجلس آداب' محلات و جھونپڑیوں' شہر و بازار' القابات و خطابات' جلال و ہیبت اور سخاوت و فیاضی کا احساس و شعور اپنے دامن میں چھپائے ہوتی ہے۔

تاریخ واحد علم ہے جو ماضی کے تمام جذبات' واقعات' مشاہدات اور مواد کے خزانوں کو اپنے دامن بیکراں میں محفوظ کئے ہوئے ہے۔ یہی وہ علم ہے جو انسانی تہذیب و تمدن اور فلسفہ و ادب کے محلات کو سجائے ہوئے ہے۔ اگر دنیا سے تاریخ کا وجود ختم ہو جائے تو پوری دنیا کے علوم و فنون تاریکی میں دفن ہو جائیں انسان کے تمام تجربات خاک میں مل جائیں۔ ماضی کی یادداشتیں ذہنوں سے کھو جائیں تو ہم خود کو کھوکھلا اور بے جان پائیں گے۔ ہماری زندگی اور تہذیب و تمدن خلاء میں معلق ہو کر رہ جائے گی۔ اسی لئے معاشروں' اداروں اور مختلف نظاموں کے لئے تاریخ کا ہونا از حد ضروری ہے کیوں کہ تاریخی شعور و تجربات کے بغیر ہم کوئی نیا دستور' قانون' روایات' اور اقدار تشکیل نہیں دے سکتے۔ مطالعہ تاریخ اپنے اندر ہر عہد کے سیاسی' معاشی' مذہبی اور فلسفیانہ افکار و نظریات رکھتا ہے جو ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ نظریات کس ماحول و معاشرے میں پروان چڑھے۔ یہ کن طبقات کی نمائندگی کرتے تھے اور کن کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ اور معاشرے میں یہ کس قسم کی مذہبی' سیاسی اور معاشرتی تبدیلیاں و انقلاب لائے۔

تاریخ ہمیں انساں کے ذہن' رجحان' عادت' عمل اور رد عمل کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ نہ صرف ماضی کی معلومات کے خزانے اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے بلکہ مقصد زندگی کے اسرار و رموز سے بھی آگاہی رکھتی ہے اور ہمیں حقیقت تک پہنچا دیتی ہے۔

مطالعہ تاریخ ذوق اور ذہنی ارتقا کے لئے ضروری ہے۔ تاریخ نئی نئی دنیائیں اور نئے نئے زمانے سامنے لاتی ہے۔ جس طرح جغرافیائی انکشافات اور سائنس نئے زمان و مکاں کے راز کھولتی ہے۔ اسی طرح تاریخ کے صفحات پر دریافت کے جوش و دلچسپی میں حصہ دار بن سکتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں۔ ہکلوٹ سوسائٹی[۱] کی سحر انگیز کتابوں کے مطالعہ سے ہم فرانس ڈریک[۲]، مارٹن فروبشر[۳] اور کیپٹن کک[۴] کے ساتھ کرہ ارض کے ان حصوں میں سفر کر سکتے ہیں جہاں یہ لوگ گئے۔ بیزلے کی کتاب "ڈان آف ماڈرن جیاگرفی" کے صفحات پر ہم کرہ ارض کے مختلف حصوں کی دریافت میں شریک ہو سکتے ہیں جب نقشہ نگاری کے فن کی ابتداء ہوئی۔ یہ سب سے بڑے جغرافیہ دانوں کا دور تھا۔ تاریخ میں گہرائی بھی ہوتی ہے اور پہنائی بھی۔ اس کے ذریعے ہم زمانہ ماضی کی عظیم القدر شخصیتوں کے افکار و کردار میں داخل ہوتے ہیں اور تعارف کا وہ درجہ حاصل کر لیتے ہیں جو ہمارے زمانے یا ہمارے معاشرے میں ناقابل تصور ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ خاندانی تاریخ کو ہزار گنا بڑھا دینے کا معاملہ ہے اس طرح ہم ماضی کے دوسرے معاشروں سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ ان میں ایسے بے شمار معاشرے بھی شامل ہیں جنھیں وقت کی لہریں اپنے ساتھ بہا لے گئیں مثلاً اٹرسکن[۵]، ازٹک، انکا اور وائیکنگ[۶] وغیرہ

تاریخ ہمیں انسانی تجربات کے ایسے پر جوش ادوار میں پہنچا دیتی ہے جو ہر پہلو سے نہایت ولولہ افروز ہیں اور ہمیں اس کے عظیم ترین کرداروں سے آگاہی حاصل کرنے کے قابل بناتی ہے۔ ہمیں ایسی گہری آگاہی بخشتی ہے جیسے ان لوگوں کے قریب ترین احباب کو حاصل تھی۔ ان عظیم کرداروں میں سے مثال کے طور پر سر سید احمد خان، مولانا محمد علی جوہر، قائداعظم محمد علی جناح، جارج واشنگٹن جیفرسن، لنکن، گوئٹے، ورڈز ورتھ اور علامہ محمد اقبال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ تاریخ کے ذریعے ہم ان بڑے لوگوں کے ہر فعل و عمل کی حقیقت جان سکتے ہیں۔ یہی کیفیت ہمیں ان کے خطوط، روزنامچے اور یادداشتیں مہیا کرتی ہے۔ یہ یادداشتیں ان کے عہد میں موجود نہ تھیں۔ غرضیکہ ہم ان کے ہر فکر میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ تاریخ کا نہایت خوش کن پہلو ہے۔ اور یہ ایسا عظیم الشان پہلو ہے کہ عالی شان تخلیقی ادبیات میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔

تاریخ ہمیں عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنے کی اجازت دیتی ہے۔ تاریخ کا طالب علم اپنے آپ سے وہی چیز کہہ سکتا ہے جو تاریخ کے ایک طالب علم سٹیفن سپنسر نے کہی:

> "میں مسلسل ان لوگوں کے متعلق سوچتا رہتا ہوں جو حقیقت میں بڑے تھے...... ان لوگوں کے نام جنہوں نے جیتے جی زندگی کے لئے جنگ کی جن کے دلوں کے مرکز بھڑکتی ہوئی آگ کی بھٹیاں تھے۔ جو سورج سے پیدا ہوئے اور کچھ عرصہ تک سورج ہی کی طرف مصروف سفر رہے اور اپنی عزت کے نقش صفحۂ دہر پر چھوڑ گئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مطالعہ تاریخ میں اتنی وسعت و اہمیت ہے کہ ہم عظیم باکردار اور روشن خیال لوگوں کو اپنی رفاقت کے لئے منتخب کرتے ہیں۔

تاریخی مواد کی کثرت کی وجہ سے تاریخ کی وسعت حدود اس قدر وسیع ہے کہ آئندہ کے مورخوں کے لئے مشکلات پیدا ہو گئیں ہیں۔ مثلاً اب روزانہ اخباروں کی ہر خبر تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ مغرب خصوصاً امریکہ میں تو اخباروں کا حجم ایسا ہو گیا ہے کہ ایک اخبار کو پڑھنے کے لئے کئی دن درکار ہوتے ہیں۔ اگر تمام دنیا کے اخباروں کو یکجا کیا جائے تو سینکڑوں من بوجھ بن جائے۔ لامحالہ مورخوں کو خبروں میں سے انتخاب کرنا مشکل ہو جائے۔ اگر مورخ وہی خبریں منتخب کرے جن سے اس کے خیال اور عقیدے کی تائید ہوتی ہو۔ اس طرح ایک ہی واقعہ کی مختلف اور متضاد تاویلیں کی جائیں تو قاری کے لئے اسی مواد کو یکجا کرنا مشکل ہو جائے۔

تاریخ کے لئے یہ بکثرت مواد صرف اخبار اور رسالے ہی مہیا نہیں کر رہے بلکہ حکومتوں نے بھی اپنے قدیم کاغذات اور تاریخی دستاویزوں کے دفاتر کے دروازے مورخوں کے لئے کھول دیئے ہیں۔ پرانے زمانے کے مورخ بڑی بے باکی سے اور پورے یقین کے ساتھ واقعات لکھتے تھے لیکن اب جب کہ تمام حکومتوں نے مورخوں کو دستاویزات دیکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ مورخ کسی واقعہ کو پورے یقین کے ساتھ نہیں لکھ سکتے کہ مبادا کل کوئی اور مورخ کسی اور حکومت کے دفتر سے کوئی اور دستاویز یا واقعہ ڈھونڈ نکالے جس سے پچھلے واقعہ کی تردید ہو جائے اور صرف محدود واقعات کا انتخاب کرتے ہیں۔ لہٰذا اب تاریخ کے وسیع میدان سے مورخ مخصوص عہد کے مخصوص واقعات لکھتے ہیں۔

تاریخ کی افادیت

Utility of History

لفظ تاریخ کے وسیع معانی ہم جان چکے ہیں۔ اس لفظ کے عام معنی سے مراد ہر وہ چیز ہو سکتی ہے، جو وقوع میں آ چکی ہے۔ ہر زمانہ میں ادوار گذشتہ کی تاریخ اور تاریخی دستاویزات کا مطالعہ کرنے سے ہمیشہ بے شمار افراد کو دلچسپی رہی ہے۔ اب علم و آگہی، ترقی اور جدید سائنس و ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ اب عام تعلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ہر فرد تاریخ کا مطالعہ ضرور کرے۔ اگر وہ عالمی تاریخ کے لئے وقت نہیں نکال سکتا تو کم از کم اسے اپنی قوم کے مشاہیر اور قومی تاریخ کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے تاکہ وہ اپنے تمدن، داستانوں، رسم و رواجات، آئین و قوانین مختلف عقائد و نظریات سیاسی اداروں، ملکی تجارت، اپنے ملک کے اقوام عالم کے ساتھ روابط، اور ایسے بہت سے حقائق اپنے حافظے کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دامن میں بھرلے۔ چونکہ بعض لوگ تاریخ کا مطالعہ پسند نہیں کرتے جیسے دوسرے لوگ ریاضیات کے مطالعے میں دلچسپی کا اظہار نہیں کرتے لہٰذا مورخ کو چاہئے کہ تاریخی مطالعے کی تمہید میں اس مطالعے کا کچھ نہ کچھ جواز پیش کرے تاکہ قاری کے ذہن میں اس مطالعہ کی افادیت پیدا ہو۔ مورخ کو عذر خواہانہ انداز ہرگز اختیار نہ کرنا چاہئے اور سب سے بڑھ کر یہ ضروری ہے کہ دور حاضر کے سائنٹیفک انداز میں مطالعہ تاریخ کی عملی افادیت واضح کرے۔

سوال یہ ہے کہ مطالعۂ تاریخ کا فائدہ کیا ہے؟ تاریخ ایک ایسا مضمون ہے جس کی افادیت سے کوئی صاحب علم انکار نہیں کر سکتا یہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ جسے تولا یا ناپا اور گنا جا سکتا ہے۔ تاریخ انہی معنی میں کار آمد ہے جن معنی میں موسیقی' شاعری' مذہب' فلسفہ' نفسیات' عمرانیات اور سیاسیات فائدہ مند ہیں۔ تاریخ کے بغیر زندگی اور معاشرہ اسی طرح ویران اور پستی کا شکار ہو جائے گا کہ جس طرح دوسرے بیان کردہ علوم کے بغیر۔ تاریخ کے بغیر ہم بعض ذہنی اور اخلاقی تجربوں سے محروم ہو جائیں گے کہ جن سے زندگی میں روشنی' چاشنی' معنویت اور ذہنی صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے ہر نسل و معاشرہ کے ہر عہد میں ہر قسم کے اعلیٰ و ادنیٰ افراد فیض و تسکین پاتے رہے ہیں۔

تاریخ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ تاریخ انسان کے لئے خوشی کا سامان ہے _ اور اس کے مطالعہ سے زندگی میں نئے نئے گوشے بے نقاب ہوتے ہیں اور زندگی کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ ہمارا زاویہ حیات بے حد وسیع ہو جاتا ہے۔ ہمارے تجربے کا دائرہ بہت پھیل جاتا ہے۔ ہم ماضی میں داخل ہوتے ہیں اور ہزاروں سال کے واقعات کا نقشہ اپنے ذہنوں میں کھینچتے ہیں جو انسانوں کی مختلف نسلوں پر مشتمل ہوتا ہے تاریخ کے صفحات سے ہم نئی دنیاؤں میں پہنچ جاتے ہیں۔ تاریخ ہمارے قلب و دماغ کی زندگی کے لئے فکر و عمل کے تمام عناصر مہیا کرتی ہے۔ تاریخ ہماری رفاقت کے لئے نئی گہرائیاں اور نئے زاویہ ہائے نگاہ مہیا کرتی ہے۔ یہ زندگی کے سفر میں ہمارے لئے بہت بڑے رفیق مہیا کرتی ہے۔ ہمیں صرف کتابیں اٹھانے کی ضرورت ہے ہم ہیرو ڈوٹس' تھیوسی ڈائیڈز' لوی' پلوٹارک' مانٹیسکو' روسو' فرائید' والیٹر اور دیگر عظیم مورخین و ہستیوں کے حلقہ خاص میں پہنچ جاتے ہیں۔ ہم ان ہستیوں کے ساتھ زیادہ قربت اور بے تکلفی کے ساتھ تعارف پیدا کر لیتے ہیں جو ان کے ہم عصروں اور ہمسروں کو میسر نہ تھا کیونکہ ہم ان بڑے آدمیوں کے خطوط' سوانح عمریاں اور روز نامچے پڑھتے ہیں۔ یہ محض تاریخ ہی کی شادمانی نہیں' بلکہ یہ زندگی کی ایک ناگزیر زرخیزی ہے۔

تاریخ کی ایک افادیت یہ ہے کہ ہمیں ماضی کو حال کی نگاہوں سے دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے اور یوں مقامات و دقائق کی دید سے ایک نیا زاویہ پیدا ہو جاتا ہے۔ میکالے نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"تاریخ کے مطالعہ سے جو سرور حاصل ہوتا ہے وہ ان حالتوں میں بیرونی ممالک کے سفر سے ملتا جلتا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے والا زندگی کی ایک نئی حالت' نئی فکر سے روشناس ہوتا ہے۔ وہ نئے فیشن دیکھتا ہے۔ اظہار مطالب کے نئے اسلوب سنتا ہے۔ قوانین' اخلاق' اور فنون کے وسیع تنوع پر غور و فکر سے اس کے ذہن و قلب میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔"

جن افراد نے بھی تاریخی مقامات دیکھے ہیں خواہ ان کا تعلق نئی دنیا سے ہو یا پرانی دنیا سے جانتے ہیں کہ جب ان مقامات کو تاریخ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو وہ ایسی اشیاء نہیں رہتیں جو عجائب خانوں کی زینت ہوتی ہیں بلکہ ان میں عہد گم گشتہ کی زندگی اور قوت حرکت کرنے لگتی ہے۔ ان میں سے ماضی کی خوشبوؤں کے جھونکے آتے ہیں۔ مثلاً بادشاہی قلعہ لاہور یا لال قلعہ دہلی کو تاریخ کی آنکھوں سے دیکھا جائے تو ان میں ایک شان جدت نظر آتی ہے۔ مغل شہنشاہوں کی ہیبت و جلالت کے مناظر چشم تصور کی سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ یہاں یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ اس میں تخیل کو خاصی زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔ خواہ وہ مورخ کا تخیل ہو یا تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ تاریخ کا براہ راست تعلق تخیل سے ہے اور یہ ہمیں اصل لوگوں سے متعارف کرواتی ہے۔

بعض افراد کو تو مطالعہ تاریخ سے بے حد دلچسپی ہوتی ہے۔ بعض بادشاہوں اور لڑائیوں کی فہرستیں ذہنوں میں محفوظ کر کے خوش ہوتے ہیں۔ بعض ان رشتوں اور سلسلوں سے بے حد متاثر و خوش ہوتے ہیں جو ماضی انہیں فراہم کرتا ہے۔ مثلاً قوموں کی تباہی' عیش و عشرت' حسن پرستی' عمدہ عمدہ کھانوں سے لوگوں کی وابستگی' نفیس لباس پر قوم کی فریفتگی' موسیقی' ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا قیام' مغلیہ خاندان کا عروج و زوال' رانا پرتاپ سنگھ کے بہادری کے قصے' میراں جی کی رام دیوانگی' رومن قوم کا تعمیری ولولہ' مغلوں کا تعمیری ذوق' شاعری' انقلاب فرانس' انقلاب روس' سکندر اعظم' چنگیز خان' نپولین' اور ہٹلر وغیرہ۔ بعض لوگ تاریخی دستاویزوں کے لامتناہی ماخذوں سے مسحور ہو جاتے ہیں جو تحقیق کا وسیع میدان پیش کرتے ہیں۔ چونکہ انسان طبعاً" متنوع پسند ہے اور انسانی طبعیتیں بھی ہر اعتبار سے یکساں نہیں ہوتیں۔ انکی دلچسپیاں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ ان کے خیالات و نظریات اور عقائد مختلف ہوتے ہیں۔ وہ رنگ و نسل اور قدو جسم میں ایک جیسے نہیں ہوتے لہٰذا اگر کوئی ایک واقعہ سے فرحت محسوس کرتا ہے تو دوسرا اسے قابل مذمت سمجھتا ہے۔ ایک کا ہیرو دوسرے کا ولن ہوتا ہے۔ لیکن یہ لکھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ مطالعہ تاریخ سب کے لئے باعث مسرت ہونا چاہئے۔ غرضیکہ ہر ایک کے جوش و محویت کے مختلف انداز ہوتے ہیں۔ مگر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مطالعہ تاریخ کی یہ کمال خوبی ہے کہ تاریخ کا ہر قاری اسے اپنے اپنے معانی و مقاصد و نظریات کی داستان سمجھتے ہوئے جوش و محویت سے اس کے مطالعہ میں مصروف ہوتا ہے۔ تاریخ سے اپنے مطالعہ و مقاصد کی تعبیرات حاصل کرتا ہے تاریخ کے حوادث و واقعات کی تفسیرات اپنے نظریات اور ذہنی پختگی کے مطابق کرتا ہے۔

تاریخ کا مطالعہ ایک ایسا پیشہ ہے جو مکمل سکون اور علیحدگی چاہتا ہے۔ اس کا قاری زمانہ گذشتہ کی یادوں کو تازہ و شاداب دیکھنے کے لئے مطالعہ کے دوران شاذ ہی اپنے امن میں خلل پسند کرے یقیناً تنہا یہی امر مطالعہ تاریخ کی افادیت کے لئے خاصی وجہ جواز ہے۔ بعض لوگ مطالعہ تاریخ سے خوش ہوتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض لوگ اسے مفید اور روحانیت افروز سمجھیں تاہم طبعی علوم کے مقابلے میں تاریخ کی افادیت کو ثابت نہیں کیا جا سکتا مثلاً تاریخ کے مطالعے اور سیاست پر عمل نے اب تک نسلی امتیاز کی بیماری پر ویسی فتح نہیں پائی جیسی علم الحیات کے مطالعے یا ٹی۔ بی کی بیماری پر علم طب نے پائی ہے۔ یہ بھی تسلیم کر لینا چاہئے کہ سائنس و ٹیکنالوجی اور ادب و فنون کے مقابلے میں تاریخ جس طرح آج لکھی جا رہی ہے یہ کوئی جمالیاتی یا اخلاقی مقصد پورا نہیں کرتی۔ تاریخ اپنی عام علمی شکل میں نہ اچھی کہانی ہوتی ہے اور نہ ہی اچھا وعظ۔ اچھے مصنفین کی تصانیف میں رومانوی' ڈرامائی اور افسانوی رنگ آمیزی نہیں پائیں گے۔

علاوہ ازیں تاریخ مسائل کے ویسے صحیح حل نہیں پیش کر سکتی جس کی توقع سائنس دانوں یا انجنیئروں سے ہو سکتی ہے۔ جب تک تاریخ دینیات یا فلسفہ نہ بن جائے یا سادہ وعظ نہ کہنے لگے اس وقت تک آپ کو انسان کی تقدیر کے متعلق ویسا جواب نہیں مل سکتا جیسا مذہب کے روحانی یا مملکت کے سیاسی رہنماؤں سے آپ توقع رکھ سکتے ہیں۔ تاریخ آپ کو یہ نہیں بتا سکتی کہ مشین کے چھوٹے چھوٹے پرزے فولاد کے ہونے چاہئیں یا ایلومینیم کے

مطالعہ تاریخ کی یہ افادیت ہے کہ یہ انسانی تجربات' مختلف بیماریوں کی حالت' مرض' ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کی روئدادوں کا سلسلہ پیش کر سکتی ہے' جن کے پیش نظر بیماریوں کے علاج ہو سکتے ہیں۔ تھیوسی ڈائیڈز ہمیں ایتھنز اور سپارٹا کے درمیان کشمکش کے مختلف اسباب بتاتا ہے کہ وہ کیا تھے۔ گویا اس نے مرض کی تشخیص بیان کر دی تھی۔

مطالعہ تاریخ سے افراد ماضی کے تجربات کے پیش کردہ ذخیرے کو استعمال کرتے ہیں۔ امریکہ نے پہلی عالمی جنگ کے اختتام پر ایک کمیٹی مقرر کی کہ وہ اس جنگ کی وجوہات تلاش کرے تاکہ دوسری جنگ کو روکا جا سکے۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپان کے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم کی تباہ کاریوں سے آگاہی کے بعد تیسری عالمی جنگ کو روکنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں تاکہ ایٹمی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنگ کہیں کرہ ارض پر اپنی تباہ کاریوں سے انسانی وجود کا مکمل خاتمہ نہ کر دے۔ تاریخ ہمیں ایسے واضح اخلاقی سبق سکھاتی ہے اور امید رکھتی ہے کہ انسانی تعلقات کے سلسلے میں ہر اخلاقی سبق پر فوری اور موثر عمل ہو۔ ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال جیسے دیگر واقعات و حوادث کو علم تاریخ احمقانہ' غیر معقول اور غیر مفید ثابت کر سکتا ہے۔

تاریخ انسانی رویہ و روش کا دائرہ کار ٹھیک ٹھیک بتا سکتی ہے کہ انسانی روش و رویہ کس طرح اور کن حدود کے اندر بدلتا ہے۔ تاریخ کا علم ماہر نفسیات' سیاسات' اقتصادیات' عمرانیات اور بشریات کے لئے بطور خاص ضروری ہے تاکہ معاشرے کے مختلف اداروں اور انسانوں کی حقیقی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکے۔ تاریخ وہ ذخیرہ معلومات مہیا کرتی ہے کہ جس سے معاشرتی سائنس دان کام لیتے ہیں۔ یہ ایسا ذخیرہ معلومات وریکارڈ فراہم کرتی ہے جس سے نئے طریقوں اور نئی دنیاؤں کی طرف راہنمائی کرنے والے افراد' داعی' مصلح' مورخ' محقق اور ادیب کام لیتے ہیں۔

تاریخ زماں و مکاں کی گہرائیوں کے متعلق آگاہی بہم پہنچاتی ہے' جو مصلح کی رجائیت یا حد سے زیادہ اعتماد پر پابندی لگا دیتی ہے۔ یہ عقل کی راہنمائی کرتی ہے۔ تاریخ کا معمولی سا پس منظریہ بتا سکتا ہے کہ انسانی معاشرے عموماً" تغیرات یا روشن خیالی کی مزاحمت کرتے رہے ہیں۔ خواہ وہ ہجوں یا ہندسوں کا بدلنا ہی کیوں نہ ہو۔ معاشرے ایسے تغیرات صرف انقلاب کے اوقات میں قبول کرتے ہیں مثلاً اعشاری نظام انقلاب فرانس کے دوران جاری ہوا یا پھر ایسے دیگر تغیرات آمروں کی ماتحتی میں قبول کئے جاتے ہیں جیسے مصطفیٰ کمال اتا ترک کی آمریت میں ترکی رسم الخط کو عربی کے بجائے لاطینی بنایا گیا۔

مطالعہ تاریخ انسانی رویوں اور انسانی اداروں کی ہیت ترکیبی کے بارے یں آگاہ کرتا ہے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ انسان موجودہ حیثیت میں کون کونسی منازل طے کر کے پہنچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ہمیں یہ یقین کرنے کی رغبت ہوتی ہے کہ ماضی میں انسانی ارتقاء کی صحیح سمت و جہت جان لینے کے بعد ٹھیک طور پر جان سکتے ہیں کہ آئندہ کیا ہو گا۔ تاریخ ہمارے لئے ماضی' حال اور مستقبل کے یقین و اعتماد کے دروازے کھول دیتی ہے۔ تاریخ کے ایسے جاری و ساری عمل پر یقین "عقیدہ **تاریخیت**" کہلاتا ہے۔ یہ بھی اس عقیدے کی ایک شکل ہے جسے فلسفی مسئلہ جبر کا نام دیتے ہیں۔ یعنی یہ عقیدہ کہ انسان مستقبل کو جیسا چاہتے ہیں ویسا نہیں بنا سکتے' کیوں کہ مستقبل کو جو کچھ ہونا تھا اس کا فیصلہ ماضی کی نوعیت نے کر دیا۔ اعلیٰ درجے کی تاریخیت یہ ہے کہ ہم یقین کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ ہمارے پاس ماضی کی تاریخ کا مکمل علم ہے جس کی روشنی میں ہم مستقبل کے بارے میں ٹھیک ٹھیک پیش گوئی کر سکتے ہیں کہ آئندہ بھی ویسا ہی ہو گا کہ جیسا ماضی میں ہو چکا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یعنی کہ مستقبل کے حوادث و واقعات کے محرکات اور علت و معلول بھی اگر ویسے ہی ہونگے کہ جیسے ماضی کے واقعات و حوادث کے تھے تو نتائج ایک جیسے ہونگے یعنی اگر کوئی نمرود ہو گا تو ابراہیمؑ بھی ہو گا' اگر فرعون ہو گا تو موسیٰؑ بھی ہو گا اور اگر کوئی یزید ہو گا تو یزیدت کی موت و فنا کا سامان حسینؓ بن علی ہو گا بقول علامہ اقبال ؎

موسیٰ و فرعون و شبیرؓ و یزید
ایں دو قوت از حیات آید پدید

ناقص درجے کی تاریخیت یہ ہے کہ ہمیں ماضی کی تاریخ کے بارے میں اتنا علم نہ ہو کہ مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی کر سکیں۔ ہم یہ نہ بتا سکیں کہ عظیم برطانوی سلطنت کیونکر بکھر گئی؟ اور کیا ہر استعماری قوت کا یہی حشر ہو گا؟ ۱۹۱۷ء میں روس کیسے سوویت یونین اور پھر ۷۸ برس بعد دسمبر ۱۹۹۱ میں کیسے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر مختلف ریاستوں میں تقسیم ہو گیا؟ کیا تنزلی کا یہ ارتقائی یا اضدادی عمل ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا امریکہ بھی اسی اضدادی یا نامیاتی عمل کا شکار ہو کر ٹوٹ جائیگا؟ کیا مصری' سمیری' بابلی' یونانی اور رومی تہذیبیں اسی عمل کا شکار ہو کر ٹوٹ گئیں تھیں؟ ناقص درجے کی تاریخیت انتہائی مہلک ہوتی ہے۔ یہاں مورخ اپنے ناقص تاریخی علم کی بنا پر مستقبل کے بارے میں ٹھیک بات اور پیش گوئی نہیں کر سکتا بلکہ مفروضی و سطحی معلومات کی بنا پر معاشرے میں انتشار پھیلاتا ہے۔ تاریخی ریکارڈ نامکمل ہے اور مورخوں کی پشت ہا پشت کی محنتیں اسے پورا نہیں کر سکیں۔ علاوہ ازیں تاریخ نویس زمانہ حال تک بڑے بڑے آدمیوں کے حالات' جاہ و جلال اور ڈرامائیت سے زیادہ دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ انہوں نے لوگوں کے حالات و حوادث سے ویسی دلچسپی نہیں لی جیسی بڑے لوگوں کی زندگی سے انہوں نے صرف ماضی کے سیاسی اور مذہبی افکار و عقائد اور اداروں کا مطالعہ اہتمام سے کیا۔ اب گذشتہ انیسویں صدی سے تاریخ نویس اقتصادی اور معاشرتی اداروں کے مطالعہ پر توجہ دے رہے ہیں یہ خوش کن رجحان ہے۔

روایتی تاریخ نویسی میں یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ ایک پشت کے مورخین جو تاریخی ریکاڈ تیار کرتے ہیں وہ متاخر مورخین کے حوالے کیا جاتا ہے۔ اس لئے ہمارا تاریخی ریکارڈ بہت ناقص ہے اس لئے ماضی کی یادداشتیں اور واقعات کو جمع کرنے اور ریکارڈ کو مکمل کرنے کی اصلاح و گنجائش بہت کم ہے مثلاً کوئی مورخ ہندوستان کے کسی شہر کا یہ استصواب رائے پیش نہیں کر سکتا کہ پندرھویں یا سولہویں صدی میں ہندوستان کے باشندے یہاں کے مسلمان حکمرانوں کے متعلق کیا خیالات رکھتے تھے؟ لیکن یہاں ہمیں اپنی لاعلمی کے متعلق بھی مبالغے سے کام نہ لینا چاہئے تاریخ ہر اس فرد کے لئے جو اس کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے تجربے کے اعتبار سے زمانی و مکانی توسیع ہے۔ تاریخ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شعور و آگہی بخشتی ہے۔ اسی طرح مقامی و علاقائی تاریخوں میں وسعت و گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ تاریخ جس اسلوب سے آج کل پڑھائی اور لکھائی جاتی ہے، محض ڈرامائی کہانی نہیں، اگرچہ بعض اوقات اس سے ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے۔ اگر یہ ایسی کہانی بھی ہو تو یہ غور و فکر کرنے اور سوچنے سمجھنے والے افراد کے لئے بے حد مفید مثالیں اور معلومات مہیا کرتی ہے۔

مطالعہ تاریخ انسانی ترقی کے ارتقاء کے مختلف مدارج سے آگاہ کرتا ہے کہ انسان نے زمانہ قبل از تاریخ سے لیکر جدید دور تک سائنس، ٹیکنالوجی، معاشرتی سائنسز اور دیگر حیاتیاتی علوم میں کہاں تک مہارت و قابلیت حاصل کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دور جدید میں اخلاقی و روحانی اقدار میں کمی اور مادی اقدار میں اضافہ ہوا ہے جس سے انسان عرفان و شعور کی منزلیں طے کرنے کی بجائے تاریکیوں کی راہوں میں الجھ گیا ہے۔

نطشے کے مطابق تاریخ کا مطالعہ معاشرے کے تین طبقات اپنے اپنے مزاج و پسند اور خیال کے مطابق کرتے ہیں:

۱۔ رجعت پسند (Reactionaries)

یہ لوگ ماضی بعید کے روایتی دور کے پوجاری ہوتے ہیں۔ یہ پتھر کے دور کی بازگشت ہیں۔ خیالی، روایتی، اور قدیمی دور کی خوشحالیوں کا ذکر بڑی حسرت سے کرتے ہیں۔ روسو کے دور فطرت (State of nature) کی جنت نظیر زندگی کو یاد کرتے ہیں اور جدید معاشرتی اقدار کو قدیم مردہ معاشرتی اقدار سے بدلنا چاہتے ہیں۔ قدیم معاشروں کی روایات و اقدار کو از سرنو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ ذہنی طور پر رجعت پسند افراد ماضی مرحوم کے معاشرے میں رہتے ہیں۔ یہ اپنی ہٹ اور ضد کی پکے ہوتے ہیں۔ یہ عموماً" کم علم، مذہبی اور بوڑھے افراد ہوتے ہیں۔

۲۔ قدامت پسند (Conservatives)

قدامت پسند سے مراد ایسے افراد ہیں جو قدیم رسم و رواجات اور روایات کو پسند کرتے ہیں اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ لوگ ماضی بعید کی بجائے ماضی قریب سے اپنا تعلق و سلسلہ زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہ معاشرتی اقدار جیسی موجودہ ہیں ان میں کسی قسم کی تبدیلی پسند نہیں کرتے اور انہیں من و عن برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ قدامت پسند افراد کسی تبدیلی کے خواہاں نہیں ہوتے۔ وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ خود بخود بتدریج تبدیلیوں پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ لوگ رجعت پسندوں کی بہ نسبت حقائق و معقولیت کی دنیا کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اس طبقے میں عموماً" عام تعلیمیافتہ، جاگیر دار، زمیندار اور پرانے نظریات و عقائد کے حامل افراد ہوتے ہیں۔ انہیں پرانی معاشرتی اقدار اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رسوم و رواجات سے گہرا لگاؤ ہوتا ہے۔

۳۔ آزاد خیال (Liberal)

یہ لوگ روشن خیال بھی کہلاتے ہیں۔ یہ تاریخ میں تقسیم و پابندی کے قائل نہیں ہوتے۔ یہ تاریخ کو ماضی کا ورثہ خیال کرتے ہیں اور ماضی کے اس ورثہ سے افادیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ روایات کے دشمن نہیں دوست ہوتے ہیں۔ وہ ماضی کی روایات کے ساتھ بالکل چمٹے رہنا پسند نہیں کرتے بلکہ ماضی کے تجربات کو پیش نظر رکھتے ہوئے حال و مستقبل کے لئے بہتر اور نئی راہوں کے متلاشی ہوتے ہیں۔ زمانے کی ترقی پر یقین رکھتے ہیں۔ اور ترقی کے لئے قدیم روایات کے بدل کو بہتر خیال کرتے ہیں۔ یہ حال کی نظر سے مستقبل کی بہتر ترقی کو دیکھتے ہیں۔ یہ ماضی کی تاریک راہوں کی بجائے مستقبل کی راہوں کو روشن کرنے میں زیادہ تسکین محسوس کرتے ہیں۔ یہ معاشرتی اقدار کو نئے سرے سے مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وہ افراد ہیں جو ستاروں پہ کمند ڈالتے ہیں۔ یہ اعلیٰ تعلیمیافتہ' جوان اور پختہ عمر کے افراد ہر مکتبہ فکر اور ہر مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طبقہ میں بے دین' کیمونسٹ اور انقلابی نظریات سے وابستہ لوگ بھی نظر آتے ہیں۔ ان کو معقولیت پسند (Rational) بھی کہا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ تاریخ کا مطالعہ مذہبی طبقہ بھی بڑی دلچسپی سے کرتا ہے جس کو ہم چوتھا طبقہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ طبقہ رجعت پسند طبقہ میں ہی شمار ہوتا ہے مگر یہاں پر اس کا علیحدہ ذکر کرنا بہتر ہو گا

۴۔ مذہبی طبقہ (Religious People)

مطالعہ تاریخ مذہبی افراد کے نزدیک بے پناہ اہمیت کا حامل ہے۔ وہ تاریخ سے بانی مذہب' اس کے حواریوں اور اصحابہ کے احوال و حالات کا درس لیتے ہیں۔ یہ اپنے اپنے مذاہب کے دور اولیٰ کی راسخ العقیدی کو مثالی دور قرار دیتے ہیں۔ مصلح کے اقوال و ارشادات کو بطور ہدایت و راہنمائی کے اپناتے ہیں اور اس کی تبلیغ و پرچار کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک خلافت راشدہ' عیسائیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ بارہ حواریوں اور یہودیوں کے نزدیک حضرت موسیٰؑ کے ساتھ بنو اسرائیل کا ہجرت کا زمانہ اور ہندوؤں کے مطابق رام راج کا زمانہ بہترین مثالی ادوار ہیں۔

مطالعہ تاریخ ہمیں انسانی خواہشات و جذبات' راسخ العقیدی' لادینیت' ایثار و وفاداری' بے وفائی و خود غرضی' حب الوطنی و غداری اور معاشرتی اقدار کے بے شمار پہلوؤں کا مثبت جائزہ عطا کرتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاریخ میں جب ہم کسی ملک کے کسی خاص واقعے کا جائزہ اس وقت کی دنیا اور اس وقت کے لوگوں کو سامنے رکھ کر کریں' اور یہ نہ بھولیں کہ اس وقت دنیا کا ماحول بہ حیثیت مجموعی کیسا تھا' تو ہمیں اس دور کے ہر واقعے کو صحیح طور پر سمجھنے' اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگانے' اور اس سے صحیح نتائج برآمد کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ تاریخ کا دامن بے شمار علوم سے لبریز ہے۔ مذہب' سیاست' اقتصادیات' اخلاقیات' عمرانیات' جغرافیہ' فلسفہ ادب و فنون لطیفہ' علم حیاتیات' علم حیوانات' طب' کیمیا' طبعیات' حساب' ارضیات اور دیگر لا تعداد علوم جو درجہ سند رکھتے ہیں تاریخ کے دامن کے ساتھ وابستہ ہیں اور انسانی زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ سے منسلک ہیں۔ اگر تاریخ کے علم کو خارج کر دیں' فراموش کر دیں یا اس کی افادیت سے بحیثیت ام العلوم کے انکار کر دیں تو پھر علم کی کوئی شاخ ایسی نظر نہیں آتی جو اس کے متبادل کے طور پر ہمہ گیر معلومات بہم پہنچا سکے۔ تاریخ بحر علم کی حیثیت رکھتی ہے۔ جبکہ دیگر نیچرل اور سوشل سائنسز اس سے نکلنے والی ندیاں ہیں۔ لہٰذا علم کے ہر ماہر کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

اٹھارویں صدی میں یورپ کے تمام ممالک میں 'مطالعہ تاریخ کو بڑا فروغ حاصل ہوا اور اس مضمون کی افادیت و اہمیت کو تمام علوم کے ماہرین نے تسلیم کیا اور اسے صحیح زندگی گزارنے کے لئے ضروری قرار دیا۔ روسو (Rosseau) اپنے ناول ایمیل (Emile) میں اپنے فرضی شاگرد ایمیل کو تاریخ اٹھارہ سال کی عمر میں پڑھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس عمر کو پہنچ کر ایمیل کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسانی نفسیات کا مطالعہ کرے۔ اگر اس کو لوگوں سے ملنے دیا جائے گا تو اس کے کردار پر برا اثر پڑے گا۔ اس لئے ایمیل کو ان لوگوں سے دور ہی رکھنا چاہئے۔ وہ ایمیل کو نفسیات کا مطالعہ تاریخ کے ذریعہ کرانا چاہتا ہے۔ ایمیل ماضی کی شخصیتوں کا مطالعہ کرے لیکن وہ اس کو بھی خطرناک سمجھتا ہے۔ اس لئے کہ تاریخ میں نیکی اور بدی دونوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ روسو کے خیال میں تاریخ ماضی کی سچی اور حقیقی تصویر پیش نہیں کرتی۔ مورخ اپنے خیالات پیش کرتے ہیں روسو ان مورخوں کو بہترین سمجھتا ہے جو اصل واقعات بغیر ذاتی تاثرات کے پیش کر دیں۔ وہ کہتا ہے کہ بچوں کو محض حالات سنا دینے چاہئیں نتیجہ وہ خود نکالیں۔ روسو کے خیال میں تھیوسی ڈائیڈز (Thucydides) ایک ایسا مورخ ہے جس کی تصانیف بچوں کو پڑھائی جا سکتی ہیں کیونکہ وہ اصل واقعات بلا کم و کاست پیش کر دیتا ہے۔ ان پر اپنی ذاتی رائے پیش نہیں کرتا۔ روسو تاریخ پڑھا کر اپنے شاگرد ایمیل کو عقلمند اور بہتر انسان بنانا چاہتا ہے۔ وہ ان لوگوں کے حالات ایمیل کو پڑھاتا ہے جن کا دور حاضر پر اثر پڑتا ہے۔ وہ ایمیل کو تاریخ ماضی کی اہم شخصیتوں کی نقل کرنے کے لئے نہیں پڑھاتا۔ وہ نہیں چاہتا کہ ایمیل دوسروں کے نقش قدم پر چلے بلکہ وہ ایمیل کی ذاتی شخصیت کو نشوونما دینا چاہتا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ ایمیل کو سقراط (Socrates) یا کیٹو (Cato) نہیں بنانا چاہتا' وہ ایمیل کو ایمیل ہی دیکھنا پسند کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تعلیم دے کر ایمیل کو دوسروں کے نقش قدم پر چلنے کی ترغیب دی گئی تو اس کی ساری تعلیم غلط ہو گی۔

پرشیا کے مشہور فرمانروا فریڈرک اعظم (Fredrick the Great) کا خیال تھا کہ بچوں کی معلومات میں اضافہ کر دینے کا نام تعلیم نہیں ہے۔ وہ کہتا تھا کہ قوت فیصلہ اور غور و فکر کی صلاحیت کو نشوونما دینے کا نام تعلیم ہے۔ زمانہ ماضی کے حالات کو صحیح طور پر سمجھنے کی صلاحیت طلباء میں پیدا کی جائے تاکہ جہالت دور ہو اور طلباء اپنے گردونواح اور کائنات کو پہچانیں اور عمدہ شہری بنیں۔

انیسویں صدی میں مطالعہ تاریخ کو اس قدر اہمیت دی گئی کہ یورپ کے اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کر دی گئی۔ اس کی تحقیق' تدریس اور تحریر کے لئے سائنٹیفک نظریہ کی حمایت کی گئی۔ فرانس کے پروفیسر سائین بوس (Sign Bose) نے اس بات پر زور دیا کہ تاریخ کو سائنٹیفک نظریہ کے مطابق پڑھایا جائے۔ اس نے اس نظریہ کی حمایت میں کہا کہ:

> "ہم تاریخ اخلاقی نصیحتوں کے لئے نہیں پڑھاتے۔ یہ مقصد تو قصے اور کہانیوں سے بھی حاصل ہو سکتا ہے اور نہ تاریخ جذبہ حب الوطنی کو ابھارنے کے لئے پڑھانی چاہئے۔ مختلف ملکوں کے لوگ اپنی خواہشات کے مطابق ایک ہی مضمون سے مختلف نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ یہ اصول منطق کے خلاف ہے تاریخ کو اسی طرح ذاتی مقاصد کے لئے مسخ کر دیا جاتا ہے۔ ہر علم کی قدر و قیمت اس پر مبنی ہے کہ وہ حقیقت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اسی لئے تاریخ سے سوائے حقیقت شناسی کے اور کوئی کام نہیں لینا چاہئے۔"

مورخ تاریخی حقیقتوں کو تاویلوں کی مدد سے موڑ توڑ کر ایک غلط اور تنگ نظریہ کو حب الوطنی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ واقعات کو اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے۔ کہ ان سے حسب منشا نتائج اخذ کئے جا سکیں۔ اکثر ممالک میں تاریخ کے ذریعہ قومیت کے جذبہ کو ابھارا جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں قومی تاریخ کو اس طرح سراہا گیا کہ مختلف ممالک کے درمیان نفرت' حسد اور تعصب بھڑک کر انتہا کو پہنچ گئے اور ان کا نتیجہ یورپ کو دو خوفناک جنگوں کی صورت میں بھگتنا پڑا۔

آج کے سائنسی دور میں کوئی فرد بھی سائنس کی افادیت و ایجادات سے انکار نہیں کر سکتا سائنسی علوم کی بدولت ایک فرد کیمسٹ' ماہر طبعیات' ماہر کیمیا' ماہر فلکیات اور انجنیئر وغیرہ بن کر معاشرتی فلاح و بہبود میں اضافہ کر سکتا ہے۔ کمپیوٹر' الیکٹرونکس اور انجنیئرنگ کے بہتر پیشوں کو اپنا کر روز مرہ کی زندگی میں معاشی طور پر زیادہ خوشحال زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آپ تاریخ دان بننا پسند کریں گے؟ کیا آپ تاریخ کے مضمون کو بطور پیشہ اپنانا پسند کریں گے؟ اگر آپ کا جواب ہاں میں ہے تو یقیناً آپ ایک قناعت پسندانہ مثبت سوچ کے متحمل مزاج بردبار انسان ہیں اور آپ کی سوچ مادیت پسندانہ نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تاریخ ہماری کس سمت راہنمائی کرے گی؟ اس کے مطالعہ سے ہمیں کس قسم کی ملازمت یا پیشہ مل سکتا ہے؟ کیا تاریخ کا مضمون ہماری جدید ضروریات کو پورا کر سکتا ہے؟ تو یہ سوالات مادی تاریخ کی توجیہات کی کڑی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے انسان کا روحانی' ادبی' سیاسی اور معاشرتی سرگرمیوں سے تعلق و سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ وہ گوشت پوست کی چلتی پھرتی مشین بن جاتا ہے۔ اور اس کی حیثیت پیداواری مشین کی سی ہو جاتی ہے۔ صبح و شام وہ مشین اور لیبارٹریوں میں مصروف رہتا ہے۔ تھکاوٹ' و بدبو کو برداشت کرتا ہے۔ مواد' اوزان' اور کلیات کے حساب و کتاب میں مستغرق رہتا ہے۔ لا تعداد فارمولوں کو بناتا' دہراتا اور یاد کرتا ہے۔ یہ تو سائنسی توجیہہ ہے اس میں ہم غلطی بھی کر سکتے ہیں۔ ایک مضمون یا چیز ایک فرد کے نزدیک محبوب و پسندیدہ ہو' ہو سکتا ہے وہ دوسروں کے نزدیک ناپسندیدہ و غیر شگفتہ اور غیر معیاری ہو۔ ہر طبیعت کا مزاج' انتخاب اور پسند جداگانہ ہوتی ہے۔ سائنسی تہذیبی دور میں سائنسی مضامین کی افادیت سب سے زیادہ ہے۔ اور دور احیائے علوم سے لے کر آج تک انسانیت کی جو خدمت سائنس نے کی ہے وہ کسی اور مضمون نے نہیں کی۔

ہر مضمون کی اپنی اپنی افادیت ہوتی ہے۔ تاریخ کا مضمون مخالف سائنس نہیں ہے اور نہ ہی اس کا سائنس کے ساتھ کوئی تضاد ہے بلکہ انیسویں صدی میں تو تاریخ سائنس کے دائرہ کار میں شامل ہو گئی اور اس کا ہی ایک حصہ شمار ہونے لگی۔ نظریہ ارتقاء کے ظہور نے جہاں سائنسی اقدار کو متاثر کیا وہاں تاریخ کی افادیت و مقصدیت کو بھی متاثر کیا۔ نظریہ تاریخی ارتقاء ایک ذہنی ضرورت بن کر ابھرا اور اس نے قرون وسطیٰ کے روایتی اور شخصی تاریخی نظریات میں تبدیلی پیدا کر دی۔ پرانی سوچ کو بدل ڈالا۔ برے کردار کو حقارت آمیز نظر سے دیکھا جانے لگا۔ دھوکہ دہی سازش اور قتل و غارت گری سے بر سر اقتدار آنے کو قابل نفرین قرار دیا۔ مذہب کو سیاست بازی کے لئے ناجائز طور پر استعمال کر کے (Exploit) کامیابی حاصل کرنے کے فعل کو ناجائز' مکروہ اور بیہودہ حرکت قرار دیا۔ اس طرح سے سائنسی انداز میں مطالعہ تاریخ کی افادیت پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔

جہاں تک تاریخ کے عملی پہلوؤں کا بطور پیشہ افادیت کا تعلق ہے تو یہ ہر شعبہ ہائے زندگی میں مدد کرتی ہے۔ اس کی تعلیم اسکول سے یونیورسٹی تک دی جاتی ہے۔ مذہب مسجد' مدرسہ' کلیسا' مندر اور گردواروں میں ہر جگہ اس کی تعلیم کے بغیر کام نہیں چلتا۔ صحافت کے شعبہ میں براہ راست اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے معلومات درکار ہوتی ہیں۔ سفارتکاروں کے لئے اس کی تعلیم ضروری ہے اور سفارت خانوں میں ثقافتی شعبے موجود ہوتے ہیں۔ ادب و فلسفہ لائبریریوں' میوزم' آثار قدیمہ' پرانے ریکارڈ خانوں اور سماجی شعبوں میں ہر جگہ تاریخ دانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ فوج کے ہر شعبہ (نیوی۔ ایئر فورس وغیرہ) میں تاریخی پس منظر میں ذہنوں کی تاریخی لحاظ سے ٹریننگ دی جاتی ہے۔ مثلاً بسمارک کے جرمنی اور ہٹلر کے جرمنی کے فرق' حالات اور معاہدات کو تاریخ کے بغیر نہیں سمجھ سکتے۔ نپولین اور اس کے خلاف اتحاد یورپ کا ادراک تاریخ کے بغیر کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ امریکہ کی جنگ آزادی اس کے زرعی و صنعتی انقلاب اور جمہوری نظام کو تاریخ کی مدد کے بغیر نہیں سمجھ سکتے۔ طلوع اسلام' تبلیغ' غزوات' اسلامی فتوحات و انتظامات اور اسلامی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کو تاریخ کے بغیر کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ تخلیق کائنات' بنی آدم کی ابتداء' اور تہذیب انسانی کے آغاز کا پتہ تاریخ سے چلتا ہے۔ ملکی سربراہ' بادشاہ اور سفارت کار اپنے اور دیگر قوموں وممالک کے حالات و روایات اور سیاسی و تمدنی ترقی کو علم تاریخ کے بغیر سمجھ کیسے سکتے ہیں؟ علم تاریخ کی روشنی میں ہی وہ اپنے ملک کی داخلہ و خارجہ پالیسیوں کو ترتیب و تشکیل دیتے ہیں۔

انسان کو تاریخ سے اس لئے بھی دلچسپی ہے کہ یہ انسان کی اپنی کہانی ہے۔ یہ اس کی ابتداء' ارتقا' عروج و زوال' بلندی و پستی اور خوشی و غم کی کہانی ہے اس لئے جب یہ تاریخ پڑھتا ہے تو اس میں اسے اپنی تصویر اور عمل جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اسے دوسروں کی آپ بیتی پڑھ کر تسکین و سبق حاصل ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ ایثار و قربانی' بہادری اور صبر و تحمل کے واقعات سے اسے حوصلہ ملتا ہے المیہ واقعات سے رنج و غم ہوتا ہے۔ خوشی کے واقعات سے مسرور ہوتا ہے۔ عجیب و غریب واقعات سے حیران و ششدر ہوتا ہے۔ عظیم شخصیتوں کے افکار و اعمال سے تسکین حاصل کرتا ہے۔ ظلم کے خلاف حق کی خاطر قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اپنے حال کو بہتر بنانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

مطالعہ تاریخ سے قوت حافظہ مضبوط ہوتی ہے۔ شعور و تخیل میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور ذہنی صلاحیتوں میں پختگی آتی ہے۔ اس سے ماضی کو سمجھنے' اس کی تعبیر کرنے اور مستقبل کی ترقی کے لئے اخلاقی اصولوں کو وضع کرنے میں مدد ملتی ہے۔

تاریخ وسیع منظر مہیا کرتی ہے۔ ماضی و حال کے سلسلوں کو مستقبل کے خاکوں سے ملاتے ہوئے ہمیں یاد دلاتی ہے کہ وقت کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ ہماری زندگیاں مختصر سی ہیں۔ اور وقت بہت تیزی کے ساتھ بھاگ رہا ہے جو اس کی ساعتوں سے بچھڑ جائے اس کا وقت سے دوبارہ ملاپ کبھی ممکن نہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاریخ چونکہ وسیع منظر مہیا کرتی ہے لہٰذا یہ ہماری زبان و مکان' اخلاقی' معاشرتی' سیاسی اور مذہبی تنگ نظری میں اعتدال پیدا کرتی ہے یہ ہمیں صبر کی تعلیم دیتی ہے تاکہ انسانوں کی غلطیوں' مہموں کی بد انجامیوں اور اداروں کی ناکامیوں کے مسائل کو صبر کے ساتھ برداشت کیا جا سکے۔ اور اپنی حسرتوں' آرزوؤں اور امیدوں کی ناکامی پر حوصلہ نہ ہاریں۔

تاریخ ہمیں رواداری سکھاتی ہے۔ صدیوں سے ہر زمان و مکان میں بیشمار عقیدے' قومیں' فلسفے اور نظریات پیدا ہوئے۔ ان میں سے ہر فرد و قوم نے یہی فرض کر لیا کہ وہی راہ راست پر ہیں دیگر افراد و اقوام گمراہ ہیں۔ وہی علم و دانش کے وارث ہیں۔ وہی تاریخ کا مقصد و نصب العین اور وہی خدا کی مشیت کا ظہور ہیں۔ جسٹس ہومز کے الفاظ میں :

"ایسے افکار و مفادات مکروہ اور موت سے لبریز نظر آتے تھے"

یہ تحقیق اور اختلافات کی آزادی کو واضح کر دیتی ہے تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے۔ کہ آزادی ہی وہ اصول ہے جسکی راہنمائی و روشنی میں حقائق کی دریافت میں غلطیوں سے بچا جا سکتا ہے۔ اور مستقبل کے لئے ہدایت حاصل کی جا سکتی ہے۔ تاریخ ہماری رہبر و حادی ہے۔ یہ انسانی ذہن کی تربیت کرتی ہے' اسے شعور و آگہی عطا کرتی ہے اور اشیاء کی روح کی گہرائیوں میں جھانکنے کا فہم و ادراک بخشتی ہے۔ یہ زندگی کو زیادہ خوبصورت' عمدہ طریقوں اور مثبت رویوں کے ساتھ منزل تک پہنچانے میں بہترین رفیق کی طرح مدد کرتی ہے۔ معاشرتی مسائل کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے میں مدد دیتی ہے۔ ذمہ داریوں اور فرائض سے آگاہ کرتی ہے۔ صحیح اور غلط میں امتیاز کرنا سکھاتی ہے۔ انسان کو انسانیت کا درس دیتی ہے۔ نسلی امتیاز' تشدد' نفرت تعصب' تنگ نظری اور فرقہ بندی کے جذبات کو ختم کرنے میں مدد دیتی ہے۔ ایثار و قربانی اور خلوص و وفا کی مثالیں پیش کرتی ہے۔ حق و صداقت' عدل و دیانت' نیکی اور سلیقے کے ساتھ زندہ رہنا سکھاتی ہے۔ یہ حق کی خاطر باطل کے ساتھ ٹکرانے اور اسے پاش پاش کرنے کے اصول راہنمائی مہیا کرتی ہے۔

غرضیکہ تاریخ سے ہم قوموں' ملکوں' تحریکوں' ہجرتوں' قربانیوں' نظریوں' انقلابوں' حادثوں' قوانین' عقائد توہمات' رسومات' مصلحین اور انکی تعلیمات و افکار' الہامی و غیر الہامی کتب' قدیم و جدید دستاویزات' تہذیبوں کے عروج و زوال' معاشروں کے اہم معاشرتی' سیاسی' مذہبی' اور قوم پرستی کے جذبات و واقعات کے بارے میں اہم و مفید معلومات حاصل کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ تاریخ ایک فن ہے جس کے ذریعے ماہرین نہیں انسان بنائے جاتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاریخ کے مقاصد

Purpose of History

تاریخ کے تانے بانے کو سمجھنے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مقصد تاریخ بیان کیا جائے کہ یہ کن مقاصد کو مد نظر رکھ کر پڑھنی اور پڑھانی چاہیے۔ مطالعہ تاریخ کا مقصد محض معلومات بہم پہنچانا ہی کافی نہیں بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ تاریخ میں کون سی ایسی معلومات کا خزانہ پوشیدہ ہے جو مفید ذہنی غذا بن سکتا ہے اور اپنے قاری کے ذہن میں ایک تازہ روح پھونک کر حیات نو عطا کر سکتا ہے۔ تاریخ کا مقصد علم کے درشہوار اور گوہر بے بہا کا حصول و مقصود ہے۔ تاریخ علم کے درشہوار کے حصول کا ذریعہ ہے مقصد نہیں فرانس بیکنؒ کے مطابق:

> "تاریخ کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ صرف واقعات تحریر کرے اور ان واقعات کے ساتھ مشورہ بھی دے لیکن ان (واقعات) پر تبصرہ کرنا اور ان سے نتیجے نکالنا لوگوں کی قابلیت پر چھوڑ دے تاکہ لوگ آزادانہ طور پر خود فیصلہ کر سکیں۔"

تاریخ کا مقصد تعین کئے بغیر اس کا مطالعہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی آدمی بغیر سوچے سمجھے گھر سے نکل پڑے اور شہر کی گلیوں کوچوں میں مارا مارا پھرے یا پھر کسی جنگل کی بھول بھلیوں میں کھو جائے۔ کسی کو بغیر مقصد کے کسی بھی شئے کے حصول سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا' اس سے محض اس کا وقت اور محنت ضائع ہوتی ہے۔ بغیر مقصد کے تاریخ کا مطالعہ کرنے والا بھی ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ریگستان میں چلا جا رہا ہے اور اس کو راستے اور سمت کا مطلق اندازہ نہیں۔ ایسے شخص کا خدا ہی حافظ ہے بغیر مقصد کے مطالعہ تاریخ عمر کے قیمتی لمحات کو ضائع کرنا ہے۔

علماء تاریخ نے کم و بیش دو سو مقاصد بیان کئے ہیں جن کو تاریخ پورا کر سکتی ہے۔ کسی بھی علم کے متعلق اتنا وسیع دعویٰ ایسا ہے جیسے کسی دوا کے لئے یہ کہنا کہ یہ تمام امراض کے لئے اکسیر ہے۔ اس قسم کا وسیع اور لا محدود دعویٰ اس علم کی قدرو منزلت ظاہر کرتا ہے۔ اس وقت ہم کو یہ غور کرنا ہے کہ وہ کون سے مقاصد ہیں جن کو تاریخ کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم تاریخ کے مقاصد پر روشنی ڈالیں بہتر ہو گا کہ ان کی چند عام فہم اقسام مقرر کر لی جائیں۔

۱ سماجی مقاصد (۲) ثقافتی مقاصد (۳) سیاسی مقاصد (۴) اخلاقی مقاصد اور (۵) اقتصادی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقاصد

تاریخ کی ان عام اقسام کے علاوہ تاریخ کے لا تعداد مقاصد میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

۱_ مفکرین کا کہنا ہے کہ تاریخ کے مطالعہ کو اس لئے شامل تدریس (اسکول سے یونیورسٹی تک) کیا جاتا ہے کہ تاریخ میں بچوں کے لئے بلا کی کشش ہوتی ہے۔ اور بچے کہانیاں پسند کرتے ہیں اسطرح سے یہ انسانی شعور کی تربیت کرتی ہے۔ تاریخ میں بے شمار دلچسپ واقعات ہیں لہٰذا بادشاہوں کے قصے کہانیاں بچے بڑے شوق سے و دلچسپی سے سنتے اور پڑھتے ہیں۔ اس مضمون میں بچوں کی دلچسپی کے لئے معلومات کے لا محدود خزانے پوشیدہ ہیں مگر بد قسمتی سے پاکستان میں نظام تعلیم روبہ زوال ہے۔ سیاسی مصلحتوں نے تعلیمی اداروں کو اسلحہ خانوں کے اڈوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ لہٰذا اب ان تعلیمی اداروں میں علم کے متلاشی اور اس کو استعمال کرنے والے بہت کم ملتے ہیں۔

۲_ تمام مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ اسکول سے یونیورسٹی تک مطالعہ تاریخ کا اولین مقصد تاریخ کے مضمون سے دلچسپی پیدا کرنا ہے۔ تاکہ طلباء میں جذبہ تجسس ابھرے۔ ان کو اشتیاق پیدا ہو اور وہ تاریخ کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کریں۔ اور پھر ان قیمتی اقدار سے مستفید ہوں جو زندگی کی راہوں میں ان کی راہنما ہوں۔

۳_ تاریخ انسانوں کے حیرت انگیز کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ چونکہ حقیقت انسانوں سے زیادہ حیرت انگیز ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت تاریخ ہی میں ملتا ہے۔ کس طرح وحشی انسانوں نے اپنی خدا داد قابلیت سے کام لے کر بڑے بڑے خونخوار درندوں کو رام کیا۔ ارض و سماوی آفات کا مقابلہ کیا اور آج بحر و بر کا شہنشاہ بن بیٹھا ہے۔ زمین کا سینہ چیر کر قدرت کے پوشیدہ خزانے نکال لئے۔ سمندر کی تہہ سے بیش بہا موتی نکالتا ہے۔ ہواؤں' فضاؤں اور ستاروں پر ایسے دوڑتا ہے جیسے زمین پر۔ چاند کو تسخیر کرنے کے بعد دیگر ستاروں اور سیاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ یہ تمام حالات جاننے کا جذبہ تجسس مطالعہ تاریخ سے پیدا ہوتا ہے۔

۴_ حال ماضی کی پیداوار ہے۔ ہماری موجودہ زندگی' رسم و رواج اور اداروں کی جڑیں ماضی میں ہیں۔ ماضی کے حالات کی مدد سے ان کی غرض و غایت کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔اور پھر ان کا استعمال سمجھ کر کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کی مدد سے اپنی زندگی اور مستقبل کو زیادہ شاندار بنایا جا سکتا ہے۔ معاشرہ' خاندان' حکومت' مذہب' اور تعلیمی و سماجی ادارے انسان نے کن مقاصد کی تکمیل کے لئے بنائے اور وقتاً" فوقتاً" ان میں اصلاحات و تبدیلیاں کیں۔ یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ادارے اب ان مقاصد کی تکمیل میں کس حد تک مدد گار ثابت ہو رہے ہیں اور ان میں کیا نقائص ہیں تاکہ ان میں مناسب اصلاحات کر کے مستقبل کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔ تاریخ کا یہی وہ مقصد ہے جس کی حمایت ہر مکتبہء فکر کے علماء اور مفکرین نے کی ہے۔

۵۔ پانچواں اہم اور قیمتی مقصد اسلاف کے کارناموں کا مطالعہ ہے۔ جن کو پڑھ کر ہر قوم اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر کرے۔ ان کے دلوں میں ایسا جذبہ اور جوش ابھرے کہ وہ بھی اپنے نامور اسلاف کی طرح کارہائے نمایاں کریں۔ اور صحیح معنوں میں ان کے فرزند ثابت ہوں۔ جو تاریخ نئی نسلوں کو ان کے اسلاف کے کارناموں سے روشناس کرانے میں ناکام رہے اور ان کے دل و دماغ میں اسلاف کی عزت و احترام پیدا نہ کر سکے وہ بے کار و بے مقصد ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ابتک ہمارے ملک میں جو تاریخ پڑھائی گئی اور پڑھائی جا رہی ہے یا لکھی گئی، لکھوائی گئی یا لکھوائی جا رہی ہے اور جتنا وقت اس پر صرف کیا گیا وہ بالکل بیکار گیا کیونکہ یہ اسلاف کا احترام اور ان پر فخر کرنے کی بجائے ان سے نفرت پیدا کرتی ہے۔ محمود غزنوی کی تباہ کاریاں، تخت کے لئے مسلمان فرما نرواؤں کی باہمی لڑائیاں، قتل، غارت گری، مذہبی و فرقہ وارانہ اختلافات، محلات کی سازشیں، اکبر کے کافر اور اورنگ زیب کے کٹر مسلمان ہونے کے فتوے وغیرہ۔ یہ قصے ایک مسلمان کے دل میں اپنے اسلاف کی جانب سے کس قسم کے جذبات ابھاریں گے؟ ان کو اپنے اسلاف سے کیا محبت ہو گی؟ اس غلط تاریخ کا نتیجہ آپ کے سامنے کلاشنکوف کلچر، کلمہء گوؤں کا ایک دوسرے کو کافر قرار دینے کے فتوے، قتل و غارت گری کا گرم بازار، ڈاکہ زنی، لوٹ مار، زناکاری، شراب نوشی، اقربانوازی، رشوت خوری اور خوف وہراس کا شکار معاشرہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ آج کی پاکستانی نئی نسل کے دل میں اپنے اسلاف، بزرگوں اور تاریخ کی عزت و محبت نام کو نہیں۔ وہ یورپ و امریکہ کی تاریخ پڑھ کر ان کی مدح سرائی کرتے ہیں اور ان ہی کے گن گاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کو معلوم ہی نہیں کہ ہمارے اسلاف نے کیا کیا کارہائے نمایاں کئے تھے کہ وہ ان کے نقش قدم پر چل کر ان کی طرح سے شہرت و ناموری حاصل کریں۔ بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں ایسی تاریخ پڑھائی جائے جو ان کو اپنے اسلاف کے کار ہائے نمایاں سے روشناس کرنے کے علاوہ اپنی ثقافت سے بھی روشناس کرے۔

پاکستانی تاریخ نویسوں کو چاہئے کہ وہ تاریخ کا سائنٹیفک نظریہ "ماضی، حال اور مستقبل ایک ہی وحدت ہے" کی روشنی میں طلباء اور نئی نسلوں کو زندگی کی اصل حقیقتوں سے آگاہ کریں کہ کائنات کی ہر چیز تبدیل ہو رہی ہے۔ انسان کی زندگی بھی مسلسل تغیر پذیر ہے اس طرح سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انہیں زندگی کے ارتقائی پہلوؤں سے روشناس کرائیں تاکہ وہ ہر تبدیلی کو ہمدردی کی نظر سے دیکھیں۔ اس سے نفرت نہ کریں۔ کیونکہ انسانوں نے تبدیلیوں کے ذریعہ' معاشرے کی اصلاح کی اور ترقی کی شاہراہیں دکھائیں۔ نئی نسل کو اس بات کے لئے تیار کیا جائے کہ وہ نئے کامیاب تجربات کو اپنانے کی کوشش کریں کیونکہ ہماری ترقی کا راز کامیاب تبدیلیاں ہیں۔ چونکہ اہل مغرب علوم میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ قومی سوچ کو بیدار کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ ہم پیچھے کے علاوہ آس پاس اور آگے بھی دیکھیں اور مغربی علوم حاصل کرنے میں نہ ہچکچائیں۔

تاریخ کے تمام واقعات ایک مسلسل لڑی ہیں جو ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔ تاریخی واقعات اتفاقی حادثات نہیں ہیں۔ تاریخی واقعات کو ارتقاء سے تعبیر کیا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ تاریخ کے اس پہلو کو سمجھنے کے بعد ہم کو اپنی دنیا اور زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ موجودہ دور میں مسئلہ ارتقاء نے انسان کے تمام افکار پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ تاریخ کے تمام واقعات میں قانون ارتقاء کار فرما ہے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ حال ماضی سے کس طرح ارتقاء پذیر ہوا۔ جب سماج ارتقاء کا نتیجہ ہے تو پھر اس ارتقاء کا کچھ مقصد بھی ہو گا۔ ہمیں یہ مقصد معلوم کرنا ہے۔ یہ مقصد جب ہی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ جب ہم ارتقائی عمل کا بغور مطالعہ کریں۔ تاریخ کا مطالعہ اس مقصد سے کرنا چاہیئے کہ انسان کے تمام افکار و واقعات کا ارتقائی پہلو سمجھ میں آ جائیں۔ تاریخی واقعات کے تسلسل اور تبدیلی کو بے جان حرکت نہیں تصور کرنا چاہیئے ان میں کونسا منشاء یا مقصود ہوتا ہے یا ان میں کس قانون کے تحت حرکت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی واقعات کی غرض و غائیت معلوم کرنا تاریخ کا اولین مقصد ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ معاشرے کے ارتقاء کی کہانی ہے۔

۶۔ تاریخ کے ذریعہ ان کی اہمیت نئی نسل یعنی طلباء کے ذہن نشین کرائی جائے۔ ان کو یہ بات محسوس کرائی جائے کہ ہمیشہ سے انسان ان کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔ امن کی خاطر اس نے بڑے بڑے انتظامات (اقوام متحدہ کا ادارہ سلامتی کونسل اور غیر جانبدار تحریک NAM وغیرہ) کیے ہیں۔ ہمارا فرض بھی ہے کہ ہم امن برقرار رکھنے کے لئے جو کچھ ممکن ہو کریں۔ بالخصوص اس زمانہ میں جب کہ جنگ اس قدر مہلک اور تباہ کن ہو گئی ہے کہ نسل انسانی کے نیست و نابود ہو جانے کا اندیشہ ہو گیا ہے۔ جیساکہ جنوری۔ فروری ۱۹۹۱ء میں امریکہ اور اس کے ۳۵ اتحادیوں نے عراق کے خلاف مہلک ترین ہتھیار استعمال کئے۔ ۲۷ اگست ۱۹۹۲ سے اپریشن جنوبی عراق (Operation Southern Iraq) سے عراق کو حصوں بخروں میں تقسیم کرنے کے لیے پلان بنایا ہوائی' بحری اور بری فوجی کاروائیوں کے لیے عراق کا ایک حصہ "غیر پروازی زون" (No Fly Zone)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرار دیا۔ اس سے جنگ کے اندیشے بڑھ گئے ہیں۔ ایسی صورت میں بڑی ضرورت ہے کہ انسانوں کے دلوں میں امن سے رغبت اور جنگ سے نفرت پیدا کی جائے۔ تاریخ میں بے شمار جنگوں کی تباہ کاریوں کے حالات و واقعات درج ہیں ان کے تباہ کن اثرات سے روشناس کر کے ان کے دلوں میں جنگ سے نفرت اور امن سے رغبت کے بیج بوئے جا سکتے ہیں۔ اور اس طرح عالمی امن برقرار رکھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

۷۔ مطالعہ تاریخ کے ذریعہ انہیں آگاہ کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی ترقی اور تہذیب و تمدن کے پروان چڑھانے میں ہر زمانے میں دنیا کے تمام انسانوں نے کچھ نہ کچھ اضافہ کیا ہے۔ مصر' بابل' چین' ہندوستان' یونان' روما' یورپ' امریکہ غرضیکہ تمام ملکوں اور قوتوں نے علم و ادب اور ہنر و ایجادات میں اضافہ کیا ہے۔ تہذیب و ثقافت اور علم و ہنر کسی ایک قوم کی میراث و جاگیر نہیں بلکہ اس میں تمام انسانوں نے ہر زمانے میں مسلسل اضافہ کیا ہے۔ ہم کو غیر قوموں سے نفرت نہیں کرنی چاہئے۔ مل جل کر زندگی بسر کرنے میں ہی سب کی فلاح و بہبود مضمر ہے۔ مذہب' قوم' نسل اور رنگ کے فرق مصنوعی اور ظاہری ہیں تمام انسان ایک خاندان کے افراد ہیں۔ اور بقول شیخ سعدی "ایک جسم کے اعضا ہیں"۔ رسم و رواج' زبان' رنگ کے فرق جغرافیائی تبدیلیوں اور ماحول کی ضرورتوں کا نتیجہ ہیں۔ ان سطحی فرقوں کی وجہ سے ہمیں دوسرے انسانوں سے نفرت نہیں کرنی چاہئے بلکہ جس طرح طبعی دنیا میں طرح طرح کے قدرتی مناظر دیکھ کر ہماری طبعیت خوش ہوتی ہے۔ اس طرح مختلف انسانوں اور ثقافتوں کو دیکھ کر ہمیں خوش ہونا چاہئے۔ ان سے نفرت اور پرہیز کرنا بربریت اور جہالت ہے۔ اسلام نے بھی تمام انسانوں کو میل جول اور محبت کے ساتھ رہنے کی ہدایت کی ہے۔ غرضیکہ تاریخ سے بیشمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جن کے ذریعے سے مفید اور کار آمد سبق تاریخ کے استاد طلباء کو دے سکتے ہیں۔

۸۔ جذبہ حب الوطنی کو ابھارنے میں تاریخ سب سے زیادہ موزوں علم ہے۔ قوم کے بہادروں شہیدوں' جانبازوں اور محبان وطن کی قربانیوں اور حالات زندگی بیان کر کے جذبہ حب الوطنی ابھارا جا سکتا ہے۔ نسلوں کو ان کے اسلاف کے کارنامے سنائیں جائیں تاکہ وہ اپنے ملک اور ملک کی ہر چیز پر فخر کریں اور یہ محسوس کریں کہ اس سرزمین اور ہماری زندگی کو بہتر و خوشگوار بنانے کے لئے ہمارے اسلاف نے کیا کیا کوششیں کیں اور کیا کیا سامان مہیا کئے۔ یہ ملک ہمارا گھر ہے جہاں ہم اطمینان اور آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کی بدولت ہم ترقی کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس کی قدر کرنی چاہئے۔ اس کے علاوہ قومیت کے تنگ نظریات سے بھی آگاہ کیا جائے کہ تاریخ میں بے شمار جنگیں قومیت کے تنگ نظریئے کی وجہ سے لڑی گئیں۔ دونوں عالمی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنگیں اس تنگ نظریہ قومیت کا نتیجہ تھیں۔ اس طرح سے افراد کے دلوں میں بین الاقوامی اخوت کا جذبہ ابھارا جائے تاکہ دوسرے ممالک اور ان کی ثقافتوں سے نفرت نہ کریں اور دنیا کی تمام قوموں کے ساتھ مل جل کر تعاون سے زندگی بسر کرنا سیکھیں اس طرح مطالعہ تاریخ کی مدد سے انسانوں میں رواداری اور وسیع النظری پیدا کی جا سکتی ہے۔ جو کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے۔

۹۔ تاریخ کے ذریعہ محنت اور فرض شناسی کی تعلیم بھی دی جا سکتی ہے۔ محنت اور فرض شناسی انفرادی اور سماجی ترقی کا راز ہیں۔ جن افراد اور قوموں نے محنت کی وہ آج دنیا میں ترقی یافتہ اور راہنما ہیں۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ آرام طلبی اور عیاشی ہمیشہ قوموں کے لئے ذلت و تنزل کا باعث بنتی ہے۔

۱۰۔ حق و باطل اور نیکی و بدی میں فیصلہ کرنے کی صلاحیتیں بھی تاریخ کے مطالعہ کے ذریعہ سے ابھاری جا سکتی ہیں۔ توہم پرستی اور اندھی تقلید کے نقصانات سے آگاہ کر کے ان سے آئندہ کے لئے بچایا جا سکتا ہے۔ ایسے افراد میں جذبہ خود داری و خود آگاہی کو ابھارا جائے تاکہ وہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو جان کر اپنے آپ کو پہچانیں اور انسانوں کی برادری میں اپنا صحیح مقام و تشخص قائم کریں۔

۱۱۔ بیکن نے کہا تھا کہ "تاریخ انسان کو دانشمند بناتی ہے۔" یہ قول مبنی بر حقیقت ہے۔ تاریخ عظیم دانشوروں کے علم و حکمت کا پوشیدہ خزانہ ہے جس کو تلاش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماضی میں دانشوروں نے مسائل کے حل کے لئے جو طریقہ کار اختیار کئے اور ان کے اچھے برے نتائج و پہلو پیش کئے تاریخ کے وجود سے ان کو حاصل کر کے دانشمند بن سکتے ہیں۔ تاریخ عقل و دانش اور علم و حکمت کا چراغ ہے جو زندگی کو تاریک منازل سے کامیابی کے ساتھ گزارنے کا راستہ دکھاتی ہے۔ تاریخ زندگی کا عملی فلسفہ ہے اس کے مطالعہ سے عملی دانشمندی میں اضافہ ہوتا ہے اور انسانی جذبات کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

۱۲۔ تاریخ کے ذریعہ لوگوں کے اخلاق و کردار کو بلند کیا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل نامور تاریخی ہستیوں، انبیاء، اولیاء، مصلحین اور دانشوروں کے حالات زندگی بیان کر کے کی جا سکتی ہے۔ ایسی سوانح عمریوں سے اخلاق و نصیحت آموز خیالات و واقعات کو ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں اساتذہ، مصلحین، مبلغین، واعظین، کو چاہئے کہ وہ نصیحت آمیز خیالات اور نامور ہستیوں کے حالات نہایت موثر و دلچسپ پیرائے میں بیان کریں۔ انہیں ٹھونسنے کی کوشش نہ کریں۔ نصیحت آموزی کے عمل کو کھلا چھوڑ دیں تاکہ وہ خود بخود اس سے سبق حاصل کریں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بعض مفکرین کا خیال ہے کہ تاریخ میں زیادہ تر ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں نیکیاں اور بدیاں دونوں تھیں۔ اس لئے اگر بدیوں کو نظرانداز کر کے محض نیکیاں بتائی جائیں گی تو وہ غلط تاریخ ہو گی۔ یہ کام تو جھوٹے قصوں سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ اگر لوگوں کو مشہور ہستی کے تاریک پہلوؤں سے روشناس کرایا جائے گا تو یہ خطرہ ہو گا کہ لوگ ان کی زندگی سے برے سبق حاصل کریں گے اور ان کا اخلاق و کردار پر برا اثر پڑے گا۔ بہرحال نامور ہستیوں کے تاریخ میں حالات و واقعات اس انداز سے پیش کئے جائیں کہ لوگوں کے دل و دماغ پر اچھا اثر پڑے اور وہ اپنی فطری عادتوں کے مطابق نیک کاموں میں ان کی پیروی کریں اور ملک و قوم کے لئے مفید اور قابل تقلید مثال پیش کریں۔ آخر میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اخلاقی اقدار اور فطرت انسانی کو سمجھنے میں تاریخ سے بڑی مدد ملتی ہے۔

یہ چند مقاصد جو بیان کئے گئے ہیں انہیں مطالعہ تاریخ کی مدد سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ کا مقصد انسانوں میں عرفان و شعور پیدا کرنا ہے۔ جب یہ شعور عملی طور پر حاصل ہو جاتا ہے تو تاریکیوں کے پردے چاک ہونا شروع ہوجاتے ہیں اور حال کی روشنی میں درخشاں مستقبل مسکراتا ہوا نظر آتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب دوئم

حوالہ جات

۱- رچرڈ ہکلوٹ (۱۵۵۲-۱۶۱۶ء) نے پرانی جغرافیائی دریافت کی کتابیں جمع کر کے شائع کیں۔ بعد ازاں اس نام کے اعزاز میں ہکلوٹ سوسائٹی کی بنیاد پڑی (۱۸۴۶ء) جس نے بے شمار کتابیں شائع کیں۔

۲- الزبتھ کے عہد کا مشہور انگریز ملاح اور **مکتشف** (۱۵۴۵-۱۵۹۶ء) اس نے سپین پر سب سے بڑی ضرب لگائی۔

۳- انگلستان کا مشہور ملاح (۱۵۳۵- ۱۵۹۵ء)

۴- انگلستان کا سب سے زیادہ مشہور منچلا ملاح (۱۸۰۸- ۱۸۹۲ء) اس نے کئی نئی دنیائیں اور زمینیں دریافت کیں۔

۵- اٹلی کا ایک طبقہ آبادی جو رومیوں سے پہلے وہاں موجود تھا اب ناپید ہے۔

۶- سکنڈے نیویا کے چند گروہ جنھوں نے یورپ کے شمالی ساحلوں پر قزاقانہ حملے کئے۔

۷- جنگ عظیم اول کے اختتام پر یہ کمیٹی جو Nye Committe کہلاتی ہے، سینیٹر نائی کی سرکردگی میں قائم کی گئی تھی جس نے اپنی رپورٹ میں امریکہ کے اسلحہ سازوں کو جنگ کا ذمہ دار قرار دیا۔

۸- تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جین جیکوئس روسو، "**ایمیل**" (نیویارک، ۱۹۷۷)

۹- فرانسس بیکن (۱۵۶۱ - ۱۶۲۶ء)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیسرا باب

تاریخ بحیثیت سائنس

HISTORY AS A SCIENCE

تاریخ کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ سائنس ہے؟ کیا یہ آرٹ ہے؟ کیا یہ آرٹ بھی ہے اور سائنس بھی؟ یا کہ تاریخ نہ تو سائنس ہے اور نہ ہی آرٹ بلکہ تاریخ' تاریخ ہے۔ کس قدر سادہ اور واضح سوالات ہیں۔ ان سوالات کا جواب صدیوں سے ایک بہت بڑے تنازعہ کا باعث بنا ہوا ہے۔ جب کوئی تاریخ کا طالبعلم اسے سائنس کا درجہ دیتا ہے تو نیچرل سائنس کے دانشور اپنی تجربہ گاہوں سے نکل کر اس طالبعلم کے خلاف نہ صرف زہر اگلتے ہیں بلکہ ساری زندگی تاریخ کو خرافات کا انبار قرار دے کر اسے سائنس کے احاطہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ تاریخ کو ایسا قیاس و مفروضات پر مبنی علم قرار دیتے ہیں جو کہ علم کی مقدس وادیوں میں کبھی داخل نہیں ہو سکتا۔ دوسری جانب تاریخ کے حمایتی ایسے دلائل و نظریات پیش کرتے ہیں کہ تاریخ بھی ایک ایسا علم ہے جس طرح دوسرے نیچرل علوم! غرضیکہ موافق اور مخالف دلائل و نظریات کی بھرمار کر دی جاتی ہے۔

تعریف

تاریخ کو آرٹ قرار دینے یا تاریخ کو سائنس کے دائرہ کار میں داخل کرنے یا اسے سائنس کے دائرہ کار سے خارج کرنے کی بحث اس وقت تک لا حاصل رہے گی جب تک کہ ہم سائنس' آرٹ اور تاریخ کی الگ الگ تعریف مقرر نہ کر لیں۔

سائنس کی تاریخ دراصل انسان کی تاریخ ہے۔ سائنس کا ماخذ لاطینی زبان کا لفظ Scire ہے جس کا مطلب علم حاصل کرنا اور سیکھنا ہے۔ اس لحاظ سے ہر قسم کا علم خواہ وہ اکتسابی ہو یا غیر اکتسابی سائنس کہلائے گا۔ لیکن اصطلاحی معنوں میں صرف وہی علم سائنس کہلاتا ہے جو منظم اور مربوط ہو اور خاص طریق کار کا پابند ہو۔ اب سائنس کی تعریف یوں ہو گی

"سائنس ایسے یکساں حقائق کا مجموعہ ہے جن سے ایک عام اصول یا قانون

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اخذ کیا جائے۔ ایک ایسا قانون یا اصول جو ہمیں اس قابل بنا دے کہ ہم یقین سے کہہ سکیں کہ مخصوص حالات میں یکساں حوادث ایک ہی طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔"

سائنس ایک مربوط (Systematic) مکمل (Complete) اور صحیح واقفیت کا علم ہے۔ جس طرح اینٹوں کا ایک ڈھیر عمارت کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا اسی طرح غیر مربوط اور غیر مکمل واقفیت علم کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی۔ طبعی علوم (Natural Sciences) اشیاء کو جیسی کہ وہ ہوں بیان کرتے ہیں۔ ان کا کام مشاہدے اور تجربے کے ذریعے سے مظاہر قدرت کی نوعیت کو سمجھنا' ان کے متعلق قوانین دریافت کرنا' ان قوانین کی مدد سے مظاہر قدرت کے متعلق پیشگوئی کرنا ہے یعنی کہ یہ جاننا کہ فلاں فلاں حالات میں فلاں واقعات ظہور پذیر ہوں گے وغیرہ۔ مثلاً علم نباتات ہمیں یہ بتاتا ہے کہ پودے کس طرح اگتے ہیں' کس طرح ہوا اور پانی سے اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں اور کس طرح پھل اور پھول لاتے ہیں۔ اسی طرح باقی طبعی علوم بھی اپنی اپنی جگہ اپنی مخصوص اشیاء کے متعلق حتی الامکان مکمل واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ طبعی علوم ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ فلاں شے کیسے ہونی چاہے بلکہ یہ کہ وہ کیسی ہے۔

مطابقت

An Analogy

یہاں پر ہم نیوٹن کے قوانین حرکت کی مثال پیش کر سکتے ہیں۔ ان کا عمل اور رد عمل ہر جگہ اور ہر مقام پر ایک جیسا ہو گا۔ نیوٹن کے پہلے قانون حرکت کی رو سے اگر کوئی جسم ساکن ہے تو ہمیشہ ساکن ہی رہے گا۔ اگر متحرک ہے تو خط مستقیم میں یکساں سپیڈ کے ساتھ اپنی حرکت جاری رکھے گا۔ بشرطیکہ کوئی بیرونی قوت اس پر عمل نہ کرے۔ مثال کے طور پر الماری میں پڑی ہوئی کتاب وہاں ہی رہے گی۔ جب تک کوئی آدمی (بیرونی قوت) اس کو الماری سے نہ نکالے۔ ایک اور مثال یوں پیش کی جا سکتی ہے اگر ہم گیند کو زور سے زمین پر پھینکیں تو گیند ہمیشہ لڑھکتی ہی رہے گی لیکن ہمارا مشاہدہ اس کے برعکس ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ گیند کچھ دور جا کر رک جاتی ہے یہ مشاہدہ بظاہر پہلے قانون حرکت کے خلاف معلوم ہوتا ہے لیکن غور کرنے پر معلوم ہو گا کہ یہ اس قانون حرکت کے عین مطابق ہے کیونکہ نیوٹن کی یہ دلیل تھی کہ متحرک جسم کی حرکت اس لئے زائل ہو جاتی ہے کہ اس کی حرکت پر مختلف قوتیں مثلاً ہوا کی رکاوٹ' رگڑ کی قوت اور کشش ثقل عمل کرتی ہے۔ اگر یہ قوتیں نہ ہوں تو جسم ہمیشہ کے لئے خط مستقیم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں حرکت کرتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر شیشے کی گولی کو تین مختلف افقی مستوی سمتوں پر (۱) ہموار کچے فرش پر (۲) اینٹوں کے فرش پر اور (۳) چکنے اور ہموار سنگ مرمر کے فرش پر لڑھکائیں تو ہم دیکھیں گے کہ سنگ مرمر پر گولی ساکن ہونے سے پہلے بہت زیادہ فاصلہ طے کرے گی۔ اینٹوں کے فرش پر اس سے کم اور کچے فرش پر سب سے کم ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سنگ مرمر کا فرش کچے فرش کی نسبت رگڑ کی مخالف قوت کم مہیا کرتا ہے۔ اس لئے گولی زیادہ دور جاتی ہے جو نیوٹن کے پہلے قانون حرکت کے عین مطابق ہے۔ یہ اصول ہر جگہ اور ہر مقام پر ہمیشہ یکساں نتائج پیش کرتا ہے۔

اس طرح اصول توانائی، اصول کثافت، اصول لیور، اصول حرارت اور اصول روشنی وغیرہ کو ایک طرح کے حالات و شرائط کے تحت دنیا کے کسی حصے میں کتنی بار ہی کیوں نہ ایک عمل کو دہرائیں، ہر جگہ اور ہر مقام پر ان کے نتائج ہمیشہ یکساں ہوں گے۔ اسی لئے لٹریچر، اقتصادیات، سیاسیات، جیسے مضامین کو دائرہ سائنس سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ یعنی ایسے علوم جو معاشرتی اور بشری (Humanistic) ہیں انہیں سائنس نہیں کہا جاتا کیونکہ سائنس کا ایک طریق کار ہے جو معاشرتی علوم میں نہیں پایا جاتا۔ سائنس انسانی تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں ہماری زندگی میں مسائل کا بہتر حل پیش کرنے میں مدد دیتی ہے۔ سائنس قوانین فطرت کا کھوج لگاتی ہے تاکہ مادیت پر فتح حاصل کر کے انسانی زندگی کی آسائشوں میں اضافہ کیا جا سکے۔ سائنس کا دارومدار انسان کے حواس خمسہ پر ہے۔ اس کے برعکس معیاری علوم (Normative Sciences) کا نقطہ نظر اور ان کی غرض و غایت طبعی علوم سے بالکل مختلف ہے۔ ان کا تعلق اشیاء کی ہیت و بود سے نہیں ہوتا بلکہ ان کی قدرو قیمت سے ہوتا ہے۔ وہ ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ فلاں اشیاء یوں ہیں یا یوں تھیں بلکہ انہیں یوں ہونا چاہیے۔ وہ اپنے معیاری اصولوں کے مطابق ان کی قدرو قیمت کا جائزہ لیتے ہیں۔ مثلاً علم تاریخ ایک معیاری علم ہے۔ اس کا کام یہ دیکھنا نہیں ہے کہ ہمارے افعال کیسے ہیں بلکہ یہ کہ وہ زمانہ ماضی میں کیسے تھے اور اصول ارتقاء کے مطابق اب انہیں کیسا ہونا چاہیے تھا؟ یہ علم انسان کے ماضی کے افعال کی اچھائی اور برائی اور اس کے محرکات و اسباب کے متعلق فیصلہ کرتا ہے۔ طبعی علوم کے اصول جاننے کے بعد سوال کیا جا سکتا ہے کہ تاریخ کیا ہے؟ کیا تاریخ سائنس ہے؟ اگر ہم تاریخ کی تعریف متعین کئے بغیر تاریخ کو سائنس یا آرٹ ثابت کرنے میں اپنا زور صرف کر دیں تو ہم اس الجھن میں پھنس جائیں گے جس سے نکلنا ہمارے بس کی بات نہ ہو گی اور اگر ہم اس الجھن سے نکل بھی گئے تو پھر بھی ہمارے ذہن میں تاریخ کی علمی یا فنی تراش پیدا نہیں ہو سکے گی۔ اس بحث کو آسان اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قابل فہم بنانے کے لیے ضروری ہے کہ تاریخ کی ایک تعریف معین کی جائے تا کہ نتیجہ خود بخود واضح اور عیاں ہو جائے:

"تاریخ ماضی کے حوادث و واقعات کے مطالعہ کا نام ہے نہ صرف ماضی بلکہ حال و مستقبل کے حقائق کا فہم و ادراک بھی تاریخ کہلاتا ہے۔[۲]"

اگر لارڈ آکٹن کے الفاظ تاریخ کی تعریف پر منطبق کریں اور ہم تاریخ کو رفتار حوادث بتائیں تو اس سے ہماری مراد "تاریخ سازوں" کی سوانح حیات ہو گی۔ ظاہر ہے کہ اسکندر، اشوک سیزر، چنگیز، ہلاکو، بلبن، اکبر اور ٹیپو سلطان کے حالات یا ان کے کارناموں کے سماج پر اثرات کو سائنس کیونکر کہا جائے۔ اگر ہم تاریخ کی اس تعریف کو تسلیم کر لیں تو پھر تاریخ کو سائنس کہنا جھوٹ ہے۔ تاریخ کا اطلاق اگر ماضی کے حوادث و واقعات کے ریکارڈ پر کیا جائے جنہیں ہمعصر مورخوں نے لکھا تو کیا اس صورت میں ہم تاریخ کو سائنس کہہ سکیں گے؟ ہرگز نہیں؟ آئیں اب یہ دیکھیں کہ کیا تاریخ آرٹ یعنی فن ہے؟ کیونکہ افسانہ نویسی اور وقائع نگاری فن ہے۔ اس فن کا نام تاریخ نہیں بلکہ تاریخ نویسی ہے۔ آرٹ سے مراد فن، مشق یا مہارت ہے جو بذریعہ تجربہ، مطالعہ یا مشاہدہ حاصل کی جاتی ہے۔

علم تاریخ کا کام جاننا اور فن کا کام کچھ کرنا ہے۔ تاریخ کے علم کی حیثیت علمی (Theoretical) ہوتی ہے۔ اور فن کی عملی (Practical)۔ تاریخ کا علم مطالعہ سے سیکھا جاتا ہے اور فن مشق سے۔ فزکس، کیمسٹری، فزیالوجی وغیرہ علم ہیں۔ جراحی (Surgery) موسیقی اور مصوری وغیرہ فن یا آرٹ ہیں۔ لیکن یہ فرض کر لینا کہ علم اور فن کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوتا اور وہ ایک دوسرے سے قطعی طور پر مختلف ہوتے ہیں ایک غلطی ہے۔ ہر علم کچھ اصول یا قوانین دیتا ہے۔ اور جب وہ اصول عمل میں لائے جاتے ہیں تو وہ علم فن کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ مثال کے طور پر انجنیئرنگ (Engineering) کے اصول پڑھتے ہیں تو ایک علم پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ لیکن جب ان اصولوں کو عملی جامہ پہناتے ہیں تو وہی انجنیئرنگ کا علم فن بن جاتا ہے۔ علم اور فن کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایسا علم جو فن نہ بن سکے (یعنی جس کے اصول عمل میں نہ لائے جا سکیں) بیکار ہوتا ہے۔ اور ایسا فن جو علم پر مبنی نہ ہو خطرناک ہوتا ہے۔ ایک ان پڑھ دیہاتی حجام اس لئے خطرناک سرجن (Surgeon) ہوتا ہے کہ اس کی جراحی علم الابدان (Anatomy) پر مبنی نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علم فن کی جڑ ہے اور فن علم کا ثمر۔ فزیالوجی کا علم ڈاکٹری کے فن کی بنیاد ہے۔ کیمسٹری کا علم صابن سازی کے فن کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنیاد ہے۔ علم النجوم جہاز رانی کے فن کی بنیاد ہے۔ اسی طرح تاریخ کا علم کسی شئے اور واقعہ کی تلاش اسباب کا فن ہے۔ اور یہ فن تمام معیاری علوم کی تحقیق و تفتیش کی سائنس کی بنیاد ہے۔ جب تحقیق و تفتیش کے اصولوں کو اپنی روز مرہ زندگی میں استعمال کرتے ہیں معاشرے اور اس کے اداروں کی غلطیوں کی نشاندھی کرتے ہیں تو تاریخ کا علم فن میں تبدیل ہو جاتا ہے پس تاریخ علم بھی ہے اور فن بھی۔ **بحیثیت** علم اس کا کام ہمیں صحیح فکر کے اصول بتانا ہے کہ ہم کس طرح ان پر عمل پیرا ہو کر غلطیوں سے بچ سکتے ہیں[3]۔ چونکہ ہر علم کو تحقیق و تفتیش کی ضرورت ہوتی ہےاور تحقیق و تفتیش کے اصول علم تاریخ دیتا ہے لہٰذا ہر علم تاریخ کا محتاج ہے۔ اسی طرح تاریخ کا فن یعنی تحقیق و تفتیش کا فن تمام فنون سے افضل ہے۔ اسی بنا پر تاریخ کو اُم العلوم (Mother of Sciences)اور فن الفنون (Art of Arts) کہا جاتا ہے۔ سوال کا دوسرا رخ یوں ہے کہ ہم تاریخ کو رفتار حوادث یا داستان نویسی تسلیم کر لیں تو ہم تاریخ کو سائنس نہیں کہہ سکتے۔ تاریخ دراصل ایک ایسا عمل ہے جو بذریعہ تحقیق و تفتیش اور تنقید کے حاصل کیا جاتا ہے۔ ان معنوں میں تاریخ یقینی طور پر ایک سائنسی علم ہے مگر سائنس نہیں۔ اس تنقید و تحقیق کا مقصد حال کے حوادث کی تشریح کرنا ہے۔ تاریخ طبعی علوم سے ایک مختلف علم ہے جو مشاہدات یا تجربات کا علم نہیں بلکہ نکتہ چینی اور تحقیق و تنقید کا علم ہے۔ اور اس تحقیق و تنقید سے ہم ایک عام اصول یا قانون اخذ کرتے ہیں جو ہمیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ مخصوص حالات میں یکساں حوادث و واقعات ایک ہی طرح اثر انداز ہوتے ہیں اور ایک ہی طرح کے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ مثلاً فرعون کے مصر اور بوربونون کے فرانس میں ہزاروں سال حائل ہیں لیکن دونوں ملکوں کے جاگیرداری نظام نے مصر (حضرت موسیٰ' بنی اسرائیل) اور فرانس میں (عوامی) انقلاب و نتائج یکساں پیدا کئے ۔ مصری' اسیری' بابلی' نینوائی اور موہنجو دارو کی تہذیبوں کے عروج و زوال کے عوامل و قوانین ایک جیسے تھے۔ اور ان کے فنا کے نتائج بھی یکساں تھے۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ تحقیق و تنقید کی سائنس ہے۔ تاریخ کے متعلق یہ نظریہ کہ یہ بھی سائنس ہے احیائے علوم کی تحریک کے دوران پندرھویں صدی میں پیدا ہوا مگر اس نظریئے کو زیادہ اہمیت عہد وکٹوریہ میں حاصل ہوئی۔ عہد وکٹوریہ کے مورخوں نے سب سے پہلے تاریخ کو سائنس قرار دیا۔ اس عہد کے لوگوں کو اپنی ذہنی صلاحیتوں پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ انسان کی سائنس پیدا کر لیں گے۔ اسی طرح انہیں اعتماد تھا کہ وہ معاشرے' اقتصادیات' سیاسیات' قانون اور تاریخ کی سائنس بھی تخلیق کر لیں گے۔ تھامس بکل کو یقین تھا۔ اس نے تاریخ کو ایک سائنس کی منزل پر پہنچا دیا ہے۔ آس کا کہنا ہے کہ:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"میں تاریخ کو ایک آفاقی اور غیر متبدل باقاعدگی کی شاندار اصل راہ پر لے آیا ہوں جسے قانون فطرت کہتے ہیں۔"

فرانس میں آگوسٹ کونٹ[4] نے اعلان کیا کہ:

"اب تاریخ پر پہلی مرتبہ منظم انداز میں غور کیا گیا ہے اور دوسرے مظاہر کی طرح معلوم ہو چکا ہے کہ یہ بھی غیر متبدل قوانین کے تابع ہے۔"

انیسویں صدی کے آخری ربع میں کیمبرج یونیورسٹی کے دو پروفیسروں لارڈ ایکٹن اور جے۔ وی۔ بری نے کہا کہ اگر تاریخ نے اب تک سائنس کا درجہ حاصل نہیں کیا تو لازمی طور پر یہ آگے چل کر سائنس بن جائے گی[5]۔ اب تاریخ کا بڑے سے بڑا مورخ، مفکر، اور پروفیسر بھی اعتماد کے ساتھ تاریخ کو سائنس کہنے کی بات کرتا ہے۔ اور اب تاریخ کو سائنس سمجھنے اور کہنے کی عادت ذہنوں میں رچ بس گئی ہے۔ چنانچہ جے۔ وی۔ بری کہتا ہے کہ "تاریخ سائنس ہے اسکے علاوہ کچھ نہیں۔"

ظاہر ہے کہ تاریخ ان معنی میں سائنس نہیں جن معنی میں علم کیمیا، فزکس یا حیاتیات سائنس ہیں۔ تاریخی مواد سائنٹیفک تجربات کے لئے پیش نہیں کیا جا سکتا اس کے تجربات دہرائے نہیں جا سکتے۔ یہ اپنے مواد کو نظم و ضبط کے قوانین کے تحت مربوط صورت میں پیش کر سکتی ہے۔ تاریخ کی انہیں خامیوں کی بنا پر یہی کہا جائے گا کہ تاریخ سائنس کے لفظ کی افادی حیثیت کے اعتبار سے سائنس نہیں۔ تاہم ظاہر ہے کہ تاریخ میں سائنس کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے یا استعمال کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ یعنی تاریخ کے احاطے میں ان تمام اشیاء کی تحقیق و تفتیش کی جا سکتی ہے جو تاریخی اصولوں پر صحیح ثابت ہوتی ہے۔ انہیں قائم رکھا جاتا ہے۔ اور جو صحیح ثابت نہیں ہوتیں انہیں مسترد کر دیا جاتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ تاریخ اشیاء کی تحقیق و تفتیش کیوں کرتی ہے؟ تاریخ کے ہاں تحقیق و تفتیش کی ٹیکنیک اور میزان کیا ہے؟ یہ کیسے اور کیوں کر معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق و تفتیش حقیقت پر پہنچ چکی ہے اور صحیح نتائج اخذ کیے ہیں؟ یا تمام حقائق ایک صف میں آ گئے ہیں؟ کیمیا دان ان کیمیائی اجزاء میں اپنی شخصیت یا عقائد و رجحانات اور نظریات شامل نہیں کر دیتا جنہیں تجربات کے لئے استعمال کرتا ہے۔ مگر مورخ اپنے مواد کو ان اجنبی اجزاء سے (ماضی کے حوادث و واقعات) پاک کیونکر رکھ سکتا ہے؟ دراصل تاریخ میں سائنٹیفک طریقے کی اصطلاح کے وہ معنی ہیں جو طبعی علوم کے تسلیم کیے جاتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں- کیا اس کی جگہ زیادہ حقیقت پسندانہ اصطلاح استعمال کرنی چاہیے مثلاً تاریخ کا تنقیدی طریقہ- کیا سائنٹیفک تاریخ کو ٹیکنیکل تاریخ یا صحیح سائنس کہنا چاہیے؟

واقعات و حوادث کی تحقیق و تفتیش کے لئے سائنٹیفک طریقے کا صحیح استعمال تاریخ کے صرف ابتدائی دائرے میں کیا جا سکتا ہے- حقیقی اساسی دائرے میں نہیں کیا جا سکتا- ہم سائنٹیفک نقطہ نگاہ سے ثابت کر سکتے ہیں کہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو راولپنڈی کے نیشنل پارک (موجودہ لیاقت پارک) میں اکبر خان نامی آدمی نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو شہید کیا- یہ بالکل درست ہے لیکن اس سے آگے؟ اس سے آگے ہماری سائنس نہیں لے جاتی- یعنی اکبر خان نے یہ قدم کیوں اٹھایا؟ کون اور کیوں اس فعل کا ذمہ دار تھا؟ اس کے نتائج کیا برآمد ہوئے-؟ اکبر خان کو فوری کیوں گولی مار دی گئی؟ کیا اکبر خان کو گولی مارنے والے پولیس آفیسر کے خلاف آج تک کوئی ایکشن ہوا؟ درحقیقت یہ ایسے دلچسپ سوالات ہیں کہ سائنٹیفک طریقے پر ان کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا- صحیح تو یہ ہے کہ ان کا کوئی جواب ہو ہی نہیں سکتا-

سائنٹیفک تاریخ کے نظریہ کے علاوہ دور حاضر کے بعض مورخوں نے ٹیکنیکل تاریخ کا نظریہ بھی اختراع کیا ہے- ٹیکنیکل تاریخ کی اصطلاح کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ہربرٹ بٹر فیلڈ نے ایجاد کی تھی- ہمیں تاریخ کو ڈرامائی اور کیمیائی انداز میں مسائل کے حل کے طو پر پیش نہیں کرنا چاہئے- ٹیکنیکل تاریخ میں اصلی موضوع سے انحراف کیا جاتا ہے- صرف چھوٹی چھوٹی اور مختصر اشیاء کو پسند کیا جاتا ہے- تاریخ مختصر سے رسالے کی شکل اختیار کر جاتی ہے- ہمیں اس قسم میں تاریخی افکار و نظریات کو محدود شکل میں پیش نہیں کرنا چاہئے- اور نہ ہی ہمیں زیادہ بلند پروازوں سے کام لینا چاہئے اور تاریخ کے لئے غیر فطری قوانین مرتب کرنا مناسب نہ ہو گا اور ہمیں سائنس کا لبادہ بھی نہیں اوڑھنا چاہئے-

بیسویں صدی کے شروع میں مورخوں نے تاریخ کو باقاعدہ سائنسی اصول و ضوابط اور قوانین کے تحت کام کرنے والے علم کی حیثیت میں پیش کیا جن کی بنیاد پر موجودہ تاریخ نے جنم لیا اور خالص سائنسی تحقیق پر تاریخ لکھی جانے لگی- مشہور مستشرق رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے کہ:

"سائنس سے مراد تحقیق کی نئی روح' تفتیش کے نئے طریقے اور پیمائش و مشاہدہ کے نئے اسلوب ہیں..... جن سے ..... لوگ بے خبر تھے-"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لہذا تاریخ کا میکانکی نظریہ جس پر ارتقائی عمل کی بنیاد تھی کی شکل میں تاریخ لکھی جانے لگی۔

چونکہ تاریخ نوع انسان کی ماضی میں سرانجام دی گئی سرگرمیوں کا مرتب و مربوط علم (Systematic Knowledge of Past) ہے۔ اور تاریخ کا نظریہ واقعات کی رنگینی ہے۔ اور اس کا مقصد ہے کہ واقعات انسانی عقل و شعور کے مطابق قابل فہم و عمل ہوں۔

سائنس کا علم بذریعہ مشاہدہ' مطالعہ اور تجربہ کے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کا نظریہ فطری قوانین کے ٹھوس اصولوں پر مبنی علم ہے۔ اس کا مقصد حقائق فطرت کو آشکار کرنا ہے یعنی کائنات کی تشریح و توجیہ کرنا ہے۔ تاریخ سائنس ہے یا آرٹ؟ "کروچے" اس موضوع پر تفصیل سے بحث کرتا ہے اور اس امر کی سختی سے تردید کرتا ہے کہ تاریخ سائنس ہے۔ اس کے نزدیک تاریخ آرٹ یعنی فن ہے۔ کیونکہ جس طرح فن یا آرٹ نہ تو لذت بخشتا ہے اور نہ ہی لذت کو اپنے میں سموتا ہے اور نہ ہی یہ فطرت کے حقائق و راز سے پردہ اٹھاتا ہے۔ مزید برآں یہ نہ تو فطرت کی نمائندگی کا دعویدار ہے اور نہ ہی باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانے میں حصہ لیتا ہے۔ آرٹ تصورات سے الگ ہو کر ایک وجدانی کیفیت کا نام ہے۔ اور آرٹسٹ اس انفرادی و وجدانی کیفیت کو محسوس کرتا ہے۔ اور اسکی نمائندگی کرتا ہے اس لئے آرٹ دیکھنے اور محسوس کرنے کے عمل کا نام ہے۔ اس کے برعکس سائنس ایک مربوط و مرتب علم ہے۔ اور یہ مربوط تعلقات پیدا کرتی ہے اور مرتب شدہ نتائج سے آگاہ کرتی ہے۔

آرٹ اور سائنس کی تعریف کے بعد "کروچے" تاریخ کی تعریف یوں کرتا ہے

> "کہ تاریخ انفرادی واقعات کا نام ہے۔ اور ان واقعات کا بیان و وجوہات تاریخ میں فکر پیدا کرتی ہیں۔"

اگر محض اس بیان کی وجہ سے واقعات کی ترتیب اور مربوط سلسلہ کی وجہ سے تاریخ کو سائنس قرار دیا جائے تو یہ بنیادی غلطی ہو گی۔ کیونکہ بیان میں کسی واقعہ کا تجزیہ کرنے کے بعد اس کی تفصیلات دی جاتی ہیں۔ جبکہ سائنس میں کسی شے کے نتائج و بیان' مشاہدہ و تجربہ کے بعد پیش کئے جاتے ہیں۔ سائنس اور تاریخ میں طریقہ کار کی نوعیت بالکل مختلف اور جداگانہ ہے۔ **سائنسدان** جب کسی شے یا واقعہ کا تجزیہ و مشاہدہ کرتا ہے تو انہیں وہ عام قوانین کے ذریعے ثابت کرتا ہے۔ لیکن تاریخ میں واقعات و حوادث کو کسی قانون کے تحت پابند نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں [illegible] مشاہدہ نہیں [illegible] سکتا بلکہ [illegible] غور و فکر [illegible] لایا جاتا ہے اس لئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاریخ فرد کی وجدانی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے اور اسکی نمائندگی کرتی ہے۔ اس لحاظ سے اس میں اور آرٹ میں مماثلث پائی جاتی ہے۔ لیکن تاریخ ایک خاص قسم کا آرٹ ہے۔ دوسرے آرٹسٹ جو محسوس کرتے ہیں اسے بیان کرتے ہیں مورخ بھی یہی کرتا ہے۔ لیکن مورخ دوسرے آرٹسٹوں کے برعکس یہ یقین رکھتا ہے کہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ سچ اور حقیقت ہے۔ کروچے منطقی طرز پر استدلال کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا آرٹ مجموعی طور پر اسکی نمائندگی کرتا ہے جو چیز وقوع پزیر ہو چکی ہے؟ اس لئے جو چیز واقع ہو چکی ہے وہ ناممکن نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ عملی طور پر تشکیل پا چکی ہے۔ حقیقت اسی میں پوشیدہ ہے جو ممکن ہو۔ اور تاریخ اس حقیقت کو بیان کرتی ہے اس لئے تاریخ ایسا آرٹ ہے جو ممکن کو بیان کرتی ہے۔ لیکن آرٹ خالص وجدانی کیفیت کا بیان ہے۔ اس میں سوچ نہیں ہوتی جبکہ حقیقت کو ممکن سے جدا کرنے کے لئے سوچنا پڑتا ہے۔ اس صورت میں تاریخ کو "حقیقت کا وجدان" کہا جا سکتا ہے۔ جب ایسا کہا جائے گا تو تاریخ کی حدود آرٹ سے بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا کروچے کے نزدیک۔

> "تاریخ نہ تو کسی قانون کو دریافت کرتی ہے نہ وضع کرتی ہے اور نہ ہی یہ تصورات کو تخلیق کرتی ہے۔ یہ صرف بیان کرتی ہے۔"

چونکہ سائنس محض امکانات پیش کرتی ہے اس لئے بقول مورخین سائنس تاریخ سے افضل ہے۔ کروچے کا کہنا ہے کہ تاریخ سائنس سے پہلے وجود میں آئی اور سائنس کی بنیاد جن واقعات ، مشاہدات' مواد اور تجربات پر ہے وہ تاریخی مواد ہے۔ اس لئے جب تک تاریخ واقعات کا تعین نہیں کرتی اس وقت تک سائنس دان بھی کچھ نہیں کر سکتا۔

کالنگ وڈ اس کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ چونکہ سائنس کے معنی کسی علم کو مرتب صورت میں پیش کرنا ہوتا ہے اس لحاظ سے تاریخ کو سائنس کہنا درست ہے کیونکہ کوئی بھی علم جو سائنس کے زمرے میں آتا ہے اسے ایک خاص انداز اور طریقہ سے منظم کیا جاتا ہے جیسا کہ علم موسمیات جو ان مشاہدات و واقعات پر مبنی ہوتا ہے جنہیں سائنسدان وقوع پذیر ہوتے دیکھتا ہے۔ ان میں تغیر و تبدل اپنی مرضی سے نہیں کر سکتا۔ اسی طرح علم کیمیا ہے جو مشاہدہ کے علاوہ بھی واقعات خاص حالات کے تحت عمل میں لاتا ہے لیکن تاریخی واقعات ان میں سے کسی بھی طریقے پر ترتیب نہیں دئے جاتے۔ جنگ' انقلاب اور حوادث جو مورخ کا موضوع ہوتے ہیں وہ کسی تجربہ گاہ کی پیداوار نہیں ہوتے اور نہ ہی مورخ ان واقعات کا اس طرح مشاہدہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتا ہے کہ جس طرح سے سائنسدان تجربات اور مشاہدات سے فطرت کے مستقل قوانین دریافت کرتے ہیں۔ مورخ تاریخ میں کوئی مستقل قانون و اصول دریافت نہیں کرتا کیونکہ تاریخ ایک ایسی سائنس ہے جو ماضی کے واقعات کا مشاہدہ حال کی آنکھوں سے کرتی ہے یعنی یہ واقعات کا استخراجی مطالعہ کرتی ہے۔ اور ایسے طریقے سے بحث کرتی ہے کہ جو خود مشاہدہ تک پہنچ جاتا ہے۔ مورخ اس کو شہادت (Evidence) کہتا ہے[5]۔

کالنگ وڈ تاریخ کو تحقیق کی ایک قسم بتاتا ہے اور اسے سائنس کا درجہ دیتا ہے۔ کیونکہ نیچرل سائنس بھی ایک ایسا علم ہے جو ہمارے ذہن میں فطرت کے بارے میں پیدا ہونے والے سوالات کا جواب دیتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سائنس ان واقعات کو جو پہلے سے وقوع پذیر ہو چکے ہیں انہیں جمع کر کے ان پر غور نہیں کرتی بلکہ ان اشیاء کی ماہیت دریافت کرتی ہے جن کا ہمیں پہلے سے علم نہیں ہوتا۔ لہٰذا سائنس ناواقفیت سے شروع ہوتی ہے۔ اور اشیاء کی حقیقت کو دریافت کرتی ہے۔ اس طرح تاریخ سائنس کے دائرے میں آ جاتی ہے۔ کیونکہ تاریخ بھی ماضی میں وقوع پذیر انسانی سرگرمیوں اور حوادث کو تلاش کرتی ہے اور ان کا جواب دیتی ہے۔ لہٰذا فطرت کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ سائنس ہے اور انسانی ذہن کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ تاریخ ہے[7]۔

مسئلہ تاریخ کا خاکہ

Sketch of a Theory of History

تاریخی شعور اور عمل سائنس کے دباؤ سے آزاد ہے۔ یہ خود مختار سائنس ہے جس کا اپنا عمل، قانون، فکر اور نظام ہے۔ تاریخ ایسی سائنس ہے جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کو سمیٹ کر ترتیب دیتی ہے۔ اس لئے انسان کی ذہنی و فکری ترقی کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ تاریخ کے سائنسی نظریے کو پیش کرنے کا مقصد مورخ کے اسلوب میں سائنسی طرز فکر پیدا کرنا ہے تاکہ وہ خیالات و نظریات اور تجربات و مشاہدات کو ایسی پختہ بنیاد پر پیش کرے کہ جس میں غلطی کا احتمال کوئی نہ ہو یا کم از کم ہو۔

تینوں علوم کے وظائف کا تعین کرنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ تینوں کے حصول و نتائج کے اصول ایک جیسے ہیں۔ تینوں انسان کی فلاح و بہبود کے متعلق ہیں مگر جس طرح ہر سائنسدان اپنی تجربہ گاہ میں اپنی پسند کے مطابق نیچرل سائنس پر تحقیق کرتا ہے اور آرٹسٹ کسی خاکے میں اپنی پسند کے رنگ بھر کر تصویر مکمل کرتا ہے اسی طرح ہر مورخ صدیوں کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

واقعات کو اپنے انداز میں پیش کرتا ہے۔

تاریخ نیچرل سائنس ہرگز نہیں بلکہ یہ معاشرتی سائنس ہے جسکا نمایاں مقصد ماضی کے واقعات کی روشنی میں حال و مستقبل کی راہیں متعین کرنا ہے۔ انسانی فطرت متنوع سہی مگر بے مہار نہیں۔ اس کے اپنے اصول و نظریات اور تحقیق و تفتیش کی راہیں متعین ہیں۔ تاریخ میں دنیا کے ہر ملک، خطے، طبقے، نسل اور گروہ کا ذکر ہے۔ اور یہ قوموں کی سیاسی، مذہبی سماجی، علمی، ادبی، تحقیقی اور تہذیبی داستانوں سے لبریز ہے۔ یہ تاریخ کا مواد ہے اور اس کے آلات دستاویزات، اخبارات، رسائل، ڈائریاں، کتبے، رپورٹیں، اعلانات، روزنامچے، سوانح عمریاں، عمارات، سکے اور کھنڈرات وغیرہ ہیں۔ مورخ ان آلات و مواد کو پیش نظر رکھ کر کسی خاص زمانے کے لوگوں کے حالات و واقعات کے نتائج اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے لبادوں کی لمبائی کتنی تھی وہ کس طرح کے مکانوں میں رہتے تھے۔ وہ شہروں کو آباد کرتے اور کبھی انہیں ویرانوں میں بدل دیتے۔ کبھی ان کے بادشاہ کتابیں لکھواتے اور کبھی ان کے بادشاہ کتابوں کو جلا دیتے۔ جس طرح واقعات پیش آتے مورخ انہیں قلمبند کرتا ہے۔ اور حوادث و واقعات کے اسباب و نتائج سے آگاہ بھی کرتا ہے۔ لہٰذا تاریخ تحقیق و تفتیش کی میزان پر صحیح طور پر حاصل ہونے والے نتائج کی تنقیدی سائنس ہے۔ چونکہ تاریخی مواد جمع کرنے کا طریقہ سائنٹیفک ہے اس لئے اس کو مجموعہ حقائق کی سائنس بھی کہا جاتا ہے۔

تاریخی واقعات کی بنیاد ماخذوں پر ہے اور ماخذوں کی چھان بین یا سائنسی الفاظ میں تحلیل و ترکیب کے ذریعے تاریخی حالات مرتب کئے جاتے ہیں۔ تحقیقات اور عقلی دلائل سے ان کی صحت ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح جو تاریخی معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ عین سائنٹیفک اصولوں کے مطابق ہوتی ہیں اس اعتبار سے تاریخ کو سائنس کہا جا سکتا ہے۔ یعنی تاریخی معلومات حاصل کرنے کا طریقہ سائنٹیفک ہے۔ لیکن سائنس اور تاریخ میں بڑا فرق یہ ہے کہ علم کیمیاء اور علم طبعیات وغیرہ نیچرل سائنس ہے۔ ان کی معلومات مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہوتی ہیں۔ نیچرل سائنس کے تمام اصول تجربہ کی مدد سے حاصل ہوتے ہیں اور ان کو تجربہ کے ذریعے دکھایا جا سکتا ہے۔ سائنس کے ہر اصول کا ہر شخص تجربہ کر سکتا ہے مثلاً پانی مجموعہ ہے آکسیجن اور ہائیڈروجن گیسوں کا۔ ان کا باہمی تناسب ۲ حصہ ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن گیس ہے۔ دونوں کے ملانے سے پانی بنتا ہے اس کو تجربے سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ پانی ۲۱۲ درجہ فارن ہائیٹ پر ابلتا ہے۔ خشک فاسفورس ۱۰۴ درجہ فارن ہائیٹ پر جلنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سائنس کے تمام اصول تجربہ کے ذریعے ثابت کیے جا سکتے ہیں اور ان میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔^ برخلاف اس کے تاریخی واقعات کو دہرایا نہیں جا سکتا۔ نہ اب اصل واقعات کا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ ہم واقعات کربلا، ۱۶ جنوری ۱۹۹۱ میں امریکہ اور اس کے ۳۵ اتحادیوں کا عراق پر حملہ، عراقی تباہی، اسکندر اعظم کی فتوحات، چنگیز و ہلا کو خان کی ہلاکت خیزیاں و تباہ کاریاں، نپولین کی جنگیں، جنگ عظیم اول و دوئم، انقلاب فرانس اور ۱۹۱۷ء کا انقلاب روس کے واقعات و مشاہدات کو کسی تجربہ گاہ میں دہرا نہیں سکتے اور نہ ہی ماضی کے دیگر حوادث کو دہرایا جا سکتا ہے۔ صرف یہی ہے کہ انہیں تاریخی ماخذوں سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ اور سائنس میں مطالعاتی طریقہ و عمل ایک جیسا ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ نیچرل سائنس میں مرتبہ معلومات اور اعداد و شمار کو "فوراً" تجربہ گاہ میں بذریعہ تجربہ دہرا کر اپنے مطالعہ کی صحت و غلطی کو پرکھ لیا جاتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس معاملے میں علت و محلول (Cause and effect) میں کیا فرق یا تعلق ہے۔ مگر تاریخ میں ہم ماضی کے کسی حادثہ و واقعہ (Historical Drama) کو دنیا کی کسی بھی تجربہ گاہ میں دہرا نہیں سکتے۔ یہ حقیقتاً ممکن نہیں کیونکہ ماضی اپنے دفاع میں کچھ کہنے کے لئے موجود ہی نہیں۔ ہم گواہ نہیں بلا سکتے کہ انہیں سامنے کھڑا کر کے سوال کریں اور جرح کے ذریعے حقیقت حال تک پہنچ جائیں۔ ماضی قریب کے بعض معاملات پر بھی کوئی اخلاقی فیصلہ صادر کرنا ممکن نہیں مثلاً ہیروشیما اور ناگا ساکی پر ایٹم بم کا استعمال یا انگریزوں کے برصغیر پاک و ہند پر تسلط کی جنگوں کے واقعات وغیرہ کو تاریخی اعتبار سے دہرانا کس قدر ناممکن کام ہے۔ مثلاً جب کوئی مورخ ۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند کا ذکر کرے گا تو انگریزوں کے اعلان تقسیم اور ان ملکوں کے نئے حدود کا نقشہ تو بڑی آسانی سے پیش کر دے گا لیکن اس خونی انقلاب میں جو ہزاروں خاندان تہ تیغ ہوئے لاکھوں انسان بے گھر ہوئے اور باقی ماندہ کس حالت میں پہنچے اور ان کے دلوں پر کیا گزری؟ ان سب باتوں کا بیان مورخ کے بس سے باہر ہے کیونکہ مورخ کی خاطر ہندوستان کو دوبارہ تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

سائنس دان کو جب کوئی مشکل پیش آتی ہے تو وہ سائنس کی تجربہ گاہ میں جا کر تجربہ کر لیتا ہے اور اس کے شکوک دور ہو جاتے ہیں لیکن مورخ کو کوئی تجربہ گاہ میسر نہیں جہاں وہ ۱۹۴۷ء کے واقعات پیدا کر کے مظلوموں کے دل کا حال معلوم کر سکے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کر سکتا ہے ۱۹۴۷ء میں زندہ بچ کر آنے والے مظلوموں یا ان کے لواحقین سے بیانات و حقائق کو معلوم کر کے واقعات کی وجوہات میں اضافہ کرے۔ کوئی مورخ بھی ماضی کو اس طرح زندہ نہیں کر سکتا کہ مصیبت زدہ لوگوں کے احساسات بھی سامنے آجائیں۔ مورخ کی تجربہ گاہ ایک کمرہ یا کوئی مخصوص عمارت نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتی اس کی تجربہ گاہ وسیع و عریض کائنات اور اسمیں وقوع پذیر ہونے والے انسانی واقعات و سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ اس کی تحقیق کا مواد ٹھوس مادے کی صورت میں نہیں بلکہ انسانوں کے ماضی و حال کی مذہبی' سیاسی' معاشرتی' ادبی و تہذیبی نظریات و عقائد اور واقعات و کہانیاں ہوتی ہیں۔ مورخ قوانین فطرت کی تشریح و توجیہ پیش نہیں کرتا بلکہ وہ ملکوں' قوموں' سلطنتوں' اور تہذیبوں کے عروج و زوال' ترقی و انحطاط اور شکست و ریخت کی دلچسپ' حیرت انگیز اور عبرت ناک ادوار کی منظر کشی کرتا ہے۔ اسطرح نیچرل سائنس کا موضوع ٹھوس مادہ' بے جان اشیاء اور بے حس و حرکت دھاتیں' پتھر اور دیگر اشیاء ہوتی ہیں۔ جبکہ مورخ کے پیش نظر حساس' متجسس جذبات و ایثار کا پیکر اور عرفان و شعور کے حامل انسان ہوتے ہیں۔

سائنس اور تاریخ میں ایک اور فرق یہ ہے کہ سائنس دانوں نے تجربات کے ذریعے قوانین قدرت دریافت کئے ہیں۔ جو صحیح اور سچ ثابت ہوتے ہیں۔ ان کی صداقت و حقانیت تجربہ کے ذریعے ثابت کی جا سکتی ہے۔ ہر شخص تجربہ کر کے ان کی صحت کے متعلق یقین کر سکتا ہے لیکن تاریخ کے ذریعے انسانی کردار کے ایسے اٹل اور سچے اصول دریافت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک مکمل کامیابی نہیں ہو سکی۔ انسانی کردار کے ایسے جامع اصول جو ہر وقت اور ہر کام کے لئے سچ ثابت ہوں مکمل دریافت نہیں ہو سکے۔ نیچرل سائنس کے طلباء تجربات کے ذریعہ قوانین قدرت دریافت کرنے میں مصروف ہیں اور انہوں نے ایسے بہت سے قوانین دریافت کر لئے ہیں جو ہماری زندگی میں بڑے کار آمد ثابت ہو رہے ہیں لیکن تاریخ کے ذریعے ابھی تک انسانی کردار کے ایسے اصول دریافت نہیں ہو سکے[9]۔

وہ مضامین جو نیچرل سائنس کے دائرہ میں نہیں آتے سوشل سائنس کہلاتے ہیں۔ چونکہ تاریخ کا تعلق معاشرتی مسائل اور سرگرمیوں سے ہے اس لئے تاریخ کو سوشل سائنس کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اقتصادیات سیاسیات' نفسیات' عمرانیات' اخلاقیات' اور فلسفہ وغیرہ سوشل سائنس کے زمرے میں آتے ہیں۔

تاریخ سوشل سائنس ہونے کے علاوہ آرٹ بھی ہے۔ مورخ جو کچھ معلومات فراہم کرتا ہے اس کو الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ تاریخی معلومات کو خوبصورت اور دلکش لباس میں پیش کیا جائے یعنی ادبی نقطہ نظر سے عبارت عمدہ ہونی چاہیے۔ اگر عبارت دلکش اور دلفریب نہیں ہو گی تو تاریخی معلومات کی عمارت بالکل ایسی ہو گی جیسے ہڈیوں کا ڈھانچہ جو ایک حقیقت تو ضرور ہے مگر ایسی بدنما کہ جس کو دیکھ کر ڈر معلوم ہو اور جو آنکھوں کو قطعی نہ بھائے۔ اس لئے تاریخی حقائق کو عمدہ لباس میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ مورخ اپنی تحقیقات کو دلفریب اور موثر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلوب و انداز میں پیش کرتا ہے اسی نقطہء نظر سے تاریخ کو آرٹ یا ادب کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادبی خوبیوں پر واقعات کی صحت کو قربان کر دیا جائے۔ اردو ادب میں مولانا محمد حسین آزاد کی دربار اکبری اور مولانا شبلی نعمانی کی تاریخی تصانیف ادبی اعتبار سے قابل قدر ہیں۔

آرٹسٹ اپنی تخلیق کا انجنیئر ہوتا ہے۔ اپنی عمارت کے احوال سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے۔ اس کی برجیوں کے پیمانے بناتا ہے۔ اور اس کے میناروں کی پیمائش کرتا ہے۔ اس کے ہر گل بوٹے میں ناپ تول کر رنگ بھرتا ہے۔ اس کے ناظرین میں سے ہر بلبل ہزار داستان ہوتی ہے۔ بس یہی مراد اور غرض و مقصد فن تاریخ سے ہوتا ہے۔ اس فن کی بنا ڈالتے ہوئے مصنف کو دو چیزوں کا خاص طور پر خیال رکھنا ہو گا ایک تو یہ کہ قصہ گو کو حقیقت نگار ہونا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ اسے کوئی نہ کوئی نتیجہ یا اخلاقی سبق دینا چاہیئے۔ اس لئے اگر قصہ حقیقت پر مبنی نہ ہو گا تو جھوٹا ہو گا اور اس کی تصنیف کے لیے مصنف جھوٹ بولنے کا عادی ہو جائے گا۔ یہاں پر میں یہ کہوں گا کہ قصہ بنا کر پیش کرنا بہت ہی بڑا جرم ہے۔ یہ اس طرح کی دروغ بافی ہے جو دل میں ایک بہت بڑا سوراخ کر دیتی ہے۔ جس کے ذرریعے جھوٹ آہستہ آہستہ داخل ہو کر ایک عادت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مصنف کو چاہیئے کہ یہ اس کا یقین و عقیدہ ہو کہ وہ اپنی تمام تصنیفات میں یہ عہد کر لے کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے وہ اسکی تخلیق نہیں ہے بلکہ سچے واقعات کا سائنٹیفک بیان ہے اور اس کی تحریر کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ وہ ماضی کے واقعات کی قندیل روشن کر کے حال کی تاریکیوں کے پردے چاک کر کے مستقبل کی راہوں کو روشن کر رہا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ واقعات کا مواد اور ان کے کرداروں کی سیرتیں ہماری سیرتوں سے مشابہ ہوں کہ ہم ان میں اپنے روزانہ کے ملنے والوں کو تلاش کر سکیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیسرا باب

حوالہ جات

۱- Hugh Taylor, History As A Science, (Methuen & Co, London, 1933), P.6.

۲- A. L. Rowse, Science and History, (W.W. Norton & Co,. 1928), P.87.

۳- James C. Malin, On the Nature of History, (University of Kansas, Lawrence, 1954), P. 28; V. Gordon Childe, Henry Schuman, What Is History, New York, 1953), P. 60.

۴- آگوسٹ کونٹ فرانس کا مشہور فلسفی ہے (۱۷۹۳-۱۸۵۷ء)

۵- Rowse, Science and History, pp, 30-2, 42-3.

۶- Collingwood, The Idea of History, (Oxford University Press, London, 1966), pp. 82-5.

۷- Ibid.

۸- Peter Hardy, The Problems of Causation For the Historian, Journal of the Panjab University Historical Society, Vol. XII, June 1961, p. I.

۹- Taylor, History As a science, pp. 10-11.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چوتھا باب

نظریہء تاریخ
عہد قدیم سے سائنسی دور تک

CONCEPT OF HISTORY
FROM ANCIENT TIME TO SCIENTIFIC TIME

تصور نظریہ

ماضی کے متعلق معلومات بہم پہنچانا کافی نہیں بلکہ تاریخ کا اصل مقصد تاریخی شعور پیدا کرنا ہے۔ مورخ کا فرض ہے کہ وہ اپنے قاری کے ذہن میں تاریخی شعور پیدا کرے۔ لیکن تاریخی شعور یا تاریخی ذہنیت کا مطلب کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان محرکات کا مطالعہ کریں جنکی بنا پر انسان کو تاریخ کے مطالعہ کی خواہش ہوئی۔ انسان کو ہمیشہ ماضی سے دلچسپی رہی ہے انسان کچھ ایسا محسوس کرتا ہے کہ ماضی کا اس کی زندگی پر نہ صرف اثر بلکہ بڑا دخل ہے۔ لیکن اس اثر اور دخل کو سمجھنے کے لئے محض معلومات کافی نہیں بلکہ تاریخ کے متعلق نظریات ہونے چاہئیں۔ یہ نظریات انسان کی تخلیق سے لے کر آج تک انسانی معاشرے میں نہایت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ پیشتر اس کے کہ ہم مختلف نظریات کا مطالعہ کریں' اس امر کا جائزہ لیں کہ نظریہ سے کیا مراد ہے؟

نظریہ سے لغوی طور پر مراد ایسے مسائل ہیں جن کے حل کے لئے کسی اصول' قاعدے یا فکر و نظر سے کام لیا جائے۔ یا ایسی تعلیمات جو کسی خاص فکر' فارمولے یا تھیوری کو پیش کریں مثلاً ڈارون کا نظریہ ارتقاء ' آئن شائن کا نظریہ اضافیت' روسو کا نظریہ معاہدہ عمرانی اور کارل مارکس کا نظریہ سوشلزم تاریخ میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ عمومی طور پر نظریہ سے مراد وہ فلسفہ ہے جو کسی مخصوص حادثہ یا واقعہ کی سائنسی توضیح پیش کرے۔ جس کا مقصد انسانوں میں تاریخی شعور پیدا کرنا ہوتا ہے۔ نظریات انسانی واقعات و حوادث کو عرفان و شعور کی عملی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ نظریہ کو تصور و تخیل کی اصطلاح میں نہ لینا چاہئے کیونکہ تصور و تخیل دماغ کی وہ قوت کیفیت ہے جو فرضی و خیالی صورتیں بنا کر وہم کے سامنے کھڑی کر دیتا ہے۔ جب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کسی واقعہ و حادثہ کا تخیل و تصور پختہ سوچ اختیار کر لیتا ہے اور شعور و آگہی کی ارتقائی منزلیں طے کر کے قیاس اور شک و شبہ سے بالا تر ہو کر عملی صورت اختیار کر لیتا ہے تو نظریہ کی عمارت میں داخل ہو جاتا ہے۔ گویا تصور نظریئے کی اکائی ہے جو اس کی نشوونما میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ جبکہ نظریات واقعات کی فطرت کی عمارت پر قائم ہوتے ہیں اور فطرت کے اصولوں کے مطابق ڈھالے جاتے ہیں۔

نظریات کی اقسام

نظریات کی تین اقسام ہیں۔ (۱) رومانی (۲) عملی اور (۳) فکری

۱۔ رومانی

ان میں رزمیہ نظمیں، قدیم یادگاریں اور مشاہیر کی سوانح عمریاں شامل ہیں۔ مفکرین کا خیال ہے کہ ان کے ذریعہ اعلیٰ کردار کی تعمیر کی جا سکتی ہے۔ یہ مشاہیر کے بہادری کے کارنامے، اخلاق اور کردار کو بلند کرتے ہیں۔ کارلائل کا کہنا ہے کہ ''مشاہیر کی صحبت منفعت بخش ہوتی ہے[۱]۔'' جب کسی بڑے آدمی کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ رزمیہ نظموں اور کہانیوں کے منفعت بخش اثرات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ بعض مفکر مشاہیر کو اتنی اہمیت نہیں دیتے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص عیوب سے مبرا نہیں ہے۔ برٹرنڈ رسل نظریہ تاریخ کو سمجھنے کے لئے مشہور شخصیتوں کے حالات کے مطالعہ پر زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

> ''بعض لوگ انفرادی ذہانت اور ذکاوت کے قائل نہیں ہیں۔ اور عظیم کارناموں کو کسی شخصیت سے منسوب نہیں کرتے بلکہ ان کو ایسے واقعات کا نتیجہ بتاتے ہیں جن کا تعلق فرد کی شخصیت سے نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں وہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر سترھویں صدی کی سو بڑی بڑی شخصیتیں بچپن ہی میں فوت ہو جاتیں تو آج دنیا کا یہ نقشہ نہ ہوتا۔ ان بڑی شخصیتوں میں سے ایک اہم شخصیت گیلیو ہے[۲]۔''

مورخ کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ ان بڑی بڑی ہستیوں کو نمایاں طور پر پیش کرے جنھوں نے نظریات اور بڑی بڑی تحریکوں کو جنم دیا اور ان کے ساتھ ساتھ ان کی دیگر وجوہات کو بھی نظر انداز نہ کرے کہ جنھوں نے تاریخی شعور بخشا۔ اگر مورخ تاریخ کو نظریات کے اسلوب میں پیش کرے گا تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان بڑی بڑی شخصیتوں نے حیرت انگیز کارنامے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرانجام دے۔ اس لئے ان مشہور ہستیوں کو زندہ رکھا جائے' ان کے نظریات کو فروغ دیا جائے اور ان کو تاریخ سے خارج نہ کیا جائے۔ لیکن تاریخ کو اس نظریہ کے ساتھ پیش کرتے وقت مشاہیر کے حالات زندگی سے تعمیر اخلاق کا کام حد سے زیادہ لینے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ اس میں غلط بیانی کا احتمال ہے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ اخلاق و کردار کا صرف تاریخ ہی ذریعہ نہیں ہے۔ بلکہ ہر زمانے کی ممتاز شخصیتیں اپنے نظریات پیش کرتی آئی ہیں اور وہ تاریخ و ادب پر اپنے جدا جدا نقش چھوڑتے رہے ہیں۔ لہٰذا ادب بھی تاریخ و مذہب کے علاوہ اخلاقی تعلیم کا ذریعہ ہے۔ بلکہ افسانے' ڈرامے اور قصے کہانیاں بھی اخلاقی تعلیم کا ذریعہ ہو سکتی ہیں۔ بالاخر ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اخلاقی اقدار اور فطرت انسانی کو سمجھنے کے لیے رومانوی نظریات سے بڑی مدد مل سکتی ہے اور یہ تاریخ کا قیمتی اثاثہ ہیں۔

۲۔ عملی

نظریات کا مطالعہ انسان کو دانشمند بنا دیتا ہے۔ ان کے مطالعہ سے انسان میں ایسا شعور پیدا ہوتا ہے جو عملی زندگی میں بہت کارآمد ہوتا ہے۔ اس سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور انسان سلیم الطبع ہو جاتا ہے۔ وہ مستقبل کے لئے حوادث و واقعات اور تحریکوں کی علامات کی صحیح **تشخیص** کرنے لگتا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ تاریخ قوت فیصلہ کو جلا بخشتی ہے۔ لیکن یہاں تین امور غور طلب ہیں

(۱) کیا تاریخ کے عام قاری سے ہم توقع کر سکتے ہیں کہ وہ نظریات کے فلسفہ کو سمجھ سکتا ہے؟

(۲) کیا نظریات کے مطالعہ سے ان میں ایسی صلاحیتیں ترقی پا سکتی ہیں کہ وہ متضاد حالتوں کے حوادث تحریکوں کی علامات کا صحیح جائزہ لے سکتے ہیں؟

(۳) جہاں تک نظریات سے عملی دانشمندی حاصل کرنے کا تعلق ہے تو وہ نظریات کے مطالعہ کے علاوہ دیگر ذرائع و علوم مثلاً نفسیات' سیاسیات' عمرانیات اور مذہب و فلسفہ کے مطالعہ سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ میں نظریات کا مطالعہ عملی دانشمندی میں اضافہ کرتا ہے اور انسانی جذبات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ لیکن یہ معمر اور پختہ شعور افراد کے لئے زیادہ مناسب اور بہتر ہے۔

۳۔ فکری

تاریخ کے اس نظریئے کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے تاریخ کے عملی نظریے کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سمجھا جائے۔ تاریخ کے تمام واقعات ایک مسلسل لڑی ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل ایک ہی زنجیر کی یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ کڑیاں ہیں۔ تاریخی واقعات اتفاقی حوادث نہیں ہیں۔ تاریخی واقعات کو اگر ارتقائی عمل سے تعبیر کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ تاریخ کے نظریہ ارتقاء کو سمجھنے کے بعد ہم ماضی و حال کے حوادث کے عمل کا خود بخود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں نظریہ ارتقاء نے انسان کے تمام افکار و نظریات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ تاریخ کے تمام حوادث و واقعات میں قانون ارتقاء مسلسل کار فرما ہے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا ہو گا کہ حال ماضی سے کس طرح ارتقاء پذیر ہوا۔ جب معاشرہ ارتقاء کا نتیجہ ہے تو پھر اس ارتقاء کا کچھ مقصد بھی ہو گا۔ ہمیں تاریخ کا یہ مقصد و نظریہ معلوم کرنا ہے۔ ہمیں تاریخ کا یہ مقصد و نظریہ تب ہی سمجھ میں آ سکتا ہے جب ہم ارتقائی عمل کا بغور مطالعہ کریں گے۔ ہیگل تاریخ کے اس عمل ارتقاء کو اضدادی عمل کا نام دیتا ہے۔

تاریخ کے اس نظریہ کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ معاشرے کے ارتقاء کی داستان ہے۔ تاریخی شعور سے ہماری مراد یہ ہے کہ جب ہم تاریخ کے کسی پہلو کا مطالعہ کریں تو واقعات و حوادث کے ارتقائی پہلو پر غور کریں اور ان کو سمجھنے کی کوشش کریں اور پھر ان کی مدد سے ارتقاء کا منشا اور قانون دریافت کرنے کی کوشش کریں۔ جب ہم معاشرے کے کسی شعبہ، ادارہ یا واقعہ کا مطالعہ نظریہ ارتقاء کے مطابق کریں گے تو ہمیں اس شعبہ، ادارہ یا واقعہ کا مقصد و غائیت سمجھ میں آ سکتے ہیں۔

نظریئے کا عمومی جائزہ

تاریخ کا مطالعہ دراصل نظریات کا مطالعہ ہے۔ نظریات کبھی بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہر نظریہ اپنے عہد اور تمدن کی تصویر ہوتا ہے اور اپنی علیحدہ حیثیت، اہمیت اور مقصدیت رکھتا ہے۔ ہر نظریہ ایجاد کی مانند ہوتا ہے جو معاشرے کی اقدار میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ تاریخ کے مذہبی نظریہ کے مطابق "تاریخ خیر و شر اور نیکی و بدی کے تصادم کی کہانی ہے۔" تاریخ کی سائنسی نظریے کے مطابق "تاریخ انسان و فطرت کے درمیان ایک جنگ ہے۔" ہیگل کے نظریہ کے مطابق "تاریخ اضدادی عمل کا پرتو ہے"۔ مارکس کے مادی نظریہ کے مطابق "تاریخ طبقاتی تصادم کی کشمکش کا نام ہے"[3]۔ غرضیکہ تاریخ اسی نوع کے لاتعداد نظریات سے بھری پڑی ہے۔

نظریات کی ~~تاریخ~~ میں یہ سوال نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ جب کوئی نظریہ مخصوص

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حالات و واقعات کے تحت کسی معاشرے میں جنم لیتا ہے' پروان چڑھتا ہے اور تمام ارتقائی مراحل طے کر کے فلاحی اور مثالی معاشرے یا ادارے کو تشکیل دیتا ہے' اپنی نظریاتی روایات' اقدار و اثرات پیدا کرتا ہے تو کیا جب وہ معاشرہ یا اوارہ یا نظریہ کسی وجہ سے اپنی قوت و افادیت کھو دیتا ہے تو پھر مستقبل میں وہ نئے حالات میں پرانی یا نئی توضیحات کے ساتھ پہلے یا اس سے زیادہ و کم قوت و شدت کے ساتھ از سرنو زندہ ہو کر معاشرے میں نئی تبدیلیاں لا سکتے ہیں؟ یا پرانی اقدار کو نئی حیات عطا کر سکتے ہیں؟

ہر نظریئے کے پیرو کاروں کی ہمیشہ سے ہی یہی کوشش رہی ہے کہ وہ اپنے یا دوسرے فرسودہ' مضمحل اور زوال پذیر معاشرے میں تبدیلی و ترقی اپنے نظریئے کی اقدار و اصول کی روشنی میں لا سکیں یعنی اپنے نظریئے کا احیاء اور اس کی تعلیمات کا از سرنو نفاذ چاہتے ہیں۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ آج تک جس نظریہ نے بھی اپنی افادیت کھو دی دوبارہ نہ تو اس کا احیاء ہوا ہے اور نہ ہی نفاذ ہوا ہے۔ اور ان کے احیاء کی کوئی بھی تحریک خواہ اس کا تعلق کسی ہی نظریہ سے کیوں نہ ہو' کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔

نظریہ یا تحریک کسی معاشرے میں مخصوص حالات کے تحت عمل میں آتے ہیں۔ جب کسی معاشرے' ادارے یا نظام میں برائیاں اس حد تک پہنچ جائیں کہ ان میں اصلاح کی گنجائش باقی نہ رہے تو اصول فطرت کا رد عمل ہوتا ہے اور کوئی نظریہ اور تحریک جنم لیتی ہے جو اس معاشرے' ادارے یا نظام میں رواج پذیر برائیوں' روایات اور غلط اقدار کا خاتمہ کر کے وہاں نئی اقدار' افکار' اصول اور نظریئے کو نافذ و جاری کر کے اس مضمحل معاشرے' نظام یا ادارے میں نئی روح پھونکتے ہیں۔ ہر نظریہ اپنے اندر انقلابی روح رکھتا ہے لہذا اپنے ابتدائی ادوار میں انقلابی کہلاتا ہے اور انقلابی تبدیلیاں لاتا ہے کیوں کہ جب تک مکمل طور پر معاشی و معاشرتی نظام کی عمارت کو مسمار نہیں کیا جاتا اس وقت تک نیا نظام' نیا معاشرہ اور نیا نظریہ صحیح حالت میں کام نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہر نیا نظریہ پرانے نظریئے کی موت کا باعث بنتا ہے۔ نیا نظریہ پرانے نظریہ کے ساتھ کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کرتا بلکہ بھرپور طاقت کے ساتھ اپنے اصول و تعلیم کا نفاذ چاہتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے پیرو کاروں میں ایسی روح تخلیق کرتا ہے جو اس کے نفاذ کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہوتے ہیں

جب کسی نظریئے یا تحریک کی تخلیق و نشوونما ہوتی ہے اور وہ اپنے ارتقائی مراحل طے کر کے پوری قوت کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے تو اس کے پیرو کار اس کی ہر اکائی کی افادیت پر پورا ایمان رکھتے ہیں۔ اس کی تمام خوبیوں سے بے حد متاثر ہوتے ہیں اور من و عن اس کا نفاذ نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صرف اپنے معاشرے بلکہ پوری دنیا و کائنات پر چاہتے ہیں۔ یہ نظریئے کی آفاقیت کو ظاہر کرتا ہے جو اس کی توسیع پسندی اور استعماریت کے خیالات کو جنم دیتا ہے۔ جیسے اسلام کا آفاقی انقلاب کا نظریہ' یہود و نصاریٰ کے آفاقی مذاہب کے نظریات سوشلزم اور سرمایہ داری کے عالمی پھیلاؤ کے نظریات اپنی اپنی افادیت کے لئے مشہور ہیں۔ عموماً" نظریہ کا آفاقی تصور ہی اس کی وسعت پسندی کی بنا پر زوال کا سبب بنا ہے کیوں کہ جب تک کوئی نظریہ و تحریک ایک محدود وحدت' مخصوص معاشرہ اور جغرافیائی حدود میں رہتا ہے اس وقت تک یہ اپنی اقدار و روایات اور اصول و روح پوری قوت کے ساتھ بیدار و زندہ رکھتا ہے۔ اپنی ہیت کو برقرار رکھتا ہے۔ جونہی اس میں توسیع پسندی کے اثرات رونما ہوتے ہیں' نئے ملک فتح ہوتے ہیں' نئے معاشروں کی اقدار و روایات کے تصادم و انضمام سے اس نظریئے یا تحریک کی ہیت' شکل و صورت اور ڈھانچہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب یہ نظریہ اپنی انقلابی روح کھو دیتا ہے۔ انقلابی نہیں رہتا بلکہ سمجھوتہ پر عمل پیرا ہو کر مفتوحہ اقوام کی تہذیب و تمدن کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ یا اس میں خود جذب ہو جاتا ہے۔ اس کی توسیع سے اس میں وہ شدت و قوت برقرار نہیں رہتی کہ وہ نئی جگہوں پر یا ہر جگہ سے پرانی اقدار و روایات کو ختم کر کے اس میں نئی روح بھر دے۔ لہٰذا وہ دوسری روایات کو خود میں جذب کر لیتا ہے یا اسمیں جذب ہو کر اسے اپنا حصہ بنا لیتا ہے یا اس کا حصہ بن جاتا ہے اور اپنی اصلیت کو گم کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس نظریہ یا تحریک میں خارجی اثرات یعنی جغرافیائی' علاقائی' تہذیبی اور لسانی عناصر شامل ہو جاتے ہیں او نظریہ یا تحریک میں ہم آہنگی و وحدت برقرار نہیں رہتی اور یہ مختلف عناصر میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اس کی خالص روایات باقی نہیں رہتیں اور یہی عناصر اسے بتدریج کمزور یا ختم کر دیتے ہیں۔

اس زوال پذیر معاشرے میں مصلحین' مبلغین' اور مفکرین ایک نظریہ و تحریک کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور ابھرتے ہیں تاکہ بڑی اقدار و روایات کو ختم کر کے معاشرے کو نئی اقدار کے مطابق استوار کر سکیں اور پھر وہ اپنی تحریک یا نظریہ کی بے پناہ قوت کے ساتھ قوم کو تاریخی شعور کی روشنی میں پستی سے نکال کر ترقی کی راہ پر گامزن کر دیتے ہیں۔ یہی وہ طبقہ ہے جو تاریخی ارتقاء کی روشنی میں نظریہ کا احیاء چاہتا ہے اور کرتا ہے۔ نظریہ و تحریک کو خارجی اثرات سے پاک و صاف کر دیا جائے تو اس میں زندگی کی قوت و طاقت واپس آ سکتی ہے۔

کسی تحریک یا نظریہ کی کمزوری' زوال اور خاتمہ کے کئی اسباب ہیں۔

۱۔ نظریہ کی اقدار طبعی طور پر از خود ختم ہو جائیں اور رفتار حوادث زمانہ کا ساتھ نہ دے سکیں اور ان کا احیاء ممکن نہ ہو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲_ یا اسقدر بنیاد پرستی اور اصول پرستی پر توجہ دیں کہ عوام میں مقبولیت کھو دے اور لوگوں کو اس سے جذباتی لگاؤ نہ رہے۔ جب نظریہ و تحریک کی روح ختم ہو جائے تو پھر مردہ جسم میں حیات از سر نو پیدا نہیں کی جا سکتی۔

۳_ زماں و مکاں سے اسقدر بعد ہو جاتا ہے کہ خالص روایات و اقدر کی توضیح و تشریح میں اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں جو اکثریت کو متاثر نہیں کر سکتے اور صرف معمولی اقلیت ہمنوا ہوتی ہے جو معاشرے کو متحد کرنے کی بجائے مختلف حصوں اور فرقوں میں منقسم کر دیتی ہے۔ اور یہ قوتیں معاشرے کو کمزور اور روبہ زوال کر دیتی ہیں۔

۴_ بعض اوقات سیاسی، سماجی اور مذہبی قوتیں اتنی شدت سے مخالفت کرتی ہیں کہ نظریہ و تحریک اپنی بقا و سالمیت کی جنگ ہار جاتا ہے یا گروہ بندی کا شکار ہو جاتا ہے۔

۵_ جب نیا نظریہ و تحریک تقاضوں کے مطابق نہ ڈھل سکیں تو نئے افکار و خیالات، مسائل و ضروریات اور تقاضوں کا پرانی اقدار و روایات میں حل و ہم آہنگی نہیں رہتی۔

۶_ زمانے میں ہر لحظ اور ہر لحہ ہر شئے میں تغیر جاری ہے۔ اور یہی تغیر و تبدل نئے حالات کے مطابق نئے خیالات و افکار اور نئی تحریکات و نظریات کو جنم دیتی ہیں۔ یہی تاریخی ارتقاء اور تاریخی شعور کا نظریہ ہے۔

اس بحث کے جو نتائج سامنے آئے ہیں کہ افکار و نظریات اور تحریکیں اچانک رونما نہیں ہوا کرتے بلکہ یہ حالات کے دباؤ کی پیداوار ہوتے ہیں۔ مصلحین، مفکرین اور عظیم شخصیتوں کا وجود بھی مخصوص حالات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مخصوص حالات و ماحول کی بنا پر ان کی تعلیمات و نظریات پروان چڑھتے ہیں۔ حالات زمانہ شخصیتوں کو جنم دیتا ہے۔ بعد میں یہ جو حالات کی راہنمائی کرتی ہیں۔ شخصیتیں وہی کچھ کرتی ہیں جس کا تقاضہ حالات کرتے ہیں۔ وہ تاریخی عمل کا ایک حصہ ہوتی ہیں اور جب تاریخی عمل ارتقائی مدارج طے کرتا ہے تو حالات و ماحول میں تغیر رونما ہوتا ہے، افکار و نظریات نئے قالب میں ڈھلتے ہیں اور وقت کی تبدیلی کے ساتھ معاشرتی قدریں، تہذیبی روایات، معاشی ضروریات اور سیاسی نظام بدل جاتے ہیں۔ اور یوں تاریخ کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔

یونانیوں کا نظریہ تاریخ

تاریخ کی ابتدا کس طرح ہوئی؟ اس کو کس طرح سے علم کا درجہ دیا گیا؟ انسانی ذہن نے کس طرح تاریخ کا شعور و احساس حاصل کیا؟ مورخین نے تاریخ کو کیا حیثیت دی؟ اور تاریخ نویسی کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لئے کیا اصول و نظریات وضع کیے؟ آیئے ان چند سوالات کا جواب تاریخی شعور اور یونانیوں کے نظریہ تاریخ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔

جان سٹورٹ مل کہتا ہے کہ تقریباً ہر شے جس پر آج کل کا انسان ناز کرتا ہے اس کی ابتدا یونان سے ہوئی ہے۔ اہل یورپ کا کہنا ہے کہ فن تاریخ نویسی سب سے پہلے یونان میں شروع ہوئی۔ چنانچہ یونانی علم تاریخ کے جد امجد مانے جاتے ہیں۔ اور اہل یورپ یونانیوں کو اپنا علمی باپ سمجھتے ہیں۔ یونانیوں سے پہلے تاریخ کی سب سے پرانی کتابیں مصریوں، بابلیوں، اشوریوں، اور عبرانیوں کی ہیں۔ تاریخ کی ان کتابوں کا انداز ناصحانہ ہے۔ یونانیوں کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے دوسروں سے علم حاصل کر کے اسمیں تحقیق و تفتیش کی، اسے آگے بڑھایا اور اس میں کمال حاصل کیا۔ تاریخ کے میدان میں یونانی مورخوں کا انداز مشرق کے ان وقائع نگاروں سے بالکل جداگانہ تھا۔ اس عہد کے چین، مشرق بعید اور ہندوستانی اقوام کی تاریخ نگاری کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ ہندوستان میں تو یقیناً سیاسی تاریخ نگاری کا آغاز اسکندر اعظم کے حملہ ہندوستان کے بعد ہوا مگر یہودیوں کی تاریخ نگاری کا دور اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ اہل یونان کی تاریخ نگاری کا ہے۔ یونانیوں کا علم تاریخ اور واقعات کے ریکارڈ کو محفوظ رکھنے کا طریقہ کتابی عہد (آغاز تحریر) سے بہت پہلے کا ہے۔ لیکن عہد جدید میں فن تاریخ نگاری کا سہرا یونانیوں کے سر ہے کہ انہوں نے تاریخ کے مواد کو جمع کیا اس میں تحقیق کی روح پھونکی، اسے آگے بڑھایا، ترقی دی اور انسان کو تاریخی دور میں داخل کیا۔

یونان کا عہد اول کا ادب (۲۵۰۰ ق م) سے ہومر کے دور تک (۸۵۰ ق م) وسیع طور پر فطری دور (Myth) کے دلچسپ دیومالائی قصے کہانیوں، افسانوں، دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش، رسومات اور عقائد پر مشتمل ہے۔ یونانی دیوتاؤں، دیویوں، اور مافوق الفطرت ہستیوں کے کارناموں کا ذکر تاریخ ادبیات میں نہایت مبالغہ آمیزی سے ملتا ہے۔ ادب کے ان شاہکاروں میں کچھ مواد انسانی سرگرمیوں کے بارے میں بھی ملتا ہے مگر انسان ان سرگرمیوں میں کوئی ایسا مرکزی کردار ادا نہیں کرتا کہ جس کے ارد گرد کہانی گھومے بلکہ وہ محض ایک ایجنٹ کے طور پر ان دیویوں، دیوتاؤں اور مافوق الفطرت ہستیوں کے لئے کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔

ہومر (Homer ca. ۸۵۰ ق م)

نویں صدی قبل از مسیح میں ہومر دنیا کا سب سے بڑا رزم گو شاعر اور "معلم یونان" تھا۔ افلاطون کا کہنا ہے لوگ اس کو اس لقب سے یاد کرتے تھے اور ہم سمجھتے ہیں ان کا یہ کہنا بالکل ٹھیک تھا۔ یہ امر کہ "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" یونانی ادبیات کی اولین یادگاریں ہیں۔ اس کے باوجود کہ یہ کتابیں ہر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرح سے کامل و مکمل ہیں ہمیشہ حیرت و استعجاب کا باعث رہیں۔ ان دونوں کتابوں کا اسلوب سادہ و وسیع ہے ایلیئڈ کی نوعیت اور اس کا لب و لہجہ ایک تاریخی نظم کا ہے۔ وہ زیادہ مربوط و منظم اور فی الواقعہ ایک رزم کی داستان ہے۔ اس کے مقابلے میں اوڈیسی "سحرو ساحری اور عشقیہ حکایات" سے پر' معاشرتی زندگی کی زیادہ بہتر ترجمان اور اخلاق و توہمات کی آئینہ دار ہے۔ اس لئے یہ تہذیب و شائستگی کی ایک برتر منزل اور شہری زندگی کے آغاز کی تصویر ہے۔ ان دونوں کتابوں کا اسلوب ایک ہے۔ ان میں "قدیم یونانی تمدن" کا رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ گویا جس کی تصویر دور سے اور بالواسطہ کھینچی گئی ہو۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ آہنی ہتھیاروں کا زمانہ تھا۔ ان منظومات سے یونانی تہذیب و شائستگی کے اس دور کا پتہ چلتا ہے جس کو زمانہ قبل تاریخ کے اواخر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہومرکی رزمیات کو دراصل تاریخ کی ابتدائی شکل تصور کرنا چاہئے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہیروڈوٹس اور تھیوسی ڈائنڈز جیسے کلاسیکی مورخین نے ہومر کا ذکر ایک تاریخ نگار ہی کی حیثیت سے کیا ہے۔ یوں بھی جوں جوں ہماری عصر حاضر کی تحقیقات کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے ان کی بدولت قدیم ٹرائے' ہومر اور ہومری مقامات کے بارے میں ہمارے علم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس اعتبار سے ایلیئڈ اور اوڈیسی کی قدرو قیمت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ ان سے قدیم یونانی باشندوں کے بارے میں نہایت قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اور تاریخی دستاویزات کی حیثیت سے دیکھا جائے تو جب سے ازمنہ ماضیہ کی بعض رزمیات کا مطالعہ کیا گیا ہے ایلیئڈ اور اوڈیسی کی وقعت کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے[8]۔ ہومر کی شاعری سے گویا کہ ہمیں تاریخ کا لمس ملتا ہے۔ اس عہد کے تمدن' رسم و رواج' عقائد' فن طب' جراحت جڑی بوٹیوں' (ادویات) کا علم' مختلف امراض' دھاتوں اور دستکاریوں کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ یہ کوئی تحقیقی کام نہیں بلکہ خیالی فرضی رزمیہ داستان گوئی ہے مگر پہلی گراں قدر تاریخی دستاویز ہے۔ یوں عہد اول کی تاریخ ادب سے بھی لبریز تھی۔ دلچسپ قصے کہانیاں اس کی زینت بنے۔ اس قسم کی اولین تاریخ نگاری میں تحقیق کو کوئی عمل دخل نہ تھا۔

زینو فینیس (Xenophanes)

انسانی سرگرمیوں کو تاریخی عمل میں ڈھالنے کا کام چھٹی صدی قبل مسیح میں زینو فینیس نے کیا۔ وہ آئی اونین[9] (Ionian) باشندہ تھا اور اس نے مقامی و علاقائی واقعات' روزنامچے' نسب نامے نہایت تحقیق و تنقید سے تحریر کئے۔ یہ مواد جزوی ماخذ' جزوی تاریخ اور جزوی داستانیں تھا اور اسمیں غلطیوں کا بہت امکان تھا۔ زینو فینیس کی تصانیف اسقدر مستند تھیں کہ وہ پانچویں اور چوتھی صدی قبل از مسیح میں مورخین و مصنفین اور ادبی شخصیات کی توجہ کا اہم مرکز رہیں۔ بیسویں صدی کے مورخین کے نزدیک چھٹی صدی قبل مسیح کا یونانی ادب تقریباً تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دور کو فلسفہ حیات کا عہد اولین بھی گردانا جاتا ہے۔ اس دور میں دانشوروں کو نہایت اہمیت حاصل ہوئی اور انہیں ہیرو قرار دیا جانے لگا۔ لہٰذا ہومر اور حسیڈ[۱] (Hesiod) کو بطور دانشور ہیرو جانا جانے لگا۔ حسیڈ کا فلسفہ یہ تھا کہ "کائنات قدرتی ہے اور اس کو عقلی اصولوں سے سمجھا جا سکتا ہے"۔ اس نے یونانی قصے کہانیوں اور داستانوں کو فضول قرار دیا اور انہیں معقولیت اور شواہد کی روشنی میں سمجھنے کا فلسفہ و نظریہ پیش کیا۔ حسیڈ شاعری کا بابا آدم ہے جس نے انساب الاضام (Theogony)' ایام سعد و نحس کی تقویم اور پانچ ادوار عالم کا تصو پیش کیا۔[۱]

کیڈموس (Cadmos)

کیڈ موس چھٹی صدی قبل مسیح کے وسط کا مورخ ہے۔ قدیم ترین مورخ جس کے متعلق ہمیں یقینی طور پر کچھ معلومات حاصل ہیں۔ کہا جاتا ہے کیڈ موس نے شہر ملے طوس کی بنا اور سارے آئیونیا کی ایک تاریخ بھی لکھی جو چار فصلوں میں تھی۔ اسے تعجب تھا کہ دریائے نیل کے ہنگامی سیلابوں کی علت کیا ہو سکتی ہے؟

ہیکٹس (Hecateus)

ہیکٹس وہ پہلا یونانی مورخ ہے جس نے چوتھی صدی قبل از مسیح تاریخ یونان کے واقعات کو دیویوں' دیوتاؤں' مافوق الفطرت ہستیوں' مبالغہ آرائی اور آرائش سخن کے توہمات سے الگ ہو کر ان کی ماہیت کے مطابق تحریر کیا اور واقعات و اشیاء کی تاویل معقولیت کے ساتھ پیش کی۔ وہ پہلا مورخ ہے جس نے تاریخ کی تاویل عقل کے مطابق کی۔ اس نے پہلی مرتبہ یونانی اقوام کو تاریخ و جغرافیہ سے روشناس کرایا اور اس موضوع پر اپنی کتاب "نقشہ عالم" (A map of the World) تحریر کی جو جغرافیہ سے زیادہ تاریخ کی کتاب ہے۔ چنانچہ ہیکٹس وہ پہلا مورخ ہے جس نے جغرافیائی سائنس دریافت کی۔ اس لئے اسے "بابائے جغرافیہ" بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب "نقشہ عالم" میں مختلف ممالک' مقامات' باشندے' انکے باہمی تعلقات اور خصوصیات کا عمیق مطالعہ پیش کیا ہے۔ پہلی مرتبہ اہل یونان کو تاریخ مشرق اور مشرقی اقوام سے متعارف کرایا۔ اس کے علاوہ نہایت تاریخی ترتیب (Dates) کے ساتھ اشوری' ایرانی اور ایشائے کوچک کے بادشاہوں کے حالات و واقعات پیش کئے۔ یہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہیکٹس وہ پہلا مورخ ہے جس نے بین الاقوامی تاریخ لکھنے کا آغاز کیا۔ اس نے قدیم تاریخ یونان بھی تحریر کی جس میں وہ بیان کرتا ہے کہ "میں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ میرے نزدیک صحیح ہے۔ اگرچہ یونانیوں کے افسانے بے شمار ہیں اور میرے خیال میں وہ بیہودہ ہیں۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہلینکیئس (۴۸۰_۳۹۷ ق م Hellanicus)

ہلینکیئس نے اولمپک کھیلوں کے فاتحین[۱۲] مقامی روایات اور ایتھنز کے مختلف قصے اور واقعات بیان کئے ہیں۔ تھیوسی ڈائیڈز نے ہلینکیئس کے مواد کو ناقص قرار دیا ہے اور اس پر بہت تنقید کی ہے۔ اگرچہ ہم ہلینکیئس کی تحریروں کو نقائص کی حامل قرار دیتے ہیں مگر وہ تاریخ کے لئے خام مال اور اول درجے کی معلومات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہلینکیئس کی تحریریں مکمل طور پر نہیں جزوی طور پر دستیاب ہیں۔

ہیروڈوٹس (۴۸۴--۴۲۵ ق م Herodotus)

ہیروڈوٹس کا وطن ہیلی کارنسوس[۱۳] اور ولادت ۴۸۴ ق م ہے۔ جنوبی اٹلی کے شہر تھری واقعہ لیوکانیہ میں ۴۲۵ ق م میں وفات پائی۔ اکابر مورخین میں پہلا اور اولین مورخ جس نے اپنی کتاب میں علم اور فن کا امتزاج بڑی خوبی سے کیا۔ ہیروڈوٹس کی تاریخ جو ۹ فصلوں پر مشتمل ہے میں ایران و یونان کی لڑائیوں کا حال نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ یورپ اور ایشیا کے متعدد حصوں کا اس نے خود سفر کیا تھا لہٰذا اس کی تصنیف میں جن قوموں اور ملکوں کا ذکر آیا ہے ان میں بیشتر کا تعلق اس کے ذاتی مشاہدات سے ہے جن کی صحت کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ ہیروڈوٹس کی نظر اگرچہ آج کل کے معنوں میں تنقیدی نہیں تھی لیکن وہ رعایت اور جانبداری سے بچتا تھا۔ اس کی نسلی تاریخ میں نسلی اور جغرافیائی معلومات کی بھرمار ہے لہٰذا اس کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شاید پہلی کتاب ہے جس میں زمانہ ماقبل تاریخ کے غدیری گاؤں[۱۴] کا چشم دید حال ملتا ہے۔

ہیروڈوٹس نے مصر کے حالات میں نہایت تفصیل اور خوبی سے قلم اٹھایا اور دریائے نیل سے مبسوط بحث کی ہے۔ وہ خود بھی دیکھ چکا تھا کہ نیل کا گاد ہر سال خشکی میں پھیل جاتا ہے گویا اسے معلوم تھا کہ مصر نیل کا عطیہ ہے۔ بعینہٖ جب اس کو مصر زیریں کی پہاڑیوں پر متحجر گھونگے نظر آئے تو اس نے یہ نتیجہ قائم کیا کہ یہاں کبھی سمندر موجزن تھا[۱۵]

تاریخ کو محتاط رویئے' درست واقعات' صحتمند روایات اور معقولیت کے ساتھ پیش کرنے والا پہلا مورخ ہیروڈوٹس ہے۔ اسے بابائے تاریخ محض طرز تحریر کی بنا پر نہیں بلکہ تاریخ میں حقیقت پسندی' تحقیق و تفتیش اور حقائق نگاری کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ اس نے ازمنہ گذشتہ میں انسانی کارناموں اور سرگرمیوں کو معلوم کرنے کی کوشش کی۔ واقعات کی چھان بین کے لئے دور دراز کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سفر اختیار کئے۔ وہاں کے مقامی باشندوں سے ماضی و حال کے حالات و واقعات سنے اور تاریخ کے لئے مواد حاصل کیا۔ تاریخ کو ادب سے علیحدہ کیا' قصے کہانیوں اور داستانوں کو شامل تاریخ نہ کیا اور تاریخ کو تحقیق و تفتیش کے معنوں میں استعمال کیا جیسا کہ وہ اپنا نظریہ تاریخ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "تاریخ سے مراد تلاش حق ہے" ہیروڈوٹس کی "تلاش حق" سے مراد زمانہ ماضی کے حقائق کی تلاش ہے۔ ہیروڈوٹس نے تاریخ کو حقائق و تحقیق کی سائنس بنا دیا لہٰذا ہیروڈوٹس کو سائنٹیفک تاریخ کا خالق اور اس کے دور کو حقائق کی تلاش اور تحقیقاتی سائنس کا دور قرار دے سکتے ہیں۔ جیسا کہ وہ بیان کرتا ہے کہ:

"یہ ہیروڈوٹس ساکن ہلی قارناسوس کی تحقیقات ہے۔ جو اس کو اس لئے شائع کر رہا ہے کہ انسانوں کے کارنامے (اپنے آباو اجداد) فراموش نہ ہو جائیں اور ان انسانوں کی یادگار باقی رہے اور یونانی اور وحشیوں (ایرانیوں) کے عجیب و غریب کارناموں کی شان و شوکت باقی رہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی تحریر میں آ جائے کہ (یونانیوں اور وحشیوں) کے درمیان جو تنازعہ تھا اس کے اسباب کیا تھے[16]"

ہیروڈوٹس لفظ تاریخ کو تحقیق کے معنوں میں استعمال کر کے حقائق نگاری کو تاریخ کے لئے لازم قرار دیتا ہے اور تلاش حق پر زور دیتا ہے۔ ہیروڈوٹس کے بعد اہل یونان کے نزدیک تاریخ تلاش حق (ازمنہ ماضیہ) کا ذریعہ تھی کہ جس سے دیگر علوم کی حقانیت کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔ ہیروڈوٹس انسان کو معقولیت پسند کہتا ہے کہ جس کا فرض ہے کہ اشیاء کی تشریح عقلی بنیادوں پر کرے اور فکر کو استعمال کر کے حقائق کا کھوج لگائے۔ ہیروڈوٹس کا کہنا ہے کہ مورخوں کو چاہئے کہ وہ یہ معلوم کریں کہ انسانوں نے ازمنہ ماضیہ میں کیا کارنامے سرانجام دئے اور کیونکر سرانجام دئے؟ ہیروڈوٹس محض واقعات تک اپنی توجہ مبذول نہیں رکھنا چاہتا بلکہ انکی وجوہات کو بھی جاننا چاہتا ہے۔

ہیروڈوٹس کا تاریخ لکھنے کا نمایاں نظریہ یہ تھا کہ وہ یونان و ایران اور مشرق و مغرب میں تصادم کی وجوہات جاننا چاہتا تھا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کونسی وجوہات ہیں جنکی بناپر یونانی اقوام کو ایرانی باربار شکست دیتے ہیں اور ایرانیوں کی فتح کی کیا وجوہات ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ جنگ' شکست اور فتح محض اتفاقات کا نتیجہ نہیں ہیں کیونکہ "حال کے واقعات کی وجوہات ماضی میں پوشیدہ ہیں۔ ماضی کی حقیقت حال میں پنہاں ہے اور حال ہمیشہ مستقبل کی رہبری کرتا ہے"۔

ہیروڈوٹس بیان کرتا ہے کہ "ایران و یونان کی جنگ دو تمدنوں اور دو نظریات کی جنگ تھی" چونکہ ہیروڈوٹس کے زمانے میں یونانیوں کے سب سے بڑے دشمن ایران کے کسریٰ تھے جو برابر یونانیوں کی [illegible] پر چڑھائی کرتے رہتے تھے۔ ہیروڈوٹس کے زمانے میں یونانیوں کو اپنی تہذیب کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

متعلق یہ گمان تھا کہ دنیا کی کوئی دوسری قوم ان کی طرح مہذب نہیں۔ چنانچہ وہ ایرانیوں کو "وحشی" کہتا ہے لیکن اس کی باوجود وہ ایرانیوں کی چند خوبیاں بھی بیان کرتا ہے۔

شاٹ ول (Shot Well) ہیروڈوٹس کو "ایرانی جنگوں کا ہومر" کا خطاب دیتا ہے۔

ہیروڈوٹس نے ایرانیوں اور یونانیوں اشوریوں' مصریوں' ایشائے کوچک' اور خلیج فارس کے ساتھ ساتھ آباد ملکوں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ وہاں کے باشندوں' نسلوں' ان کے مختلف عقائد' موسمی حالات اور قدرتی پیداواروں کے بارے میں بیشمار بیش قیمت معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ حقائق اتنے عمدہ اور دلکش پیرائے میں تحریر کئے ہیں کہ اڑھائی ہزار سال بیت جانے کے باوجود آج تک کوئی بھی مورخ اس کے طریقہ ہائے نگارش پر انگلی تک نہیں اٹھا سکا۔ وہ تاریخ کے ہر دور میں مورخین میں یکساں مقبول رہا ہے۔ وہ نہایت قابل اعتبار مورخ گردانا جاتا ہے۔ ہر دور کے مورخین اس کی ایمانداری اور حقیقت پسندی کو خراج تحسین پیش کرتے رہے ہیں۔ فن تاریخ نویسی نے یونان میں اپنی پہلی منزل ہیروڈوٹس کے ہاتھوں مکمل کی۔ اس نے تنقید کا فن ہیکاٹیئس (۵۴۰-۴۷۵ ق م Hecataeus) کی تحریروں سے سیکھا۔ اس کی تاریخ اپنے عہد کی تہذیبوں کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔ اس نے یونانیوں کے علاوہ ایرانیوں' بابلیوں' مصریوں' اشوریوں' اور عبرانیوں کی تہذیب و تمدن کی صحیح تصویر کشی کی اور پہلی "تاریخ عالم" مرتب کی اور عالمی تاریخ لکھنے کی بنیاد رکھدی۔ گویا اس کی تاریخ ایک طرح سے سیاحت نامہ بھی ہے۔

تھیوسی ڈائیڈز (۴۷۱-۴۰۱ ق م Thucydides)

تھیوسی ڈائیڈز دنیا کے اکابر مورخین میں سے ایک ایسا مورخ ہے جس کے متعلق یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ وہ علم تاریخ اور فلسفہ تاریخ کا بانی ہے۔ جنگ **پیلو پونیشیا**[19] پر اس کی تاریخ کا شمار دنیا کی بلند ترین ادبی بلکہ میں یہ کہوں گا کہ علمی کتب عالیہ میں ہوتا ہے۔ تھیوسی ڈائیڈز خود اس جنگ میں شریک تھا ابتدائے کتاب میں اپنی تصنیف کی غائیت سے بحث کرتے ہوئے اس نے قدیم ترین ایام سے لے کر خود اپنے زمانے تک یونانی معاشرے کے ارتقاء سے بھی مختصراً بحث کی ہے۔ طاعون اثینیہ[20] (۴۳۰ تا ۴۲۵) کا بیان نہایت خوب ہے۔ وہ اس **کسف** کا بھی ذکر کرتا ہے جو ۳ اگست ۴۳۱ کو اثینیہ میں نظر آیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب سورج گرہن کا حال تفصیل سے بیان کیا گیا[21]

تھیوسی ڈائیڈز تاریخی حقائق کو علل و معلول کے ساتھ پیش کرنے والا پہلا مورخ ہے۔ اس نے تاریخی حقائق و واقعات کو ہیروڈوٹس سے بالکل جداگانہ انداز میں پیش کیا اور اب تو تاریخ کے دامن سے خارج کردیا۔ اپنی تاریخ میں کہیں بھی قصے کہانیاں بیان نہیں کیں اور نہ ہی داستان گوئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قائل تھا۔ اس کے خیال میں:

"ازمنہ ماضیہ کے واقعات کا علم اس لئے ضروری ہے کیونکہ اس امر کا پورا امکان ہے کہ آئندہ اسی قسم کے واقعات (اسی قسم کی علل و معلول Cause and effct کی بناپر) دوبارہ ہوں گے۔"

تھیوسی ڈائیڈز کے تاریخی نظریات سے ہم سپارٹا اور ایتھنز کی جنگوں کی وجوہات کو سمجھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ہیروڈوٹس کی بہ نسبت تھیوسی ڈائیڈز کا موضوع تاریخ دقیق، قلیل اور محصور سا ہے اور وہ اپنی تحقیق کا انحصار چشم دید شواہد و معلومات پر کرتا ہے اور انہیں تاریخ کے لئے قابل قبول مواد قرار دیتا ہے۔ اس نے تاریخ مرتب کرنے کے لئے حالات و واقعات سے آگاہ چشم دید افراد کے انٹرویو لئے اور انہیں وجوہات و معقولیت کے ساتھ قلم بند کیا تھیوسی ڈائیڈز کے مطابق " چشم دید شواہد کے بغیر تاریخ کا کوئی وجود نہیں۔" تھیوسی ڈائیڈز تاریخ نویسی کے لئے ماضی قریب کے شواہد و واقعات کو زیادہ معتبر و مستند سمجھتا ہے اور مواد (Source) کے صحیح اعداد و شمار (data) کو تاریخ کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ تھیوسی ڈائیڈز تاریخ نویسی کے لئے مندرجہ ذیل امور پر زور دیتا ہے:

۱۔ ازمنہ ماضیہ کی (یونانی) تاریخ تحریر کرتے وقت معتبر ماخذوں کو حاصل کیا جائے۔

۲۔ جنگ کے بارے میں (ملٹری ہسٹری) مختلف وجوہات میں سے صحیح ترین کا انتخاب کیا جائے۔

۳۔ سیاسی تاریخ رقم کرتے وقت حکومتی نمائندوں اور مختلف سیاسی شخصیات کے بیان و تقاریر کو شامل کرنا چاہیے۔

۴۔ تاریخ کو قصے کہانیوں اور داستان گوئی سے مبرا رکھنا چاہیے۔

۵۔ ازمنہ ماضیہ کے واقعات معقولیت حق و صداقت اور وجوہات کی روشنی میں تحریر کرنے چاہئیں

تھیوسی ڈائیڈز سپارٹا کی جنگوں سے قبل تحریر کی گئی تاریخ کو درست خیال نہیں کرتا اور وہ عہد نو اور ماضی قریب کی معلومات، اعداد و شمار، مواد اور شواہد کو معتبر سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ پیشتر اس سے کہ مواد کو غلط طور پر پیش کیا جائے انہیں احاطہ تاریخ میں لے آنا چاہیے۔ تھیوسی ڈائیڈز پر سب سے بڑی تنقید یہ ہے کہ اس نے اپنے عہد کی سماجی اور معاشی تاریخ کو نظر انداز کیا اور یکطرفہ سپارٹا کی جنگوں کی فوجی تاریخ رقم کی۔

تاہم وہ قدیم یونانی مورخین میں سے عظیم تر، صاف گو، حقیقت پسند معقولیت پسند مورخ تھا۔ اس کا طریقہ ہائے تاریخ نویسی مورخین کے لئے آج بھی ایک عمدہ نمونہ ہے جسے مورخوں کی تاریخ نویسی کی تربیت کے لئے بہترین قرار دیا جا سکتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زینوفون (۴۳۰-۳۵۵ ق م Xenophon)

تھیوسی ڈائیڈز کے بعد یونانی تاریخ نویسی کا ایک روشن دور ختم ہوا۔ زینوفون نے اگرچہ یونانی اور دیگر مشرقی اقوام کی تاریخ تحریر کی مگر وہ ہیروڈوٹس اور تھیوسی ڈائیڈز سا معیار برقرار نہ رکھ سکا۔ بطور وقائع نگار وہ نہایت معتبر اور حقیقت پسند تھا اور اس نے واقعات تحریر کرتے وقت پوری دیانت داری برتی۔ اس نے تاریخ کو سوانح نگاری کی طرز پر رقم کیا اور اپنے عہد کی نمایاں شخصیات' حکومتوں اور اداروں کے بارے میں مفید معلومات قلمبند کیں۔ یہ یونانی تاریخ کا آخری معتبر مورخ تھا۔ تاریخ نویسی میں تجزیہ نگاری اور معقولیت پسندی میں وہ مقام حاصل نہ کر سکا جو اس کے پیشرو ہیروڈوٹس اور تھیوسی ڈائیڈز کو حاصل تھا۔

زینوفون سقراط کا پیرو اور دس ہزار سپاہ پر مشتمل دستہ کا کمانڈر تھا۔ اس نے فرات سے بحیرہ اسود تک کوہستانی علاقے میں اپنے سفر کا حال اناباسس (Anabasis) میں جس خوبی سے لکھا ہے اس کا شمار تاریخ کے شاہکاروں میں ہوتا ہے[۲۳]۔ زینوفون "تاریخ ہیلینیکا[۲۴]" کا مصنف بھی ہے۔ سات ابواب میں زینوفون کی تاریخ کا سلسلہ تھیوسی ڈائیڈز کی تاریخ کے سلسلے "محاربہ مانٹینیہ[۲۴]" سے مل جاتا ہے۔ جس سے زینوفون کی تاریخ کا سلسلہ ۴۱۰ کے واقعات تک جا ملتا ہے۔

الفیوروس (۴۱۰-۳۲۲ ق م Eporos)

الفیوروس چوتھی صدی مسیح کے وسط کا مورخ ہے وہ اس کے علاوہ جغرافیہ دان بھی تھا۔ نظریہ تاریخ کے بارے میں اپنے استاد آسوکریٹس (Isocrates) سے بے حد متاثر تھا۔ ہیروڈوٹس کے بعد وہ پہلا مورخ ہے جس نے تاریخ عالم پر قلم اٹھایا۔ الفیورس جغرافیہ کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔ اس نے تاریخ کی جغرافیائی اساس پر فلسفیانہ خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ الفیورس کی تاریخ کا سلسلہ ۳۵۵-۲۵۶ پر ختم ہو جاتا ہے۔ اور وہ ۲۳۴ ہی میں مکمل ہو چکی تھی[۲۵]۔

تھیوپومپوس (۳۸۰_۳۲۳ ق م Theopompos)

تھیوپومپوس بھی اپنے استاد آسوکریٹس (Isocrates) سے بہت متاثر تھا اور اس کے سیاسی نظریات کی بنیاد پر تاریخ نویسی کی۔ یہ یونانی مورخ اور خطیب تھا۔ یہ پہلا یونانی مورخ ہے جس نے روما کا واضح طور پر ذکر کیا ہے۔ وہ بڑا فاضل اور کثیرالاطلاع شخص تھا اور اس امر پر بڑا زور دیتا تھا کہ تاریخی مباحث میں سیرت و کردار' آداب' ذات اور نیتوں کا تجزیہ ناگزیر ہے۔ اس لحاظ سے گویا وہ ٹیسی ٹس (Tacitus) کا پیشرو اور نفسیاتی تاریخ کا موجد تھا۔ تھیوپومپوس کی بڑی بڑی تصنیفات میں "تاریخ یونان[۲۶]" بارہ ابواب پر مشتمل ہے جس سے تھیوسی ڈائیڈز کی تاریخ کا وہ سلسلہ جو ۴۱۰ ق م پر ختم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو جاتا تھا ۳۹۸ ق م تک وسیع ہو جاتا ہے اس کی دوسری "تاریخ فیلقوس"[۲۷] مقدونوی اٹھاون (۵۸) فصلوں پر مشتمل ہے جو فی الحقیقت سارے یونان کی تاریخ ہے اس سے زینوفوں کا سلسلہ ۳۶۲ ق م سے ۳۲۶ ق م تک بڑھ جاتا ہے۔ افیورس اور تھیوپومپوس دونوں مورخوں کا اسلوب نہایت سادہ و آسان تھا مگر وہ تجزیہ نگاری، معقولیت اور قوت رائے سے عاری تھے۔

پولی بیوس (۲۰۵-۱۲۵ ق م Polybios)

پولی بیوس ایک مورخ، جغرافیہ دان اور رواقی تھا[۲۸]- وہ اکابرین مورخین میں سے ایک تھا۔ اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ پہلا عالم گیر مورخ تھا۔ قطع نظر اپنے اسلوب کے وہ یونان و روم کے تاریخی سنگم کا عظیم مورخ تھا۔ اس نے "یونان اور روما کی تاریخ" لکھی جو چالیس (۴۰) فصلوں پر مشتمل تھی۔ اس میں زیادہ تر بحث ۲۲۰ ق م اور ۱۴۶ ق م کے درمیانی وقفے سے کی گئی ہے[۲۹]۔ کتاب مذکورہ کے طویل مقدمے (فصول اول و دوم) میں پولی بیوس نے بتایا ہے کہ تاریخ کا مقصد اور نظریہ کیا ہونا چاہئے۔ پہلا مقصد تاریخ پولی بیوس کے مطابق حقائق کی تلاش اور حصول علم ہے۔ اس کے بڑے بڑے عناصر تین ہیں (۱) دستاویزوں کا مطالعہ، (۲) **جغرافیے** کا مطالعہ اور (۳) سیاسیات و حربیات کا مطالعہ۔

پولی بیوس نے **جغرافیے** کو بالخصوص اہمیت دی۔ وہ کہتا تھا انسانی حوادث کے جغرافیائی پس منظر کی تشریح نہایت ضروری ہے۔ اسے جغرافیہ میں خود بھی بڑی وسیع معلومات حاصل تھیں جس کی ایک وجہ اس کی دور دراز کی سیاحتیں ہیں اور دوسری اس کا غیر معمولی علم و فضیلت ہے۔ اس تصنیف سے یونانی افکار کی تاریخ میں ایک نئے باب کا افتتاح ہوتا ہے کیونکہ یہ پہلا موقع تھا جب یونانیت اور رومیت نے ایک دوسرے سے اتصال پیدا کیا[۳۰]۔

دوسری صدی قبل از مسیح جب یونانی تہذیب زوال پذیر ہوئی تو قابل افسوس عمل یہ ہوا کہ اس دور میں کوئی قابل ذکر یونانی مورخ پیدا نہ ہوا جو تاریخ کے عمل کو رواں دواں رکھتا۔ اس دور میں پولی بیوس ہی وہ واحد مورخ ہے جس نے یونان و روم کی تاریخ کو ہیروڈوٹس اور تھیوسی ڈائیڈز کے اسلوب میں تحریر کیا۔ کالنگ ووڈ کے مطابق پولی بیوس کا انداز تحریر انسانی (Humanistic) ہے۔ اس نے سائنسی انداز، معقولیت، شواہد اور وجوہات کو تاریخ نویسی میں استعمال کیا۔ وہ اپنا نظریہ تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

> "تاریخ لکھنے کا مقصد یہ نہیں کہ واقعات کو کیسے کنٹرول (محفوظ) کیا جائے بلکہ واقعات کو جامعیت اور تدبر کے ساتھ پیش کیا جائے.... انسانی اعمال و سرگرمیوں کو کنٹرول نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی تاریخ ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ انہیں کیسے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کنٹرول کیا جانا چاہئے۔ جو کچھ تاریخ سے ہم سیکھ سکتے ہیں وہ یہ کہ ہم ہمیشہ اپنی اخلاقی پختگی کو قائم رکھیں۔"

اس کی تاریخ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مورخ کے لئے چند شرائط مقرر کرتا ہے جن کے بغیر اصل تاریخ نہیں لکھی جا سکتی۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:

"میں کہتا ہوں کہ تاریخ پوری طرح نہیں لکھی جا سکتی جب تک اس کو اہل عمل لوگ نہ لکھیں یا مورخوں کو پوری طرح معلوم نہ ہو جائے کہ تاریخ نگاری کے لئے امور مملکت کا عملی تجربہ ضروری ہے.... جب تک یہ نہ ہو گا تب تک مورخ تاریخ نگاری میں برابر غلطیاں کرتے رہیں گے۔[۲۱]"

یہ واضح ہے کہ پولی بیوس خود ماہر سیاست تھا اور اس نے مورخ بننے سے پہلے عملی طور پر سیاست میں حصہ لیا اور فوج کے پیشہ کو اپنایا۔ اس کو تاریخ اور ماخذوں کے بارے میں وسیع معلومات حاصل تھیں۔ اس نے آزادانہ طور پر حقائق کی روشنی میں بلا خوف و خطر اعلیٰ شخصیات پر تنقید کی۔ اس کا کہنا ہے کہ علم تاریخ کی اہمیت واقعات و حقائق کی وجوہات میں پوشیدہ ہے اور یہی شے تاریخ نگاری کے لئے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ چونکہ اس نے وسیع سلطنت رومہ کے شب و روز دیکھے تھے اس کے ذہن میں ایک وسیع نظریہ تاریخ "عالمی تاریخ" کا تھا۔ اسی وسیع النظری کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نے "تاریخ روم" تحریر کی۔ پولی بیوس نے مقصد تاریخ یہ معین کیا کہ "لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ مطالعہ تاریخ کو اس لیے ضروری ہے کہ کوئی قوم گمراہ نہ ہو اور سابق اقوام کی غلطیوں کو نہ دہرائے، اپنے نفس کی اصلاح کرے"۔ وہ تقدیر کا بھی قائل تھا۔ اس کے بقول" تاریخ کے مطالعہ سے کوئی قوم اپنی قسمت تو بدل نہیں سکتی البتہ قسمت کی فرستادہ مصیبتوں کو صبر و استقلال سے جھیل ضرور سکتی ہے۔" پولی بیوس علم تاریخ کو حکمرانوں، سیاستدانوں، دانشوروں اور سپاہیوں کی تربیت کے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔

پوسیڈونیوس (۵۱-۱۳۵ ق م Posidonios)

پوسیڈونیوس اپامیہ واقعہ شام میں ۱۳۵ ق م کے لگ بھگ پیدا ہوا اور ۸۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔ غالباً روما میں یہ رواقی فلسفی نئے افلاطونی رجحانات کے ساتھ جامعی، جغرافیہ داں فلکی اور اثینیہ میں پانئے ٹوس کا پیرو تھا۔ اس نے روڈس میں سکونت اختیار کی۔ وہ اپنے زمانے میں رواقیت کا ممتاز ترین عالم اور معلم تھا اور اس نے رومی افکار پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ سسرو روڈس میں اس کے لیکچرز سے فیض یاب ہوا۔ پومپئی کے علاوہ روم کے اعلیٰ طبقہ کے ساتھ اس کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہایت گہرے روابط تھے۔

پوسیڈونیوس نے زمین کی جسامت از سرنو معلوم کی لیکن اس کی یہ پیمائش اراٹوس تھنیس سے فروتر ہے۔ البتہ آفتاب کی مسافت اور قطر کا تخمینہ' ہپارکوس بطلیموس سے بھی کہیں زیادہ بہتر ہے گو صحت سے دور۔ پوسیڈونیوس کو ماضی کا ذہین ترین سیاح تصور کرنا چاہئے۔ اس نے جغرافیے اور بشریات کے متعلق بہت سی معلومات فراہم کیں۔ زلزلوں اور آتش فشاں پہاڑوں کا مشاہدہ کیا اور جزائر الپاری (Lipari) میں ایک نیا آتش فشاں جزیرہ ابھرتے ہوئے دیکھا۔ وہ پہلا شخص جس نے مدوجزر کی توجیہہ چاند اور سورج کے متفقہ عمل سے کی اور مداکر اور جزر تام کی طرف توجہ دلائی۔ متوازی خطوط اور ہندسی اشکال کی نئی نئی تعریفیں اور جویات اور سمندر کے حالات پر ایک کتاب تصنیف کی۔ ۴۷ ق م میں اس نے ساری دنیا کی ایک تاریخ لکھنی شروع کی جو گویا پولی بیوس ہی کا مستزاد ہے اور جس میں ۱۴۴ ق م تا ۸۲ ق م کے درمیانی وقفے سے بحث کی گئی ہے۔ افکار فلسفہ پر پوسیڈنیوس کی شرح تمائیوس کا اثر ازمنہ وسطیٰ کے آخر تک یورپ میں نمایاں رہا

پلوٹارک (۴۵ء - ۱۲۰ء Plutarch)

یونانی مورخوں کی صف میں پلوٹارک آخری مستند مصنف تھا۔ شروع میں اس نے مذہبی پیشوائی کا پیشہ اختیار کیا۔ اور بعد ازاں اس نے فلسفہ' سائنس اور ادب پر بہت سے عالمانہ و محققانہ مضامین تحریر کئے۔ اس نے سٹاک (Stoic) کے فلسفہ رواقیت جو سخت قسم کے زہد و تقویٰ اور ہمہ اوست کا قائل تھا پر بے حد تنقید کی۔ اس نے ا پیقیورس (Epicurean) فلسفہ کہ

> "ہر شے کی مادی حیثیت ہے' خدا بھی مادی وجود رکھتا ہے اور انسان آزاد ہے نہ تو وہ خداؤں کے تحت ہے اور نہ عالم تقدیر کے"

پر زبردست تنقید کی۔ اور خود افلاطون کے تصوراتی فلسفہ کو قبولیت بخشی کہ

> "کائنات ایک زندہ عضو کی مانند ہے۔ اس کا جسم و روح ہے' عقل ہے' اور انسان اور کائنات کی ساخت ایک ہی قسم کی ہے صرف تصورات اور اعیان کو ہی استقلال و مداومت حاصل ہے"

پلوٹارک نے شروع میں یونانی اسطوریات' سائنس اور چاند پر لکھا۔ اس نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ مذاہب کا تقابلی مطالعہ ہونا چاہئے۔ اس نے دعویٰ کیا کہ بابل کا سلوکس دوسری صدی قبل مسیح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شمسی مرکزی (Heleo Centric) نظریہ سے آشنا تھا۔ اور اس نے شواہد سے اس نظریہ کو مزید تقویت دی۔ پلوٹارک کی تحریروں سے یونانی فلسفہ اور یونانی سائنس کے بارے میں بیش قیمت معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ پلوٹارک کا شمار ان لوگوں میں کرنا چاہئے جنہوں نے مذہب کے تقابلی مطالعے کی بنیاد رکھی۔

پلوٹارک نے تاریخ پر زندگی کے آخری حصہ میں کام کیا۔ تاریخ میں اس کا بہترین کام "پلوٹارک لائیوز" "سوانح شرفاء یونان"، "ایتھنز کا عروج و زوال" اور "سوانح شرفاء روم" تحریر کیں۔ پلوٹارک کی شہرت اس کے فلسفہ و سائنس کے علوم کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی تاریخ نویسی کی خصوصیات کی بنا پر ہے۔ شیکسپیئر نے رومی ڈرامہ نویسی کے لئے پلوٹارک کی تاریخ کو بطور ماخذ استعمال کیا۔ پلوٹارک مصر و روم بھی گیا اور روم میں اس کے بہترین دوست و احباب تھے۔ جب وہ روم پہنچا تو شہنشاہ ہیڈرین (Hadrian) نے نہایت عزت و احترام سے اس کا استقبال کیا۔ اور یونان میں اسے اعلیٰ عہدہ کی پیشکش کی جو اس نے قبول نہ کی اور اپنے آبائی وطن چیرونا (Chaeronea) کو ترجیح دی جہاں پر اس کا ۱۲۰ء کے بعد انتقال ہو گیا۔ پلوٹارک نے یونان و روم کی مشہور عظیم شخصیات کی سوانح تحریر کیں اور آئندہ کے مورخین کے لئے سوانح عمریاں تحریر کرنے کا اسلوب وضع کیا۔ یہ یونانی ادیب اور معلم اخلاق زیادہ تر اپنی سوانح (Lives) کی بدولت مشہور ہوا[۳۲]۔ پلوٹارک نے سوانح نگاری میں کمال پیدا کیا۔ اس کا طریقہ نگارش یہ تھا کہ وہ ایک یونانی اور ایک رومی ممتاز ہستی کو لیتا ہے اور دونوں کا موازنہ کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی مجموعہ سوانح کا نام "متوازی سوانحات" رکھا۔ یونانی مورخین کی عظمت یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ نویسی کو تاریخی تسلسل سائنسی طرز اسلوب، تحقیق، معقولیت اور وجوہاتی سائنس کے ساتھ تحریر کیا۔ انہوں نے تاریخ کی عمارت نظریاتی بنیادوں پر نہیں بلکہ انسانی (Humanistic) اقداروں پر قائم کی۔ تاریخ کو ادب و قصہ گوئیوں سے جدا کر کے تحقیقی و تفتیشی علوم کی صف میں کھڑا کر دیا۔ تاریخ کا سائنٹیفک نظریہ یونانیوں کی تخلیق ہے۔

دورِ رومہ

رومہ کی تاریخ کی ماہیت اس بات میں پائی جاتی ہے کہ یہ پرانی اور نئی دنیا کو ملانے والی ایک لڑی ہے۔ یہ اس پانی کے ذخیرے کی طرح ہے جس میں کہ پہلے مختلف چشموں سے پانی آ کر جمع ہوتا ہے اور پھر اس میں سے کئی شاخوں کی صورت میں نکل کر منقسم ہوتا ہے۔ پہلے تمام پرانی اقوام سلطنت رومہ کے اندر جذب ہو گئیں اور پھر اس سے نئی قوموں کی صورت میں ظاہر ہوئیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وکیل' فوجی اور حکمرانوں کی حیثیت سے اہل رومہ عروج پر پہنچے ہوئے تھے لیکن تخلیقی کاموں میں صفر کے برابر تھے اس لئے انہوں نے یونانیوں سے سارے علوم و فنون لے لئے۔ چونکہ انہیں علم کی بنیادوں سے واقفیت نہ تھی لہٰذا چند نسلوں کے بعد ان کے ہاں علوم و فنون کا خاتمہ ہو گیا۔ اور رومن تہذیب قبل از وقت مر گئی۔ یہ بات نہایت افسوس ناک ہے کہ رومن تہذیب یونانی مورخوں مثلاً ہیروڈوٹس اور تھیوسی ڈائیڈز جیسے قابل ذکر تاریخ دان نہ پیدا کر سکی۔

گائس جولیس سیزر (۴۴ - ۱۰۰ق م Gaius Julius Caesar)

گائس جولیس سیزر مدبر ریاست' سپاہی اور مورخ تھا۔ اس نے رومی تقویم و کیلنڈر کی تکمیل کی۔ جہاں تک فنی پہلوؤں کا تعلق ہے **سوسیگے** نیس (Sosigenes) نے اس کا ہاتھ بٹایا۔ لیکن یہ آج تک سیزر ہی کے نام سے موسوم ہے۔ جولین کی خصوصیات وہ چہار سالہ دور ہے جس میں تین سالوں کی مدت ۳۶۵ دن اور چوتھے کی ۳۶۶ دن اور یوں سال کی اوسط طوالت ۳۶۵¼ دن ہو جاتی ہے۔ طویل ترین سال لیپ (Leap یا Bissextile) وہ ہیں جن کی چار کے عدد پر تقسیم ہو جاتی ہے۔ پہلے جولین سال کی ابتدا یکم جنوری ۴۵ ق م (۷۰۹ رومی) کو ہوئی۔

سیزر نے ایک کتاب (De astris) علم ہیئت پر بھی لکھی اور ایک مکتوب بھی جس میں پیمائش کی بحث تھی۔ یہ دونوں تحریریں ضائع ہو چکی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قواعد کی اصطلاح "ابلاتی وِسّ" جس کی کوئی مثال یونانی زبان میں نہیں ملتی اسی کی رائج کردہ ہے۔ اس نے دولت روما کی پیمائش کا ارادہ کیا۔ اور وارو کو حکم دیا کہ عوام کے لئے کتب خانے کا انتظام کرے لیکن یہ دونوں تجاویز اس کی موت کے باعث رک گئیں۔ سیزر کے اذکار تاریخ کا ایک شاہکار ہیں۔

جولیس سیزر سے پہلے رومی تاریخ یونانی زبان میں یونانیوں کے قلم سے لکھی گئی۔ جولیس سیزر نے لاطینی زبان میں "جنگ گال" لکھی۔ یہ کتاب لاطینی تہذیب کے بحیرہ روم سے بحیرہ اوقیانوس تک پہنچنے کی داستان ہے۔ یہ کتاب تاریخ سے زیادہ تزک ہے۔ جولیس سیزر کا ہمعصر سلوست روم اور جوگرتھا کی جنگ کو پیش کرتا ہوا پر لطف انداز میں روم کو بچانے کی اپیل کرتا ہے "سیزر کی خانہ جنگی" غالباً اس کے کسی نائب کی تحریر کردہ ہے جو کہ اس کے اپنے عہد کی حصول حکومت کی داستان ہے۔ یہ سادہ اور فوجی زبان (سخت لہجے) میں تحریر کردہ ہے۔ اس میں وہ افسانوی انداز میں بیان کرتا ہے کہ کس طرح وہ ۴۹ قبل مسیح کو روم میں داخل ہوا' پامپیئی کو شکست دی' سپین کو سرنگوں کیا' قلوپطرہ کو مصر کے تخت پر بحال کیا اور کس طرح قلوپطرہ کے مخالفین کو تیونس میں شکست دی۔ اس کے دور کا خاتمہ ہو جاتا ہے جب اس کے مخالفین اسے رومی جمہوریت کا ڈکٹیٹر بنتے ہوئے ۱۵ مارچ ۴۴ ق م میں روما میں قتل کر دیتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کونٹس کرٹیئس روفس- (Quintus Curtius Rofus)

کونٹس کرٹیئس روفس نے غالباً کاڈئیس (۴۱ - ۵۴ ق م) کے ماتحت فروغ پایا- وہ رومی خطیب اور مورخ تھا اور اسکندر اعظم کی ایک سوانح حیات کا مصنف ہے- یہ کتاب دس فصلوں میں تھی[۳۵] اور اس کا انداز اگرچہ غیر ناقدانہ ہے مگر ادبی لحاظ سی نہایت خوب ہے- جس سے لوی اور سینکا (Seneca) کے تتبع کا پتہ چلتا ہے- یہ تصنیف یونانی رومانیت اور رومی خطابت کا ایک بے مثل امتزاج ہے- کرٹیئس شاید پہلا شخص تھا جس نے ایک غیر ملکی بحث پر قلم اٹھایا-

لوی (۵۹ - ۱۷ء Livy)

لوی نے اپنی "ابتدائی تاریخ روم" میں شاعرانہ انداز میں رومی دولت مشترکہ کی عظمت کے گیت گائے- یہ تاریخ نثر میں رزمیہ شاعری ہے- اس میں وہ روم کی ابتداء' ابتدائی تاریخ' پہلے سات بادشاہوں کے حالات' رومی جمہوریت کے قیام' حصول اقتدار کی باہمی جنگوں اور فرانس و یورپ کی مہموں سے فراغت کے واقعات نہایت تفصیل کے ساتھ پیش کرتا ہے- علاوہ ازیں وہ رومیو کی مشہور کہانی اور اسی قسم کی دیگر بہت سی افسانوی داستانیں بیان کرتا ہے- زیادہ تر کہانیاں یونانی ادب سے اخذ شدہ ہیں جنہیں رومی تمدن کے روپ میں پیش کیا گیا ہے- لوی اپنے زمانے کی برائیوں کو پیش کرتا ہے- اور اسے یہ یقین تھا کہ رومی جمہوریت ان تمام برائیوں پر غالب آ جائے گی وہ واقعات کی تفصیل کے معاملہ میں بہت لاپرواہ ہے- اس کے حالات زندگی کے بارے میں بہت کم معلوم ہے- مگر وہ ایک عہد ساز دور میں زندہ رہا- اس نے تاریخ روم کو ۱۴۲ جلدوں میں مرتب کیا جن میں سے صرف ۳۵ دستیاب ہیں- اس نے تیس سال کی عمر میں تاریخ لکھنی شروع کی اور مسلسل چالیس برس تک اپنی موت تک لکھتا رہا- اس کی تاریخ زیادہ طور پر ادبی تاریخ ہے- لوی کو ابتدائی عہد روم کی تاریخ رقم کرتے وقت کئی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا مثلاً تاریخ ردم کا ابتدائی ریکارڈ روم و فرانس کی ابتدائی جنگوں میں تلف ہو چکا تھا اور پھر ۳۷۶ قبل مسیح میں فرانس کے روم پر فتح کے وقت روم کو نذر آتش کر دیا گیا تھا جس سے تمام ریکارڈ جل کر خاکستر ہو گیا- اس لئے لوی کو پہلی چھ جلدوں میں خصوصاً ادبی تاریخوں کے قصوں' کہانیوں سے مدد لے کر تاریخ روم کی تصویر میں خیالاتی رنگ بھرے- تاہم لوی تاریخ نویسی کے لئے حقائق و واقعات کی درستگی کا نظریہ پیش کرتا ہے- اور مورخ کی غیرجانبداری پر زور دیتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ وہ ہر حال میں سچائی کا دامن نہ چھوڑے چنانچہ وہ بیان کرتا ہے کہ:

"مطالعہ تاریخ بیمار قوموں اور ذہنوں کے لئے بہترین اکسیر دوائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخ میں مختلف اقوام کے تجربات کا اندراج ہوتا ہے۔ اس میں اپنے اور اپنی قوم کے لئے مفید ترین تجربے کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ اور غلط تجربات سے پرہیز کیا جا سکتا ہے"۔

لوی کی "تاریخ رومہ" جیسی ضخیم کتاب پھر کبھی نہیں لکھی گئی۔ اس نے اپنے چند ماخذوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کا طرز تحریر مبالغہ سے بری ہے۔ لیکن وہ اپنے ماخذوں کی صداقت کو بلا ثبوت مان لیتا تھا۔ اسکے ہر لفظ سے وطن پرستی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور وطن پرستی کی تلقین کو وہ اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اس نے افسانوں کو بھی اپنی تاریخ میں جگہ دی۔ لوی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے رومیوں کی ابتداء سے لے کر اپنے زمانے تک تاریخ لکھی۔ اور واقعات کو مسلسل بیان کیا۔ گویا رومیوں کے لئے یہ تاریخ دراصل "تاریخ عالم" تھی کیونکہ رومیوں کا عقیدہ تھا کہ ان کے مورث اعلیٰ دیوتا تھے لیکن لوی نے رومیوں کو محض انسان قرار دیا۔ جیسا کہ لوی تحریر کرتا ہے کہ:

"روم کے ظہور سے پیشتر واقعات جو ہم تک پہنچے ہیں وہ قدیم افسانوں کی صورت میں ہیں۔ تاریخی دستاویزات کی صورت میں نہیں۔ یہ افسانے شاعری سے پر ہونے کی وجہ سے بڑے دلکش ہیں۔ میں ان افسانوں کی نہ تصدیق کروں گا اور نہ ہی تردید۔ کوئی وجہ نہیں کہ میں ان افسانوں پر اعتراض کروں۔ جب کہ قدیم طریق کے مطابق ان افسانوں میں انسانی عنصر کے ساتھ ساتھ خدائی عنصر بھی شامل ہے۔ اس خدائی عنصر سے ماضی بڑا شاندار ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی قوم دعویٰ کر سکتی ہے کہ اس کی ابتداء الوہیت سے ہوئی تو وہ صرف ہماری قوم ہے۔ رومی قوم نے اپنی لڑائیوں کے ذریعہ جو عظمت حاصل کی ہے وہ ایسی مسلم ہے کہ ان کا یہ دعویٰ کہ ان کی قوم کے بانی کا باپ مریخ ستارہ خود تھا۔ دیگر قوموں کو اس طرح مان لینا چاہئے جس طرح وہ رومی حکومت کو تسلیم کرتے ہیں[۲۶]۔"

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ لوی نے واقعات کے ساتھ افسانے بھی شامل کر دیئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ رومی مورخ محسوس کرتا ہے کہ اب اس کی قوم روبہ زوال ہے۔ اس کی وجہ بقول لوی یہ ہے کہ "اب رومی سیدھی سادھی زندگی کو چھوڑ کر عیش و عشرت اور دولت مستیوں میں محو ہو گئے ہیں"۔ چنانچہ اس مورخ کو اب اپنی قوم کا زوال صاف نظر آتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ٹیسی ٹس (۵۰ ق م - ۱۱۷ء Tacitus)

رومیوں کا دوسرا ممتاز مورخ ٹیسی ٹس ہے۔ اس نے اپنی تاریخ موسومہ "ہسٹوریائی" میں چھ رومی شہنشاہوں کے زمانے کے حالات لکھے ہیں۔ لیکن اس کی نظر زیادہ تر شہر روم تک محدود رہی۔ اس کے خیال میں رومیوں کا اصل فرض حکومت کی تنظیم نہیں بلکہ فتوحات ہیں۔ ٹیسی ٹس پہلی صدی عیسوی میں "تاریخ روم" اور "رومی جمہوریہ" کا ایسا قابل قدر مورخ ہے کہ جس کے نظریہ تاریخ اور اسلوب تاریخ نویسی کو اس عہد جدید میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لوی کے پچاس سال بعد ٹیسی ٹس نے اپنی تاریخ میں بلند ترین ادبی معیار کو برقرار رکھا۔ اس نے روم کے زوال کو اپنی کتاب "واقعات" میں پیش کیا۔ اس نے اپنے عہد کے علاوہ اپنے سے پہلے عہد رومہ کے بھی حالات قلمبند کیے۔ وہ بیک وقت کئی امور کا ماہر تھا۔ خطیب' جاگیردار' سیاستدان اور بالا آخر مورخ ہے۔ جس وقت اس نے سیاست سے کنارہ کشی کر کے تاریخ نویسی کو باقاعدہ طور پر اپنایا تو اس کی سیاسی زندگی پورے جوبن پر تھی۔ اس کے زمانے میں روم کا دور جمہوریت ختم ہو چکا تھا اور مطلق العنانیت قائم ہو چکی تھی لیکن دور جمہوریت کی آزادی کی یاد لوگوں کے دلوں میں اب بھی موجزن تھی۔ چنانچہ وہ ایام رفتہ کا رونا روتا ہے اور اپنے زمانے کو دور غلامی کہتا ہے۔ لیکن دور جمہوریت کو واپس لانے کی کوئی تجویز پیش نہیں کرتا۔ لہٰذا اس کی تاریخ سبق آموز نہیں کہی جا سکتی۔ جیسا کہ وہ خود بیان کرتا ہے:

> "اس عرصے میں شہر روم کے باشندے غلامی میں غرق ہو گئے۔ جن میں کونسل' ممبران سینٹ اور سردار بھی شامل ہیں۔ جس کا جتنا اونچا عہدہ ہے وہ اسی حساب سے اظہار ریاکاری کرتا ہے۔ یہ لوگ اپنے چہروں سے نہ کسی شہنشاہ کی موت پر اظہار غم کرتے ہیں اور نہ اس کے جانشین کی تخت نشینی پر اظہار خوشی کرتے ہیں۔ بلکہ اپنی خوشامد میں خوشی اور غم دونوں شامل کرتے ہیں[۳]۔"

وہ ٹیبرس اور نیرو کے محلات کے مظالم کو دردناک انداز میں پیش کرتا ہے وہ روم کے مہذب لوگوں پر "جرمینیا" کے جنگلوں کی وحشی زندگی کو ترجیح دیتا ہے۔ ٹیسی ٹس ایک اخلاقی مورخ تھا۔ اس نے تاریخ سے وہی کام لیا جو جووینل نے شاعری سے لیا تھا۔ ٹیسی ٹس نے نصرانیت پر غور و فکر کرنے کو رومی نخوت کے منافی خیال کیا لیکن چوتھی صدی میں روم عیسائی ہو گیا۔ ٹیسی ٹس کے مطابق تاریخ کا علم ہر آدمی کے لئے ضروری ہے کہ یہ اخلاق و کردار کی تعمیر کرتا ہے۔" اور وہ اسے "سبق آموز ماضی کی حقانیت کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔" ٹیسی ٹس تاریخ کو ادب کا ہی حصہ سمجھتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے اور اسے ادب سے الگ تصور نہیں کرتا۔

رومی مورخوں میں ایک خامی یہ تھی کہ ان میں سے زیادہ تر تنخواہ دار ملازم تھے یا از قسم لیڈر تھے۔ یہ بڑے مہذب اور اعلیٰ تعلیمیافتہ تھے لیکن رومیوں کی تہذیب پر یونانی رنگ چڑھ چکا تھا۔ اس لئے انہوں نے یونانی اسلوب تاریخ نگاری اختیار کیا۔ اس کے ساتھ یونانی مورخوں کی خامیاں بھی ان کی تاریخ نگاری میں داخل ہو گئیں۔ لیکن ساتھ ہی رومی تاریخ نگاروں نے روز نامچہ نما تاریخیں لکھ کر اس فن میں اضافہ کیا۔ جولیس سیزر نے "خود نوشت" لکھنے کا رواج شروع کیا۔ رومی تاریخ نگاروں نے خاص خاص واقعات کے متعلق علیحدہ رسالے لکھنے کا رواج بھی قائم کیا۔ جولیس سیزر کی "فتح فرانس" اس قسم کی تاریخ کی بہترین مثال ہے۔ اس سے تاریخ کی وسیع النظری میں اضافہ ہوا۔ لہٰذا رسالہ نویسی سے سوانح نگاری کا دستور پیدا ہوا۔

تاریخ نگاری میں رومی مورخ یونانی مورخوں کے نقال تھے۔ جب یونانی رومیوں کے زیر نگیں ہو گئے تو یونانیوں نے اپنے رومی حکمرانوں کی خاطر تاریخ نگاری شروع کی مگر یہ رومی نما یونانی ہیروڈوٹس اور تھیوسی ڈائیڈز کے طریق پر تاریخ نگاری نہ کر سکے اور راہ راست سے ہٹ گئے۔

دورِ اعتقاد

چوتھی صدی عیسوی میں جب روم عیسائی ہو گیا تو نصرانی کلیسا کی رومی الحاد پر فتح کا نتیجہ یہ نکلا کہ تاریخ روساء و شرفاء کے محلات سے نکل کر مذہبی پیشواؤں کے کلیساؤں میں داخل ہو گئی اور تاریخ نویسی پر راہبوں اور دینی پیشواؤں کا قبضہ ہو گیا اور از منہ وسطیٰ تک یورپ کی تاریخ پر یہی لوگ قابض رہے۔ چنانچہ تاریخ سے اصلاح کا کام لیا جانے لگا۔ تاریخ کو دینیات کی لونڈی بنا دیا گیا۔ تاریخ کے ایوان حوادث و واقعات سے خالی ہو کر شعبدوں سے بھر گئے۔ ایک ہزار سال تک یورپ صحیح تاریخ سے نا آشنا رہا۔ خدا اور انسان کے تعلقات کے ریکارڈ کا نام تاریخ رہ گیا۔

سینٹ آگسٹائن (۳۵۴ء - ۴۳۰ء St. Augustine)

سینٹ آگسٹائن کی کتاب "خدا کا شہر" (City of God) فلسفہ اور تاریخ دونوں سے عاری ہے۔ وہ افسانوں اور دینیات سے بھری پڑی ہے۔ جب ۴۱۰ء میں گاتھوں نے روم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تو عام لوگ اس تباہی کا باعث روم کا عیسائی ہو جانا خیال کرنے لگے۔ ان کے خیال میں روم کے قدیم دیوتاؤں نے نصرانی روم سے انتقام لیا تھا۔ سینٹ آگسٹائن نے اپنی کتاب "خدا کا شہر" میں ابلیس کو جنت سے نکالے جانے سے لے کر روز حشر تک کے مکمل واقعات بیان کئے ہیں۔ اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے نزدیک اشوریوں' ایرانیوں' مقدونیوں اور رومیوں کی حکومتیں حماقتوں کا مجموعہ تھیں۔ ان خیالات کے باوجود سینٹ اگسٹائن کا تصور تاریخ ازمنہ وسطیٰ تک یورپ پر غالب رہا۔

سینٹ اگسٹائن نے رومتہ الکبریٰ کا خاتمہ بچشم خود دیکھا۔ زوال کے واقعات نے اس کو اس عقیدے کا حامل بنا دیا کہ اس دنیا کی کوئی چیز دائمی نہیں بلکہ فانی ہے۔ اس نے اس نظریہ فنا کی بڑے زور شور سے تلقین کی اور ساتھ ہی اس نے یہ بھی ثابت کیا کہ روم کو فنا کرنے میں خدا کی مصلحت یہ تھی کہ اس کے دین برحق کی ترقی ہو۔ گویا خدا نے مذہب عیسوی کو بڑھانے کے لئے روم کو گھٹایا۔

عیسوی مذہب سے تاریخ نگاری ایک اور طرح بھی متاثر ہوئی۔ مورخین کا یہ اعتقاد ہو گیا کہ ہر چیز وقتی ہوتی ہے' دائمی نہیں۔ خدا ہر چیز کو نئی وضع اور صورت میں پیدا کرتا ہے اور نئی چیز پرانی چیزوں کے اثرات سے بری ہوتی ہے۔ تاریخ کے محیط میں تمام عالم آ جاتا ہے اور تاریخ کی حدود قومیت سے بڑھ کر عالمگیر ہو جاتی ہیں۔ اور تاریخ نگاری کا مقصد یہ ہو جاتا ہے کہ وہ پوری دنیا کی ترقی کا خاکہ پیش کرے۔

رومی مورخوں کا نظریہ تھا کہ انسان حادث نہیں بلکہ قدیم ہے۔ لیکن مذہب عیسوی کے مطابق انسان اور کائنات دونوں قدیم نہیں بلکہ خدا کے پیدا کردہ ہیں۔ رومی روح انسانی کو بھی قدیم مانتے تھے اور تناسخ کے قائل تھے۔ لیکن مذہب عیسوی کے مطابق ہر جاندار کی روح نئی ہوتی ہے۔ اسی طرح عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق ہر نئی قوم کی روح بھی نئی ہوتی ہے۔

عیسائی مورخین کا عقیدہ تھا کہ انسان کی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے تمام واقعات و حوادث کا تعین (تقدیر) خدا کے اشارے سے ہوتا ہے۔ انسان تقدیر کے سامنے بالکل بے بس اور مجبور محض ہے اور محض خدا کا آلہ کار ہے۔ انسان کو اپنی منزل مقصود اور آئندہ ہونے والے واقعات کا کوئی علم نہیں۔ اس کا علم صرف خدا کو ہے۔ کیونکہ وہی اس کے لئے ایسی منزل مقصود کا تعین کرتا ہے کہ جس میں انسان کی بہتری مقصود ہوتی ہے۔ اس تبدیلی میں عقل کو کوئی دخل نہیں۔ در حقیقت از روئے مذہب فاعل خدا ہے' انسان نہیں۔ لہٰذا اس عہد کی تاریخ نگاری پر اعتقاد کے گہرے اثرات رونما ہوئے اور تاریخ کو معجزوں سے بھر دیا گیا۔ اگرچہ عقائد نویسی یہودی دین عیسوی سے بہت پہلے تاریخ میں شامل کر چکے تھے۔ عیسائی محض یہودیوں کے نقش قدم پر چلے۔ جب مسلمان تاریخ کے میدان میں اترے تو انہوں نے غزوات نویسی کو شامل تاریخ کر دیا۔

یورپ تقریباً ایک ہزار سال اعتقاد کی پرستش میں گرفتار رہا اور اس عرصہ کے دوران تاریخ اعتقاد نویسی کرتی رہی۔ دور اعتقاد میں ہر واقعہ کو حکم ربی سمجھ کر بغیر دلائل کے تاریخ کے سپرد کر دیا جاتا۔ دور اعتقاد میں تاریخ کا مقصد اخلاقی درس دینا بھی تھا۔ اس دور میں تاریخ کا دائرہ کار بہت محدود

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا۔ تاریخ میں بادشاہوں کے کارناموں اور کامیابیوں کو رحمت خداوندی سے منسوب کر دیا جاتا جس سے بادشاہ بہت خوش ہوتے اور تاریخ نویسوں کو انعام و اکرام سے نوازتے۔

جب دور اعتقاد ختم ہوا اور یورپ میں دور عقل شروع ہوا تو واقعات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا یوں معجزوں اور کشف و کرامات کی جگہ ٹھوس واقعات نے لے لی یعنی ایسے واقعات جن کو عقل سلیم تسلیم کر لے اور انسانی تجربے سے باہر نہ ہوں۔ اس کے علاوہ مورخ ان واقعات کو اپنی طرف سے بغیر کسی اضافے یا ترمیم کے من و عن تحریر کرنے لگے۔ گویا واقعات پر تصرف کا کسی کو حق نہ دیا گیا۔ نتیجہ اخذ کرنے میں مورخ کو آزاد چھوڑ دیا گیا کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق جو چاہے نتائج نکالے۔ لیکن نتیجہ نکالنے کے لئے واقعات پر تصرف کا حق مورخ کو نہ دیا گیا۔ یوں تاریخ زیب داستاں سے آزاد ہوئی۔

دور روشن

جب اسلامی تہذیب کے اثرات عرب و سپین سے یورپ پر پھیلے تو ان اثرات کی وجہ سے از منہء وسطیٰ کے آخری دنوں میں یورپ میں چند ایک ایسی کتابیں لکھی گئیں کہ جنہیں تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ اسلام اور عیسائیت کا میل ملاپ بیت المقدس' سسلی' جنوبی اٹلی اور ہسپانیہ میں ہوا۔ اسلام سے جنگ کرنے کے لئے یورپی بہادر صلیبی جنگوں میں شریک ہوئے لیکن بہت جلد انہوں نے اسلام کے قدموں میں بیٹھ کر علوم و فنون حاصل کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے علوم و فنون سے قطع نظر علم تاریخ میں طبری' بلازری' مسعودی' ابن خلکان اور ابن خلدون نے مشرق کے علاوہ مغرب کی بھی راہنمائی کی۔

اسلامی تہذیب کا جنوبی اٹلی اور ہسپانیہ کی یونیورسٹیوں کے ذریعہ نصرانی یورپ پر بہت گہرا اثر پڑا۔ اسلامی تہذیب کے اثرات کی وجہ سے یورپ کے از منہء وسطیٰ کا خاتمہ ہوا اور دور جدید کا آغاز ہوا۔ از منہ وسطیٰ اور عہد جدید کے عبوری دور میں تحریک انسانیت[۳۸] (Humanism) کا احیاء ہوا۔ یہ تحریک کلیسا کے اقتدار کے خلاف بغاوت تھی۔ اور مغربی ذہنوں کو مذہبی زنجیروں سے رہائی دلانے کے لئے ایک کوشش تھی۔ یہ پرانے علوم کی حیات نو کی تحریک تھی۔ ایک ہزار سال تک یورپ کا ذہن تاریکیوں میں بھٹکتا رہا۔ تاریخ نویسی میں "تحریک احیائے علوم" کا دور اس لئے بھی بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں تاریخ کو کلیسا سے الگ کر دیا گیا۔ اب پادریوں کی جگہ اہل علم نے تاریخ نویسی کی طرف توجہ دی۔ اور از منہء وسطیٰ کو جہالت اور تاریکیوں کا دور قرار دیا۔ تاریخ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نویسی پر تحریک احیائے علوم کا اثر یہ ہوا کہ لاطینی لفاظی کو ترک کر دیا گیا اور تاریخ نویسی کے لئے نیا اسلوب نگارش وضع کیا- مذہب سے بے زاری کا اظہار ہونے لگا- تاریخ کو دور اعتقاد کے نظریات (نظریہ تقدیر) سے الگ کر دیا گیا- اس دور کا تاریخ نگاری پر سب سے نمایاں اثر یہ ہوا کہ لکھنے والوں میں ایک تنقیدی روح پیدا ہو گئی- قدیم یونانی مورخوں مثلاً ہیروڈوٹس' تھیوسی ڈائیڈز' لوی اور پلوٹارک کے آزادانہ نظریات کا جذبہ تاریخ و تخلیق میں پھر سے پیدا ہو گیا-

چودھویں صدی عیسوی کا آغاز یورپ کے لئے ایک نیک شگون تھا- کیونکہ اس صدی میں یورپ میں احیاء العلوم کی تحریک پیدا ہوئی- اس صدی سے ایک نیا یورپ جنم لیتا ہے- پرانا یورپ مرجاتا ہے یا یوں کہیے تاریکی ختم ہو جاتی ہے- اور روشنی کا آغاز ہوتا ہے- چودھویں صدی یورپ کی تاریخ میں یقیناً ایک نقطہ انقلاب ہے- اس سے پہلے مذہب کا خوف اور یاس و ناامیدی کا دور دورہ تھا- اس کے بعد یورپ میں ہمت و طاقت آ جاتی ہے- یاس و ناامیدی جاتی رہتی ہے اور لوگ پرامید ہو جاتے ہیں- اٹلی' جرمنی اور فرانس کی تعلیمی درسگاہوں میں تبدیلی آ جاتی ہے اور یکایک یورپ کی درسگاہیں طلبا سے بھر جاتی ہیں- تقلید کی بجائے تحقیق و تفتیش کا جذبہ ابھرتا ہے- صلیبی جنگوں سے یورپ کے مختلف حصے ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے اور یورپ خود مشرق کے قریب آ جاتا ہے- اور مشرقی علوم و فنون سے بہرہ ور ہوتا ہے- ایک نیا مذہب اور ایک نیا فلسفہ ابھرتا ہے- ارسطو و دیگر یونانی مفکروں اور مورخوں کی کتب لوگوں کو میسر آتی ہیں- اور چودھویں صدی میں یورپ ایک نئی ڈگر پر چل پڑتا ہے اور یہ ڈگر ترقی و کامرانی اور تحقیق و تفتیش کی ڈگر تھی-[۲۹]

چودھویں صدی میں یورپ ایک لمبے خواب سے جاگا- اس وقت یک لخت علم کی تڑپ پیدا ہوتی ہے اور دور دراز علاقوں میں لوگ علم کے بھوکے نظر آنے لگے- یہ طلب پہلے کبھی نہ تھی- تاریخ نویسی کی مشعل پرانی دنیا سے نئی دنیا کو منتقل ہوتی ہے- لورنیزو ولا (۱۴۰۶ء _ ۱۴۵۱ء) نے اپنے تاریخی نظریات سے کلیسائی دنیا میں سنسنی پیدا کر دی- اس کے علاوہ اٹلی میں لیونار دو برونی (۱۳۶۹ _ ۱۴۴۴ء Leonardo Brouni) شمالی افریقہ سے عربی ہندسے لایا- تاریخ نویسی میں اس نے نیا اسلوب اختیار کیا تھا- اس نے فلورنس کی تاریخ کو بارہ جلدوں میں لکھا- اس کا انداز تحریر کلاسیکیت' معقولیت اور انفرادیت کے لئے مشہور ہے-

پوگیو براشیولینی (۱۳۸۰ء- ۱۴۵۹ء)

وہ متواتر سات پوپوں کا سیکرٹری رہا- اس نے آٹھ جلدوں میں فلورنس کے لوگوں کی تاریخ لکھی- اس نے لاطینی طرز بیان چھوڑ کر اطالوی انداز کی طرح ڈالی-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فلیو ئیس بلونڈس (۱۳۸۸ء۔ ۱۴۶۳ء)

وہ اپنے زمانہ میں سب سے بڑا تحریک انسانیت کا عالم تھا۔ اس نے روم کے عہد قدیم کے متعلق بہت سی کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ رومی سلطنت کے زوال کے بعد کی نصرانی تاریخ کو اکتیس (۳۱) جلدوں میں لکھا۔ بلونڈس کی یہ کتابیں روم اور عیسائیت کی تاریخ کے لئے آج تک مفید و کار آمد خیال کی جاتی ہیں۔

نکولومیکاولی (۱۴۶۹ء۔ ۱۵۲۷ء)۔ فرانسسکو گیوشا ڈینی (۱۴۸۳ء۔ ۱۵۴۰ء)

یہ دونوں مورخ الحاد اور پاپائیت کی نفرت میں مشہور ہیں۔ ان دونوں مورخوں نے تاریخ نویسی کے اسلوب اور مفہوم میں نمایاں تبدیلی کی۔ تحریک انسانیت (Humanism) آہستہ آہستہ اٹلی کے باہر یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی قبولیت کے ساتھ پھیلتی گئی یہاں تک کہ سولھویں صدی کے وسط میں شمالی یورپ کے ملکوں میں اسلوب تاریخ نویسی بدل چکا تھا۔

پولی ڈور ورجل (۱۴۷۰ء۔ ۱۵۳۵ء)

یہ ایک اطالوی باشندہ تھا جو انگلستان میں آباد ہو چکا تھا اس نے ساتویں صدی انگلستان کی تاریخ لکھی۔ یہ تاریخ عرصہ دراز تک انگلستان میں بطور نمونہ کام آتی رہی۔

جوشم فان واٹ (۱۴۸۴ء۔ ۱۵۵۱ء)

سوئٹزر لینڈ میں جوشم فان واٹ نے سوئٹزر لینڈ کی تاریخ مرتب کی۔ اس نے تاریخ نویسی میں تنقیدی انداز اختیار کیا۔

رہنانس (۱۴۸۶ء۔ ۱۵۴۸ء)

فان واٹ کے جرمن ہمعصر رہنانس نے تیوتانی تاریخ پر تنقید کی۔ اسی زمانہ میں رہنانس کے دوست اراسمس نے عہد نامہ جدید اور کلیسائی کتابوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔

سکالینڈ میں جارج بوکانن (۱۵۰۶ء۔ ۱۵۸۲ء) اور فرانس میں جوزف میکیلیگو (۱۵۴۰ء۔ ۱۶۰۹ء) اس نئے اسلوب تاریخ نویسی اور درس فکر کے مدرس تھے۔ ہالینڈ نے ہوگو گروٹیئس (۱۵۸۳ء۔ ۱۶۴۵ء) کو پیدا کیا۔

سولھویں اور سترھویں صدی کے یورپ میں دینیات کے علاوہ تاریخ کے مطالعہ کے لئے دوسرے محرکات پیدا ہو چکے تھے۔ سمندری سفروں اور نئے نئے ملکوں اور راستوں کی دریافت نے تاریخ کی فضاؤں کو وسیع کر دیا تھا۔ چھاپہ خانہ کی ایجاد سے علم یورپ کے کونے کونے میں پہنچ چکا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا۔ تاریخی فکر تیز ہوئی اور تاریخی دریافتوں کا احاطہ وسیع ہوا۔ از منہء وسطٰی کی کہانیوں کی جگہ مورخوں نے ان ملکوں کے باشندوں کے عادات و اطوار اور وہاں کے معاشرتی و سیاسی اداروں کا مطالعہ شروع کیا۔ اس نوعیت کے معاشرتی مورخوں کا آغاز ہسپانیہ سے ہوا۔

گوفزا لودی اویدو (۱۴۷۸ء – ۱۵۷۸ء)، بار تولومی (۱۴۷۸ء – ۱۵۶۶ء)، فرانسیسکو دی گومارا (۱۵۱۲ء – ۱۵۷۰ء) اور انطونیو دی ہریر (۱۵۴۹ء – ۱۶۲۵ء) ان ہسپانوی مورخوں میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔

نئی دنیا کی دریافت نے یورپ کی معاشی حالت کو بدل کر رکھ دیا۔ آبادکاری، بحری تجارت اور غیر منظم تجارت نے پریشان حال لوگوں کو موقعہ دیا کہ وہ قانون اور دستور حکومت کے متعلق غور و فکر کریں۔ جغرافیائی دریافتوں اور معاشرتی عبوری دور کے علاوہ تاریخی سرگرمیوں کے لئے سب سے بڑا محرک وہ دستوری تنازعہ تھا جو ۱۵۵۰ سے ۱۴۵۶ تک رہا۔[۴۰]

جس طرح پوپ اور لوتھر میں بحث و تمحیص سے جرمنی میں تاریخ نویسی کا نیا انداز پیدا ہوا تھا اسی طرح انگلستان میں پہلے چارلس اور **ہیمپڈن** میں جو بحث و تمحیص ہوئی اس سے انگلستان میں تاریخ نویسی اور تاریخ کے مطالعہ میں ترقی ہوئی لیکن اس کے باوجود تاریخ کو جنگ کا آلہ بنایا گیا۔

سترھویں صدی کے خاتمہ اور اٹھارہویں صدی کے شروع میں تاریخ نویسی کے ساتھ فلسفہ تاریخ نے بھی اس قدر ترقی کر لی تھی کہ لوگ اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ لوگوں کو علم ہو چکا تھا کہ اگر ماضی کو سمجھنا ہے تو علم تاریخ کے بغیر ناممکن ہے اور اٹھارویں صدی میں اس علم کے فروغ کے لئے کئی ہسٹاریکل سوسائٹیاں بن گئیں۔

اٹھارہویں صدی کی تاریخ نویسی میں سب سے پہلے گیودانی ․بیٹو ویکو نے تاریخ کو میدان جنگ سے الگ کر کے ایک مطالعہ کی صورت میں پیش کیا۔ اس نے اٹھارہویں صدی میں فلسفہ تاریخ پر کتاب لکھی لیکن وہ سائنٹیفک خطوط پر تاریخ کا مطالعہ پیش نہ کر سکا۔ وہ فلسفی مورخ سے زیادہ مقنن تھا۔ اس نے تاریخ کے بارے میں جو اصول وضع کئے تھے انہیں دوسروں نے استعمال کیا۔ ان میں سب سے پیش پیش **مونٹیسکو** (۱۶۸۹ء – ۱۷۵۵ء) تھا۔ **مونٹیسکو** پر ویکو اور ابن خلدون[۴۱] کا بہت زیادہ اثر دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنی کتاب "روح القوانین" اور "عروج و زوال روما" میں انگلستان اور فرانس کے دستوروں کا قدیم رومی دستور سے موازنہ کرتا ہے۔ اس نے معاشرتی علم میں اس خیال کو پیش کر کے ایک نمایاں اضافہ کیا کہ آب و ہوا کا اداروں اور افکار پر کیا اثر ہوتا ہے؟

والٹیئر (۱۶۹۴ء – ۱۷۷۸ء Voltaire)

تاریخ نویسی میں تنقید نگاری کا شدید ترین رویہ **والٹیئر** نے اختیار کیا۔ سویڈن کے سپاہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

والٹیر نے "عالم گیر تاریخ تمدن" میں عیسائی تہذیب پر اسلامی تہذیب کے اثرات کو نمایاں کیا۔ اس نے تاریخ نویسی کے ان تمام اصولوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو فرانس میں رائج ہو چکے تھے۔ **والٹیئر** کی تاریخ نویسی کا اثر ڈیوڈ ہیوم (۱۷۱۱ء- ۱۷۷۶ء)' ولیم رابرٹس (۱۷۲۱ء- ۱۷۹۳ء)' مائیکل شمت (۱۷۹۴ء- ۱۷۳۶ء)' ایڈورڈ گبن (۱۷۳۷ء- ۱۷۹۴) اور آرنلڈ ہیرین

(۱۷۶۰ء- ۱۸۴۲ء) کی تاریخ نویسی پر ہوا۔ یہ سب کے سب مورخ اس بات پر متفق تھے کہ "تاریخ مثالوں کے ذریعہ تعلیم دینے والا فلسفہ ہے۔" تاریخ کی اس تعریف سے وہ فلسفہ تاریخ کے پرانے مکتبہ فکر سے الگ ہو گئے اور یہ نہ واضح کر سکے کہ تاریخ کس چیز کی تعلیم دیتی ہے اور اس کی تعلیم کیا ہے؟ **والٹیئر** نے "تاریخ لوئی چہار دہم" تحریر کی اور انہی تحریروں میں اسے اور اس کے عہد حکومت کو بے حد سراہا۔ لوی چہار دہم کو وہ سورج دیوتا بادشاہ (Sun King) کا نام دیتا ہے۔ اسی طرح وہ پروشیا کے فریڈرک اعظم کی تعریف و توصیف کرتا ہے۔ اور اسے ایک روشن خیال حکمران قرار دیتا ہے علاوہ ازیں اس کی "تاریخ عالم" تہذیبوں کا بہترین مطالعہ ہے۔ اس قسم کی مفکرانہ تاریخ بہت کم تحریر کی گئی ہے۔ **والٹیئر** کا کہنا ہے کہ "تاریخ وہ ہوتی ہے جو معقولیت کی راہنمائی کرتی ہے۔" **والٹیئر** نے ہر شعبہ ادب مثلاً خطوط' داستانیں' ڈرامے' ناول' شاعری اور تاریخ نویسی پر طبع آزمائی کی ہے۔ یورپ کے تمام مفکروں میں اس کا انداز بیان نہایت سادہ اور عام فہم ہے۔ وہ علماء یورپ میں سب سے زیادہ مشہور مصنف اور تنقید نگار ہے۔

دورِ عقلی سے سائنسی دور تک

جب معقولیت پسند (Rationalists) مورخوں کی جماعت سرگرم عمل تھی تو فرانس میں انقلاب رونما ہوا۔ اس انقلاب نے دوسرے علوم کی طرح تاریخ نویسی پر بھی اثر کیا۔ انقلاب فرانس کے زمانہ میں جرمنی میں نوجوان مورخوں کی ایک جماعت کام کر رہی تھی۔ اس جماعت پر روسو کے افکار کا بہت اثر تھا اور یہ جماعت **والٹیئر** کے نظریہ عقلیت کی مخالف تھی۔ ان میں زیادہ مشہور جوہن ہرڈر' جوہنس ملر' اور فریڈرک شلو تھے[۴۲]۔ انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں فریڈرک شلو نے تاریخ عالم لکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ انقلاب فرانس اور انقلابی جنگیں (۱۷۸۹ء- ۱۸۱۵ء) تاریخ نویسی کے لئے موزوں نہ تھیں۔ تاریخ کے نظریات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے۔ ان کا ساتھ دینا بہت مشکل تھا۔ جذبات کی رفتار محسوسات سے تیز تھی اور خیالات اسی تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے کہ کوئی اصول وضع کرنا محال تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وی آنا کانگریس (۱۸۱۵ء) کے بعد سیاسی رد عمل نے ادبیات میں رومانی تحریک کو پیدا کیا۔ تاریخ نویسوں کی نئی نسل اس رومانی تحریک سے وابستہ تھی اس نے **والٹیر**' روسو اور کانٹ کے نظریات کے خلاف آواز بلند کی اور ان کی افادیت سے انکار کیا۔ اس روگردانی کا مقصد تاریخ کے روایتی اور قدامت پسند نظریات کا اعادہ و احترام تھا۔ قدیم مورخین نے تاریخ نویسی کا دائرہ کار روایتی طور پر بادشاہوں اور مصلحوں کے حالات زندگی تک محدود رکھا تھا۔ اس دور میں شخصی کردار کو تاریخ کی قوت محرکہ سمجھا جاتا تھا۔ جو بادشاہ کامیاب ہوتے ان کا کردار اعلیٰ انہیں بطور ہیرو یا قوم و مذہب کے راہنما اور صوفیانہ اعمال و صفات کا حامل قرار دیا جاتا اور جو ہار جاتے ان کا کردار چھوٹا اور مذہب و قوم کی ناپسندیدہ کردار و اعمال رکھنے والا بیان کیا جاتا ہے۔ جیسے کہ سترھویں صدی کے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت میں جب شہزادہ اورنگ زیب نے (۱۶۶۰ء۔ ۱۶۵۷ء) حصول بادشاہی کے لئے جنگ کی اور کامیابی پر باپ کو قید' بھائیوں کو قتل کیا تو روایتی مورخین کے ایک گروہ نے بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے اقدامات کو بے حد سراہا۔ اسے مصلحت دین کی خاطر بہتر کارنامہ اور اسے بطور ہیرو قوم و مذہب پیش کیا۔ دوسری طرف جنگ ہارنے والے اسی کے حریف بھائی شہزادہ دارالشکوہ کے کردار کو بہت چھوٹا اور قوم و مذہب کے لئے نقصان دہ و ناپسندیدہ قرار دیا۔ ان تاریخی روایات سے شخصیت پرستی اور وراثتی اقتدار پرستی کو جنم ملا اور یہ روایات صدیوں پر محیط رہیں۔ اب وی آنا کانگریس کے بعد مورخین کی نئی نسل نے یورپ میں قدامت پسندی کے لئے احترام اور قدیم عادات و اطوار کو برقرار رکھنا چاہا لہٰذا انہوں نے ازمنہ وسطیٰ کی ہر شئے کو شان و شوکت کے لباس میں پیش کیا۔ بادشاہوں کے "سایہ خداوندی" اور "ظل سبحانی" (The Divine Right of Kings) ہونے کی تلقین کی گئی۔ جمہوریت کی جگہ قومیت کا پرچار کیا گیا۔ رومان پسندوں نے تاریخ نویسی کو از سرنو ناصحانہ انداز میں پیش کیا۔ تاریخی واقعات کو ان کی افادیت کو پیش نظر رکھ کر بیان کیا۔ ازمنہ وسطیٰ کی کلیسائی زندگی کو خوش نما رنگوں میں پیش کیا اس زمانہ کے مورخوں نے ماضی کو کھوئی ہوئی جنت بتایا۔ انہوں نے پرانے اور فرسودہ افکار و روایات کو نئی زندگی پر ترجیح دی اور انہیں از سرنو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ انسانی معاشرے کو انقلاب فرانس سے آگے نہیں لے جانا چاہتے تھے۔ ان کے نظریات کے مطابق یورپ نے کلیسا اور ازمنہ وسطیٰ کے تمدن و تہذیب کو ترک کر کے بہت بڑی تباہی مول لی ہے۔ انہوں نے ازمنہ وسطیٰ کے مذہب و تمدن اور معاشرتی روایات کو روح حیات بیان کیا۔ انہوں نے ہر اس چیز کی مخالفت کی اور برا سمجھا جسے انقلاب فرانس نے پیدا کیا تھا۔ اس رومانی تحریک سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ یورپ کے ازمنہ وسطیٰ کے نظریات تاریخ کو کھل کر اور واضح طور پر دنیا کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ تاہم رومانی تاریخ نویسی ایک غلط تحریک تھی۔ اس نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قدیم مردوں کو دفن کرنے کی جگہ انہیں زندہ کرنا چاہا۔

تاریخ نگاری کے اس جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ ہیروڈوٹس سے **گبن** تک جس قدر نامور مورخ تھے وہ تاریخ کو سائنس کا درجہ نہ دے سکے۔ اگرچہ تھیوسی ڈائیڈز' پولی بیوس' ابن خلکان' ابن خلدون اور اٹھارہویں صدی کے چند ایک مورخ تاریخ کو سائنس کا درجہ دینے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ تھیوسی ڈائیڈز اور پولی بیوس نے سیاسی مقاصد کے لئے تاریخ لکھی۔ از منہ وسطٰی کے عربوں نے دینی مقاصد و نظریات کے لئے تاریخ لکھی۔ یورپ کے دور احیاء کے مورخوں نے قومیت اور وطنیت کے پیش نظر تاریخ نویسی کی۔ تاہم اٹھارہویں صدی کے یورپی مورخ **والٹیئر** سے گبن تک معتقدات کی والہانہ حمایت سے گریز نہ کر سکے۔ انہوں نے جو کچھ تحریر کیا وہ تاریخ سے زیادہ داستان گوئی ہے۔

جب رومان پسند مورخ از منہ وسطٰی کے تاریخی نظریات کی تلقین کر رہے تھے تو تاریخ نے اپنا سفر جاری رکھا اور انیسویں صدی میں پہنچ کر مورخوں نے تاریخ کو سائنس کا درجہ دے دیا۔ تاریخ سائنسی نظریات کے بارے میں اٹھارہویں صدی میں انگلستان' فرانس' جرمنی' اور اٹلی میں کام ہوتا رہا اور اس سلسلہ کی چند ایک کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ یہ عمل ذرائع تاریخ کو ترتیب دینے کا تھا۔ ہر ملک نے اپنی قدیم دستاویزات کو تلاش کیا' مرتب کیا اور شائع کیا۔ انیسوں صدی کے یورپ میں حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ سائنٹیفک تاریخ نویسی کے لئے مواقع پیدا ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقت کو افسانہ سے' صداقت کو پروپیگنڈا سے اور فلسفہ کو کہاوت سے الگ کر دیا گیا۔ چنانچہ ہیرن شا اٹھارویں صدی کی تاریخ کے تین نقائص واضح کرتا ہے:

(ا) غلط مقصد (۲) غلط تصور اور (۳) غلط انداز۔

وہ تاریخ کے ان تینوں نقائص کی نشاندہی کرنے کے بعد اٹھارہویں صدی کے تاریخی نظریات کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس زمانہ میں

> "تاریخ کو محض تاریخ سمجھ کر پڑھا جاتا تھا۔ تاریخ کے مطالعہ کا مقصد ماضی کی بڑی بڑی تحریکوں کے اسباب اور نتائج دریافت کرنا تھا۔ اس کا مطالعہ کسی سیاسی یا دینی تحریک کی حمایت یا مخالفت کے لئے کیا جاتا تھا۔ **والٹیئر** نے اپنا تمام علم و فضل کلیسا کی مخالفت میں صرف کر دیا۔ ہیوم ایسا فلسفی بھی اپنی "تاریخ انگلستان" ٹوری پمفلٹ بنائے جانے سے باز نہ رکھ سکا۔ تھامس کارلائل کے امریکی دوست آر۔ ڈبلیو ایمرسن نے یہاں تک لکھ دیا تھا کہ جب انگریز یونان اور روم کی تاریخ لکھتے ہیں تو اسے بھی "پارٹی پمفلٹ" بنا دیتے ہیں۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اٹھارہویں صدی کی تاریخ کے بارے میں ہیرن شا مزید بیان کرتا ہے کہ:

"تاریخ زیادہ طور پر مقامی، ذاتی، سطحی، حزبی تھی- ہر ملک کی علیحدہ علیحدہ تاریخ لکھی جاتی تھی- یورپ کو کل کی حیثیت نہیں دی گئی تھی- یہی حالت دوسرے ملکوں کی تھی- حزبی اس لئے کہ سیاست اور دین سے باہر ہو کر تاریخ نہیں لکھی جاتی تھی معاشی تحریکوں اور سماج کی تبدیلیوں کو بالکل نظرانداز کر دیا جاتا تھا- سائنس اور آرٹ کا تاریخ کی کتابوں میں ذکر نہیں کیا جاتا تھا- ذاتی اس لئے کہ اس زمانہ کی تاریخ نویسی میں بادشاہوں، تاجداروں، رؤساء اور سپاہیوں کا تذکرہ ہوتا تھا_ عوام کو نظرانداز کر دیا جاتا تھا- سطحی اس لئے کہ بڑی بڑی تحریکوں کے اسباب کی جستجو میں "تحقیق سے کام نہیں لیا جاتا تھا-"

وہ آخر میں تاریخ نویسی کے بارے میں بیان کرتا ہے کہ:

"اس زمانہ کی تاریخ نویسی کا انداز بھی غلط تھا- ذرائع کی تلاش میں زیادہ ذرائع صرف نہیں کئے جاتے تھے- اور حاصل شدہ ذرائع پر تنقید نگاری سے کام نہیں لیا جاتا تھا- تاریخ نگاری کا سارا انداز غلط اور شک پیدا کرنے والا تھا-"

تاریخ نویسی میں نئے نظریات کا آغاز ۱۷۹۵ء میں وولف کی "تمہید ہومر" سے ہوتا ہے- یہ کتاب اگرچہ ایک ادبی تھی مگر اس میں ان اسباب کو پیش کیا گیا تھا کہ جن کی بنا پر یہ گمان ہو سکتا ہے کہ "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" ہومر کی لکھی ہوئی نہیں تھی بلکہ انہیں ترتیب دینے والا ایک ادارہ تھا- وولف کے اس انقلابی رسالہ نے تاریخ نویسوں میں سنسنی پیدا کر دی تھی- وولف کے شاگرد آگسٹس بوخ نے اپنے استاد کے طریقہ استدلال کو تاریخ کے حوادث و واقعات پر منطبق کیا- بوخ سے زیادہ وولف نے نیبھر کو متاثر کیا- بوخ نے وولف کے طریقہ استدلال کو تاریخ یونان پر منطبق کیا اور نیبھر نے وولف کے طریقہ استدلال کو تاریخ روم پر منطبق کیا-

تاریخ کے اس نئے نظریئے کو پیش کرنے میں جرمنی کا بہت زیادہ حصہ تھا- لیوپولڈ فان رانکے اس نئے نظریہ تاریخ کا راہنما تھا- اس نے تاریخ کو غیرجانبداری سے پیش کرنا اپنا فرض اولین بنا لیا- اس نے طویل زندگی پائی اور وہ عمر بھر بھرپور محنت کرتا رہا- پچاس سال کی عمر میں وہ اندھا ہو گیا تھا لیکن اس پر بھی اس نے "تاریخ عالم" لکھوانی شروع کرائی- موت سے پہلے وہ سات مکمل جلدیں لکھوا چکا تھا- اس نے ۹۱ سال کی عمر میں ۱۸۸۶ء میں وفات پائی-

تاریخ نویسی کا یہ نیا نظریہ و اسلوب بہت جلدی جرمنی سے فرانس، انگلستان اور امریکہ جا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہنچا۔ روس میں سولو فیف نے اس نئے نظریہ کی پیروی کی۔ ان ملکوں کے علاوہ یورپ کے ہر ملک میں تاریخ کے اس نئے نظریئے کے حامی مورخوں کے گروہ پیدا ہو چکے تھے۔ ان میں سے کئی ایک تو وطنیت و قومیت کے جذبات کا شکار بھی ہوئے۔ تاریخ کے غیر جانبدرانہ نظریات و رویئے کی ترقی و ترویج کے لئے زیادہ جذبات و ذرائع مہیا ہو جانے کی وجہ سے تاریخ نویسی کے انداز میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ تاریخ کا شخصیت پرستی کا روایتی قدامت پسندانہ نظریہ جس کے مطابق تاریخ محض شاہی خاندانوں' حکمرانوں اور روسا' کے حالات زندگی تک محدود تھی اب ختم ہو گیا۔ اس سلسلہ میں شخصیت پرستی اور قدامت پسندی کے نظریہ تاریخ کا آخری حامی تھامس کارلائل تھا۔ وہ بڑے لوگوں کے حالات رقم کرتے ہوئے انگریزی ادب کی تمام اصطلاحیں ختم کر دیتا ہے جبکہ عام لوگوں کی تاریخ لکھنے کے لئے اس کے قلم سے نفرت ٹپکتی ہے۔

جمہوریت کی روئیدگی' اشتراکیت کے پھیلاؤ' معاشی دباؤ اور انیسویں صدی کی دوسری تحریکوں نے تاریخ نویسی کو ایک نیا نظریہ دیا۔ جرمنی میں روشر اور فرانس میں ایونل نے عوام کی زندگیوں کو تاریخ کا موضوع بنایا۔ انیسویں صدی کے مورخ تاریخ کے نظریوں کے متعلق اگرچہ متفق نہ ہو سکے تاہم وہ انیسویں صدی کے سب سے زیادہ طاقتور نظریہ ارتقاء سے کسی نہ کسی طرح متاثر ضرور ہوئے ہیں۔

نظریہ ارتقاء کوئی نئی دریافت نہیں تھا۔ یہ نظریہ اتنا قدیم تھا جتنا افلاطون (۴۶۸ - ۳۸۴ ق م)۔ افلاطون نے اپنے اسی نظریہ کی وجہ سے شہرت دوام حاصل کی۔ اس کے اس فلسفہ کو حقیقت (Realism) بھی کہتے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ صرف تصورات ہی مستقل اور حقیقی ہیں۔ جب انسانی ذہن جماعتوں اور تعریفوں کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کا سروکار افراد یا جذبات سے نہیں ہوتا بلکہ نمونوں (Types) اور تصورات سے۔ قدرتی اشیاء تو ہر لحظہ بدلتی ہیں صرف تصورات اور اعیان کو ہی استقلال و مدانمت حاصل ہے لہٰذا یہی حقیقت کے مالک ہیں۔

افلاطون کے بعد اس نظریئے کا سب سے بڑا حامی ارسطو (۳۸۴ - ۳۲۲ ق م) تھا۔ ارسطو ایک نیچرلسٹ تھا اور اس نے استخراجی منطق کی بنا ڈالی۔ ازمنہ وسطیٰ میں مسلم مفکرین نے تخلیق کائنات کے متعلق بہت سے تدریجی نظریات پیش کئے جو چوتھی صدی میں سینٹ گسٹانن کے پیش کردہ نظریات کے ساتھ قریبی مماثلت رکھتے ہیں۔ یورپ تحریک احیائے علوم کے دور میں اس نظریئے سے پہلی بار متعارف ہوا۔ برونو (۱ - ۱۶۰۰) کو اس نظریہ کی اشاعت و تبلیغ کی پاداش میں ردم میں زندہ جلا دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد یورپی مفکروں میں اس نظریئے کو بہت اہمیت و مقبولیت حاصل ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ یہ انیسویں صدی کا سب سے زیادہ طاقتور نظریہ بن گیا۔ فریڈرک ہیگل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱۸۳۱ء- ۱۷۷۰ء) نے نظریہ ارتقاء کو تاریخ عالم کی کلید بنا دیا۔ اس نے نسل انسانی کے سیاسی ارتقاء کے سارے عمل کو تصور کل کی طرف بڑھتے ہوئے بتایا۔ اس نظریئے کا اطلاق ریاست کے وجود پر کیا اور ریاست کی ترقی کا زینہ قرار دیا۔ ہیگل نے اپنے نظریہ ارتقاء کو جدلیت (Dialect) کے روپ میں دنیا کی ہر شئے پر لاگو کیا۔ ہیگل کا خیال ہے کہ "تاریخ علوم کی شاخوں میں سے ایک ایسی شاخ ہے جو معقولیت (Rationality) کو سمجھتی ہے۔ اور یہ جدلیاتی طریقہ کی تفصیل ہے"۔ ہیگل کے نظریہ جدلیت نے تاریخ کو نئی زندگی، نئی روح، نئی راہ اور نیا فلسفہ بخشا۔ اس کے نظریہ تاریخ کا اثر یہ ہوا کہ جرمنی متحد ہو کر عظیم عالمی طاقت بن گیا۔ وہ نظریہ جدلیت کا عظیم مبلغ تھا۔ بیسویں صدی کی تاریخ پر یہ نظریہ چھایا ہوا ہے۔ اور اس صدی کی تاریخ نویسی میں جدلیت کی روح کار فرما ہے۔

بیسویں صدی میں مورخوں اور فلسفیوں کے علاوہ دوسرے علوم کے مفکروں نے بھی جدلیاتی ارتقاء کے نظریہ کو اپنایا ہے۔ بعض مفکروں پر تو اس نظریہ نے بہت زیادہ اثر کیا ہے۔ انہوں نے اپنے تمام افکار کو اس نظریہ کے تابع کر کے پیش کیا اور انکی حیثیت کو منوانا چاہا۔ کئی مورخوں، فلسفیوں، اور مفکروں نے تو اس نظریہ سے محض اپنی علمی شان کو برقرار رکھنا چاہا اور کئی ایک نے اس سے ڈھال کا کام لیا۔ لیلیٰ اور ڈارون نے اس نظریہ کو ارضیات اور حیاتیات پر منطبق کیا۔

انیسویں صدی کے دوران تاریخ نویسی آزاد ماحول میں پھلنے پھولنے لگی۔ یہ جابرانہ پابندیوں کی غلام نہ رہی اور تمام بندشیں ختم ہو گئیں۔ بیسویں صدی کے شروع میں تاریخ فلسفہ جمہوریت سے متاثر ہوئی اور اس نظریہ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوتی گئی یہاں تک کہ انسانوں کے اعمال و افکار، حوادث و واقعات تاریخ کی لپیٹ میں آ گئے۔ اور تاریخ کا مطالعہ عمرانی علوم میں شامل ہو گیا۔

عمرانی علوم میں سے معاشیات، تاریخ سے بہت زیادہ قریب ہے۔ اسی قربت کے پیش نظر کارل مارکس (۱۸۸۳ء- ۱۸۱۸ء) نے تاریخ کا معاشی نظریہ پیش کیا۔ اس نظریہ کو تاریخ کا مادی نظریہ یا تاریخی مادیت بھی کہتے ہیں۔ اس نظریہ سے یہ مراد ہے کہ انسان کے معاشرتی ارتقاء میں معاشی عناصر کا بہت بڑا حصہ ہے۔ تاریخ کا معاشی نظریہ انیسویں صدی کی دریافت نہیں۔ افلاطون اور ارسطو کی تحریروں میں اس نظریہ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ تصوراتی سوشلزم کے حامیوں نے بھی اس نظریہ کا پرچار کیا ہے اور اس پر بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ لیکن کارل مارکس اور ان تصوراتی سوشلسٹوں میں نمایاں فرق تھا۔ کارل مارکس نے مادی نظریہ تاریخ کو انسانی تہذیب کی تاریخ پر منطبق کرنے کے بعد طبقاتی جنگ میں آنیوالی تاریخ کو پیش کیا۔ مارکس نے جدلیاتی مادیت کو ایک سائنس کی صورت میں پیش کیا اور ہیگل کی ارتقائی جدلیات پر تاریخ عالم کا نظریہ پیش کیا۔ ہیگل کی تصوریت کو وجودیت میں بدل کر اسے ایک انقلابی آلہ کے طور پر استعمال کیا۔ مارکس کے نزدیک تاریخ معاشی عمل کا نام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ ذرائع پیدائش سے تمام سماج کی ترکیب و تشکیل ہوتی ہے۔ ذرائع پیدائش میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ سماج میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

تاریخ کے سارے تسلسل میں معاشی عنصر غالب رہتا ہے۔ مارکس کے اس نظریہ سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ انسان معاشی مقاصد کے علاوہ جدوجہد بھی نہیں کرتا۔ مارکس اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ انسانی معاشرہ کی تشکیل میں معاشی اسباب کے علاوہ دوسرے عناصر بھی کار فرما ہوتے ہیں۔ مارکس نے انسانی تاریخ و تہذیب کے لئے اس نظریہ کو قانون کی صورت میں پیش کیا۔ چونکہ انسانی سرگریوں کا تعلق ذرائع پیدائش سے ہے۔ اس لئے مارکس کے نزدیک انسان کی انفرادی ہستی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مورخ تاریخ نویسی کرتے چلے آ رہے تھے۔ ماہرین معاشیات معاشی حوادث کے اسباب و علل کا تجزیہ کیئے بغیر انہیں پیش کرتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن مارکس نے درباری مورخوں اور اجیر ماہرین معاشیات کے تراشے ہوئے اصول ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ساری انسانی تاریخ ذرائع پیدائش کے تغیر سے پیدا ہوتی رہی ہے۔ اور یہ کہ تاریخ کے حوادث کا تعلق خواہ تاجر سے ہو یا عوام سے ان کے ظہور کا سب سے بڑا سبب معاشی ہوتا ہے۔ مارکس کے زمانہ میں بہت سے مورخ تاریخی حوادث کے اسباب کی تلاش میں مصروف تھے لیکن مارکس نے ایسا نظریہ پیش کیا جسے نہ تو اس کے پیش رو اور نہ ہی ہمعصر مورخ اور ماہرین معاشیات سمجھ سکے۔ مارکس اپنی کتاب "فلسفہ افلاس" میں لکھتا ہے۔

> "ماہرین معاشیات اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ پیدائش کیونکر ہوتی ہے لیکن وہ اس امر کو فراموش کر دیتے ہیں کہ تعلقات کیونکر پیدا ہوتے ہیں یعنی وہ اس تاریخی حرکت کو بھول جاتے ہیں جس سے یہ تعلقات قائم ہوتے ہیں۔"

مارکس کے جدلیات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان نظریات کو معاشرے اور تاریخ میں کس قدر اہمیت حاصل ہو سکتی ہے۔ بیسویں صدی کے سائنسی دور کا عظیم مفکر آسولڈ سپنگلر (۱۸۸۰ء - ۱۹۳۶ء) تھا جس نے عالمی تاریخ کا سائنسی بنیادوں پر نظریہ پیش کیا۔ اس نے نامیاتی اصولوں کا اطلاق تاریخ اور انسانی تہذیب پر کیا۔ بیسویں صدی کے اس علمی دیوتا نے اپنی کتاب "زوال مغرب" سے یورپ اور امریکہ میں طوفان برپا کر دیا۔ اس کے نزدیک اتحاد، معاشی سامراج اور اشتراکیت ایک ہی کل کے اجزا ہیں۔ وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ہم ماضی کے مطالعہ سے مستقبل کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس نے پہلی مرتبہ تاریخ کو اس انداز میں پیش کیا کہ گویا یہ پہلے سے تحریر شدہ ہے۔ وہ تاریخ میں سلسلہ کی تقسیم کا قائل نہیں مثلاً قدیم، ازمنہ وسطیٰ اور جدید۔ وہ ساری انسانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاریخ کا زمان و مکان کی قید سے آزادانہ مطالعہ کا قائل تھا۔ وہ کئی صدیوں کی تاریخ کو ایک جملہ میں ختم کر دیتا ہے:

> "یونانی حدود کے قائل تھے اور مغربی یورپ والے لا محدودیت کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یونانی تاجروں کے جہاز دور دراز ملکوں تک نہ جا سکے۔ لیکن مغربی یورپ کے رہنے والوں نے اپنے جہازوں کے بادبانوں کو لا محدودیت کے لئے پھیلا دیا۔"

بیسویں صدی کے نامور مورخ ٹائن بی (۱۹۷۶ء-۱۸۸۹ء) نے قومی ثقافت کا **بحیثیت** تاریخی قوت کے ادراک کیا اور تہذیبوں کے ٹکراؤ کو تاریخی ارتقاء کا سبب قرا دیا۔ ٹائن بی نے بادشاہوں کے شخصی کردار کی جگہ ثقافتی کردار کو تاریخ کی قوت محرکہ قرار دیا۔ اس کے نزدیک طاقتور تہذیب وہ ہوتی ہے۔ جس میں تنظیم، اتحاد اور شعور کی پختگی موجود ہو۔ ٹائن بی کے ان نظریات سے تاریخ میں **داخلیت** پرست رجحانات کو فروغ ملا۔ ٹائن بی سے پہلے روسو اور ہابز جیسے انقلاب فرانس کے بانیوں نے انسانی حقوق کے نام سے ایک نئی تاریخی قوت دریافت کی اور معاہدہ عمرانی کے نام سے نئی ثقافت کی بنیادیں دریافت کیں۔ ان کے نزدیک وہ ثقافت زیادہ طاقور ہوتی ہے جس میں زیادہ سے زیادہ انسانی حقوق کا تحفظ ہو۔ وہ انسانی حقوق کو تاریخ کی قوت محرکہ ٹھہراتے ہیں۔ ٹائن بی کے نظریہ تہذیب و ثقافت نے اقوام عالم میں انسانی حقوق اور جمہوریت کی لہر پیدا کی جس سے عالمی تہذیب و ثقافت کو ایک نیا نظریہ تاریخ یعنی "تہذیبی ارتقاء" کا نظریہ ملا۔ اس سے عالمی ثقافت کو ایک نئی سطح حاصل ہوئی ہے۔

ہم نے دیکھا کہ مختلف ادوار میں مختلف نظریات تاریخ کی قوت محرکہ رہے۔ دنیا میں کتنے انقلابات رونما ہوئے مگر ہر انقلاب کی اٹھنے والی لہر تاریخ کے بہتے ہوئے دھارے میں جذب ہو گئی۔ تاریخ کا ارتقائی تسلسل بتدریج جاری رہا۔ ماضی حال سے اس طرح ملا ہوا ہے کہ اس کی حد فاصل عمل تقسیم سے بالا تر ہے۔ دنیا کے حوادث و انقلابات اتنے متنوع ہیں کہ ہر ایک کا اثر تاریخ پر مختلف ہوتا ہے۔ میرے نزدیک تاریخ سیاست و غارت گری کا بازار نہیں بلکہ انسانی تاریخ لوگوں کی ہے اور یہ انسانی ذہانتوں اور فطانتوں سے عبارت ہے۔ یہ ان گمنام مردوں، عورتوں، موجدوں، **سائنسدانوں** مدبروں، شاعروں، آرٹسٹوں، راگیوں، فلسفیوں، صوفیوں اور مورخوں کی ہے کہ جنہوں نے انسان اور دنیا کو سمجھا اور جنہوں نے انسان کی خدمت کی اور اس کی دنیا تعمیر کی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چوتھا باب

حوالہ جات

۱- Thomas Carlyle, On Heroes and Hero - worship, P. 39.

۲- Bertrand Russel, A. History of Western Philosophy. (New York, 1945). P. 119.

۳- صادق علی گل- سرگذشت تاریخ ص ۸- ۱۸۷، ۱۶۷

۴- ملاحظہ ہو Legacy of Greece. P. 251

۵- ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی دنیا کی اولین عظیم رزمیہ کتابیں ہیں۔

۶- مائی کنی تمدن Mycenae Culture

۷- ایلیڈ کے آخر میں اہل آکیا (Achaeans) اور اہل ٹرائے (Trojans) کی جو فہرست دی گئی ہے وہ غالباً گیارھویں یا بارھویں صدی قبل مسیح کی کوئی بہت پرانی جغرافیائی دستاویز ہے۔ جس سے اس زمانے کے سیاسی جغرافیے کا پتہ چلتا ہے۔ ملاحظہ ہو ایلیڈ' (۲) (۴۹۴ - ۸۷۷)

۸- Guy lushington Prendergast, Concordance to Iliad, (London, 1875), P.416; Henry Dunbar, Concordance to Odyssey and Hyns, (Oxford, 1880), P. 424; Victor Terret. Homere, (Paris, 1898); Thomas Day seymour, Life in the Homeric Age (London1907), P.720; Andrew Long. The World of Homer, (London, 1910), P.324; Walter Leaf, Homer and History, (London, 1915), P.321.

۹- مغربی ایشائے کوچک کا یونانی جزیرہ۔

۱۰- پانچویں صدی قبل مسیح کا وہ پہلا فلسفی مورخ جس نے ہومر کے کام کی اہمیت کو متعارف کرایا اور اس کی قدرواہمیت کو تقویت دی۔

۱۱- ملاحظہ ہو۔ L. W. King, History of Babylon, (New York, 1915), P. 302.

۱۲- اولمپک کھیلوں کا آغاز ۷۷۶ قبل مسیح میں ہوا

۱۳- ہیلی کارنسوس Halicarnassos کاریہ میں جزیرہ کوس سے بالکل متصل ہے۔

۱۴- ہوائیں' پانی' اور مقامات کے بقراطی رسالے میں بھی غدیری آبادیوں کی طرف مختصر اشارات موجود ہیں۔ یہ گاؤں فاسس (Phasis) جس کا ذکر ہیروڈوٹس نے کیا ہے مقدونیہ میں بحیرہ اسود کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مشرق میں واقع ہے۔

۱۵- W. W. How and J. Wells, Commentary on Herodotus (Oxford, 1915), Vols; I.' J. T. Shotwell, An Introduction to the History of History, (Oxford, 1922), PP. 144, 61; Jonathen Wright, The Science of Herodotus, (1923), Scientific Monthly, PP. 16, 638–648; Joseph Well; Studies in Herodotus, (Oxford, 1923), P, 238; Terrot Eaveley Glover, Herodotus, (California Univ., 1924). P. 316; Archibakd Henry Shce, The Egypt of Hebrews and Herodotus, (London 1854), P. 683.

۱۶- History of Herodotus, P. I

۱۷- M. L. W. Laistner, Greek History. P. 368.

۱۸- بعض مورخوں کا خیال ہے کہ ہیکاٹیس ہیروڈوٹس کا فن تاریخ نویسی میں استاد ہے۔

۱۹- جنگ پیلوپونیسیا Peloponnesia ۴۳۱ سے ۴۰۳ تک جاری رہی۔ تھیوسی ڈائیڈز ۱۷ کی تاریخ ۴۱۱ پر ختم ہو جاتی ہے۔ جنگ کا خاتمہ اسپارٹا کی سیادت پر ہوا۔

۲۰- تھیوسی ڈائیڈز کی تاریخ فصل دوم میں طاعون اثینیہ کی تباہی کا پورا پورا حال مذکورہ ہے جو ۴۳۰ اور ۴۲۵ کے درمیان شہر اثینیہ میں طاعون سے پھیلی اور جس کی اصلیت پر بڑی بڑی بحثیں کی گئی ہیں۔ یہ وبا دو مرتبہ پھیلی۔ پہلی بار دو برس تک اور دوسری بار تقریباً ڈیڑھ سال کے وقفے کے بعد پھر اس کا ظہور ہوا۔

۲۱- Jame Harrison, Primitive Athens as described by Thucydides, (Cambridge, 1906), P. 180; Francis Macdonald Cornford, Thucydides Mythhistoricus, (London, 1907), p. 268; Alfod Eckhard Timmern, The Greek Commonwealth: Politics and Economics in Fifth Century Athens, (Oxford, 1922), Bd,ed, p. 462; J. T. Shotwell, History of History, (London, 1922), PP. 162–78.)

۲۲- Wilhelm Gemoll, ed., Anabasis, (Paris, 1908), P. 640.

۲۳- Hellenica

۲۴- Mantinea

۲۵- Jose Forderer, Ephoros and Strabon, (Tubingen, 1910), P. 79.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۶- ہیلینکا' ہسٹوریا یا سونٹا کنسر ہیلی نیکون بھی اس کی دیگر تاریخ کی کتب ہیں

۲۷- فلی پیکا۔

۲۸- فلسفہ افلاطون کا پیرو کار۔

۲۹- زیادہ صحت کے ساتھ یوں کہیئے کہ ۴۴۰ ق م تا ۱۶۸ ق م سے گو اس کا سلسلہ ۱۴۶ ق م تک محدود ہو جاتا ہے زیادہ تر فصول ۱-۵ ہی محفوظ ہیں اور فصول ۱۸۶ کے بعض اقتباسات صرف ایک مخطوط (Urbinas, ۱۰۲) سے ملے ہیں۔ باقی فصلوں کا علم ان اقتباسات سے ہوا جو Constantinos Prophyrogennetos کی تاریخی جامع میں ملے (دسویں صدی کا دوسرا نصف) اور یہ مبحث وار مرتب کر دیئے گئے ہیں۔

۳۰- J. T. Shotwell, History of History, PP. 191 - 201.

۳۱- The Histories of polybius, (New York, 1889), P. 114.

۳۲- H.J. Rose, The Roman Questions, (Oxford, 1924), P. 220.

۳۳- Ablativas اسم کی اخراجی کو کہتے ہیں جس سے فعل کے ماخذ وغیرہ یعنی سے' کے مستفاد ہوتے ہیں۔

۳۴- سیزر کی تاریخ Comentarii ملاحظہ ہو

Warde Fowler, Julius Caesar and the foundation of the Roman Imperial syste, (London, 1901); T. Rice Holes, Caesar, Conguest of Gaulf, (London, 1899), P.888; and Ancient Britzin and Imyasions of Julius Caesar, (Oxford, 1907), P. 780.

۳۵- فصول اول و سوم ضائع ہو چکی ہیں۔ باقی نامکمل ہیں۔

۳۶- Livy, Early History of Rome, P. 1718

۳۷- Complete Works of Tacitus (Modern Libray), P. 7.

۳۸- ہیومنزم (Humanism) ایسا فلسفہ انسانیت ہے جس کی رو سے انسان کی ذات کائنات کا مرکز ہے اس فلسفہ کا پیرو کسی مافوق الادراک ہستی کا قائل نہیں ہوتا بلکہ انسانی فلاح و بہبود کی کوشش کی ذریعہ نجات خیال کرتا ہے۔

۳۹- Rantdil, The Universiteis of Europe in the Middle Ages, (Oxford, 1936), PP. 30, 32, 352.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۰- ان دستوری کشمکشوں میں تین اہم حیثیت رکھتی ہیں:

۱- ڈچ نیدر لینڈز نے ہسپانوی فلپ کی دست برد سے اپنی خود مختاری کو بچانا چاہا-

۲- دوسری کشمکش فرانس کے بادشاہ اور اس کے جاگیرداروں میں تھی اور

۳- تیسری کشمکش انگلستان کے سٹورٹ بادشاہوں اور پارلیمنٹ میں تھی-

۴۱- علم سوشیالوجی کو بطور ایک مضمون یا علم سب سے پہلے پیش کرنے کا فخر ابن خلدون کو حاصل ہے

۴۲- John Herder. Reflection on the philosophy of the the Swisss Miller, History of Confederation; Frederick Schuler, History of humanity; Johnson (i) Thirty years War (ii) Wiltger Chichte

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پانچواں باب

تاریخ اور مسئلہ اسباب

THE PROBLEMS OF THE CAUSATION IN HISTORY

تعریف

سبب کی جمع اسباب ہے۔ لغوی طور پر اس سے مراد کسی شے کی وجہ، دلیل، کارن، وسیلہ، حجت، علت واسطہ، جوڑ، منشاء، پیوند، طریقہ، ذریعہ، وسیلہ اور قانون ڈھونڈنا ہے۔ یا ایسی چیز جو دو چیزوں کو ملائے۔ علم عروض کی اصطلاح میں سبب سے مراد دو حرفی کلمہ ہے۔ فلسفے کی اصطلاح میں سبب سے مراد وہ چیز جس سے دوسری چیز کا وجود حاصل ہو یا ظاہر ہو۔ تاریخی اصطلاح میں سبب سے مراد کوئی عمل جو کسی شئے کی ترغیب کا باعث بنے یا وہ ثبوت جو واقعات و حالات سے فراہم ہوتا ہے۔

عام اصطلاح میں سبب (Cause) سے مراد علت یا معقولیت (Reason) ہے جو کسی واقعہ کے عمل میں آنے کی حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے۔ سبب وہ عمل ہے جو واقعات و حوادث کا کھوج لگانے میں مدو معاون ثابت ہوتا ہے۔ دیگر الفاظ میں ہم لفظ سبب کی یوں تعریف کر سکتے ہیں کہ یہ وہ شعلہ (Spark) ہے جس کے ذریعہ سے ہم حقائق و حوادث کا پورا الاؤ روشن کرتے ہیں اور انسانی عقل سے ہر واقعہ کا سبب تلاش کرتے ہیں۔

مورخ اور محقق کا واسطہ صرف تاریخی اعمال سے ہی نہیں ہوتا بلکہ اسے ان اعمال کی تلاش میں یہ دریافت کرنا ہوتا ہے کہ "کیا ہوا؟" "کیونکر ہوا؟"، "اور کیسے ہوا؟" حقائق کی تلاش میں اس کا براہ راست واسطہ "کیا، کیوں، کب اور کہاں" (What, Why, How and Where) سے پڑتا ہے یعنی عراق نے ۲ اگست ۱۹۹۰ء میں کویت پر کیوں کر قبضہ جمایا؟ امریکہ اور اس کے ۳۵ اتحادی ممالک نے خلیج میں افواج کا کیسے اجتماع کیا؟ اور ۱۶ جنوری ۱۹۹۱ء میں خلیج فارس میں عراق پر امریکی حملے کے نتائج کیا ہوئے؟ یہ تمام اعمال و حالات کیونکر وقوع پذیر ہوئے؟ جب تک مورخ اور محقق کو واقعات کا کھوج لگانے کے لئے اس "کہاں" کا جواب نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مل جاتا وہ ہرگز مطمئن نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ ماضی کی اس "کیوں" کی روشنی میں حال اور مستقبل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ حقیقت کو پایا جا سکے[1]۔

جب انسان واقعہ گر ہے تو وہ ان واقعات کے اسباب بھی با آسانی معلوم کر سکتا ہے اور ٹھوس واقعات اسباب کے ساتھ پیش کر سکتا ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اصل **مسبب** انسان ہے واقعہ نہیں' لیکن واقعہ گر خدا اور انسان دونوں ہیں۔ لیکن تاریخی واقعات عموماً ایک سے زائد وجوہات کے حامل ہوتے ہیں۔ بعض اوقات معمولی سا واقعہ بھی نہایت اہم وجوہات کا مالک ہوتا ہے۔ مثلاً کسی سیب کا درخت سے گرنا بظاہر معمولی سا اور قدرتی امر ہے۔ لیکن اس کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس کا گرنا قوانین قوت ثقل (Gravitional laws) اور حیاتیاتی اصولوں (Biological Principles) کے **مسبب** ہوتا ہے۔ سیب زمین پر اس لئے گرا کہ اس کے خلیات (Cells) پر جب عمل زوال (Decay) مکمل ہوا تو زمین کی متواتر قوت ثقل نے اسے نیچے کی طرف گرا لیا۔ مورخ سیب گرنے کے روز مرہ قدرتی معمولات کی "کیوں" سے سروکار نہیں رکھتا۔ ایسا واقعہ تو آئزک نیوٹن جیسے **سائنسدان** کی تحقیق کا موضوع بن جاتا ہے۔ جبکہ مورخ کا تعلق انسانی سرگرمیوں کی علت اور تاریخی واقعات و حوادث کی تعبیر و تاویل سے ہوتا ہے[2]۔

بعض اوقات صرف ایک وجہ (Cause) بھی کسی خاص تاریخی واقعہ یا حادثہ کی نشاندہی کے لئے کافی ہوتی ہے۔ مثلاً **لینن** کے غیر معمولی اور نادر کردار و اعمال سے (Phenomenon of Lenin) ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس پر روشنی پڑتی ہے۔ بورس **یلسن** (سوویت صدر ۹۳-۱۹۹۲) اور گورباچوف (سابق سوویت وزیر اعظم) کے کردار و اعمال سے[3] ۲ دسمبر ۱۹۹۱ کو سوویت یونین کا ۷۴ برسوں بعد خاتمہ ہو گیا اور یہ ملک "مختلف علاقائی ریاستوں میں منقسم ہو گیا۔

سوال یہ ہے کہ ۱۹۷۰ میں متحدہ پاکستان کے واقعات الیکشن کس حد تک مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کی علیحدگی کا سبب بنے؟ پاکستانی مورخ اور محقق کے لئے یہ اسباب چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ ان میں سے ہر سبب کئی حقائق اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے اور ان حقائق کا ایک ایک حادثہ ' واقعہ ' اور مشاہدہ بے شمار وضاحتوں' تعبیروں اور تاویلیوں کا طلب گار ہے۔ یوں "اہم تاریخی تبدیلیاں اور واقعات ایک سے زائد اسباب کی نشاندہی کرتے ہیں[4]"۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بھی مورخ اور محقق اس قسم کے تاریخی مواد ' واقعات اور حادثات کی صحت و ترتیب' علت اور داخلی و خارجی پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے تو اس کے ذہن میں قدرتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طور پر "کب، کہاں، کیسے اور کیوں" (When, Where, How and why) کے سوالات جنم لیتے ہیں

۱ کب (When) سے مراد وقت ہے۔ یہ واقعہ کس دور، عہد اور وقت میں وقوع پذیر ہوا؟
۲ کہاں (Where) سے مراد جگہ ہے۔ یہ واقعہ کس خطہ، ملک، شہر اور جگہ میں رونما ہوا۔؟
۳ کیسے (How) سے مراد تفصیل ہے۔ یہ کہ واقعات کی تفصیل کیا ہے؟ یہ کیسے وقوع پذیر ہوئے۔؟
۴ کیوں (Why) سے مراد علت ہے۔ یہ کہ واقعات کے اسباب و محرکات کیا تھے؟

مورخ ایک سے زائد علوم کا ماہر ہوتا ہے۔ اور شعبہ ہائے زندگی کے مختلف پہلوؤں سے واقفیت عامہ رکھتا ہے لہٰذا وہ واقعات کی تلاش اسباب کے لئے "کب، کہاں، کیسے اور کیوں" کے وسیلوں سے مدد لے کر تفتیش و تحقیق کے عمل کو پورا کرتا ہے۔[5]

اقسام اسباب

اسباب کی کئی اقسام ہیں جو واقعات کے محرکات تلاش کرنے میں مدد دیتی ہیں[6] ۔ مندرجہ ذیل مشہور اقسام ہیں

۱۔ ضروری اسباب (Necessary Causes)
۲۔ کافی اسباب (Sufficient Causes)
۳۔ فوری اسباب (Immediate Causes)
۴۔ دور رس اسباب (Long – term Causes)
۵۔ اختصاری اسباب (Short- term Causes)
۶۔ مافوق الفطرت اسباب (Supernatural Causes)
۷۔ ڈرامائی اسباب (Dramatic Causes)

۱۔ **ضروری اسباب :** ضروری اسباب وہ ہیں جو واقعات و حادثات کی بنیادی علت اور وسائل سے بحث کرتے ہیں۔ یہ واقعات کا پہلا محرک ثبوت ہوتے ہیں مثلاً کسی قتل کے لئے آلات قتل اور سامان آمد و رفت وغیرہ۔ اسی طرح خلیج کی جنگ کے ضروری محرکات مثلاً عراق کے تیل کے ذخائر کی چوری، صدام حسین کو کویت پر قبضہ کے لئے امریکی گرین سگنل، عراق کا کویت پر حملہ و قبضہ، امریکہ اور اس کے ۳۵ اتحادیوں کی مشترکہ افواج کا اجتماع وغیرہ۔ ضروری اسباب واقعات سے اپنی جداگانہ حیثیت نہیں رکھتے

۲۔ **کافی اسباب :** بعض واقعات کے ایک سے زائد اسباب ہوتے ہیں۔ ان بے شمار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسباب کو مکمل طور پر ایک ساتھ ہی دریافت کیا جا سکتا ہے۔ کافی اسباب، ضروری اسباب کے دائرہ کار سے جداگانہ حیثیت، عمل اور اثر رکھتے ہیں۔ چونکہ یہاں پر کسی واقعہ کے لئے ایک سے زیادہ محرکات و اسباب معلوم ہوتے ہیں لہٰذا کسی نہ کسی سبب کی بدولت مورخ اور محقق مطمئن ہو جاتا ہے مثلاً انیسویں صدی کے آغاز میں برصغیر پاک و ہند میں برطانوی نو آبادیاتی نظام کے قیام کے کیا محرکات تھے؟ اتنی وسیع آبادی اور ملک پر ایک چھوٹے سے جزیرے (برطانیہ) کی کامیابی اور حکومت کسی واحد سبب کی وجہ سے قائم نہیں ہو سکتی؟ برطانوی نو آبادکاروں کو اتنے دور دراز کے علاقہ میں خطرناک حالات میں آبادکاری کے کیا محرکات تھے؟ ہندوستان کی دولت، مغلیہ سلطنت کا زوال، طوائف الملوکی، باہمی انتشار، ریشہ دوانیاں اور غداریاں انگریزی تسلط اور آباد کاری کے لئے کافی اسباب تھے۔ جدید ذرائع آمدورفت، اسلحہ اور وسائل ہندوستان پر انگریزی تسلط کے لیے "ضروری اسباب" بنے۔ جبکہ ہندوستان میں دشوار گزار راستے، سڑکیں اور ذرائع آمدورفت کے لئے پرانی طرز کی بیل گاڑیاں، گھوڑے، اونٹ وغیرہ استعمال ہوتے تھے جو جدید ایجادات کا مقابلہ نہ کر سکے اور یہی "ضروری اسباب" انگریزوں کی حکومت کا باعث بنے۔ انگریز آباد کار کامیاب حکومت اور تسلط کے لئے "کافی اسباب" بروئے کار لائے مثلاً آمدورفت کے لئے جدید راستے، سڑکیں، ریلوے، موٹر گاڑیاں، اور ہوائی جہازوں کو استعمال کیا۔ اب نا قابل عبور راستوں، پہاڑوں، صحراؤں، اور جنگلوں کو "ضروری اسباب" کے ساتھ مہینوں اور دنوں کی بجائے گھنٹوں اور منٹوں میں طے کیا جانے لگا۔ یہ جدید آلات و وسائل انگریز آبادکاروں کے لئے ہندوستان میں آبادکاری کے لئے "ضروری سبب" بنے اور ان "ضروری اسباب" کے بغیر انگریزی تسلط مضبوط و مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔

یاد رکھنا چاہئے کہ ایسے "ضروری اسباب" ہندوستان میں انگریز آباد کاروں کی آباد کاری کے لئے "کافی اسباب" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر یہ تمام اسباب مکمل طور پر قابل اطمینان اسباب نہیں کہلا سکتے۔ اس سلسلہ میں بہت سے "ضروری اسباب" کی کمی بری طرح محسوس ہوتی ہے مثلاً ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی اختلافات بھی تو انگریزوں کے تسلط کے لئے معاون اسباب بنے۔ اس سلسلہ میں غداروں اور وطن فروشوں کے کردار و اعمال "ضروری اسباب" کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ یوں اسباب کی تلاش کی فہرست بہت طویل ہے مگر ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہمیں ماضی کے واقعات سے کسی تاریخی واقعہ کے متعلق "کافی وجوہات" تلاش کرنے کے لئے ماضی کے حقائق کی تحقیق کرنی ہو گی کہ ان میں سے "ضروری وجوہات" آسانی کے ساتھ دریافت ہو جائیں اور یہ "ضروری اسباب" حقائق کی ایسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعبیر و تاویل پیش کریں کہ واقعات کی مکمل تفصیل کے ساتھ صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے آ جائے۔

۳- **فوری اسباب** : تاریخ میں زیادہ اہمیت کے حامل واقعات "فوری اسباب" کی بنا پر وقوع پذیر ہوتے ہیں جو اختصاری اسباب کے حامل ہوتے ہیں مثلاً امریکہ کی جنگ عظیم دوم میں شمولیت جاپان کی ۷ دسمبر ۱۹۴۱ء کو پرل ہاربر پر حملہ کے "فوری اسباب" کی بنا پر ہوئی۔ جنگ عظیم اول کا ۴ اگست ۱۹۱۴ کو فوری سبب ۲۸ جون ۱۹۱۴ کو سربیا کے دارالحکومت سراجیو میں آسٹریلیا کے ولی عہد آرچ ڈیوک کا قتل تھا۔

۴- **دور رس اسباب** : دور رس اسباب' واقعات کے ماضی کے محرکات کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ایک خاص پس منظر کے حامل ہوتے ہیں اور بعیدی وجوہات کے حامل ہوتے ہیں مثلاً پاکستان اور ہندوستان کی ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ کی جنگیں پس منظر میں دور رس اسباب کی حامل تھیں یعنی ان جنگوں کی تہوں میں مسلمانوں کی برصغیر پر ہزار سالہ حکومت' انگریزوں کے تسلط کے دوران ہندوؤں کی مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیاں اور مسئلہ کشمیر کار فرما تھا۔ جاپان کا پرل ہاربر پر حملہ اس کے تاریخی پس منظر میں اس پر مقتدرانہ دعویٰ کی بنا پر ہوا۔ اسی طرح عراق کا کویت پر ۱۹۹۰ء میں حملہ و قبضہ اس کے تاریخی دعویٰ یعنی عثمانیوں کے عہد میں کویت ' عراق کے صوبہ میں شامل تھا کے "طوالانی اسباب" کی بنا پر تھا۔

۵- **اختصاری اسباب** اختصاری وجوہات' فوری وجوہات کی بنا پر عمل میں آتی ہیں۔ یہ اپنے پیچھے کوئی تاریخی پس منظر نہیں رکھتیں مثلاً جب جاپان نے پرل ہاربر پر "دور رس اسباب" کی بنا پر حملہ کیا تو صدر روز ویلٹ کا کانگریس کے نام پیغام "فوری وجوہات" کی بنا پر تھا اور کانگریس کا جاپان کے خلاف اعلان جنگ اور جنگ عظیم دوم میں شمولیت "اختصاری اسباب" کی بنا پر تھا۔ جارج واشنگٹن نے امریکی عوام میں اور قائد اعظم محمد علی جناح نے مسلمانان پاک و ہند میں "اختصاری اسباب" کے وسیلہ سے جذبہ آزادی کی روح پھونکی۔ ان اختصاری اسباب نے آزادی کے الاؤ کو مانند شعلہ ہوا دے کر روشن کیا جس سے دو نئے ممالک' امریکہ اور پاکستان معرض وجود میں آئے۔ دونوں ممالک کی آزادی کے مقاصد و اسباب تسلط اغیار سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔

تاریخی مناظر کی تبدیلی کا مطلب یہ ہے کہ کسی مقصد کے حصول کے لئے ایک مدت اور وقت کا تعین کر دیا جائے جس کے دوران یہ اختصاری اسباب اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے حالات کو بنا [illegible] دیتے ہیں۔ اگر اس مقررہ مدت میں اختصاری وجوہات اپنا اثر و رسوخ بروئے کار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہ لائیں یا کوئی قابل قدر تبدیلی وقوع پذیر نہ ہو تو حالات بگڑ جاتے ہیں اور پھر یہی حالات اس طرح اسباب کے بے شمار شعلے بن کر بلند ہوتے ہیں اور ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لیکر خاکستر کر ڈالتے ہیں۔ جس طرح آگ کو روشن کرنے کے لئے ایندھن' آکسیجن اور حرارت کا ہونا ضروری ہے اسی طرح حالات کی تہوں میں اسباب کا ہونا ضروری ہے۔

۶۔ **مافوق الفطرت اسباب :** مافوق الفطرت اسباب ناگہانی حالات میں انتہائی حیرت انگیز طریقے پر رونما ہوتے ہیں۔ یہ اسباب عقل و فہم سے بالا تر ہوتے ہیں۔ زیادہ طور پر کرامات، معجزات، جادوگری' پیش گوئی اور ہپناٹزم شمار ہوتے ہیں۔ یہ انبیاء' اولیا' مذہبی افراد کی بدولت وقوع پزیر ہوتے ہیں۔ جبکہ جادوگر اور ہپناٹزم کے واقعات شیطانی اعمال اور غلط قوتوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں مثلاً ۱۹۱۷ کے انقلاب روس میں راسپوٹین کا ہپناٹزم کا حامل کردار خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جدید سائنسی علوم نے مافوق الفطرت اسباب کی اہمیت کو کسی حد تک محدود کر دیا ہے۔ اب زیادہ سے زیادہ تلاش اسباب کی خاطر واقعات کی تاویل کی جا سکتی ہے۔ لیکن مافوق الفطرت واقعات کے اسرارو رموز معلوم کرنا مورخ کے بس کا روگ نہیں۔ یہ کام صرف انبیاء و اولیاء کا ہے۔ مذہبی نقطہ نظر سے ہر واقعہ کا اسباب صرف خدا ہے۔ اور تمام اسباب **مسبب الاسباب** پیدا کرتا ہے۔ خدا اسباب موت بھی یعنی از قسم بخار' قولنج' اور سرسام وغیرہ پیدا کرتا ہے۔ یعنی خالق کائنات **مسبب الاسباب** بھی ہے۔ تخلیق کائنات (ارض و سماء کب' کس طرح پیدا ہوئے' کس نے پیدا کیے) کے اسباب کا جواب تمام مذہبی کتابیں نہایت ہی مختصر دیتی ہیں یعنی "کن فیکون" (ہوجا اور ہو گیا)۔ سینٹ اگسٹائن کے مطابق تخلیق کائنات سے خدا کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی مخلوق پر برکت و رحمت نازل کرے۔ مسلمانوں کا نظریہ بھی یہی ہے۔ بقول مولانا روم خدا کہتا ہے کہ:

من نہ کردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

ترجمہ۔ میں نے خلق کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ میں اس سے فائدہ حاصل کروں بلکہ میرا مقصد یہ تھا کہ میں اپنے بندوں پر جود و عطا نازل کروں۔

قرآن حکیم۔ **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (سورۃ الذّٰرِیٰت)**

ترجمہ۔ تحقیق نہیں پیدا کیا جنات اور انسانوں کو سوائے اس کے کہ وہ میری عبادت کریں (جناب امیر علیہ السلام حضرت علی باب العلم کا فرمان ہے کہ **لیعبدون** سے مراد **لیعرفون** ہے یعنی وہ میری معرفت حاصل کریں)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۷- **ڈرامائی اسباب** بعض اوقات نہایت اہم واقعات ڈرامائی نتائج پیش کرتے ہیں۔ واقعات حیرت انگیز طور پر ڈرامائی اسباب کے کارن خلاف توقع منظر' نقشہ' خاکہ اور تصویر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً پاکستان کے ۱۹۷ کے الیکشن میں عوام نے یکسر جاگیرداروں' وڈیروں' سرداروں' سرمایہ داروں اسمگلروں اور کارخانہ داروں کو مسترد کر کے عام لوگوں کو منتخب کر کے حیرت انگیز ڈرامائی نتائج پیش کئے۔ دوسری مثال ۱۹۷۱ میں امریکہ اور چین کے درمیان ڈرامائی طور پر روابط و دوستی کی ابتدا ہے۔ اگرچہ عرصہ دراز سے دونوں ممالک میں نظریاتی اور توسیع پسندانہ عزائم کی وجہ سے روابط کا سلسلہ منقطع تھا۔ ۱۹۷۳ میں ڈرامائی طور پر ویٹ نام کی جنگ کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ۱۹۷۳ میں **نکسن** نے ڈرامائی انداز میں جب ویٹ نام سے امریکی افواج کی واپسی اور جنگ بندی کا اعلان کیا تو اقوام عالم کے لئے یہ حیرت انگیز واقعہ تھا۔

تلاشِ اسباب

علم تاریخ کی خصوصیات اس کے ارتقائی پہلو کا مطالعہ ہے یعنی ہر واقعہ کی ارتقائی غایت اور علت معلوم کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ واقعات کا سلسلہ وار ظہور پذیر ہونا ایک اتفاقی امر نہیں بلکہ اس کے پیچھے کوئی پوشیدہ منشاء یا قانون کام کر رہا ہے جو کہ بظاہر نظر نہیں آتا لیکن مطالعہ اس نظریہ سے کرنا چاہئے کہ وہ پوشیدہ علت اور معانی دریافت ہو جائیں۔ ہر واقعہ کا کوئی سبب ضرور ہوتا ہے چنانچہ ہمیں ہر واقعہ کا سبب بھی ڈھونڈنا ہے۔

تاریخ کے تمام واقعات ایک لڑی یا زنجیر کی مانند ہیں۔ جس طرح زنجیر کی ہر کڑی دوسری سے وابستہ ہوتی ہے اسی طرح تاریخ کا ہر واقعہ دوسرے سے وابستہ ہوتا ہے۔ واقعات میں تبدیلی ہوتی ہے لیکن یہ تبدیلی کسی اصول اور منشاء کے مطابق ہوتی ہے۔ بلا مقصد اور بے وجہ نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری نہیں کہ واقعات کا رخ ہمیشہ ایک ہی سمت اور خط مستقیم میں رونما ہو۔ واقعات میں جو تبدیلی ہوتی ہے اس کا رخ آگے یا پیچھے' ترقی یا تنزل کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تبدیل شدہ حالات ہمیشہ ترقی کا پہلو لیں گے۔ ان میں ترقی معکوس بھی پائی جاتی ہے۔ بہرحال واقعات میں تبدیلی اور تسلسل کا عمل جاری رہتا ہے۔

تبدیلی خواہ ترقی کی جانب ہو یا تنزل کی جانب لیکن اس کی کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ اس لئے تبدیلی کو اسباب یا علل و معلول سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک محقق' مورخ اور معلم تاریخ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ واقعات کی چھان بین کے وقت اسباب اور نتائج کی طرف توجہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مبذول رکھیں۔ تاریخی واقعات و حوادث کے تسلسل اور تبدیلی کو بے جان حرکت نہیں تصور کرنا چاہئے۔ ان میں کونسا منشاء یا مقصد ہوتا ہے۔ یا کس قانون کے تحت ان میں تبدیلی یا حرکت پیدا ہوتی ہے۔ مورخ کو تاریخی واقعات کی وہ منشاء یا قانون دریافت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو ان کا محرک و سبب بنتے ہیں۔

علوم سائنس میں جب سبب معلوم کرنے کے ضرورت پیش آتی ہے تو ہم تجربہ گاہ میں جا کر "سبب پیدا" کر لیتے ہیں اور یوں اصلی سبب کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ لیکن کیا اس قسم کا تجربہ تاریخی واقعات و حادثات کے متعلق کیا جا سکتا ہے؟ اس قسم کا تجربہ کرنے کے لئے یہ ممکن نہیں کہ مورخ یا محقق کسی حکومت کو دنیا کے ہر گوشے میں پھیلا دے اور اس کے بعد بطور تجربہ اسے دو عالمگیر جنگیں شروع کرنے کی اجازت دی جائے۔

مورخ کے پاس ماضی کا ریکارڈ موجود ہے لہٰذا وہ دستاویزات کی روشنی میں حکومتوں اور قوموں کے عروج و زوال کے اسباب معلوم کر سکتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھیں کہ ہر زمانہ میں ایک ہی قسم کے اسباب یکساں قسم کے نتائج پیدا نہیں کرتے کیونکہ زمانہ متواتر طور پر تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہے اور حالات بدلتے رہتے ہیں لہٰذا دونوں قسم کا تجربہ یعنی بذریعہ مشاہدہ اور بذریعہ عمل مورخ کے لئے ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات تلاش اسباب کے لئے مورخ کو فلسفہ و قیاس سے مدد لینی پڑتی ہے۔ فلسفہ تاریخ نے اس وقت جنم لیا جب مورخین نے واقعات کے اسباب تلاش کرنے شروع کئے اور تلاش اسباب کے سلسلے میں تاویل و تعبیر سے بھی کام لیا۔ لہٰذا اس جدید دور میں کوئی مورخ بھی خالص تاریخی واقعات کو علت و معلول کے بغیر تحریر نہیں کر سکتا اگر وہ ایسا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی تاریخ ناقابل اعتبار اور غیر مستند شمار کی جاتی ہے۔ مورخ کا کام تو یہ ہے کہ وہ واقعات کے دونوں پہلوؤں یعنی اچھے اور برے کو دکھلائے اور واقعات کے اسباب و نتائج معلوم کرنے کی کوشش کرے۔

عروج و زوال کے اسباب "قانون فطرت" پر مبنی ہیں اور یہ قوانین ہمیشہ کارگر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ قوانین فطرت انسانی کے تراشیدہ ہیں۔ لیکن مذہبی خیالات کے حامل افراد عقلی دلائل اسباب کو نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک حکم خدا آگ کی فطرت کو بھی بدل سکتا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک زوال گناہوں کی سزا ہے اور عروج نیک اعمال کی جزا ہے۔

انگریزوں نے زوال کی روک تھام کے لئے پرانے سامراجوں کے اسباب زوال کا بغور مطالعہ کیا مشہور مورخ گبن نے اسباب زوال رومتہ الکبریٰ چھ جلدوں میں قلمبند کئے۔ جب ہندوستان انگریزوں کے ہاتھ لگا تو انہوں نے سلطنت مغلیہ کے اسباب زوال پر غور و خوض کیا اور انگریز مورخ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ارون (Irwin) نے سلطنت مغلیہ کے اسباب زوال پر تحقیق کی اور انہیں معلوم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس تحقیق و چھان بین کے باوجود انگریزی سامراج کا جنگ عظیم دوئم کے خاتمہ پر خاتمہ ہو گیا۔ اور یہ خاتمہ اس طرح ہوا کہ اس کی مثال تاریخ عالم پیش نہیں کر سکتی۔ لہٰذا قوموں کے عروج و زوال کے اسباب معلوم کرنا بھی مورخ پر فرض ہو گیا ہے۔ اگر قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کو تاریخ سے نکال دیا جائے تو تاریخ کی عبرت آموزی ختم ہو جاتی ہے۔

مورخین اور محققین کی ہمیشہ ہی سے یہ کوشش رہی ہے کہ وہ حقائق و حوادث کے اسباب کو تلاش کریں۔ تاریخ کے تمام مسائل میں سے اسباب کی تلاش سب سے اہم اور ضروری ہے۔ دور حاضر کا کوئی مورخ و محقق محض واقعات کو ریکارڈ کر دینے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ مسلسل دلچسپی کیساتھ فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر یہ واضح کرتا ہے کہ ایسا واقعہ کیوں پیش آیا؟ تاریخ میں تلاش اسباب کا یہ کام نہایت قدیم ہے۔ جب سے انسان اور تاریخ نے جنم لیا ہے تب سے مسلسل طور پر مورخ اور محقق تاریخ کے ایسے ہی سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کرتے چلے آئے ہیں۔ سقراط وہ پہلا فلسفی ہے جس نے اپنی تعلیمات میں تلاش اسباب کے لئے لفظ "کیوں" (Why) پر زور دیا۔ وہ اپنے مکالمات میں تحقیق کے لئے اصول "کیوں" کی صحت پر زور دیتا ہے۔ سقراط کہتا ہے:

> "اگر ہم سمجھ لیں کہ تحقیق کے لئے اسباب کی تلاش ضروری ہے تو ہمارے حقائق کی حالت بہتر ہو جائے گی... ہم بے بس نہیں رہیں گے۔ اگر ہم محض وسوسوں اور خیالوں میں گم رہے اور یہی سمجھتے رہے کہ جو کچھ ہم نہیں جانتے' نہ اسے جان سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں جاننے کا کوئی فائدہ ہے تو یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ جس پر میں قولاً فعلاً اپنی انتہائی قوت کے ساتھ جنگ کے لئے تیار ہوں۔"

یونان اور روم کے عہد کے بڑے بڑے مورخ ہمیشہ واقعات کے اسباب کے تعاقب میں رہے ہیروڈوٹس نے واقعات کی باگ ڈور دیوتاؤں کے ہاتھ سے لے کر انسان کے ہاتھ میں تھما دی۔ ہیروڈوٹس نے یونانیوں کی ایرانیوں کے ہاتھوں شکست اور ایرانیوں کی فتح کے اسباب کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔ تھیوسی ڈائیڈز نے پیلوپونیسین جنگ میں سپارٹا والوں کے ہاتھوں ایتھنزوالوں کی شکست کے اسباب، تلاش کئے۔

عہد کلیسا کے پیشواؤں اور مورخوں نے دور احیائے علوم سے گزر کر دور اصلاح کلیسا تک تاریخ میں جو واقعات رونما ہوئے ان کے اسباب خدائی منصوبے "تقدیر" کی تکمیل کے ساتھ منسلک کئے۔[9] جب ہر واقعہ کا سبب حکم خداوندی اور تقدیر کو سمجھا جاتا تھا اور خدا کو مسبب الاسباب کہا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاتا تھا تو مورخوں نے اسباب واقعات معلوم کرنے کی کیوں کوشش کی؟ اس کا سبب یہ تھا کہ یونانی فلسفہ و منطق مسلمانوں میں بھی عباسیوں کے زمانے سے رائج ہو چکا تھا۔ یورپ میں جب نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا اور قرون وسطیٰ کا دور اعتقاد ختم ہوا تو یونانی فلسفہ و منطق نے سر اٹھایا اور تقاضہ کیا کہ انسانی عقل سے ہر واقعہ کا سبب معلوم کیا جائے کیونکہ اس عہد روشن کے یورپین اہل فکر خدا کو مسبب الاسباب ماننے کے لئے تیار نہیں تھے اور ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔

اٹھارویں صدی میں جب واقعات کی اصلیت و حقیقت کی چھان بین کے لئے کشادہ دلی اور آزادی کا راستہ اختیار کیا گیا تو سوال پیدا ہوا کہ ادوار گذشتہ سے لے کر آج تک تاریخ نے ایسی صورت کیوں اختیار کی؟ جب یورپ جہالت و بربریت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا تو یونانی تہذیب نے اس وقت کیسے اتنی شاندار کامیابی حاصل کی؟ رومی سلطنت کیوں زوال پذیر ہوئی؟ مسلمانوں نے یورپ کے وسیع و عریض حصے پر کیسے غلبہ حاصل کیا؟ اسلامی ریاست و حکومت کیونکر زوال و انحطاط کا شکار ہوئی؟ انیسویں صدی میں برطانوی باشندے کیونکر بحروبر پر چھا گئے؟ اور برطانیہ کیسے دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن گیا؟ اکیسویں صدی کے آغاز میں (۲۰ دسمبر ۱۹۹۰) کس لئے عظیم سوویٹ یونین ٹوٹ کر مختلف حصوں میں بٹ گیا؟ روس کا سوشلسٹ انقلاب کیوں کامیاب نہ ہو سکا؟ کیمونزم کی کامیابی اور ناکامی کے کیا اسباب ہیں؟ بیسویں صدی کی دو عظیم جنگوں کے کیا اسباب تھے؟ اور مختلف ادوار میں اخلاقی معیار میں ردوبدل کے کیا اسباب ہیں؟

ایسے ہی دیگر بے شمار تاریخی عمل کے متعلق سوالات ہیں جن کے لئے مسلسل طور پر مورخ اور محقق جوابات دینے کی کوششیں کرتے ہیں۔ عہد قدیم سے لے کر اٹھارویں صدی تک مورخین کے ایک گروہ میں یہ رجحان مضبوط طور پر براجمان رہا اور وہ تاریخی واقعات کو دیوتاؤں کی خوشنودی و ناراضگی اور بعد میں خدا کی مرضی کے ساتھ وابستہ کرتے رہے۔ لیکن اٹھارویں صدی میں تاریخ کی توجیہات فطرت کی اصطلاحات میں استعمال ہونی لگیں۔ اور نظریہ ارتقاء کے مطابق واقعات کا ظہور کسی مذہبی یا آسمانی منشاء کے تحت عمل میں نہیں آتا بلکہ قانون یعنی فطرت کے تقاضوں کے مطابق جنم لیتا ہے۔ یہ نظریہ نیوٹن کے سائنسی نظریات و قوانین کے انسانی اعمال پر اطلاق کا نتیجہ تھا۔ نیوٹن کے نظریے نے تاریخ کو نہ محض سیکولر بلکہ قومی بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ یہ صورت کسی نہ کسی حیثیت سے ہمارے عہد تک اب بھی قائم ہے۔[1]

اسباب کی تلاش آسان امر نہیں ہے۔ اگر ہم ماضی کے واقعات کی توجیہات کے خواہاں ہیں، اگر ہم مستقبل کے لئے پیش گوئیاں کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں تاریخ کے واضح، پختہ اور معین قوانین کی ضرورت ہو گی۔ اس کے لئے نظریہ ارتقاء کے غیر شخصی قوانین زیادہ کارگر نہیں۔ ریاضیات،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حیاتیات' کیمیا' طبعیات' ان تمام **سائنسوں** نے ایسے قوانین مہیا کئے ہیں جن سے وہ سب کچھ آشکار ہو جاتا ہے جو اب تک پردہ راز میں تھا۔ یقیناً واقعات کے اسباب تلاش کرنے کے لئے تاریخ کو بھی ایسے قوانین مہیا کرنے چاہئیں جو واقعات ماضی کی کلید' اصول اور ضابطہ بن سکیں کہ جن کی بدولت مستقبل کے لئے پیش گوئی کی جا سکے۔ جن کے ذریعے تاریخ اسی طرح ایک قانون کے تابع آ جائے جس طرح مادی دنیا مختلف قوانین کے تابع ہے۔

تاریخی واقعات کسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں اور اس سلسلے میں ہر واقعہ دوسرے کے بعد آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو واقعہ پیش آتا ہے وہ پہلے کے کسی سبب کا نتیجہ ہوتا ہے جسے ہم دریافت کر سکتے ہیں مثلاً امام حسین علیہ السلام **مدینتہ** الرسول سے باامر مجبوری اعزو اقربا کے ساتھ مکہ کی طرف روانگی' پھر نویں ذوالحجہ کو احرام حج کھول کر حج کو ادھورا چھوڑ کر کربلا کی جانب کوچ' کربلا میں شہادت عظمٰی کے درجے پر فضیلت حاصل کرنا اور ان کی مخدرات کا کوفہ و شام کے بازاروں اور درباروں میں مصائب میں مبتلا ہونا یقیناً اس امر کو ظاہر کرتا ہے۔ کہ یہ واقعات پیشتر کے متعدد اسباب کا نتیجہ ہیں

بقول علامہ اقبال ؎

آں امامِ عاشقاں پورِ بتولؑ سروِ آزادے ز بستانِ رسولؑ
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر معنی ذبحِ عظیم[11] آمد پسر
بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است پس بنائے لا الہ گردیدہ است[12]
سرّ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ بود یعنی آں اجمال را تفصیل بود

اصول تسلسل اور سلسلہ اسباب کے لئے ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ اس میں تسلسل کا صرف ایک خط اور اسباب کا محض ایک سلسلہ فرض کر لیا جاتا ہے جبکہ کسی واقعہ یا حادثہ کا ایک سے زائد یا ایک سو یا ایک ہزار سلسلے ہو سکتے ہیں۔ تاریخ میں کسی شئے کو دوام و ثبات حاصل نہیں۔ یہ مسلسل تغیر سے دوچار ہے۔ "قانون تغیر" تاریخ کا قانون نہیں یہ تو قدرت اور زندگی کا قانون ہے۔ تاریخ نے اسے اپنایا ہے۔ تاریخ کا یہ ایک قانون ہے جس کے مطابق اسباب دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ اگر واقعات کے اسباب نہ بتائے جائیں تو تاریخ محض روزنامچہ بن کر رہ جاتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کے کتنے لوگ' مورخ اور محقق اس قانون تغیر کی حمایت و تائید کریں گے دنیا کے کتنے لوگ ہٹلر کے جرمنی میں چھ ملین بے گناہ یہودیوں کے قتل ناحق کی توثیق کریں گے؟ یا ہیروشیما اور ناگا ساکی کے کتنے لوگ زندہ رہے جو اس قانون تغیر کو درست مانیں گے؟ ایسی ہی بے شمار [redacted]ور قابل غور مشکلات تاریخی حوادث کے اسباب تلاش کرنے میں پیش آتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں جن کی بنا پر بعض اوقات مورخ اور محقق تاریخ سازی کے کام کو ادھورا اور نامکمل چھوڑ دیتا ہے۔ یا "اتفاق کے اصول" میں پناہ گیر ہوتا ہے۔ اور ایک محفوظ قاعدہ اپناتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ تاریخ میں پیش آمدہ واقعات کو انسانی تقدیروں کی نشوو ارتقاء میں ایک ہنگامی اور نادیدہ قوت کی کارفرمائی کے ساتھ وابستہ و منسلک کر دیتا ہے یہ ایک قسم کی تاریخی ضرورت بھی ہے۔ یہی مشکلات سلسلہ اسباب کو تلاش کرنے میں پیش آتی ہیں۔

مورخ اور محقق کو چاہئے کہ حقائق کو زیادہ سے زیادہ سادہ بنانے کی کوشش کرے بلکہ ہر معاملے میں اسباب کا تعدد قبول کر لے۔ یا یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ ابھی تک ہمیں پورا علم حاصل نہیں ہوا کہ جن کی بنا پر اسباب کی تشریح کی جا سکے۔ ماضی کے الجھے ہوئے واقعات اور بے سروپا مواد کی توضیح کے لئے کوئی ایک اور عموماً سادہ سا سبب تلاش کرنا ناپختہ شعور کی دلیل ہے جبکہ ماضی کے واقعات اسقدر پر پیچ اور الجھے ہوئے ہیں کہ کسی ایک واقعہ کا سرا ان میں سے نہایت مشکل کے ساتھ تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایسا معاملہ ہے جو ذہنی شعور کی ایسی پختگی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ جس کے ذریعہ سے حال کے متعلق بھی پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ جو محقق اور مورخ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ ہمیں ماضی کے بڑے بڑے واقعات و حوادث کی توضیح و تشریح کے لئے کوئی ایک سبب قبول کر لینا چاہئے وہ ہم میں بے اعتمادی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے مورخ اور محقق اہم واقعات کی توضیح و تشریح اتفاقی حوادث کی شکل میں کر دیتے ہیں یا اسے کوئی سازش قرار دے دیا جاتا ہے۔ یا کوئی اور مبہم سا مفروضہ اختیار کر لیا جاتا ہے مثلاً یہ بتا دیا جاتا ہے کہ سلطنت عباسیہ صرف اس لئے برباد ہو گئی کہ فرقہ واریت کا انتہاپسندانہ مذہبی جنون تحمل و برداشت کی تمیز کھو چکا تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ برطانیہ نے مغلیہ ہندوستان کو اس لیے مسخر کر لیا کہ مغلیہ حکومت کے اندر غدار موجود تھے۔

اس قسم کے مفروضوں اور فارمولوں کو قبول کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ عقل و بصیرت کی روشنی میں پرورش پانے والے محرکات کو دبا دیا جائے اور ایسے حقائق سے روگردانی کر لی جائے کہ جن سے سفر حیات میں انسانی ہمدردی کے قدرتی جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ واقعات و حوادث کے اسباب کی تلاش ایک بہت بڑا کارنامہ ہوتا ہے لیکن ان اسباب کی تلاش بھی تو ایک شاندار قوت ہے جو تاریخ میں قلب و روح کی تازگی کا سامان ہے' جس سے ہمارے فہم و بصیرت میں گہرائی اور ہمارے فیصلوں میں عالی ہمتی پیدا ہوتی ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

عقل در پیچاکِ اسباب و علل
عشق چوگاں بازِ میدانِ عمل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پانچواں باب

حوالہ جات

Robert L. Heilbroner, The Future as History, (New York, 1968), P, 12

۲- Richard Robertson, History and Historians: An Introduction to the study of History (Mississippi, 1978), P. 5; P. Hardy, The problems of the Causation for the Historian, Journal of the Punjab University Historical Socity, June, 1961, P, 11.

۳- پریسٹرائیکا، گورباچوف کا سوویٹ یونین کے لئے یورپی آزاد مارکیٹ اصولوں پر معاشی اصلاحات کا پروگرام تھا جس کی ناکامی کے بعد ۲۰ دسمبر ۱۹۹۱ کو ۷۴ برسوں کے بعد سوویٹ یونین کا خاتمہ ہو گیا اور یوں یہ ایک عظیم سپر قوت معاشی اصلاحات کی ناکامی اور سی۔ آئی۔ اے کی سازشوں کی بھینٹ چڑھ کر منتشر ہو گئی اور کئی ایک علاقائی ریاستوں میں بٹ گئی۔

۴- Paul K. Conkin and Ronland, N. Stormberg, The Heritage and Challenge of History, (New York, 1971), P. 14.

۵- Ronald H. Nash, Ideas of History, (New York, 1969), P. 57.

۶- Thomas N. Guinsbrug, ed., The Dimensions of History, (Chicago, 1971), P. 12; Halvdan Koht Driving Forces in History, (New York, 1971), P. 5; Louis Gottschalk, Understanding History, (New York, 1967), P. 150; Marc Block, The Historian's Craft, (New York, 1953)

۷- Richard Robertson, History and Historians, P. 8

۸- تلاش اسباب کے سلسلہ میں فلسفہ تاریخ میں داخل ہوا کیوں کہ اسباب واقعات معلوم کرنے میں مورخ کو قیاس سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن یہ قیاس آرائی صرف اسباب تک ہی محدود نہیں بعض اوقات خالص واقعہ نگاری میں بھی مورخ کو قیاس سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن کئی ایسے زمانے ہیں کہ جن کے متعلق کسی قسم کے تحریری شواہد نہیں ملتے گویا کہ تاریخ عالم کے کئی ابواب کورے پڑے ہیں۔ ان ابواب کی صرف خانہ پری کرنا پڑتی ہے بعض اوقات اس خانہ پری کے لئے مواد صرف عمارات یا روایات کی صورت میں ملتا ہے۔ ان عمارات کو دیکھ کر یا ان روایات کو سن کر محض قیاس سے واقعات معلوم کرنا پڑتے ہیں۔ کسی عملی تجربہ گاہ میں تجربہ کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صرف قیاس پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

۹۔ سینٹ اگسٹائن نے "دی سٹی آف گاڈ" میں تاریخی واقعات کو مشیت ایزدی اور تقدیر الٰہی قرار دیا۔ اور یہ نظریہ ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک اسی طرح قبول کیا گیا۔ بلکہ آج بھی عیسائیت اور اسلام کے نظریہ تاریخ میں یہ مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے یعنی کہ پوری تاریخ خدا کی مشیت کے مطابق چلی اور چلتی ہے۔ مگر جب اٹھارویں صدی میں عقل و دانش کے مطابق نظریہ تاریخ پیش کیا گیا تو تاریخ کی توضیح مذہبی نظریہ سے الگ طور پر نظر آنے لگی۔ بعد ازاں نظریہ ارتقاء نے تاریخی واقعات کے ظہور کے عقلی اسباب کی توثیق کر دی۔

۱۰۔ انسان بھی کائنات کا ایک جزو ہیں اور ان پر بھی قانون قدرت کا اطلاق ہوتا ہے۔ قانون قدرت کا تصور ہمارے تصور سے بہت مختلف ہے۔ قوانین قدرت میں معقولیت ہے۔ یعنی انسانی عقل ان قوانین کو اختیار کر سکتی ہے۔ اگر انسان فطری قوانین کے مطابق چلیں اور انہیں نظرانداز نہ کریں یا ان کی خلاف ورزی سے احتراز کریں تو جو مصیبتیں اور آفتیں اب تک انسانوں کے لئے باعث اذیت بنتی رہیں وہ ناپید ہو جائیں گی اور دنیا میں امن' خوشحالی اور ترقی کا ایک خاص دور شروع ہو جائے گا۔

۱۱۔ وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ (قرآن حکیم)

۱۲۔ خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں

شاہ است حسینؑ پادشاہ است حسینؑ دین است حسینؑ دین پناہ است حسینؑ
سر داد نہ داد دست در دستِ یزید حقا کہ بنائے لا الہ ہست حسینؑ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھٹا باب

اقسامِ تاریخ

KINDS OF HISTORY

انسان دس ہزار سال یا اس سے بھی زیادہ عرصے سے دنیا میں آباد ہے۔ اس طویل عرصے میں انسانی زندگی روز بروز ترقی کرتی گئی اور زیادہ پیچیدہ ہوتی گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسانی معاشرہ مختلف نسلوں، گروہوں، قوموں، تہذیبوں اور نظاموں میں عروج و زوال کے مدارج طے کرتا رہا۔

یوں مختلف واقعات، کہانیاں، قوموں کے اندازِ نگاہ، اسلوبِ فکر اور نصب العین بھی متعین ہوتے رہے۔ اس طرح ہر قوم کے مورخ اپنی اپنی تہذیب کی کہانی بیان کرتے رہے۔ لہٰذا تاریخ کی بھی اتنی ہی اقسام بنتی رہیں جتنی تہذیبیں اور مورخ تھے۔ ہر مورخ اپنے انداز کی تاریخ لکھتا ہے۔ فلسفہ تاریخ کے ایک مفکر کارل بیکر کا بیان ہے:

"یہاں بے شمار مورخ ہیں اور ہر آدمی اپنا مورخ آپ ہے۔"

کارل بیکر کا یہ قول بالکل درست ہے کیوں کہ ہر شخص اپنی کہانی اور تاریخ سناتا ہے جو دوسرے فرد کی کہانی سے یقیناً مختلف ہوتی ہے۔ ایک لحاظ سے ہر شخص تاریخ نگاری کے لئے خام مواد مہیا کرتا ہے جسے پیشہ ور مورخ زیادہ بہتر انداز سے ترتیب میں لاتا ہے اور زمانہ ماضی کی ہر ممکن شہادت کے ذریعے ماضی کی تاریخ تازہ کرتا ہے دوسرا اپنی تعبیرات کی فنکاری سے ماضی کو نیا لباس پہناتا ہے۔ وہ نجی تفریح کو نہیں بلکہ اجتماعی قومی سرگرمیوں کو مرکز بناتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ تاریخ کو کس طرح بیان کیا جائے؟ کیوں کہ جس طرح دو نظمیں، دو ناول اور دو مصور ایک جیسے نہیں ہوتے اسی طرح کوئی دو مورخ ٹھیک یکساں نہیں ہو سکتے۔ گذشتہ صدیوں میں مورخوں نے تاریخ نویسی کے لئے کئی نمونے اور اقسام پیدا کر لی ہیں۔ انہیں رسمی نمونے قرار دیا جاتا ہے۔ جیسے نظم، موسیقی اور فن میں نمونے اور اقسام ہوتی ہیں اسی طرح تاریخ نویسی کے بھی نمونے اور اقسام موجود ہیں۔ تاریخ کی یہ اقسام اور نمونے ایسے نہیں کہ حرفاً حرفاً ان کی پابندی کی جائے اور انہیں متعین و لازم سمجھا جائے۔ ان میں اختلاف کی بھی گنجائش ہے اور نئے تجربے کے لیے بھی آزادی ہے۔ ان اقسام میں کوئی چیز آخری یا حتمی نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن بحیثیت مجموعی یہ روایتی اقسام و نمونے ہیں جو صدیوں کی پیداوار ہیں اور تاریخ نویسی کے لئے بہترین ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں کسی علم کا مطالعہ خواہ اس کا تعلق ادب سے ہو یا فن سے، حیوانات سے ہو یا ریاضیات سے، ہمیں اس کے مطالعہ کے لئے کوئی نہ کوئی نظام تو تیار کرنا چاہئے تاکہ اسے اسی نظام کے مطابق مختلف اقسام، حصوں اور ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اس کی حدود متعین کریں۔ تاریخ کی مختلف عنوانات کے تحت تقسیم مطالعہ اور تاریخ نویسی کے لئے زیادہ سہولت کا باعث ہو گی۔

تاریخ کی چیدہ چیدہ اقسام مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ سوانحی تاریخ (Biographic History)

سوانحی تاریخ ایسی تاریخ ہے جو کہ مشہور، اہم یا مقتدر شخصیت کی زندگی کے حالات و واقعات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اسے باالفاظ دیگر سوانح عمری بھی کہا جا سکتا ہے۔

تاریخ کا ایک بہت بڑا حصہ ہمارے پاس سوانح افراد کی صورت میں موجود ہے۔ عہد نامہ عتیق یعنی بائبل کی مقبول عام کہانیاں سوانح افراد ہی تو ہیں۔ مثلاً حضرت یوسف اور ان کے بھائیوں کی کہانیاں، حضرت داؤد اور ہزریعلؑ اور اس کے تاکستان کی کہانیاں یا حضرت ایوب کی کہانی۔ پلو ٹارک[۲] نے تاریخ کو یقیناً زیادہ سے زیادہ سوانح افراد کی صورت میں لکھا ہے اور اس کے یونانی و رومی مشاہیر کی کہانیاں ہمارے علم کی حد تک ایسی ہیں کہ جنہوں نے ابتدائی دور کے کلیسائی پادریوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

تھامس کارلائل نے تاریخ کو بڑے زور کے ساتھ سوانح افراد کی حیثیت میں پیش کیا ہے؟ وہ بیان کرتا ہے کہ:

> "دنیا کی تاریخ دراصل ان افراد کی تاریخ ہے جنہوں نے دنیا میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا یعنی تاریخ کی تہہ میں جلیل القدر افراد ہی کارفرما رہے ہیں۔ وہی انسانوں کے قائد تھے۔ وہی عظیم ہستیاں تھیں۔ جنہوں نے ہمارے لیے اعلیٰ درجے کے نمونے مہیا کیے اور درحقیقت وہی ان سب باتوں کے انجام دینے والے تھے جو عام لوگ انجام دینا اور حاصل کرنا چاہتے تھے۔ تاریخ عالم کے ہر دور میں ہمیں معلوم ہو گا کہ چند بڑے افراد ہر دور کو محفوظ رکھنے کے لیے ناگزیر تھے۔ انہی کی حرارت تھی جس کے بغیر ایندھن میں آگ لگ ہی نہیں سکتی تھی[۳]۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دور حاضر کے صرف چند مورخ ہی تاریخ کی اس تعبیر سے متفق ہیں کہ یہ بڑے لوگوں کی کہانی ہے اور ان کے کردار اور خصوصیات کو بیان کرتی ہے۔ بہت سے مورخ تاریخ کی اس نوعیت سے متفق نہیں ہیں۔ انگریزی اور امریکی ادب تو سوانح عمریوں سے لبریز ہے۔ مثلاً انگریزی ادب میں باسویل[4] کی " حیات ڈاکٹر جانسن[5] " لوک ہارٹ[6] کی "حیات سر والٹر سکاٹ[7] (کئی جلدوں میں ہے)، جیمز انٹینی فروڈ کی "حیات کار لائل" (چار جلدوں میں)، جان مارلے کی "حیات گلیڈ سٹون[8]" ونسٹن چرچل کی "حیات مارلبرو[9]" (چھ جلدوں میں ہے)، ٹرولیین کی "گیری بالڈی[10]" ہیں۔ اسی طرح امریکی ادب میں بھی ایسی بے شمار عمدہ سوانح عمریاں موجود ہیں مثلاً بیورج کی "حیات جان مارشل[11]" فری مین کی "حیات رابرٹ لی" آرتھر لنک کی "حیات ولسن[12]" اور لی اون ایڈل کی " حیات ہنری جیمز[13] " کا سرمایہ موجود ہیں۔

اردو زبان میں مولانا الطاف حسین حالی کی "حیات جاوید" شبلی کی "حیات سعدی" اور گلبدن بیگم کا "ہمایوں نامہ" (اصل فارسی) وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

ان تمام سوانح عمریوں میں ایک امر مشترک ہے کہ یہ تاریخ بھی ہیں اور سوانح افراد بھی۔ یہ اپنے موضوع کو نہایت عمدہ پس منظر اور تاریخی شعور کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ وقت کے تاریخی افکار و وقائع اور ماضی کے حوادث کے ساتھ ان ہستیوں کا سلسلہ قائم کرتی ہیں جس سے اس عہد کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ تاریخ کی ایسی کتابوں کا سلسلہ حیاتِ زمانہ سے منسلک کرتے ہیں۔ ذاتی و نفسیاتی کہانیوں سے ان کی حیثیت جداگانہ ہے۔

سائنس یا قانون جیسے خشک مضامین بھی سوانح افراد کے ساتھ دلچسپ اور عمدہ بنائے جاتے ہیں۔ ان بڑی شخصیتوں میں سے گیلیلیو، نیوٹن، آئن سٹائن اور ایڈی سن جیسی شخصیتوں کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ جنھوں نے حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیئے۔ انگریزی قانون کی تاریخ کو ہولڈز ورتھ[14]، لارڈ کوک[15]، بلیک سٹون[16]، منیس فیلڈ[17]، بنتھم[18]، بروگم[19] اور ایلڈن[20] کے بغیر نامکمل ہے۔

اسی طرح امریکہ کے قانون دستور کو اس وقت تک صحیح طور پر نہیں سمجھا جا سکتا کہ جب تک جان مارشل، جوزف سٹوری[21]، جسٹس فلیڈ اور جسٹس ہومز کی شخصیتیں زیر غور نہ لائی جائیں۔ امریکی تاریخی ادب خصوصیت سے ایسی بڑی ہستیوں کی سوانح سے معمور ہے۔ عام افراد کے مطالعہ کے لیے زیادہ دلچسپ اور فائدہ مند تاریخ سوانح افراد کی ہی شکل میں ہے۔ سوانح افراد کے مواد میں امریکی تاریخ نہایت خوش نصیب ہے۔

سوانحی تاریخ ہمیشہ دل پذیر و دلچسپ رہی ہے۔ اس کے مطالعہ کے حق میں دلائل پیش کرنا نہایت آسان ہیں مثلاً پڑھنے میں سہل اور خوشگوار ہے۔ یہ زیادہ رنگین و پر لطف ہوتی ہے۔ اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں بعض اوقات ڈرامائی واقعات آ جاتے ہیں۔ اس میں پیچیدہ مسائل کو شخصیتوں سے وابستہ کر کے سادہ اور عام فہم بنا دیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر لانگ فیلو کی نظم "سام آف لائف" سے خاص روشنی پڑتی ہے:

جلیل القدر افراد کی زندگیاں ہمیں یاد دلاتی ہیں
ہم بھی اپنی زندگیوں کو نہایت پاکیزہ بنا سکتے ہیں
اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت اپنے پیچھے چھوڑ سکتے ہیں
وقت کی ریت پر پاؤں کے نشان

سائنٹیفک مورخ تاریخ کی اس قسم کو مکمل تاریخ نہیں سمجھتے اور اسے گہرے شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لارڈ ایکٹن نے کہا تھا کہ انفرادی کرداروں سے جو دلچسپی پیدا ہوتی ہے اس سے زیادہ انسان کے تاریخی شعور کو غیر منصفانہ اور غلط بنانے کا بڑا سبب کوئی نہیں ہو سکتا۔ برطانوی مورخ لوئیس نیمیر کا اصرار ہے کہ:

سوانح افراد ایک طرح کا تاریخی کنڈر گارٹن ہیں۔ مورخ کو فرد کے مطالعہ سے الگ نہ ہونا چاہئے۔ تاہم اس کا تعلق سیاسیات اور اقتصادیات کی بڑی قوتوں سے ہونا چاہئے۔ جن کی بنا پر تاریخ کی رفتار متعین ہوتی ہے اور اس کو اور ان بڑے اداروں پر نظر جمائے رکھنا چاہئے جہاں افراد کا اثر محض برائے نام رہ جاتا ہے۔

اس قسم کی تاریخ میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ سوانح عمری کا مصنف اگر ممدوح کا رشتہ دار، پروردہ، دوست یا کسی بھی طرح زیر اثر ہو تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ پیش نظر شخصیت کے حالات قلمبند کرتے ہوئے جانبداری سے کام لے گا۔ اس کی معمولی سرگرمیوں کو مبالغہ آرائی کے ساتھ عظیم کارناموں کی شکل میں بیان کرے گا۔ اگر اس کو پیش نظر شخصیت سے کوئی ذہنی وابستگی یا روحانی و مذہبی عقیدت ہے تو پھر وہ اس کی غلطیوں اور خامیوں کو نیکیوں اور خوبیوں کے رنگ میں پیش کرے گا۔ یہ امر تاریخ کے لیے مضر رساں ہے۔ اس طرح کے اسلوب سے تاریخ میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ سوانح افراد کی یہ صورت ناقابل اعتماد ہوتی ہے اور اس سے استفادہ کرتے وقت ہمیں ہر امر مذکور کے لیے دیگر معاصر ماخذوں سے تصدیق کرنے کی ضرورت محسوس ہو گی سوانعمری کی اس جانبدارانہ قسم کے لئے علامی ابوالفضل کے "اکبر نامہ" کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

دوسری صورت میں سوانح افراد کا مصنف اگر پیش نظر شخصیت کے افکار و نظریات سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اختلاف رکھتا ہے یا اس کے زیر عتاب رہا ہے یا کوئی مفاد و توقعات رکھتا تھا جو پوری نہ ہو سکیں تو یہاں پر وہ تعصب کا شکار ہو کر غلط بیانی سے کام لیتا ہے۔ اس شخصیت کی ہر نیکی و خوبی کو گناہ اور برائی کے رنگ میں پیش کرے گا۔ یہاں پر بھی ایسی تصنیف سے استفادہ کرتے وقت سچ اور جھوٹ میں امتیاز کرنے کے لیے ہمیں دیگر معاصرانہ ماخذوں سے تصدیق کرنے کی ضرورت ہو گی۔ عبدالقادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" اس قسم کی سوانح عمری کی بہترین مثال ہے۔ اس قسم کی ہر دو سوانح عمریوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مورخ کو ہمیشہ غیر جانبدارانہ تصنیفات سے سروکار ہوتا ہے جو کسی لالچ' دباؤ یا عقیدت کے جذبات کی ملاوٹ کے بغیر لکھی گئی ہوتی ہیں۔ جہاں پر صرف اور صرف حقائق پیش کیے گئے ہوتے ہیں۔ تاریخ میں غیر جانبدارانہ سوانح بہت کم ملتی ہیں۔

غرضیکہ تاریخ کا کوئی پہلو بھی ہو اسے الگ تھلگ رکھ کر نہیں سمجھا جا سکتا یعنی تاریخ کے تمام معاملات سیاسیات' بین الاقوامی امور' سائنس' ٹیکنالوجی' اقتصادیات' نفسیات اور اخلاقیات وغیرہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں۔ تاریخ میں تنگ نظری اور محدودیت کو کوئی خطرہ نہیں۔ تاریخ کا اگر صحیح مطالعہ کیا جائے تو اس کا ہر موضوع نئے موضوعات کا اور ہر باب نئے ابواب کے دروازے کھولتا ہے۔ تاریخ کی صحیح قسم پر کوئی محدود لیبل نہیں لگایا جا سکتا۔ اگر آپ تھامس جیفرسن کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ آپ کو ان امور کا ضرور علم ہو جن سے وہ گہری دلچسپی و وابستگی رکھتا تھا مثلاً سیاسیات' قانون' فلسفہ' مذہب' آرٹ' ادب' تعمیرات' زراعت' باغبانی' تاریخ' بشریات' تعلیم' کتب خانے' مخطوطے اور درجنوں دوسری چیزیں جن سے جیفرسن کو دلچسپی تھی۔ تاریخ زندگی کے تمام پہلوؤں اور ذہن انسانی کے تمام معاملات' ہیجانات' مناقشات اور افکار پر حاوی ہے۔

۲- سیاسی تاریخ Political History

فری مین کا مقولہ ہے کہ تاریخ زمانہ ماضی کی سیاست ہے اور زمانہ ماضی کی سیاست دور حاضر کی تاریخ ہے۔ سیاسی نظریات ان کی کیفیت خواہ کچھ بھی ہو کہا جا سکتا ہے کہ وہ تاریخ نویسی کے لئے ایک فلسفہ' ایک جذبہ' ایک روش اور ایک اسلوب رکھتے ہیں۔ قومی تاریخ پر جارحانہ پابندیوں کے باوجود ہر دور میں مورخ سیاسی تواریخ قلمبند کرتے رہے ہیں۔ عموماً ہر دور میں مورخ سیاسی تاریخ کو اپنے آقا کے مفاد کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ جو تاریخ قومی تصورات کے بغیر یا قومی ڈھانچے سے باہر رہ کر مرتب کی جائے گی ہرگز قابل اعتبار نہ ہو گی۔

یہ حقیقت ہے کہ سیاسی نقطہ نگاہ کے مطابق تاریخ لکھنا گوناگوں خطرات کو دعوت دینا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاریخ کی اس قسم میں تاریخ کو تنگ اور محدود نظریہ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں مورخ اور تاریخ خواں دونوں جارحانہ حب الوطنی کے جذبات کا پیکر بن جاتے ہیں۔ اس طرح سے زمانۂ ماضی پر دور حاضر کی قومیت کا پرتو ڈال کر مصنوعی تقسیمیں پیدا کی جاتی ہیں۔ تاریخ کے لازمی عناصر کو چھوڑ کر سیاست اور ڈپلومیسی کا کردار بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس پر جو چھاپ لگا دی جاتی ہے تاریخ کو اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ مثلاً ثقافت، مذہب، معاشرتی اقدار اور اقتصادیات کو جس رنگ و روپ میں بدل دیا جائے گا وہ اسی نئی شکل میں نئے نام سے پکارے جائیں گے جیسا کہ قومی ثقافت، قومی اقتصادیات، قومی ادارے، قومی عقائد و نظریات اور قومی فوج وغیرہ۔ سیاسی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ ایک خاص قسم کی سادگی اور بیانی خطوط کی وضاحت پیش کرتی ہے۔

سیاسی تاریخ کا تعلق ریاست، معاشرے اور حکومت سے ہے۔ سیاسی تاریخ ریاست و حکومت کی تمام بنیادی اقدار اس کی ہیئت، اقسام اور نشوونما کا جائزہ پیش کرتی ہے یعنی یہ ریاست و حکومت کی مختلف حیثیتوں سے بحث کرتی ہے۔

بعض مفکرین کا خیال ہے کہ سیاسی تاریخ علوم کا وہ حصہ ہے جو ریاست کی بنیاد، حکومت کے اصولوں، حاکمیت اعلیٰ اور معاشرے کی سیاسی سرگرمیوں سے بحث کرتا ہے[۲۳]۔ مگر یہ تصور ہمارا ذہن عمرانیات کی طرف لے جاتا ہے تاہم سیاسی تاریخ کی باقاعدہ تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ

> "سیاسی تاریخ انسانوں کے اس اجتماعی رویے سے بحث کرتی ہے جس کے مطابق وہ اپنے تمام اجتماعی امور کو باقاعدہ منظم صورت میں انجام دیتے ہیں اور اپنے مقاصد زیادہ بہتر صورت میں حاصل کرتے ہیں۔"

گویا سیاسی تاریخ انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی امور، واقعات و حوادث کو سیاسی معاشرے میں معقول توازن کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ یہ وہ مواد مہیا کرتی ہے کہ جس کی بنا پر مورخ ماضی میں افراد کی سیاسی سرگرمیوں اور رویوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ فری مین نے کہا تھا کہ:

> "تاریخ ماضی کی سیاست ہے اور سیاست حال کی تاریخ"

جان سیلی کا بیان ہے کہ:

> "سیاسیات کے بغیر تاریخ بے ثمر ہے اور تاریخ کے بغیر سیاسیات کی کوئی جڑ نہیں۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"History without political science has no fruit,

Political science without history has no root"

تاریخ سیاست کی محتاج نہیں۔ اس کے اپنے مقاصد، دائرہ کار، اقدار اور اصول و قواعد ہیں یہ اپنی نشوونما کے لیے کسی علم پر انحصار نہیں کرتی بلکہ سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات، مذہب، فلسفہ جغرافیہ، عمرانیات، فنون لطیفہ، سائنسی علوم غیرضیکہ دیگر بے شمار علوم اس کے مرہون منت ہیں اور ان کی زندگیوں کی کہانیاں اس کی تہوں میں موجود ہیں۔ لہٰذا تاریخ سے تعلق ظاہر کیے بغیر کوئی بھی اچھا سیاسی نظریہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

سیاسی تاریخ میں عالی ظرفی ہمیشہ بہترین دانائی ہے۔ عظیم سلطنت اور تنگ نظری کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ الیگزنڈر پوپ (Alexander Pope) کا خیال تھا کہ حکومت کی مختلف اقسام کے بارے میں بحث یا اختلاف کرنا محض احمقانہ بات ہے۔ تاہم تاریخ عمومی طور پر حکومت اور اس کی سب اقسام کے بارے میں بتاتی ہے مثلاً اشرافیہ، خلافت، طواف الملوکیت، نظام شہنشاہیت، جاگیردارانہ نظام، فسطائیت، نازیت، نراجیت، اشتراکیت، اشتمالیت، اور جمہوریت کے تحت کام کرنے والے نظاموں کی خوبیوں اور نقائص کی جتنی بھی صورتیں ہیں، سامنے لاتی ہے۔ اس سے شرفاء، عمائدین اور عوام کے ثقافتی معیار، سماجی رجحانات، فنکارانہ میلانات، ادب، اخلاقی اقدار، مجلسی آداب اور فنون لطیفہ کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہ ہمیں حاکمیت اور تنظیم حکومت کے علاوہ اصلاحات، اعلانات، مراعات، خطابات، نوازشات، منشائے حکومت، قانون، شہریوں کے حقوق و فرائض، آزادی، تحفظات آزادی، مساوات اور عدلیہ کے وظائف و اہمیت کی عملی صورتوں سے آگاہی بخشتی ہے۔

ابتداء سے ہی تاریخ و سیاست میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ زمانہ قدیم سے عہد جدید تک اگر سیاسی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ زیادہ تر سیاسی اثر و رسوخ کے تابع تحریر کی گئی۔ برصغیر پاک و ہند میں کچھ مورخین نے بالخصوص حکمرانوں کے طرز عمل اور عزائم کی تفسیر کے لیے تاریخ کو استعمال کیا۔ نتیجتہً ہندوستان کی سیاسی تاریخ یک طرفہ راستہ پر گامزن ہو گئی۔ اس طرح سے یہاں کی سیاسی تاریخ کا یہ عمل حقیقی تاریخ کے لیے ایک المیہ بن گیا۔

جس طرح دور بادشاہت میں درباری مورخین دربار کی زنجیروں میں بندھے ہوتے تھے، اسی طرح برصغیر پاک و ہند میں آج کا رسمی اور موقع پرست مورخ حکمرانوں اور صاحب اقتدار لوگوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور انہی کے سیاسی افکار کی تشہیر میں لگا ہوا ہے۔ جس طرح درباری تاریخ نویسی اپنی تنگ نظری کے سبب تاریخ کو وسیع مفہوم نہ دے سکی، اسی طرح پاک و ہند کی جدید تاریخ نویسی بھی نفرت، فرقہ واریت، لسانیت اور نسلی تعصب کا شکار ہو کر حقیقت پسندی، وسیع القلبی اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وسیع النظری کی تعلیم نہ دے سکی۔ جس کی وجہ سے ہماری تاریخ نویسی کا کوئی قاعدہ' اصول اور نمونہ نہیں رہا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ صرف ایک ہی مشین سے ریکارڈ مرتب ہو رہے ہیں۔ لہٰذا ہماری سیاسی تاریخ ایک بے جان' خشک اور غیر دلچسپ چیز بن کر رہ گئی ہے اور ہمارے مورخین کا اسلوب بیان و تحریر' دلائل اور واقعات کو پیش کرنے کا طریقہ کار نہ تو ہماری نسلوں کو متاثر کرتا ہے اور نہ ہی ان پر کسی قسم کے اثرات چھوڑتا ہے۔

۳۔ معاشی تاریخ Economic History

معاشی تاریخ کا نظریہ انیسویں صدی کی دریافت نہیں بلکہ ارسطو اور افلاطون کی تحریروں میں بھی اس نظریہ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس توجیہہ کے مطابق سماجی و معاشی تبدیلی کی تحریکوں میں شامل ممتاز ہستیاں ان تحریکوں کی وجہ نہیں بلکہ ان کے اثرات کی پیداوار تھیں۔ تاریخ کی یہ تعبیر نئی بھی تھی اور حیران کن بھی۔ ٹروجن لڑائی کے ہیروؤں اگا ممنن (Agamemnon) اکیلز (Achilles) اور ہیکٹر (Hector) نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہو گا کہ یونانیوں کو ایک ہزار جہازوں کے ساتھ ٹرائے پر چڑھائی کے لیے آمادہ کرنے والی شہزادی ہیلن (Helen) کی خوبصورتی' کہ جس کا چہرہ "ہزار ستاروں کی خوبصورتی میں ملفوف شام کی ہوا سے بھی زیادہ خوبصورت تھا" کی بجائے درہ دانیال پر تجارتی کنٹرول کی معاشی ضرورت تھی۔ اس طرح بہت سے اور ایسے معاشی حقائق بے نقاب ہوتے گئے جن کی برہنگی پر قدیم دور کے دقیقہ رس لوگوں نے الفاظ و تصورات کے پردے ڈال رکھے تھے۔[۲۴]

۵۹۴ ق۔ م میں ایتھنز میں پلوٹارک کے بقول:

> "امیر اور غریب کے درمیان دولت کا فرق اس قدر انتہا کو پہنچ چکا تھا کہ شہر ایک خطرناک صورت حال سے دو چار نظر آتا تھا۔ اور مطلق العنان حکومت کے علاوہ اسے ہنگاموں سے بچانے کے کوئی اور ذرائع ممکن نظر نہیں آتے تھے۔[۲۵]"

۵۹۲ کے ایتھنز میں تمام ذرائع پیداوار حکومت امراء کے ہاتھوں میں تھے اور بد عنوان عدالتیں غرباء کے خلاف فیصلے کیے جا رہی تھیں۔ غریبوں میں غربت کی بدولت بغاوت کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ امراء جنہیں اپنی ملکیت اور دولت خطرے میں نظر آ رہی تھی اپنی حفاظت کے لیے خون خرابے پر تیار تھے لیکن معقولیت پسند عناصر نے سولون (Solon) جو کہ اشرافیہ سلسلہ نسب کا ایک تاجر تھا کو حکمران کے طور پر منتخب کرا لیا۔ سولون نے فوری طور پر سکے کی قیمت میں کمی کر دی۔ اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرح سب مقروض لوگوں کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اگرچہ وہ خود بھی قرض خواہ تھا۔ اس نے تمام نجی قرضے کم کر دیئے اور قرض کی بنا پر قید کا قانون ختم کر دیا۔ اس کے علاوہ اس نے ٹیکسوں کے بقایا جات اور رہن کا سود منسوخ کر دیا۔ انکم ٹیکس کی درجہ بندی کا نظام رائج کیا جس میں امیروں کو غریبوں کی نسبت بارہ گنا زیادہ شرح سے ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ سولون نے عدالتوں کی از سرنو تنظیم کر کے انہیں زیادہ عوامی بنیادوں پر استوار کیا۔ اس نے یہ بھی انتظام کیا کہ جو لوگ ایتھنز کے لیے جنگ کرتے ہوئے مارے جائیں، ان کے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت حکومت کے خرچہ پر ہو۔ ان اصلاحات پر امراء نے احتجاج کیا کہ یہ بہت سخت اور دولت کی مکمل ضبطی کے مترادف ہیں۔ جبکہ انتہا پسندوں کا یہ شکوہ تھا کہ اس نے زمینیں از سرنو تقسیم نہیں کیں۔ لیکن ایک نسل گزرنے کے دوران ہی یونان کے تقریباً" سب لوگ اس بات پر متفق رہے کہ سولون کی معاشی اصلاحات نے ایتھنز کو انقلاب سے بچا لیا تھا۔

جب اٹلی میں ارتکاز دولت کا عمل ایک دھماکہ خیز سطح پر پہنچ چکا تھا تو رومن سینٹ نے جو اپنی دانائی کے لیے حد درجہ مشہور ہے، نے غیر مصالحانہ رویہ اختیار کیا۔ جس کا نتیجہ سو سال کی خانہ جنگی اور طبقاتی لڑائی کی صورت میں نکلا۔ طبقہ امراء میں سے ایک فرد ٹائبریس (Tiberius) کو حکمران منتخب کر لیا گیا تھا۔ جب اس نے زمین کی حد ملکیت تین سو تینتیس ایکڑ فی شخص مقرر کر کے فالتو زمین دارالحکومت کے بے چین محنت کشوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی تو سینٹ نے اس کی تجویز کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ "یہ تو جائیداد کی ضبطی کے مترادف ہیں۔" اس پر ٹائبریس نے لوگوں سے ان الفاظ میں اپیل کی:

> "تم دولت اور آسائشات دوسروں کو دینے پر لڑتے اور مرتے ہو، تم دنیا کے آقا کہلاتے ہو، لیکن گز بھر زمین بھی ایسی نہیں کہ جسے تم اپنی کہہ سکو۔[۲۶]"

مغربی رومن سلطنت کے سیاسی استحکام کے خاتمے کے بعد ۴۷۶ء میں کتھولک کلیسا کی حکومت کے قیام کے لیے ضروری دولت کے از سرنو مجتمع ہونے میں بدحالی کی کئی صدیاں بیت گئیں۔ سولہویں صدی میں مارٹن لوتھر کی اصلاح پذیری کی تحریک (Reformation) ایک طرح کی کلیسا کو ادائیگیوں میں کمی اور کلیسائی جائیداد اور محاصل پر سیکولر تصرف کے ذریعے دولت کی از سرنو تقسیم کا عمل تھا۔

ایران، یونان اور روم کی لڑائیوں کی مانند صلیبی جنگیں بھی مغربی طاقتوں کی جانب سے مشرق کے تجارتی راستوں پر قبضہ کرنے کی کوششوں کا نتیجہ تھیں۔ تحریک نشاۃ ثانیہ اور نئی دنیاؤں کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دریافت انہی صلیبی جنگوں میں ناکامی کا نتیجہ تھیں۔

انقلاب فرانس والٹیر کی شاندار تحریروں یا روسو کی جذباتی اور رومانی تصانیف کے باعث واقع نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ درمیانہ طبقہ جس نے رہبری حاصل کر لی تھی اسے اپنے کاروبار اور تجارت کے لیے قانون سازی کی آزادی درکار تھی اور وہ سیاسی اقتدار اور ممتاز سماجی حیثیت کے حصول کے لیے بے قرار تھا۔ انقلاب فرانس میں دیہی علاقوں کے کسانوں کی بغاوتوں اور شہروں میں قتل عام کے ذریعے دولت کی نئے سرے سے تقسیم کی کوشش کی گئی لیکن اس انقلاب کے نتیجہ میں دولت امراء (Aristocracy) سے بورژوا طبقے کو منتقل ہو گئی۔

جنگ عظیم اول نو آباد کاریوں' نو آبادیوں اور نئی تجارتی منڈیوں کے حصول و تحفظ کا نتیجہ تھی۔ جنگ عظیم دوئم' جنگ ویت نام' جنگ کوریا اور عراق و امریکہ کی جنگیں بھی تو معاشی مفادات کے لیے لڑی گئیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت نے ۱۹۲۳ - ۱۹۵۲ اور ۱۹۶۰ - ۱۹۶۵ میں سولون (Solon) کی اصلاحات کے پرامن طریقہ کار کو اپنا کر دولت کی معتدل پیمانے پر از سرنو تقسیم مکمل کر لی۔ شائد ارباب اقتدار میں سے کسی نے معاشی تاریخ کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ مگر اب امریکہ کے بالائی طبقات نے تقسیم دولت کے اس عمل کو "طوعاً" ناقبول کر لیا اور نئے سرے سے مزید دولت اکٹھی کرنی شروع کر دی ہے۔

سیاسی نظاموں' مذہبی اداروں' تہذیبی تخلیقات ان سب کی جڑیں معاشی حقائق میں پوشیدہ ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ صنعتی انقلاب اپنے ہمراہ جمہوریت' مساوات نسواں' ضبط تولید' سوشلزم' انحطاط مذہب' اخلاقی قدروں کا زوال' ادب کی امراء کی سرپرستی سے آزادی' ناول و افسانہ کی صنف میں رومانویت کی جگہ حقیقت پسندی اور تاریخ کی معاشی توجیہہ لیکر آیا۔ تاریخ کی معاشی تعبیر نے تاریخی حقائق کو ایک نئے زاویئے سے پرکھنے کی دعوت دی۔

بلاشبہ تاریخ کی معاشی توجیہہ سے "تقریباً" سارے ہی تاریخی واقعات و حوادث کی تشریح کی جا سکتی ہے۔ مثلاً تاج محل کی تعمیر ہندوستان کی ریاستوں کی دولت سے ہوئی۔ قلوپطرہ کے مصر کے خزانوں سے' آگسٹس کے اٹلی' جس کی معشیت دم توڑ رہی تھی' نے نئی زندگی پائی۔ ہندوستان کی دولت سے برطانوی حکومت اس قابل ہو سکی کہ وہ برطانیہ عظمیٰ (Great Britain) کہلوا سکے۔

بہت سی صورتوں میں سیاسی یا فوجی اقتدار معاشی عوامل کا نتیجہ ہونے کی بجائے اس کی وجہ قرار پایا ہے۔ جیسا کہ ۱۹۱۷ء میں روس پر بالشویکوں کا قبضہ یا پھر جنوبی امریکہ کی تاریخ میں فوجی بغاوتوں کا تسلسل۔ کون یہ دعویٰ کرے گا کہ مسلمانوں کی سپین کی فتح' یا منگولوں کی مغربی ایشیا کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فتوحات' یا مغلوں کی ہندوستان کی فتح معاشی قوت کا نتیجہ تھیں؟ تاہم تاریخ کی معاشی توجیہہ سے ہم ماضی کے مشاہدات کی روشنی میں مستقبل کے بارے میں کافی معلومات اخذ کر سکتے ہیں۔

ماضی کے تجربات اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ ہر معاشی نظام کو جلد یا بدیر افراد یا گروہوں کو پیداوار بڑھانے پر آمادہ کرنے کے لیے کسی نہ کسی منافع بخش محرک کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس معاملہ میں غلامی' جبر یا نظریاتی جوش و خروش جیسے نعم البدل انتہائی غیر سود مند' بہت زیادہ مہنگے اور نہایت ہی عارضی ثابت ہوتے ہیں۔

عام حالات میں انسان "عموماً" اپنی پیداواری صلاحیت کے حساب سے پرکھے جاتے ہیں۔ ماسوائے دوران جنگ' جب انسانوں کی درجہ بندی ان کی دوسروں کو تباہ کرنے کی اہلیت کے مطابق کی جاتی ہے۔

چونکہ انسان میں عملی صلاحیت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ "نتیجتہً" "تقریباً" تمام معاشروں میں عملی صلاحیتیں اکثر لوگوں کی ایک قلیل تعداد میں مجتمع ہو جاتی ہیں۔ ارتکاز دولت کا جو عمل تاریخ میں بار بار دہرایا جاتا ہے صلاحیتوں کے اس ارتکاز کا فطرتی نتیجہ ہے۔ اگر دوسرے تمام عوامل یکساں رہیں تو ارتکاز دولت کی شرح میں اخلاق اور قانون کی عطا کردہ معاشی آزادیوں کے تناسب سے اضافہ ہو جاتا ہے۔ مطلق العنانیت میں ارتکاز دولت ایک وقت کے لیے کم ہو سکتا ہے ۔ البتہ جمہوریت' جس میں زیادہ سے زیادہ آزادی میسر ہوتی ہے ارتکاز دولت کے عمل کو تیز تر کرتی ہے۔ ۱۷۷۶ء سے پیشتر امریکی معاشرے میں ایک حد تک مساوات موجود تھی لیکن ہزار طرح کی جسمانی' ذہنی اور معاشی تفریقات کے باعث اب اس کا وجود کہیں باقی نہیں رہا اور آج امیر ترین اور غریب ترین افراد کے درمیان معاشی تفاوت اس قدر زیادہ بڑھ گیا ہے کہ جس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ ترقی یافتہ معاشروں میں اس ارتکاز دولت سے ایسی صورتحال پیدا ہو سکتی ہے کہ بہت زیادہ غرباء کی عددی طاقت چند امراء کی **صلاحیتی** طاقت کے برابر آ جائے۔ اس غیر مستحکم توازن سے ایک بحرانی کیفیت جنم لیتی ہے جس کا مقابلہ کرنے کے لیے تاریخ مختلف طریقے وضع کرتی ہے۔ کبھی دولت کی تقسیم از سر نو کرنے کے لیے قوانین بنا کر اور کبھی انقلاب کے ذریعے غربت کو تقسیم کر کے۔

غرضیکہ ارتکاز دولت ایک فطری اور ناگزیر عمل ہے۔ اس عمل میں "وقتاً" "فوقتاً" پر تشدد یا پر امن طور پر دولت کی از سر نو تقسیم کے باعث رکاوٹ پڑتی رہتی ہے۔ اس نقطہ نظر سے تمام معاشی تاریخ سماجی نظام کے دل کی ست رو دھڑکن کی مانند ہے۔ جس میں دولت کا مجتمع ہونا اور لازمی طور پر دوبارہ گردش میں آنا دل کے سکڑنے (Systole) اور اس کے پھیلنے (Diastole) کے عمل سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مشابہ ہے۔

کارل مارکس نے تاریخ کے معاشی نظریہ کو انسان کی پوری داستان پر منطبق کرنے کے بعد طبقاتی جنگ میں آنے والی تاریخ کو پیش کیا۔ کارل مارکس کے مطابق تاریخ معاشیات کے روبہ عمل ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی افراد' گروہوں' طبقات اور ریاستوں کے درمیان خوراک' ایندھن' مادی وسائل اور معاشی طاقت کے لیے مقابلہ .کے حالات و واقعات اور نتائج کا نام تاریخ ہے۔

مارکس کے نزدیک تاریخ معاشی عمل کا نام ہے۔ ذرائع پیدائش سے تمام سماج کی ترکیب و تشکیل ہوتی ہے۔ ذرائع پیدائش میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ سماج میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

تاریخ کے سارے تسلسل میں معاشی عنصر غالب رہتا ہے۔ مارکس کے اس نظریہ سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ انسان معاشی مقاصد کے علاوہ جدوجہد ہی نہیں کرتا۔ مارکس اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ انسانی معاشرہ کی تشکیل میں معاشی اسباب کے علاوہ دوسرے عناصر بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ مارکس نے انسانی تاریخ کے لیے اس نظریہ کو قانون کی صورت میں پیش کیا۔ چونکہ انسانی سرگرمیوں کا تعلق ذرائع پیدائش سے ہے۔ اس لئے مارکس کے نزدیک انسان کی انفرادی ہستی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مورخ واقعات نگاری کرتے چلے آ رہے تھے۔ ماہرین معاشیات معاشی حوادث کے اسباب و علل کا تجزیہ کئے بغیر انہیں پیش کرتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن مارکس نے درباری مورخوں اور اجیر ماہرین معاشیات کے تراشے ہوئے اصول ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ساری انسانی تاریخ ذرائع پیدائش کے تغیر سے پیدا ہوتی رہی ہے اور یہ کہ تاریخ کے حوادث کا سب سے بڑا سبب معاشیات ہوتا ہے۔ مارکس کے زمانہ میں بہت سے مورخ تاریخی حوادث کے اسباب کی تلاش میں مصروف تھے لیکن مارکس نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا جسے نہ تو اس کے پیش رو اور نہ ہم عصر مورخ اور ماہرین معاشیات سمجھ سکے۔ مارکس اپنی کتاب "فلسفہ افلاس" میں لکھتا ہے۔

> "معاشی عوامل اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ پیدائش کیونکر ہوتی ہے لیکن وہ اس امر کو فراموش کر دیتے ہیں کہ تعلقات کیونکر پیدا ہوتے ہیں یعنی وہ اس تاریخی حرکت کو بھول جاتے ہیں جس سے یہ تعلقات قائم ہوتے ہیں۔"

مارکس نے اپنے نظریہ کے علاوہ تاریخ کے جن نظریوں پر بحث کی ہے ان میں سے صرف دو قابل ذکر ہیں۔ تصوراتی اور جبری! تاریخ کے تصوراتی نظریہ سے یہ مراد ہے کہ تمام تاریخی حوادث انسانی تصورات کے نتائج ہیں۔ ان تصورات کی وجہ سے تاریخی حوادث رونما ہوئے۔ اس نظریہ پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اظہار خیال کرتے ہوئے مارکس کہتا ہے کہ "تصور اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ مادی دنیا کا ایک ذہنی عکس ہوتا ہے۔" تاریخ کے جبری نظریہ سے مراد ہے کہ انسانی تاریخ کے حوادث کا اسی صورت میں رونما ہونا ضروری تھا جس صورت میں وہ ظاہر ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ انسان میں یہ قوت نہیں ہے کہ وہ حوادث کی اس رفتار کو بدل سکے جو ازل سے مقرر ہو چکی ہے۔ کارل مارکس تاریخ کے اس جبری نظریہ کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اس نظریہ کی تردید کرتا ہوا لکھتا ہے:

"یہ حقیقت ہے کہ انگلستان میں صنعتی ترقی کے باعث اسکاٹ لینڈ کی زمینوں کی قیمت میں نیا تغیر رونما ہوا۔ اس انڈسٹری کی وجہ سے اون کی کھپت کے لیے دروازے کھل گئے۔ اون کو وسیع پیمانے پر حاصل کرنے کے لیے زرعی زمینوں کو چراگاہوں میں بدل دیا گیا۔ اس تبدیلی کے لیے ضروری تھا کہ زمین کے وسیع ٹکڑوں پر قبضہ کیا جائے۔ چنانچہ تھوڑی زمینوں کے مالک سب سے پہلے اس کا شکار ہوئے اور اس کے ساتھ ہی ہزاروں کسانوں کو زرعی زندگی چھوڑ کر کارخانوں میں مزدوری کرنا پڑی۔ ان کسانوں کی جگہ چند چرواہوں کو بھیڑیں پالنے پر نوکر رکھ لیا گیا۔ چنانچہ مسلسل تبدیلیوں سے بھیڑوں نے انسانوں کو اسکاٹ لینڈ سے نکال دیا۔ کیا آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ قدرت کو یہ منظور تھا کہ بھیڑیں انسانوں کو اسکاٹ لینڈ سے نکال دیں۔ اگر ہم اسے صحیح تسلیم کر لیں تو یہ تاریخ کا جبری نظریہ ہو گا۔"

تاریخ کے معاشی نظریہ پر رائے زنی کرتا ہوا فریڈرک اینگلز "اینٹی ڈیورنگ" میں لکھتا ہے کہ:

"اس نظریہ کی رو سے تمام مجلسی تبدیلیاں اور سیاسی انقلابات کے اسباب کی تلاش افراد کے ذہنوں میں نہیں کرنا چاہئے بلکہ ذرائع پیدائش اور مبادلہ کی تبدیلیوں میں کرنا چاہئے۔ ان اسباب کی تلاش فلسفہ میں نہیں بلکہ متعلقہ ازمنہ کی معاشیات میں کرنا چاہئے۔"

اسی نظریہ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے بوبر اپنی کتاب "تاریخ کے متعلق مارکسی تصریحات" میں لکھتا ہے کہ:

"ذریعہ پیدائش تاریخ کا الف ابجد اور تائے تمت ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب کچھ اصل موضوع سے پریشان کن انحراف ہے۔ دوسرے عناصر نے تاریخ میں معمولی تبدیلی پیدا کی۔ لیکن تاریخ کی رو سے اور اس کا سب سے بڑا سبب ذریعہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیدائش ہے۔"

لیڈلر کے نزدیک:

> "تاریخ کے معاشی یا مادی نظریہ سے یہ مراد ہے کہ ایک خاص زمانہ میں سماج کے معاشی تعلقات، سماج کے مجلسی، سیاسی، ذہنی اور اخلاقی ارتقاء کی تشکیل کرتے ہیں۔"

اگر ذریعہ پیدائش سے مراد صرف پیدائش کا طریق کار ہو تب یہ کہنا بے معنی ہو جاتا ہے کہ تمام مجلسی اداروں کا سرچشمہ یہ "ذریعہ پیدائش" ہے۔ کارل مارکس کی تحریروں سے اس امر کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ تاریخ کے معاشی نظریہ پر بحث کرتے وقت ذریعہ پیدائش سے اس کی مراد پیدائش کا طریق نہیں ہے۔ اس کے نزدیک مزدوروں کی عام حالت، ان کی تنظیم تقسیم کار، اتحاد محنت اور مزدوروں کی قوت پیدائش سب کے سب پیدائش پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مارکس کے ذریعہ پیدائش میں طبعی وسائل بھی شامل ہیں۔

> "جدید بار آور قوتوں کو کام میں لانے کے لیے انسان اپنے ذرائع پیدائش بدلتے رہتے ہیں اور اس تبدیلی میں وہ اپنے ذرائع معاش کو بدل دیتے ہیں۔ اپنے تمام مجلسی تعلقات بدل دیتے ہیں۔"
>
> "تاریخ اس سے زیادہ اور کسی چیز کی وضاحت نہیں کرتی کہ انسان کے خیالات اسی نسبت سے بدلتے ہیں جس نسبت سے مادی حالات بدلتے ہیں[27]۔"

تاریخ کے معاشی نظریہ کو جدلیاتی مادیت اور تاریخی مادیت بھی کہتے ہیں۔ جدلیاتی مادیت اس لیے کہ مظہر قدرت کے سمجھنے کا طریقہ جدلیاتی اور اس مظہر قدرت کا تصور مادی ہوتا ہے۔ جدلیاتی مادیت کے اصولوں کو جب انسان کی مجلسی زندگی پر پھیلا دیا جائے تو اسے تاریخی مادیت کہیں گے۔ تاریخی مادیت اس طرز تفکر کا نام ہے جس میں جدلیاتی مادیت کے اصولوں کو سماج کی زندگی اور اس کی تاریخ پر منطبق کیا جائے۔ جدلیاتی طرز تفکر کی تشریح کرتے ہوئے مارکس اور اینگلز، ہیگل کا حوالہ دیتے ہیں جس نے جدلیات کے اصول مرتب کئے۔ لیکن مارکس اور اینگلز کی جدلیات سے مختلف ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مارکس اور اینگلز نے ہیگل کی جدلیات سے اس کا "معقول مغز" لے کر اس کے تصوراتی چھلکے کو پھینک دیا۔ اسی طرح مارکس اور اینگلز مادیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے فیور باخ کا حوالہ دیتے ہیں۔ لیکن فیور باخ اور ان دونوں کی مادیت میں بنیادی فرق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔

کارل مارکس کے نزدیک انسانی تاریخ طبقاتی کش مکش کا ایک ارتقائی عمل ہے۔ مارکس نے اپنے اس نظریہ کی تائید میں "تاریخ عالم" پیش کرنے کے لیے اپنے قلم کو جنبش نہیں دی اور نہ ہی اس وقت تک کوئی ایسی تاریخ عالم لکھی جا چکی ہے جو **فیثا** غورث کے اس جملہ کا کہ "تمام اشیاء اعداد ہیں" معاشی پس منظر بیان کر سکے۔ مارکس کے نزدیک سیاسیات ایک آزاد سائنس نہیں، بلکہ وہ سیاسی ماحول میں معاشی اسباب کا عکس ہے۔ **مارکسیوں** نے انیسویں صدی کی جمہوریت کو بیک جنبش قلم ختم کر دیا۔ ان کے نزدیک جمہوریت اس وقت تک بے معنی ہے جب تک کہ معاشی مساوات پیدا نہ ہو جائے۔

۴۔ جنگی تاریخ Military History

تاریخ عالم میں امن و خاموشی محال ہے۔ اس میں تلاطم و شور، ہنگامہ و انقلابات، تراش و خراش اور شکست و ریخت کا عمل جاری و ساری ہے۔ فطرت ازل سے ہی بے چین ہے اور فطرت کی بے چینی کا یہ اظہار ہے کہ یہ انسانوں کے علاوہ ہر شئے میں تبدیلیاں لاتی ہے۔ خیالات و نظریات، حکومت و ریاست، مذہب و سیاست غرضیکہ کائنات کی ہر شئے ارتقائی عمل سے گزرتے ہوئے جنگ و جدل کا شکار ہوتے، ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ کی طرف رواں دواں ہے۔ قومیں نئے بحرانوں، انقلابوں اور نظریات کا شکار ہیں۔ اس انتشار و خلفشار سے نئی زندگی، نیا ماحول اور نئی اقدار جنم لے رہی ہیں۔

کسی قوم میں طاقت کا احساس اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ حالت جنگ سے دوچار ہوتی ہے۔ جنگ سے اس کی خوابیدہ طاقتیں بیدار ہوتی ہیں۔ قوموں کی زندگی اور تقدیر میں جنگ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ لاسل (Lausule) مخالفت اور جنگ کو تمام ترقی کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

جنگ دراصل فطری قانون ہے جو ہر شے میں ہر جگہ اور ہر ماحول میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ برک ہارٹ جنگ کو صحت مند معاشرے کے لیے مفید و لازمی قرار دیتا ہے۔ بقول علامہ اقبال

آ تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

لیو (Leo) جنگ کو ایک صحت بخش اور فرحت بخش ذریعہ بتاتا ہے جو گھٹیا اور کمزور کو ختم کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیتی ہے۔

جنگ قوموں میں نظم و ضبط اور احساس قومیت پیدا کرتی ہے۔ جنگ کی خاطر قومیں، جماعتیں اور افراد باہمی اختلافات ختم کر کے ایک مشترک عظیم مقصد کے حصول کے لیے اپنی خدمات و قربانیاں پیش کرتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ صرف طاقت کے ذریعے امن قائم رکھا جا سکتا ہے اور جنگ کی صورت میں اس کا لوہا منوایا جا سکتا ہے۔ اسی لیے "امن کی جنت" جنگ کی آگ میں تعمیر ہوتی ہے۔ جب حق' باطل کے خلاف بر سرپیکار ہو تو حق خواہ کتنی ہی قلیل تعداد میں ہو اور باطل کثیر تعداد میں ہو' حق کو ہمیشہ فتح نصیب ہوتی ہے اور نتیجہ کے طور پر تاریخ میں ذہنی' مذہبی' سماجی اور معاشی انقلابوں نے جنم لیا ہے۔ مثلاً عہد قدیم میں جنگ نے یونانیوں کو ایرانی تسلط کے خلاف ایک متحد اور طاقتور قوم بنا دیا۔ سولھویں صدی کے آخر میں سپین کے خلاف جنگ میں نیدر لینڈ کے متحدہ صوبے ایک خود مختار ملک ہالینڈ کی صورت میں نمودار ہوئے۔

یہ حقیقت ہے کہ جب بھی کوئی قوم باہمی انتشار و اختلافات کا شکار ہوئی وہ روبہ زوال ہو گئی۔ اس کے بعد کوئی انقلابی کام نہ کر سکی بلکہ انتہائی بے بسی کے ساتھ تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ کے لیے گم ہو گئی۔

جنگیں تاریخ میں ایک مستقل حیثیت رکھتی ہیں اور تمدن کی ترقی یا جمہوریت کی آمد سے ان میں کوئی کمی نہیں آتی۔ مستند انسانی تاریخ تقریباً دس ہزار سال پر محیط ہے۔ اس دوران صرف ۶۸ ۲ سال ایسے ہیں جن میں جنگ نہیں ہوئی۔ فی زمانہ جنگ کو انواع انسانی میں قدرتی انتخاب (Natural Selection) کا ایک ذریعہ اور باہمی مقابلہ کی انتہائی شکل تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہر ہیکلیٹس (Heracleitus) کے بقول جنگ یا مقابلہ ہی تمام چیزوں کا بانی ہے۔ تمام نظریات جنگ کی گود میں ہی پرورش پاتے ہیں۔ اسی کے باعث نئے ادارے اور ریاستیں جنم لیتی ہیں۔ امن تو ایک ایسا غیر مستحکم توازن ہے جو محض ایک فریق کی دوسرے پر مسلمہ برتری یا متحارب فریقین کی مساوی طاقت کی بنا پر ہی قائم رہ سکتا ہے۔

جنگ کی وجوہات بھی تقریباً وہی ہیں جو افراد کے درمیان مقابلہ کی ہوتی ہیں یعنی حرص' جھگڑا' ضد اور غرور۔ علاوہ ازیں خوراک' زمین' اشیاء و ایندھن کا حصول' طلب زر اور سب سے بڑھ کر حاکمیت کی خواہش۔

ریاست میں انسانی جبلتیں تو موجود ہوتی ہیں لیکن وہ انسانی کمزوریوں سے بہت حد تک مبرا ہوتی ہے۔ ایک فرد اخلاقیات اور قانون کی عائد کردہ پابندیوں کو اس لیے قبول کر لیتا ہے اور ریاستی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے اپنے مسائل لڑائی جھگڑے کی بجائے بات چیت یا قانونی ذرائع سے حل کرنے پر اس لیے آمادہ ہوتا ہے کیونکہ ریاست اسے اس کی زندگی' ملکیت اور حقوق کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔

ریاست بذات خود کسی خاص پابندی کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریاست کے پاس اپنے اختیار و ارادہ میں کسی قسم کی مداخلت کو روکنے کے لیے کافی قوت موجود ہے اور نہ ہی ریاست سے بالاتر کوئی ایسا ادارہ موجود ہے جو ریاست کو تحفظ فراہم کرتا ہو۔ کسی بین الاقوامی قانون یا ضابطہ اخلاق میں اس امر کے لیے کوئی موثر قوت بھی موجود نہیں ہے۔

اگر افراد کا معاملہ ہو تو فخر و غرور زندگی کے مقابلوں کے دوران ایک اضافی توانائی مہیا کرنے والا عنصر ہوتا ہے۔ قوموں کے معاملہ میں جنگ اور سفارت کاری کے میدانوں میں قوم پرستی زائد قوت بہم پہنچاتی ہے۔ جب یورپ کی قومیں پاپائیت کے تسلط سے آزاد ہوئیں تو ہر ریاست نے اپنی افواج اور بحریہ کو تقویت و وسعت دینے کی خاطر قوم پرستی کی حوصلہ افزائی کی۔ جس کسی ریاست نے کسی خاص ملک سے تصادم کا امکان محسوس کیا تو اس نے اپنے عوام میں اس ملک کے خلاف نفرت کو ہوا دینی شروع کر دی اور اس نفرت کو نقطہ عروج تک پہنچانے کے لیے پر اثر نعرے وضع کیے گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہاں کے حکمرانوں نے اپنی امن پسندی کا پرچار بھی جاری رکھا۔

لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ تمام مخاصمانہ پروپیگنڈہ کے باوجود متحارب ملکوں کے عوام میں باہمی نفرت شاذ و نادر ہی ایسی سطح تک پہنچتی ہے جو انسانی روحوں کی لام بندی پر منتج ہو۔ ایسی صورت حال صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بین الاقوامی طور پر خوف اور بے اعتمادی کا دور دورہ ہو اور اقوام عالم کسی عالمگیر تصادم سے دو چار ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سولہویں صدی کی مذہبی جنگوں اور انقلاب فرانس کی جنگوں کے درمیانی عرصہ میں یورپ میں عمومی نفرت کی فضا موجود نہیں تھی۔ اس عرصہ کے دوران متحارب ریاستوں کے عوام ایک دوسرے کے کارہائے نمایاں اور تمدن کا احترام کرتے تھے۔ جن دنوں فرانس کی انگلستان سے جنگ جاری تھی انگریز لوگ فرانس میں بحفاظت سفر کیا کرتے تھے۔ فرانسیسی اور فریڈرک اعظم ان دنوں بھی ایک دوسرے کی تعریف کرتے رہے جب وہ باہم جنگ ہفت سالہ (Seven Years War) لڑنے میں مصروف تھے۔ سترہویں اور اٹھارویں صدی میں جنگیں عوام کی بجائے اشرافیہ کا باہمی مقابلہ ہوتی تھیں۔ بیسویں صدی میں مواصلات ذرائع آمد و رفت اور ہتھیاروں کی ترقی نیز پروپیگنڈہ کے ذرائع کی بہتری نے جنگ کو اشرافیہ کی لڑائی کی بجائے عوام کی جدوجہد میں تبدیل کر دیا۔ اس جدوجہد میں فوجوں کے ساتھ شہری بھی برابر کے شریک ہوتے ہیں اور فتح حاصل کرنے کے لیے جان و مال کی وسیع پیمانہ پر قربانی دینا پڑتی ہے۔ اب صرف ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنگ شہروں کی تعمیر، فنون لطیفہ کی تخلیق اور متمدن اطوار کی نشوونما میں صرف شدہ صدیوں کی محنت کو تباہ کر سکتی ہے۔

البتہ جنگ کے بارے میں ایک معذرت خواہانہ تشفی کا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ جنگ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس ترقی کے باعث ہونے والی ایجادات زمانہ امن کی مادی کامیابیوں کو وسعت دے سکتی ہیں۔ بشرطیکہ یہ ایجادات جنگ کی پیدا کردہ عالمگیر افلاس و بے نوائی اور بربریت میں کھو کر نہ رہ جائیں۔

ہر دور میں جرنیلوں اور حکمرانوں نے آگسٹس اور اشوک جیسی چند شخصیات کو چھوڑ کر فلسفیوں کی جنگ سے ناپسندیدگی کا یہ کہہ کر مذاق اڑایا ہے کہ جنگ سے نفرت کرنا بزدلوں کا شیوہ ہے۔ تاریخ کی عسکری توجیہہ پر یقین رکھنے والوں کے نزدیک جنگ مسائل کا آخری حل ہے اور یہ فطری اور لابدی عمل ہے۔ ان کے بقول صرف بزدل اور احمق ہی اس بات کے قائل ہو سکتے ہیں کہ جنگ کے بغیر بھی بنی نوع انسان کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ وہ دلیل دیتے ہیں چارلس مارٹل (Charles martel) کی طورس (Tours) کے مقام پر فتح نے ہی ۷۳۲ء میں فرانس اور سپین کو مسلم علاقے بننے سے روکا اسی طرح اگر ہم تاتاریوں اور منگولوں کے حملوں کے خلاف مسلح مزاحمت نہ کرتے تو آج ہمارا کلاسیکی تمدنی ورثہ نیست و نابود ہو چکا ہوتا۔ عوام کی جنگ پسندی کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ ان جرنیلوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں جو میدان جنگ کی بجائے بستر پر مریں۔ اگرچہ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مردہ جرنیل کی نسبت زندہ جرنیل زیادہ قابل قدر اور مفید ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ کسی ہٹلر یا چنگیز خاں کا منہ پھیر دیں تو ہم خراج عقیدت کے طور پر ان کے مجسمے تراشتے ہیں۔ ایک فلسفی بھی اگر اسے تاریخ کا ادراک ہو اس بات کو تسلیم کرے گا کہ عرصہ دراز تک امن کی موجودگی کسی قوم کی جنگی صلاحیتوں کو مہلک حد تک کمزور کر دیتی ہے۔ بین الاقوامی قانون اور اخلاقیات کی لاچاری کے اس دور میں ایک قوم کو ہر گھڑی اپنے دفاع کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ جہاں اس کے اہم مفادات کا معاملہ ہو اسے اپنی بقاء کے لیے ہر وہ ذریعہ استعمال کرنے کی اجازت ہونی چاہیے جو وہ ضروری سمجھے۔ جب کسی قوم کی بقاء خطرے میں ہو تو اخلاقی اصولوں کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔

۵- مذہبی تاریخ Religious History

ایک مورخ جب مذہب کو ہر دور اور ہر سرزمین میں روبہ عمل اور بظاہر ناگزیر سمجھتا ہے تو اس کے دل میں مذہب کے لیے کچھ نہ کچھ عزت و تکریم پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ مصیبت میں مبتلا ناخوش لوگوں اور سوگواروں و ضعیفوں کے لیے ایسی مادرائی آسائشیں مہیا کرتا ہے جو لاکھوں لوگوں کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نزدیک کسی بھی مادی مدد سے زیادہ بیش قیمت ہوتی ہے۔ مذہب نے عاجز ترین مخلوق کو بھی عزت و وقار عطا کیا ہے اور مذہبی رسومات کے ذریعے انسانی معاملات کو باضابطہ طور پر خدائی معاملات میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس طرح مذہب نے معاشرہ کے استحکام میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

نپولین کے بقول " مذہب نے غریبوں کو امیروں کا قتل عام کرنے سے باز رکھا ہے۔ چونکہ انسان فطری طور پر غیر یکساں ہیں۔ اس صلاحیت و قابلیت کی غیر یکسانیت کی وجہ سے ہم میں سے بہت سوں کا مقدر غربت یا شکست خوردگی ہوتا ہے۔ ایسی مایوسی کے عالم میں مذہب کی عطا کردہ ایک ماورائی امید ہی انسان کا واحد سہارا ہوتی ہے۔ امید کو تباہ کرنے سے طبقاتی جنگ میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ آسمانی جنت اور ارضی جنت (utopia) رہٹ کے ڈولوں کی مانند ہیں۔ جب ایک نیچے جائے تو دوسرا اوپر آ جاتا ہے۔ جب مذہب انحطاط پذیر ہو تو سیکولرزم پھلتا پھولتا ہے۔

پہلی نظر میں مذہب کا اخلاقیات سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ بظاہر یہاں ہم محض اندازہ لگا رہے ہیں یا پیٹرو نیئس (Petronius) کی بات دہرا رہے ہیں جس نے یہ بات لکریٹئس (Lucretius) کے حوالے سے کی "یہ خوف ہی تھا جس نے پہلے پہل دیوتاؤں کو جنم دیا۔" زمین میں پوشیدہ قوتوں، دریاؤں، سمندروں، درختوں، ہواؤں اور آسمانوں کا خوف۔ ان قوتوں کی رضاجوئی کے لیے چڑھاؤں نے ان اندیشوں اور رسومات کو اخلاقیات اور قانون کی حمایت کے لیے استعمال کرنا شروع کیا تو مذہب ریاست کے مدمقابل ایک اہم قوت کے طور پر ابھرا۔ انہوں نے لوگوں کو باور کرایا کہ اخلاق اور قوانین کے مقامی ضابطے دیوتاؤں کا عطیہ ہیں۔ قدیم زمانہ کی تصاویر میں دیوتا تھوتھ (Thoth) کو مینیز (Menes) کو مصر کے لیے قوانین عطا کرتے، اور دیوتا شمس (Shamash) کو حمورابی (Hammurabi) کو بابل کے لیے ضابطہ اخلاق دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اسی طرح یہودا (Yahueh) سے حضرت موسیٰؑ کو دس احکامات (Ten Commandments) اور چھ سو سترہ اصول اخلاق اور آسمانی پری ایجیریا (Egeria) سے نوما پومپلیئس (Numa Pompilius) کو روم کے لیے قوانین لینے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ پاگان (pagan) مسلک اور عیسائی عقائد اس امر کا واضح اعلان کرتے تھے کہ زمینی حکمران آسمانی خداؤں کی طرف سے مقرر کیے جاتے ہیں اور وہی ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس حمایت کے لیے شکر گزاری کے طور پر تقریباً ہر حکومت اپنی زمینوں اور محاصل کی آمدنی میں مذہبی پیشواؤں کا حصہ رکھتی تھی۔

مذہب کے کچھ مخالفین کا خیال ہے کہ مذہب نے کبھی بھی اخلاقی قدروں کی ترقی و حفاظت میں کوئی کردار ادا نہیں کیا کیونکہ اخلاقی بے راہ روی میں مذہبی غلبہ کے زمانوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا ہے۔ قرونِ وسطیٰ [redacted] زمانوں میں بھی شہوت پرستی، شراب نوشی، فحش گوئی، لالچ، بددیانتی، ڈاکہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زنی اور تشدد موجود رہے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ تقریباً پانچ سو سال کے وحشیوں کے حملوں، جنگوں، معاشی بدحالی اور سیاسی ابتری کے باعث پیدا ہونے والا اخلاقی بحران غالباً بہت زیادہ شدید ہو جاتا اگر مسیحی اخلاق، مذہبی پیشواؤں کی نصیحتوں، عیسائی اولیاء کی سبق آموز زندگیوں اور سکون اور یکجائی پیدا کرنے والی مذہبی رسومات کی اعتدال پیدا کرنے والی قوتیں موجود نہ ہوتیں۔ رومن کیتھولک کلیسا نے غلامی، خاندانی جھگڑوں اور قومی مخاصمتوں کے خاتمے امن اور صلح کے دورانیوں میں توسیع کرنے، اور مبارزت یا کڑی سزاؤں کے ذریعے سچ جھوٹ کی پہچان کرنے کی بجائے مسلم عدالتوں کے قیام پر مبنی نظام کو رائج کرنے کے لئے بہت کوشش کی ہے۔ اس نے رومن یا وحشیانہ قوانین کے تحت نافذ کردہ سزاؤں میں نرمی پیدا کی اور خیراتی اداروں کی تنظیم اور گنجائش کو بہت زیادہ وسعت دی۔

اگرچہ کلیسا ریاست کے تحت خدمات انجام دیتا تھا لیکن اس کا دعویٰ سب ریاستوں سے بالا تر ہونے کا تھا کیونکہ اس کے مطابق اخلاقیات کو دنیاوی طاقت سے بالاتر ہونا چاہئے۔ کلیسا نے لوگوں کو سکھایا کہ ایسی حب الوطنی جس پر اعلیٰ تر خدائی کنٹرول نہ ہو، لالچ اور جرم کا ہتھیار بن سکتی ہے۔ مسابقت میں شریک مسیحی دنیا کی تمام حکومتوں کے لیے کلیسا نے یکساں اخلاقی ضوابط کا نفاذ کیا۔ روحانی برتری اور خدائی احکام کا ماخذ ہونے کے باعث کلیسا ایک ایسی بین الاقوامی عدالت کی حیثیت اختیار کر گیا جس کے سامنے تمام حکمران اخلاقی طور پر جواب دہ تھے۔ شہنشاہ ہنری چہارم نے اس کا عملی ثبوت ۱۰۷۷ میں کینوسا (Canossa) میں پوپ گریگری ہفتم کے سامنے سر تسلیم خم کر کے دیا اور ایک صدی بعد پوپ معصوم سوئم نے پاپائیت کے اختیار اور وقار کو اس درجہ کمال تک پہنچا دیا کہ یوں دکھائی دیتا تھا گویا پوپ گریگری (Gregery) کا اخلاقی آسمانی بادشاہت کا خواب تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔

یہ عظیم الشان خواب قوم پرستی اور انسانی کمزوریوں کے حملوں کا شکار ہو کر بکھر گیا۔ کلیسا کا انتظام انسانوں کے ذمہ تھا جو اکثر متعصب، ضمیر فروش یا لوٹ کھسوٹ کرنے والے ثابت ہوئے۔ جب فرانس کی دولت اور طاقت میں اضافہ ہوا تو انہوں نے پاپائیت کو اپنا سیاسی آلہ کار بنا لیا۔ بادشاہ اتنے طاقتور ہو گئے کہ انہوں نے پوپ کو پادریوں کی مجلس (Jesuit) کالعدم کرنے پر مجبور کر دیا۔ حالانکہ یہ وہ ادارہ تھا جس نے پاپائیت کے اقتدار کی بڑھ چڑھ کر حمایت کی تھی۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ کلیسا پارسائی کی جھوٹی داستانوں، جعلی تبرکات اور مشکوک معجزوں کے ذریعے لوگوں کو دھوکہ دینے پر اتر آیا۔ مثلاً صدیوں تک کلیسا نے نام نہاد "عطیہء کانسٹنٹائن" (Donation of Constantine) کی افسانوی روایت، جس کے تحت مغربی یورپ پوپ سلویسٹر اول

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(Pop Sylvester) کی میراث قرار دیا گیا تھا' سے بھرپور مفاد حاصل کیا۔

اسی طرح "جعلی فیصلوں" (False Decretals) جو کہ جعلسازی سے بنائی ہوئی دستاویزات پر مشتمل تھے کے ذریعے پاپائیت کی مطلق العنان طاقت کو مذہبی تقدس اور قدامت عطا کر دی گئی۔ مذہبی پیشواؤں نے اپنی تمام تر توانائیاں اخلاقی قدروں کو فروغ دینے کی بجائے دقیانوسیت پھیلانے میں صرف کر دیں۔ اور مذہبی عدالتوں (Inquisition) نے تو کلیسا کی انتہائی تذلیل کا سامان کر دیا۔ حتیٰ کہ امن کا پرچار کرنے کے دوران بھی کلیسا نے سولہویں صدی کے فرانس میں مذہبی جنگیں اور سترہویں صدی میں جرمنی میں تیس سالہ جنگ شروع کرا دی۔

کلیسا نے غلامی کے خاتمہ کے لیے جو جدید اخلاقیات کا سب سے زیادہ قابل ستائش کارنامہ سمجھا جاتا ہے' کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا۔

ان سب وجوہات کے باعث مذہبی راہنماؤں کی بجائے فلسفیوں کو انسانی تحریکوں کی راہنمائی کرنے کا موقع مل گیا جس سے مذہب کی اخلاقی قوت کے طور پر اہمیت مزید کم ہو گئی۔ تاہم انسانی تحریکوں کی کامیابی کی وجہ سے ہمارے دور کی برائیوں میں کچھ کمی آ گئی ہے۔

تاریخی طور پر کلیسا کا یہ نظریہ حق بجانب ثابت ہوا ہے کہ انسانوں کی اکثریت معجزوں' پراسراریت اور دیومالا سے بھرپور مذہب کی خواہاں ہے۔ اگرچہ مذہبی رسومات' پادریوں کے ملبوسات اور پیشوائیت کی درجہ بندی میں معمولی ترامیم کی گئی ہیں لیکن کلیسا میں ان عقائد کو تبدیل کرنے کی ہمت و جرات نہیں جن پر عقل و استدلال خندہ زن ہیں۔ کیونکہ ایسی تبدیلیاں ان لاکھوں لوگوں کو مشتعل اور مذہبی سحر سے آزاد کر دیں گی جن کی امیدیں خوش کن اور تسلی آمیز مذہبی تصورات سے وابستہ ہیں۔

کیا تاریخ کے مطالعہ سے خدا پر یقین رکھنے کے عقیدے کے حق میں دلائل ملتے ہیں؟ اگر خدا سے ہماری مراد فطرت کی تخلیقی قوت کی بجائے ایک باشعور' رحیم و کریم' اعلیٰ و ارفع ہستی ہے تو اس سوال کا جواب قدرے تذبذب کے ساتھ نفی میں ہو گا۔ حیاتیات کے دوسرے شعبوں کی طرح تاریخ بھی اصل میں ایک ایسی جدوجہد اور کشمکش کے نتیجہ میں موزوں ترین افراد یا گروہوں کے انتخاب کا عمل ہے جس میں نہ تو نیکی اور اچھائی کو کسی قسم کی برتری حاصل ہے اور جہاں قدم قدم پر حادثات اور ناکامی کا سامنا ہے اور زندہ رہنے کی صلاحیت ہی سب سے بڑی سچائی ہے۔ انسانی اور حیوانی زندگی کو انسانی مظالم و تشدد' جنگوں اور جرائم کے علاوہ وقتاً فوقتاً "خدائی افعال" یعنی زلزلوں' طوفانوں' دریاؤں' سمندری موجوں کے ہاتھوں بھی تباہی و بربادی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ یہ تمام حقائق ایک ایسی اندھی اور غیر جانبدار تقدیر کی موجودگی کی گواہی دیتے ہیں جس میں "نمنا" اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محض اتفاقیہ طور پر باطنی تناسب، خوبصورتی، شکوہ و جلال کے حامل مناظر بھی موجود نظر آتے ہیں۔

تاریخ کا ایک سبق یہ ہے کہ مذہب کی کئی زندگیاں ہوتی ہیں اور وہ اپنی خاک سے بار بار جنم لیتا ہے۔ ماضی میں کتنی بار خدا اور مذہب ختم ہو کر دوبارہ زندہ ہو چکے ہیں! فرعون اخناطون (Khnaton) نے اپنی بادشاہت کی تمام قوتیں دیوتا آمن (Amon) کے مذہب کے خاتمے کے لیے استعمال کیں۔

لیکن اخناطون کی موت کے ایک سال کے اندر ہی آمن کا مذہب دوبارہ رائج ہو گیا۔ مہاتما بدھ کی نوجوانی کے دنوں میں ہندوستان میں دہریت کا چرچا تھا۔ اور مہاتما بدھ نے بذات خود خدا کے بغیر مذہب کی بنیاد ڈالی۔ لیکن اس کی موت کے بعد بدھ مت ایک پیچیدہ الٰہیات کی صورت اختیار کر گیا۔ جس میں دیوتاؤں، ولیوں اور جہنم کے تصورات شامل تھے۔ فلسفہ، سائنس اور تعلیم کے زیر اثر قدیم یونانی دیو مالائی عقائد غیر مقبول ہو گئے۔ لیکن اس خلا کے باعث کوئی درجن بھر مشرقی مذہبی عقائد جو دوبارہ جی اٹھنے (Resurraction) کی روایات و تصورات سے بھرپور تھے، یونان میں جگہ پا گئے۔ ۱۷۹۳ء میں ہبرٹ (Hebert) اور شامٹے (Chaumette) نے روسو (Rousseau) کی تعلیمات سے متاثر ہو کر نیز بدنظمی و افراتفری کے ڈر سے خدائے بزرگ و برتر کی عبادت کا دوبارہ اہتمام کیا۔ ۱۸۰۱ء میں نپولین نے جو تاریخ کا مزاج آشنا تھا پوپ پائس ہفتم (P'us VII) سے ایک معاہدے کے ذریعے فرانس میں کیتھولک چرچ کی دوبارہ ترویج کا انتظام کیا۔ اٹھارویں صدی کے دوران عروج پانے والے لامذہبیت کا ملکہ وکٹوریہ کے کلیسا سے سمجھوتے کے باعث انگلستان سے خاتمہ ہو گیا۔ اس سمجھوتے کے تحت حکومت برطانیہ کلیسا کی حمایت پر رضا مند ہو گئی۔ حکومت میں عمل دخل رکھنے والے با رسوخ تعلیم یافتہ طبقے نے مذہب کے بارے میں اپنے شکوک و شبہات کا اعلانیہ اظہار کرنے کی بجائے اس معاملے میں خاموش نیم رضا مندی کی پالیسی اختیار کر لی۔ جواباً کلیسا نے عملاً ریاست کی برتری تسلیم کر لی اور پردازان کلیسا عمائدین حکومت کے تابع فرمان ہو گئے۔ امریکہ میں اس کے بانی رہنماؤں کی عقلیت پسندی انیسویں صدی کے دوران احیائے مذہب کی تحریک کی نذر ہو گئی۔

مذہبی سخت گیری اور مذہبی آزاد روی یعنی جذبات و خواہشات کی پابندی یا ان کی مکمل آزادی ایک باہمی رد عمل کے باعث تاریخ میں ایک دوسرے کے بعد آتے رہے ہیں۔ عام طور پر مذہب اور مذہبی سخت گیری اس دور میں پروان چڑھتے ہیں جب سماجی، معاشرتی قوانین اور ان کو نافذ کرنے والا نظام کمزور ہوتا ہے اور معاشرے میں نظم و ضبط برقرار رکھنے کی ذمہ داری اخلاقیات پر آن پڑتی ہے۔ جبکہ تشکیک اور کفر و الحاد اس وقت ترقی و عروج پاتے ہیں جب دوسرے تمام عوامل یکساں رہتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئے قانون اور حکومت اپنی بڑھتی ہوئی طاقت کے باعث کلیسا' خاندان اور اخلاقیات کو ریاستی استحکام کے لیے غیر ضروری سمجھتے ہیں اور برسر اقتدار طبقہ کو ان اخلاقی و مذہبی قوتوں کے زوال پذیر ہونے کے بارے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔

یہ حقیقت ہے کہ "جب تک غربت باقی ہے دیوتا موجود رہیں گے۔"[29] یہ انسانی ذہن کی مجبوری ہے کہ وہ ایک عظیم قوت کے تابع ہونے کے جذبات رکھتا ہے اور خوف و ڈر کی وجہ سے وہ قربانی' نذر' نیاز اور بھینٹ کا سہارا لیتا ہے تاکہ وہ اس عظیم قوت کی خوشنودی حاصل کر سکے۔

مذاہب کی پیدائش میں ایک چیز یقینی ہے کہ ان کی تخلیق کسی سازگار لمحہ میں کسی ایک فرد کی کوششوں سے ہوئی اور دوسرے لوگوں نے مذہب کو اس لیے قبول کر لیا کہ اس مذہب کے بانی اور اس مذہب کی تعلیمات ان کی الہیائی ضرورت کو پورا کرتی تھیں جو انسانی روح میں بے قرار رہتی ہے اور عوام اس شدید ضرورت کی مزاحمت نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کے نزدیک یہ یقینی چیز ایک غیر یقینی ہیجان پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس لیے عوام مذہب کی ظاہری شکل و صورت کو برقرار رکھتے ہیں' جب کہ اس کی روح ان کے لیے ایک بند کتاب کی سی ہوتی ہے۔ یہ اس حالت میں اس وقت تک رہتے ہیں جب تک کہ کوئی دوسرا مذہب' جو پہلے سے زیادہ طاقت ور نہ ہو' ان کے لیے پناہ گاہ نہ بن جائے۔

بل ہارڈٹ مذہب کو دو قسموں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک قومی مذہب اور دوسرا عالمی مذہب۔ قومی مذہب کی ابتداء پہلے ہوتی ہے اور اس کی بنیادیں ثقافت' تاریخ اور معاشرتی اقدار پر ہوتی ہیں۔ اس کے دیوتا اپنی قوم کو محفوظ رکھتے ہوئے دوسری قوموں کے لیے عذاب کا باعث ہوتے ہیں۔ جب تک قوم میں ترقی کے جذبات ہوتے ہیں' مذہب کا لب و لہجہ بلند ہوتا ہے اور یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ ایک دن تمام قومیں اس کے دائرہ اثر میں آ جائیں گی۔ جیسے یہودی کہتے تھے کہ:

"تمام قومیں موریا کے پہاڑ پر یہودہ کی عبادت کریں گی۔"

لیکن ایسا مذہب صرف ایک قوم میں ہی محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی مقدس زبان اپنے دائرے کو گھٹا لیتی ہے جس کی وجہ سے دوسری قوموں سے اس کا کوئی رشتہ قائم نہیں رہتا۔

اس کے مقابلے میں عالمی مذاہب جن میں بدھ مت' عیسائیت اور اسلام قابل ذکر ہیں۔ قومی مذاہب کے مقابلہ میں یہ ارفع و اعلیٰ مذاہب ہیں۔ ان کا دائرہ عمل بھی وسیع ہے۔ یہ سماجی و طبقاتی تقسیم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور غریبوں و غلاموں کے حقوق کے لیے جنگ کرتے ہیں۔ یہی خصوصیات انہیں [redacted] مذاہب بننے اور کہلانے کا درجہ دیتی ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بک ہارڈٹ کے نزدیک مذہب کے زوال کی بڑی وجہ وہ مقدس قانون ہوتا ہے جو پوری زندگی پر حاوی ہو کر ریاست کے برابر اپنا اقتدار حاصل کرلیتا ہے۔ جب مذہبی اقدار' سیکولر اقدار سے ملتی ہیں تو مذہب کی ظاہری شکل باقی رہ جاتی ہے اور اس کی روح ختم ہو جاتی ہے۔ یہ اس درخت کی مانند ہوتا ہے جو پتوں میں گھرا ہوا' گھنا اور خوبصورت معلوم ہوتا ہے لیکن اندر سے یہ کھوکھلا ہو چکا ہوتا ہے۔

جس وقت کوئی مذہب ایسی شکل اختیار کرتا ہے تو اس وقت ایک طبقہ الہیاتی ضروریات کے شدید اثرات کے تحت اصلاحی مذہبی تحریک شروع کرتا ہے۔ اصلاح روح کی یہ انفرادی اور تخلیقی جدوجہد تاریخ میں بالعموم ناکام رہی ہے۔ جیسے ساسانی دور میں مزدک کی تحریک۔ جب کبھی معاشرے میں یہ اصلاحی تحریک ابھرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مذہب میں وہ روح زندگی اور اقدار باقی نہیں رہتیں جو معاشرے کی الہیاتی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔

مذہب کے دائرہ عمل میں قتل و غارت گری بھی آتی ہے۔ ان میں سب سے پہلے منکرین آتے ہیں۔ کیونکہ مذہب کے ماننے والے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا سے انکار خدا کے قہر اور غضب کو دعوت دینے کے برابر ہے' اس لیے منکر اور مرتد کا قتل ضروری ہے تاکہ معاشرہ خدا کے غضب سے بچ سکے۔ جہاں مذہب ہمدردی' مساوات' اخوت' اخلاقیات اور حسن عمل کی تلقین کرتا ہے وہاں نفرت اور دشمنی کے جذبات بھی پیدا کرتا ہے۔

مذہب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے باغیوں' مشرکوں اور منکروں کو سزا دی جاتی ہے۔ مذہب کے ماننے والے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انہیں سزا دینا ضروری ہے اس لیے کہ ان کے اعمال سے اور ان کی باتوں سے معصوم ذہن متاثر نہ ہوں۔ اس لیے سینٹ آگسٹائن نے جب ڈوناٹس کے قتل کا فیصلہ کیا تو کہا "تمہیں ہم نہیں تمہارے اعمال قتل کر رہے ہیں' جنہوں نے تمہیں چرچ سے باغی کیا۔" اسی جذبہ کے تحت انوسینٹ روم نے تمام عیسائی حکمرانوں کو یہ حکم دیا کہ وہ کافروں کے خلاف جہاد کریں۔

لیکن اس مذہبی جنون اور نفرت نے اپنا انتقام لیا۔ چرچ کی حیثیت پولیس کی سی ہو گئی اور اس کے عہدیدار پولیس افسر بن بیٹھے۔ اس کے ردعمل کے طور پر مذہبی اصلاح کی تحریکیں ابھریں اور سولھویں سے اٹھارویں صدی تک مختلف دینی اصلاحی تحریکوں اور ریاست کے نئے فلاحی نظریوں نے اس کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔

مذہب کے زوال میں جو دوسرے عناصر عمل پذیر ہوتے ہیں ان میں داخلی تفرقات' فرقہ واریت' تعصب' کم علمی' اور اہل علم طبقہ کی اس سے علیحدگی قابل ذکر ہیں۔ وہ مذہب جس نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ارتقائی منازل کو طے کیا وہ دوسرے مذہب کی نسبت ابدی ہوتا ہے۔ ابدی ان معنوں میں کہ جب تک لوگ ایسے مذاہب کو مانتے رہیں۔ جب مذہب کے مخالف ریاست کی طاقت کو اس کے خلاف صف آرا کر دیتے ہیں تو مذہب اس طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ اگر یہ طاقت نہ ہو تو مذہب اپنا وجود برقرار رکھ سکتا ہے۔ اگر مذہب سیکولر طاقت کی مدد حاصل کرے تو اس کی مدد سے وہ دوبارہ اقتدار حاصل کرلیتا ہے جیسے ہندوستان میں برہمن مت نے بدھ مت کو ختم کر کے اپنا اثر پھر سے قائم کرلیا۔[۳۰]

بک ہارڈٹ مذہب کے استحکام اور قیام میں ریاست کی طاقت اور حکمرانوں کے شاہی قوانین کو انتہائی اہم سمجھتا ہے۔ اگر کانسٹنٹائن سے لیکر تھیوڈوس تک شاہی قانون نہ ہوتے تو یونانی و رومی مذاہب زندہ نہ رہتے۔ اسی طرح اگر تحریک اصلاح مذہب کے پیچھے حکمرانوں کی مدد نہیں ہوتی تو اس کا بھی وجود نہ ہوتا۔

۶- ذہنی تاریخ Intellectual History

ذہنی تاریخ سے مراد یورپ کے سیاسی افکار کی تاریخ ہے۔ اس تاریخ میں انسانی ذہن کی اجتماعی، ثقافتی، فنی، علمی اور فکری ترقی کا جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ مختلف زمانوں میں اٹھنے والی تحریکات کی توضیح کی جا سکے۔ اور ماضی کی آگاہی کے علاوہ انسانی ذہن کی طے کردہ ارتقائی منازل سے بھی روشناس کرایا جا سکے۔[۳۱]

سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں سائنس کی شعاعوں سے یورپ کا کونہ کونہ منور ہو گیا اور سارا یورپ علم کی روشنی میں نہا گیا۔ نشاۃ جدیدہ اور اصلاح کلیسا کے زمانے سے کوپر نیکس (Copernicus, ۱۵۴۳ - ۱۴۷۳) کیپلر (Kepler) اور گیلیلو (Galileo, ۱۶۴۲ - ۱۵۶۴) کے انکشافات نے سائنس کو نئی زندگی بخشی۔ وقت گزرنے پر سائنس یورپی علوم کا سرچشمہ خیال کی جانے لگی۔ اہل یورپ اسے معلومات کا خزانہ اور کائنات کی تسخیر کا زینہ تصور کرنے لگے۔ ذہنی لحاظ سے اس دور کو سائنس کا دور کہا جاتا ہے۔ سائنس کی بنیاد عقلیت پر رکھی گئی تھی۔ لہٰذا اب مذہب سے عقیدت کو خود فریبی سے تعبیر کیا جانے لگا۔

سائنس دان اپنے نظریات کی ترویج میں استدلالی طریقے برتنے لگے اور اسی بات پر زور دیا جانے لگا کہ ساری کائنات کے حقائق کا عقلی دلائل کے ذریعے ادراک کیا جا سکتا ہے۔ ہر چیز دوسرے کے توسط سے معرض وجود میں آئی ہے۔ اس نظریئے کے تحت ہر چیز کے اسباب، تشکیل اور مابعد نتائج کا جائزہ لیا جانے لگا۔ سائنس اس بات میں منہمک ہوگئی کہ کائنات میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سب کچھ کیسے، کیوں اور کیونکر ہوا؟ کائنات کے سربستہ رازوں کی تشریح استدلالی طریقہ سے کی جانے لگی۔ اس نظریئے کا زبردست حامی اس دور کی شہرہ آفاق شخصیت سر آئزک نیوٹن[۳۲] (۱۶۴۲ - ۱۷۲۷ء Sir Issac Newton,) ہے۔

اٹھارھویں صدی میں سائنس کی اشاعت یورپ کے کونے کونے میں ہونے لگی اور نئے تجربات و مشاہدات کو فروغ ملا۔ اس کا ایک نمایاں اثر یہ ہوا کہ یورپی معاشرے کا اعلیٰ طبقہ اور شہریوں کا بالائی متوسط طبقہ مذہبی قیود سے بے نیاز ہو کر سائنس کو مذہبی درجہ دینے لگا۔ لہٰذا اٹھارویں صدی کو ذہنی آزادی' آزاد خیالی اور روا داری کا دور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

قرون وسطیٰ میں فلسفہ اور دینیات باہم مخلوط ہو گئے تھے۔ سترھویں صدی میں فرانسیسی مفکر دیکارت[۳۳] (Descartes, ۱۶۵۰ - ۱۵۹۶) نے فلسفہ کو مذہب سے علیحدہ کر کے اس کا الحاق طبعی علوم (Natural Sciences) یعنی طبیعات اور ریاضی کے ساتھ کر دیا۔ اس نے فلسفہ کی بنیاد عقل و استد لال پر رکھی اور ہر اس چیز کو مسترد کر دیا جو عقل کی کسوٹی پر پوری نہ اتری۔ اس کی تحقیقات سے فلسفے کی بڑی ترویج و اشاعت ہوئی اور فلسفہ سائنسی علم بن گیا۔ دیکارت کے فلسفہ پر جان لاک[۳۴] (John Locke ۱۷۰۴ء - ۱۶۳۳) معترض ہوا۔ وہ ادراک و فہم کو علم حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیتا تھا۔ وہ ہر چیز کو عقل کی بجائے حواس مدرکہ اور تجربات کی روشنی میں جانچتا تھا۔ جان لاک کا فلسفہ اٹھارھویں صدی کا معیاری فلسفہ بن گیا۔ اسی دوران جرمن مفکر لائبنیز (Leibnitz,۱۷۱۴ء - ۱۶۴۶) روح کی حقیقت کو عقلی طور پر تسلیم کرتا تھا اور روح ہی کو حصول علم کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ اٹھارھویں صدی کا ایک مشہور مفکر اسکاٹ لینڈ کا ڈیوڈ ہیوم[۳۵] (۱۷۱۱ - David Hume, ۱۷۷۶) تھا۔ اس نے لاک کے فلسفے سے ابتداء کی مگر اس نے اس خیال کی کہ حسّ کے ذریعہ علم حاصل کیا جاتا ہے کی تردید کی۔ ہیوم کا نظریہ تھا کہ ہمارے ذہن اور قلبی کوائف میں ایسی صلاحیت نہیں کہ حس کے ذرائع سے علوم حاصل کر سکیں' اس لیے محض قیاس کی بنا پر نتائج اخذ کرتے ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے مشہور جرمن مفکر ایمونیل کانٹ (۱۷۲۴ - Emmanuel Kant, ۱۸۰۴) نے ہیوم کے نظریات کی تردید کی اور تصوریت (Idealism) کی اختراع پیش کی۔ اس نے فلسفہ کو سائنسی علوم اور دینیات سے علیحدہ کر کے اس کا اصلی مقام متعین کیا۔

سائنس دانوں اور مفکروں نے مذہبی زنجیروں کو توڑ کر ذہنی آزادی کی اشاعت کی۔ لوگوں میں کلیسائی قیود سے آزاد ہو کر عقلیت' فطرت اور قانون فطرت کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ مفکروں کا دعویٰ تھا کہ وہ علم کی روشنی سے دنیا کو منور کر رہے ہیں۔ ان کے نظریات نے ایسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انقلابی و ذہنی تحریر کو جنم دیا جس کو روشن خیالی کا نام دیا گیا۔

اٹھارھویں صدی میں سیاسی، تمدنی اور فکری لحاظ سے فرانس پورے یورپ میں ممتاز تھا اور فرانس یورپی ممالک کے لیے ذہنی بیداری، روشن خیالی اور علم و ادب کا گہوارہ بن گیا۔ فرانس علم و ادب کی روشنی کا علمبردار بن کر یورپ کے دوسرے ممالک کو منور کرنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس ملک کے اہل حکمت نے مذہبی قدامت پرستی اور کورانہ تقلید کو ہدف ملامت بنایا اور یورپی عوام کو سیاسی اقتصادی، مذہبی اور قانونی اقدار کے علم کی جدید روشنی میں تجزیہ کرنے کی طرف مائل کیا اور حکومت کی بے راہروی، کلیساؤں میں اخلاق سوزی اور ملکی عدالتوں کے ذریعے محاصل کی فراہمی، صنعتی نظام، ملکی انصرام اور قومی ثقافت پر بے لاگ تنقید کی۔ اٹھارھویں صدی کی شہرہ آفاق شخصیت **والٹیئر** (Francois Voltaire ۱۷۷۸ - ۱۶۹۴) ہے۔ اس نے نظام حکومت کی برائیوں کو طشت از بام کر کے فرانسیسی انقلاب کے لیے زمین ہموار کی۔ اس نے مذہبی روایات کی **تضحیک** اس طرح کی کہ عوام کے دلوں میں مذہبی تقدس کی بجائے نفرت کے جذبات ابھر آئے۔ **والٹیئر** کے ہم عصر روسو (Rousseau, ۱۷۷۸ - ۱۷۱۲) کو یورپ کے معاشی اور سیاسی نظام کا انقلاب آفرین مفکر کہتے ہیں۔ روشن خیال مفکروں میں وہ سب سے زیادہ ممتاز اور مسحور کن شخصیت کا حامل تھا۔ اس کی تحریریں طبقاتی امتیازات کو ختم کر کے ایک ایسا معاشرہ پیدا کرنا چاہتی تھیں جس کی بنیاد اخوت اور مساوات پر قائم ہو۔ تحریک روشن خیالی اور ذہنی آزادی کا ایک اور علمبردار دیدیرو[۳۶] (۱۷۱۳-۱۷۸۴ء (Denis Diderot, تھا جو علمی و ادبی خدمات کی وجہ سے تمام یورپ میں نام پیدا کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ اٹھارھویں صدی کے مشہور مفکر جرمی **بنتھیم**، جیمز مل، جان آسٹن، جان سٹورٹ مل، ژین سمنڈی، سینٹ سمون، لوئی بلانک، فریئر، ڈاکٹر ہال، رابرٹ اوون، ہیگل، کارل مارکس، آگسٹ کامٹے، ہربرٹ سپنسر، ولیم بگھیاٹ، گراہم ویلس، ولیم **مکیلا** گل، ہیرالڈ جے لاسکی، لیون ڈیوگائٹ، ہیوگو کریب، ڈیچو اور ہرڈر وغیرہ تھے۔

ان مفکروں نے تعمیری اور تنقیدی نظریات کی روشنی میں یورپ کے مذہبی اعتقادات، اخلاقی اقدار اور سیاسی نظریات کا جائزہ لیا اور قابل عقل و فہم خیالات کی اشاعت کی۔ ان کی گراں قدر تصانیف نے عوام کو خواب گراں سے بیدار کیا۔ ذہنی اور علمی لحاظ سے یہ دور عدیم المثال تھا۔ اس دور میں رجعت پسندانہ اور مقلدانہ خیالات کا جدید ترقی پسندانہ **تخیلات** سے تصادم ہوا اور اس سے ذہنی آزادی اور روشن خیالی کو نئی قوت حاصل ہوئی۔ چنانچہ عقلیت پسندی، روشن خیالی، ذہنی آزادی کی تغیر پذیر اقدار اس کا لازمی نتیجہ تھیں۔ ان مفکروں کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریک ذہنی بیداری اور روشن خیالی کا مقصد انسانی معاشرے کو حریت احترام آدمیت' شرف انسانیت اور امن و آشتی کی حقیقی قدروں سے روشناس کرانا تھا۔ ان کی تحریروں کے اثرات سے یورپ میں ایک ذہنی انقلاب برپا ہوگیا۔ توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی ختم ہوئی اور اس کی جگہ عقل و شعور، فہم و بصیرت' انسانی ہمدردی اور مذہبی رواداری نے لے لی۔ فرسودہ اور بعید از عقل اعتقادات ملیامیٹ ہوئے۔ یہ مفکرین امراء اور جاگیرداروں کے فرسودہ طبقاتی امتیاز کو ختم کر کے اور مطلق العنانیت پر کاری ضرب لگا کر نیا معاشرہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔

۷۔ تاریخ اسلام Islamic History

انسانی آبادی کے ہر گروہ کی اپنی الگ تاریخ' الگ تعصبات اور الگ روایات ہیں۔ انسانوں نے ہمیشہ سے اپنے محسنوں' مصلحوں' بزرگوں اور ممتاز ہستیوں کے اقوال و افعال اور حالات و واقعات کو جمع اور تحریر کیا ہے۔ یہی طریقے ابتداء سے آج تک تمام دنیا میں جاری ہیں۔ تمام ارباب مذاہب نے اپنے اپنے مذہب کے خدوخال اور اصول و فروع دین جامعیت کے ساتھ رقم کیے ہیں۔ اسی طرح اسلام کے نام لیواؤں نے "تاریخ اسلام" کو اسلامی' مذہبی' علمی' اخلاقی' تمدنی اور ادبی ضروریات کے تحت قلمبند کیا ہے۔ مختصراً یہ کہ "تاریخ اسلام مجموعہ دینی و دنیوی ہے"[۳۸]

مسلمانوں نے تاریخ نویسی کے کام کو جس اہتمام اور جانفشانی سے انجام دیا اس کی نظیر دنیا کی کسی قوم میں نہیں ملتی۔ انہوں نے اپنے اسلاف کے بارے میں چھوٹی بڑی بے شمار کتابیں لکھیں اور اسلامی تاریخ کی جزئیات و تفصیلات بیان کر کے آئندہ نسلوں کے لیے ایک مکمل ریکارڈ مہیا کر دیا۔ اگرچہ بیشتر تاریخی واقعات کی بنیاد روایات پر قائم کی گئی تھی جس کی وجہ سے بعض باتیں مشتبہ ہو گئی ہیں لیکن یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ روایتی انداز کی کمزوریوں کو کچھ عرصہ بعد مسلمانوں نے ہی محسوس کر کے اس کو بدلنے کی تجویز پیش کی۔ چنانچہ یہ فخر بھی ان ہی کو حاصل ہے کہ انہوں نے روایت کے ساتھ درایت کو ملایا اور اس طرح فلسفہ تاریخ کی بنیاد رکھی۔

مسلمان مورخین کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ دنیا کی تمام قوموں کے مورخوں کی مجموعی تعداد بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یونانیوں کو اپنے ایک مورخ ہیروڈوٹس پر ناز ہے اور اہل یورپ اس کو تاریخ کا ابو الاباء قرار دیتے ہیں لیکن ملت مسلمہ میں نہ معلوم کتنے مورخ ایسے پیدا ہوئے جن کا درجہ ہیروڈوٹس سے کہیں بلند ہے۔ مسلمان مورخین کی کثرت تعداد کا کچھ اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری (۳۴۵ھ) میں مسعودی نے "مروج الذہب" تصنیف کی تو اس نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کتاب کے دیباچہ میں تقریباً ۱۸۰ ایسے مورخین کے نام لکھے جو اس سے پہلے ہو چکے تھے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ابن الندیم نے اپنی کتاب "الفہرست" میں متعدد مورخوں اور تاریخ کی سینکڑوں کتابوں کا ذکر کیا۔

مسلمانوں نے سیرت نگاری اور اخبار و آثار پر دوسری صدی ہجری کے وسط سے ہی کتابیں تصنیف کرنا شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ ابن اسحق، ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ، الواقدی اور ابن سعد نے اسی صدی میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ لیکن باقاعدہ تاریخ نویسی تیسری صدی میں شروع ہوئی۔ المدائنی ابن قتیبہ، بلاوزی، ابو حنیفہ یعقوبی اور طبری نے تیسری صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہی تاریخ کی ضخیم کتابیں مرتب کر ڈالیں۔ ان مورخین میں ابن جریر طبری کا کارنامہ نہایت وقیع ہے۔ اس کی کتاب "تاریخ الرسل والملوک" آئندہ مورخین کے لیے اسلام کی پہلی تین صدیوں کی تاریخ کا اہم ترین ماخذ بنی اور اس کی یہ حیثیت آج بھی قائم ہے۔ تیسری صدی ہجری کے بعد مسعودی، ابن اثیر، ابن کثیر، ابن خلدون، المقریزی، المقری جلال الدین سیوطی وغیرہ کی تصانیف منصہ شہود پر آئیں۔ جنہوں نے مسلمانوں کے تاریخی لٹریچر میں معتدبہ اضافہ کیا۔

جب تک مسلمانوں نے تاریخ نویسی کے کام کو جاری رکھا انہوں نے کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے اس علم کو کافی ترقی دی۔ لیکن حسب ذیل وجوہ کی بناء پر تاریخ اسلام پر ایسی کتابیں تقریباً نایاب ہیں جو تمام پہلوؤں پر محیط ہوں یا جن میں مندرج تمام واقعات کو بغیر جانچ پڑتال کئے پورے بھروسے کے ساتھ اخذ کیا جا سکے۔

(1) مسلمانوں نے تاریخ نویسی کی ابتداء سیرت و مغازی سے کی تھی۔ لہٰذا انہوں نے زیادہ زور سیرت نگاری اور فتوحات پر دیا اور دوسرے پہلوؤں کو یا تو یکسر نظر انداز کر دیا یا سرسری طور پر ان سے گزر گئے اسی کا نتیجہ ہے کہ اگر انتظام حکومت، تمدنی حالت اور نظام تعلیم کے بارے میں کچھ معلوم کرنا ہو تو بڑی کوشش و کاوش کے بعد بہت کم مواد ملتا ہے یا سرے سے ملتا ہی نہیں۔

(2) شروع میں تاریخ کی بنیاد روایت پر قائم کی گئی تھی لیکن تاریخی واقعات کے سلسلہ میں روایات اور راویوں کے جانچنے میں اتنی احتیاط نہیں برتی گئی جتنی دینی مسائل کی احادیث کے قبول کرنے میں کی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے بہت سی ضعیف اور غلط روایات تاریخ اسلام کا جزو بن گئیں۔ اس قباحت کو محسوس کر کے بعد میں ابن خلدون نے درایت سے کام لینے کی تجویز پیش کی لیکن مسلمان اس کی تجویز پر عمل نہ کر سکے اور آیندہ بھی روایت کا اصول ہی مقبول رہا۔ چنانچہ سو سال بعد جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء مرتب کی تو وہ بھی روایت کے دائرے سے باہر نہ نکل سکے۔ موجودہ مورخین کے سامنے روایتوں کا یہی ذخیرہ ہے جس سے انہیں کام لینا پڑتا ہے۔ چونکہ کئی صدیوں کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

واقعات کی جانچ پرکھ اب ایک دشوار کام ہو گیا ہے اس لیے اولین نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہی بتغیر الفاظ آج کل کی کتابوں میں بھی درج ہوتا چلا جا رہا ہے جس کی وجہ سے مطالعہ تاریخ کا جو مقصد ہے وہ پورا نہیں ہوتا۔

عالم اسلام نے تاریخ کو مذہب سے منسلک کر کے اسے اسلامی تاریخ یا مسلمانوں کی تاریخ سے موسوم کر کے اسے اسلامی تشخص بخشا جو شائید ہی دنیا میں کسی ملک، قوم، مذہب اور تہذیب کو حاصل ہے۔ اسلامی تاریخ کی اصطلاح کے تشخص نے مسلمانوں کی تاریخ کو تاریخ عالم اور تاریخ مذاہب عالم میں ایک منفرد مقام و حیثیت دی ہے۔

مسلمان مورخین نے تاریخ اسلام میں بعض مسلمان حکمرانوں کے غیر اسلامی اور ناپسندیدہ افعال و اعمال کو دیکھ کر تاریخ اسلام کی تقسیم کچھ اس طرح سے کی ہے کہ اسلامی تاریخ اور مسلمان حکمرانوں کی تاریخ کا واضح فرق نظر آتا ہے۔ اسلامی تاریخ کو رسول مقبول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ' دور نبوتؐ' خلافت راشدہ اور حضرت امام حسن علیہ السلام کی خلافت سے دست برداری کے حالات تک محدود کیا ہے۔ اس کے بعد حکومت امویہ، عباسیہ، عثمانیہ' فاطمیہ اور ان تمام مشرقی اور افریقی حکومتوں اور ریاستوں کو عرب' عراق، ایران، افریقہ' ترکستان' اندلس' افغانستان اور ہندوستان میں شخصی اور خاندانی طور پر قائم ہوئیں اور انہوں نے اسلامی اصولوں و اقدار کو پامال یا مجروح کیا وہ حکومتیں اسلامی نہ رہیں۔ لہٰذا ان خاندانوں کی تاریخ اسلامی نہیں بلکہ مسلمان حکمرانوں کی تاریخ ہے۔ مثلاً تاریخ بنی امیہ، تاریخ عباسیہ' تاریخ فاطمیہ' تاریخ عثمانیہ، تاریخ سلاطین دہلی اور تاریخ مغلیہ وغیرہ۔ اس طرح کم و بیش بائیس مشرقی حکومتوں کی تاریخ مسلمان حکمرانوں کی تاریخ کہلائے گی۔

بظاہر اسلامی تاریخ محدود اور مختصر سی معلوم ہوتی ہے مگر جس قدر وسیع اور لامحدود اسلامی تاریخ ہے دنیا کے تمام مذاہب اور تہذیبوں کی تاریخ اس بحر بے کنار کے سامنے منجمد ندیاں اور دریا دکھائی دیتی ہیں۔ دنیا میں کسی پیغمبر ہی نہیں' بلکہ کسی بھی انسان کے حالات اتنے گوناگوں نہیں ہونگے' جتنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ سیرت پاک کے مواد اور ماخذوں کا سرسری اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ آپ کے اپنے اقوال و احکام تیئس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں جس مقدار میں زبان سے نکلے ان کا مختصر و محدود حصہ جو محفوظ رہا اور ہم تک پہنچا ہے وہ بھی ہزاروں ہی نہیں لاکھوں حدیثوں کی صورت رکھتا ہے۔ اگر آپؐ کے افعال اور آپؐ کی اپنوں میں روا رکھی ہوئی چیزیں بھی لے لی جائیں تو سنت کا یہ مجموعہ بیسوں مجلدات میں آتا ہے۔[۲۹]

کسی شخص سے ملنے والے سینکڑوں چیزیں بیان کرسکتے ہیں۔ خطبہ حجتہ الوداع ۱۰ھ کے موقع پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف عقیدت مند ہی لاکھ ڈیڑھ لاکھ تھے۔ اس سال حج کو نہ آئے ہوئے خانہ نشینوں کی تعداد یقیناً" اس سے کئی گنا زائد ہوگی۔ ماہرین حدیث نے لکھا ہے کہ صحابہ کا وہ حصہ جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی نہ کوئی حدیث مروی ہے ایک لاکھ سے زائد تعداد رکھتا ہے۔ دنیا کی کسی شخصیت کے حالات کے شاہدان عینی اتنے کیا اس کا ہزاروں حصہ بھی نہیں ملیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے والوں میں آپؐ کے بزرگ' خورد' رشتہ دار ہیں' گھر والے ہیں' ملازم ہیں' دوست ہیں اور اتفاقی ملاقاتی ہیں۔

آپؐ کی تریسٹھ سالہ واقعات سے پر زندگی میں نہ معلوم کتنے خطوط آپؐ کو لکھنے پڑے۔ تاریخ میں عہد نبوت سے متعلق اڑھائی تین سو خطوط اب بھی محفوظ ہیں۔ اگر صرف انہی کا جائزہ لیا جائے اور سیر حاصل بحث کی جائے تو کئی ضخیم جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔

پھر آپؐ کی دی ہوئی اور پیش کی ہوئی تعلیم ہے۔ اس مشن کا مقصد اس کی تکمیل کے لیے اختیار کی ہوئی تدبیریں' ان وسائل و تدابیر کا اثر و نتیجہ اور اثرات کا استحکام و دیرپائی۔ نیز ان اثرات کی رفتہ رفتہ ترمیم و تجدید کے وجوہ و اسباب سے بحث کی ضرورت ہوگی۔ سیرت نبویہؐ کے علاوہ مغازی کا شعبہ ہے۔ صرف آپؐ کی جنگوں اور فن حرب کا مطالعہ کریں تو سینکڑوں جلدوں میں بھی نہیں سمائے گا اور کام کو پھیلا کر جامع بنانا چاہیں تو ایک طرح سے ایک ذات قدسی صفات کی زندگی کے لئے ابتدائے آفرنشیں سے نفخ صور تک کی انسانی تاریخ پر تبصرہ کرنا پڑے گا۔ خاص کر اس شخصیت کے متعلق جس کی نسبت عقیدہ ہے کہ **لَو لَا کَ لَمَا خَلَقتُ الاَ فلاَ ک** ان ہزاروں پہلوؤں میں سے کس پر اکتفا کیا جائے؟ اتنی قسم کی اور اتنی کثیر چیزوں کی موجودگی میں سوانح نگار اور تاریخ نگار کیا کرے؟

اسی طرح اصحابہ میں سے صرف باب العلم حضرت علی علیہ السلام کی ذات گرامی کا ہی ذکر کیا جائے تو ان کی زندگی کا ہر پہلو الگ الگ شعبہ علوم میں شمار ہوگا۔ ان کی محبت رسولؐ' اسلام کے لئے جنگیں' قرابت داری رسول اکرمؐ' ان کی محبت الہیٰ' ذکر الہیٰ' فکر اسلام' عدالت' خلافت' امامت' شہادت اور شہادت فرزندان' اہل بیت رسول' غرضیکہ کس کس پہلو کا احاطہ کیا جائے' یہ تاریخ اسلام کی سینکڑوں کتابوں میں بھی نہیں سمائے گا۔

دور خلافت راشدہ تو تاریخ اسلام کے واقعات کا ایک عظیم انبار لیے ہوئے ہے۔ اس عہد کی فتوحات' سیاسی' معاشی' معاشرتی' اخلاقی' تہذیبی' روحانی' انسانی' علمی' فکری اور انتظامی امور و واقعات تاریخ کے وسیع دفتر لیے ہوئے ہیں۔ ان ہزاروں پہلوؤں پر کس طرح احاطہ کیا جائے۔ غرضیکہ تاریخ اسلام تاریخ انسانیت کی علمبردار ہے۔ یہ نہایت فصیح' جامع' مدلل اور طویل ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمان حکمرانوں کی تاریخ بھی نہایت وسیع و طویل ہے جس میں فتوحات، جنگیں، سازشیں، انتظامی امور و اصلاحات، علم و ادب، مصوری، موسیقی، تعمیرات اور علم سائنس کی ترقی و ترویج شامل ہیں۔ ہم مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ترقی پانے والے نظریات و افکار اور فلسفہ کو بھی اسلام کا رنگ دے دیتے ہیں جبکہ ان پر مذہب اسلام سے زیادہ یونان اور علاقائی اثرات نمایاں ہیں مثلاً" ابن رشد، الفارابی، الرازی، بو علی سینا اور ابن خلدون وغیرہ۔ اسی طرح ان حکمرانوں اور خاندانوں کے عہدوں میں قائم ہونے والے سیاسی اداروں کو اسلامی اداروں کی بجائے مسلمانوں کے اداروں کے ناموں سے پکارا جائے تو یہ زیادہ مناسب ہو گا کیونکہ ان پر اسلام سے زیادہ اپنے زمانوں کے شخصی، خاندانی اور علاقائی تہذیبی و ثقافتی اثرات زیادہ ہیں لہٰذا یہ ادارے اور تاریخیں ان مسلمان حکمرانوں اور خاندانوں کی علامت و پہچان ہیں۔

۸- تاریخ یورپ European History

اس زمانے میں یورپ کی اقوام نے علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت میں اس قدر زیادہ ترقی حاصل کر لی ہے کہ سابقہ اور موجودہ اقوام عالم میں اس کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ یورپ کی اقوام نے اس تمام کرۂ ارض پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اور اب فضاؤں اور دوسرے سیاروں پر کمندیں ڈال رہی ہیں۔ تہذیب یورپ اقوام عالم کی راہنمائی کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ اس دور سے پہلے قوموں نے تہذیبی ترقی حاصل کی مگر وہ جلد ہی اپنی موت آپ مر گئیں۔ اور ان کا غلبہ کبھی بھی اس قدر نہ پھیلا۔ وہ صرف علاقائی تہذیبیں تھیں۔ لیکن تہذیب یورپ تو عالمی تہذیب کے خدوخال قائم کر رہی ہے۔

تاریخ یورپ کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں یہ جائزہ ملتا ہے کہ وہ کونسے محرکات و عوامل ہیں جن کی بدولت اقوام یورپ اور تہذیب یورپ نے اس قدر ترقی و فروغ حاصل کیا ہے کہ وہ دیگر ادوار و اقوام اور موجودہ اقوام عالم پر سبقت لے گئی ہے؟ اس میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یورپی اقوام و تہذیب کا پچھلے زمانوں سے کس قدر تعلق پایا جاتا ہے۔ یورپ کی تاریخ اس وقت تمام اقوام کی تاریخ پر سبقت لیے جا رہی ہے۔ تہذیب یورپ ایک زبردست طوفان کی طرح اقوام عالم کی تہذیب و ثقافت کو بہائے لیے جاتی ہے۔ جو کچھ اس کے سامنے آتا ہے اس کے ساتھ ٹکراتا ہے "اصول بقائے حیات" کے تحت کمزوروں کو ختم ہو جاتا ہے۔ کمزور قومیں اور تہذیبیں اس کے سامنے چکنا چور ہو رہی ہیں۔ ہمارے سامنے بھی یہ ایک بہت ضروری سوال ہے کہ کیا ہم تہذیب یورپ کے سامنے اپنی ہستی اور اپنی تہذیب کو زندہ رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟ زندہ رکھنے کے لیے اپنی قوم، قومی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تشخص اور تہذیب کو مضبوط کرنا ہو گا۔ کمزوری موت ہے اور طاقت زندگی ہے۔ بلاشبہ تاریخ یورپ کا مطالعہ ہمیں اپنی شناخت، زندگی، موت اور تہذیب و ثقافت کا سوال حل کرنے میں مدد دیتا ہے۔

یورپ کی قدیم تاریخ اندھیروں میں گھری ہوئی ہے۔ یورپ کی ثقافت کی ابتداء یونان سے ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ بحیرہ روم کے ممالک میں پھیلی۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ براعظم ایشیاء اور افریقہ سے ملحق علاقوں پر اثر انداز ہوئی۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان نے مختلف طرز ہائے حکومت کے تجربات کے بعد دنیا کو آزادی اور حریت کے اسباق سے روشناس کر دیا۔ چنانچہ یہ یونانی ہی تھے جنہوں نے ادب، فلسفہ اور فنون لطیفہ کی ترویج کی۔

تہذیب یورپ کو اثر انداز کرنے والی دوسری بڑی طاقت سلطنت روما تھی۔ دوسری صدی عیسوی میں اہل روما نے فنون تعمیر اور سنگ تراشی کو اوج کمال پر پہنچا دیا تھا۔ انہوں نے فنون لطیفہ کی خوب ترویج کی۔ رومی دستور کا منبع و ماخذ روما کی جمہوریت تھی۔ جمہوری نظام نے بلدیاتی خود مختاری کے نظام کو ترقی دی۔ جب سلطنت روما پر وحشی قبائل نے حملہ کر کے اس کا شیرازہ بکھیر دیا تو رومی سلطنت کی تباہی کے ساتھ ساتھ سارے یورپ پر وحشت و بربریت چھا گئی۔ پھر ہزار سال تک یورپ اندھیروں میں ڈوب گیا۔ اس عرصہ میں یورپ کے لوگوں کا دائرہ نگاہ بہت تنگ اور محدود رہا اور علوم و فنون میں انہوں نے کوئی پیش رفت نہ کی۔

چھٹی صدی عیسوی میں اسلامی تہذیب و تمدن کی رو نے افریقہ، ہسپانیہ اور بحیرہ روم کے ساحلی علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مسلمان حکمرانوں نے ہسپانیہ پر آٹھ سو سال تک حکومت کی اور قرون وسطیٰ میں یہی تہذیب و تمدن کے علمبردار بنے رہے۔ اسلامی ثقافت اور اخلاق نے یورپ کی وحشی اقوام کو انسانیت کا درس دیا۔ عربی کتابوں کے تراجم سے یورپ میں تعلیم و سائنس اور ادب کی ترویج و اشاعت ہوئی۔ مسلمانوں نے اہل یورپ کو منطق، فلسفہ، طب اور سائنسی علوم میں نباتیات، حیوانیات، ریاضی نجوم و ہیئت، فلکیات اور معاشرتی علوم میں جغرافیہ، تاریخ نویسی اور لٹریچر میں شاعری، نثر نگاری اور فن انشاء پردازی سے روشناس کرایا اور ان کی ترویج کی۔ یہی تہذیب یورپ میں نشاۃ جدید کی محرک بنی۔

سولہویں صدی سے یورپ کی تاریخ جدید کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے کا یورپ تحریک اصلاح کلیسا سے شروع ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی نئی دنیا کی دریافت بھی ہوتی ہے۔ ان دونوں واقعات سے یورپ میں ذہنی آزادی کی بنیاد پڑی۔ نتیجتہ" ڈیڑھ سو سال یعنی سولہویں صدی کے آغاز سے سترھویں صدی کے درمیان تک یورپ مذہبی جنگوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ذہنی آزادی قائم ہو جانے پر مذہبی جنگ و فساد کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور موجودہ سیاسی آزادی کا دور شروع ہوتا ہے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اہل یورپ نئی دنیاؤں میں اپنی نو آبادیاں قائم کر کے اپنی تہذیب و سلطنت کی حدود بڑھا لیتے ہیں۔ دو عظیم جنگیں ان یورپی اقوام کے درمیان تجارتی چپقلش' نو آبادیاتی تسلط اور وسعت سلطنت و دولت کی بنا پر لڑی گئیں اور ان جنگوں نے اپنی تباہ کاریوں اور ہولناکیوں سے انسانیت کو شرمندہ' داغدار اور تباہ و برباد کر ڈالا۔

آج اکیسویں صدی کے آغاز میں تاریخ یورپ دنیا کی ہر متمدن یونیورسٹی کے معاشرتی علوم میں جزو اعظم بنی ہوئی ہے کیونکہ مغربی یورپ کی تہذیب دنیا پر چھا چکی ہے اور کرہ ارض کے ممالک میں تاریخ یورپ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ عصر حاضر کی تہذیب و ترقی اور اس کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے تاریخ یورپ کا مطالعہ ضروری ہے۔

۹- تاریخ نسواں Woman History

عورت کا صحیح مقام اور اس کا صحیح دائرہ کار کیا ہے؟ قدرت نے اس کے سپرد کیا کام کیے اور کیا نہیں کیے ہیں؟ ان تمام امور کو سمجھنے کے لیے تاریخ نسواں کا مطالعہ ضروری ہے۔

عورت نصف انسانیت ہے۔ اگر مرد انسانیت کے ایک حصہ کی ترجمانی کرتا ہے تو عورت دوسرے حصہ کی ترجمانی کرتی ہے۔ عورت کو نظر انداز کر کے نوع انسانی کے لیے جو بھی مذہبی' معاشرتی' تہذیبی اور سائنسی و تکنیکی پروگرام وضع ہوں گے وہ اس کی شمولیت کے بغیر ادھورے اور ناقص رہیں گے۔ ہم کسی بھی ایسی تہذیب یا معاشرے کا تصور نہیں کر سکتے جو تنہا مردوں پر مشتمل ہو اور اسے عورت کی ضرورت نہ ہو۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اور تہذیب و تمدن کے لیے یکساں ضروری ہیں۔ نہ عورت مرد سے مستغنی ہو سکتی ہے اور نہ مرد' عورت سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔ ان کے احتیاج کی نوعیت سماجی و معاشرتی بھی ہے اور جنسی و نفسیاتی بھی۔ ایک طرف اجتماعی زندگی ان سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ قدم سے قدم اور شانہ سے شانہ ملا کر کام کریں' دوسری طرف جنسی تقاضے ان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے دامن میں سکون اور اطمینان ڈھونڈیں۔ اجتماعی زندگی اسی وقت ترقی کرتی ہے جب دونوں کا سیاسی و سماجی رشتہ برابر کا ہو۔ عورت کی سعی و جہد میں خلاء رہ جائے اس کو مرد پر کرے اور مرد کی جدوجہد میں جو نقص اور کمی ہو' اس کو عورت پورا کرے۔ اسی طرح جنسی تعلق کو اپنی فطری حد میں رہنے دیا جائے اور لذت کشی کا ذریعہ نہ سمجھ لیا جائے۔ اگر مرد اور عورت کے سماجی و سیاسی رشتوں اور تعلقات میں بے اعتدالی آ جائے تو معاشرہ زوال و انحطاط کا شکار ہونے لگتا ہے اور معاشرتی توازن منتشر ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ انسان کے سفر کا آغاز مرد اور عورت کے اتحاد سے ہوا۔ اسی سے اس کی نسل بھی پھیلی اور علم و فن'

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صنعت و حرفت اور تہذیب و تمدن میں بھی ارتقاء ہوا۔

عورت اور مرد کے اتحاد کے علاوہ انسانوں کے درمیان جتنے رشتے اور تعلقات ہیں وہ یا تو اسی اتحاد کا نتیجہ ہیں یا خارجی اسباب و حالات نے ان کو پیدا کیا ہے۔ اگر یہ اسباب و حالات مفقود ہوں تو یہ تعلقات بھی وجود میں نہیں آسکتے۔

قدیم معاشرہ میں عورت کی حیثیت ہمیشہ ملکیت کی سی رہی ہے۔ جہاں اس کی آزادی حقوق اور رائے مرد کی مرضی پر منحصر ہوتی تھی۔ ان کا مقصد ایسی اقدار کو فروغ دینے کا تھا جن کے ذریعے عورتوں کو مردوں کا تابع اور فرماں بردار رکھا جائے۔ اس معاشرہ میں عورت کا مقام محض ایک شے کا تھا جو مرد کی ملکیت رہ کر اپنی آزادی خودی اور انا کو ختم کر دیتی تھی۔ اس کی زندگی جس نہج پر پروان چڑھتی تھی اس میں بیوی کی حیثیت سے شوہر کی فرماں بردار رہنا، ماں کی حیثیت سے اولاد کی پرورش کرنا تھا۔ ان حیثیتوں میں اس کی خواہشات جذبات اور تمنائیں ختم ہو جاتی تھیں اور بحیثیت ایک عورت، اس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا تھا جہاں وہ اپنی شخصیت کو برقرار رکھ سکے اور زندگی سے لطف اندوز ہو سکے۔

اس جاگیروارانہ معاشرے میں مرد کو ایک اعلیٰ و ارفع مقام حاصل تھا اور اس کی خواہش تھی کہ ان اقدار میں کوئی تبدیلی نہ آئے اور ایسی صورت پیدا نہ ہو کہ عورت ان زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو جائے۔ لیکن وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان اقدار میں تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ مغربی خیالات و افکار اور تہذیب و تمدن نے آہستہ آہستہ جاگیردارانہ معاشرے کو متاثر کرنا شروع کیا۔ ان تبدیلیوں نے قدیم اقدار کے حامیوں کو چونکا دیا۔ یہ حضرات معاشرے میں کسی قسم کی تبدیلی کے مخالف تھے اور خصوصیت کے ساتھ عورت کے مخصوص مقام کو بدلنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھے۔

صنعتی انقلاب نے عورت کو معاشی لحاظ سے مرد کے برابر لا کھڑا کیا اور اب وہ مرد کی دست نگر نہیں رہی۔ انیسویں صدی میں جمہوری اقدار نے عورت کو مساوات کا درجہ دلا دیا اور بیسویں صدی میں عورت کو بھی مرد کی طرح حق رائے دہی حاصل ہو گیا۔ بیسویں صدی کے ربع آخر میں مختلف ممالک میں عورتیں حکمرانی کے درجے پر فائز ہوئیں مثلاً بھارت میں اندرا گاندھی، سری لنکا میں بندرا نائیکے، انگلستان میں مارگریٹ تھیچر اور پاکستان میں بے نظیر بھٹو اپنے اپنے ملکوں کی سربراہ حکومت منتخب ہوئیں۔

یورپ اور امریکہ میں تاریخ نسواں (Women History) کی تعلیم و تحقیق کے شعبہ جات قائم ہوئے جہاں پر عورت کے بارے میں قدیم و جدید نظریات و تصورات، قوانین، عورت کے دائرہ کار، تعلیم و تربیت، صلاحیتوں، معاشرے کی تعمیر میں عورت کا حصہ، عورت کی اجتماعی خدمات،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تہذیب و تمدن کا عروج و زوال میں اس کی شمولیت و کردار اور دیگر سرگرمیوں کے متعلق تعلیم دی جاتی اور تحقیق کی جاتی ہے۔

۱۰۔ تاریخ تمدن Cultural History

تاریخ کی ایک قسم تاریخ تمدن ہے۔ تاریخ تمدن کی تعریف آسان نہیں۔ یہ قوم کے دل و دماغ، روح و نظر اور کردار و اطوار کی تاریخ ہوتی ہے۔ اس میں وہ اہم افکار و نظریات بیان کیے جاتے ہیں جو کسی معاشرے یا دور میں غلبہ حاصل کیے ہوتے ہیں۔ یا وہ ادارے جنہیں ہم مذہب، انسانوں اور ان کے کرداروں سے وابستہ کرتے ہیں۔ تاریخ کی یہ قسم علم و شعور کی متقاضی ہے۔ تمدنی تاریخ کے کچھ اور بھی تقاضے، مطالبے اور پہلو ہیں مثلاً کسی خاص عہد کے معاشرے نے جو کچھ تحریر کیا یا نظمیں کہیں یا تصویریں بنائیں اور عمارتیں کھڑی کیں ان سب کو احاطہ تحریر میں لایا جائے۔

اردو میں ثقافت لفظ کے مستعمل عربی مادے کے "تمدن" کے معنی شاخوں اور پتوں کی کاٹ چھانٹ کے ہیں۔ انگریزی لفظ کلچر بھی کھیتی باڑی اور زمین کی کاشت سے متعلق ہے۔ اس طرح لفظ تمدن اور کلچر کو ہم معنی تصور کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی روح عمل تخلیق یا افزائش پیداوار میں مضمر ہے۔ لہٰذا تمدن شہر میں رہن سہن اور زندگی بسر کرنے کے طریقے کا نام ہے۔ اس لیے ہم اسے زندگی کا خارجی اظہار کہہ سکتے ہیں۔ ایسی انسانی اکائی یا قومیں جو متمدن نہیں ہیں، کسی نہ کسی تہذیب کی حامل ضرور ہوتی ہیں یعنی تمدن انسانی روح کے اظہار یا تہذیب کی صورت متعین کرنے میں ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔[۴]

اب تمدن کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ:

"یہ ثقافتی تخلیق کی افزائش کرنے والا سماجی نظام ہے"

یہ ایسا سیاسی نظام ہے جسے رسوم و رواج، اخلاقیات اور قانون کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ ایک ایسا معاشی نظام ہے جو پیداوار اور اس کے تبادلہ کی بنا پر وجود میں آتا ہے۔ یہ تہذیبی تخلیق، خیالات، الفاظ، اطوار اور فنون لطیفہ کی بار آوری، جانچ پرکھ، اظہار اور پیدائش کے لیے ضروری سہولتوں اور مناسب آزادی کے ذریعے وجود میں آتا ہے۔ تمدن انسانی رشتوں اور تعلقات کا ایسا نازک اور پیچیدہ گورکھ دھندا ہے جو بڑی ہی محنت سے بنتا اور بہت جلد تباہ ہو سکتا ہے۔[۵]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایسا کیوں ہے کہ تاریخ تمدن تباہی کی داستانوں سے بھری پڑی ہے جو "شیلے" (Shelley) کی نظم "Ozymandias" کی مانند ہمیں یہ پیغام دیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں کہ ہر چیز کا مقدر فنا ہو جانا ہے؟

کیا اس عروج و زوال کے عمل میں قاعدے قوانین بھی موجود ہیں جن کی مدد سے ہم ماضی کے تمدنوں کا جائزہ لے کر اپنے تمدن کے مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی کر سکیں؟

تاریخ تمدن کے مورخ کا اصل کام یہ ہے کہ کسی نسل یا کسی عہد کے مختلف معاشروں کی دلچسپیوں' افکار اور جذبات و احساسات کو سمجھے اور ان کی توضیحات پیش کرے اور تاریخ کے پورے ڈھانچے میں ان کی روح کی تلاش کرے۔ نظریات ہمیشہ عالمی و آفاقی ہوتے ہیں۔ مورخ سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ قوموں' نسلوں اور زبانوں کی حد بندیوں سے بالا ہو کر ان چیزوں کا جائزہ لے اگر ممکن ہو تو وقت کی حدود سے بھی آگے نکل جائے۔ ثقافتی مورخ ایک سو سال پہلے کے کسی خاص واقعہ کو اس وقت تک درست ثابت نہیں کر سکتا جب تک مذہب' رومانویت' سائنس' آرٹ' صنعت اور دیگر بہت سے موضوع کو زیر بحث نہیں لاتا۔ ثقافتی مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ بین الاقوامی امور سے بخوبی آگاہی رکھتا ہو۔ وہ بہت سے دوسرے ممالک کی تاریخ' آرٹ' ادب' فلسفہ اور سائنس سے واقفیت رکھتا ہو اور ان سب کے امتزاج کی اس کے اندر خاصی صلاحیت و خصوصیت بھی موجود ہو۔

تاریخ تمدن میں بے قاعدہ پھیلاؤ اور انتشار ہوتا ہے نیز ہم اس کو متشکل نہیں بلکہ غیر متشکل قرار دے سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہے کیا؟ کیا یہ بشریات کا موضوع ہے؟ کیا اسے عمرانیات میں شامل کرنا چاہیے؟ کیا اسے اقتصادیات میں شامل کر سکتے ہیں؟ کیا یہ آرٹ ہے؟ تاریخ تمدن ان سب کا مجموعہ ہے۔ ہر مورخ نے اس کو علیحدہ علیحدہ حیثیت اور موضوع کے اعتبار سے پیش کیا ہے اور اس کے ثبوت میں اپنی اپنی پسندیدہ مثالیں اور توضیحات پیش کی ہیں۔ بعض مورخ ان تمام مذکورہ موضوعات کو اکٹھا کر دیتے ہیں اور ایک ایسا مرکب پیش کرتے ہیں جو کسی خاص عہد اور معاشرے کے کردار اور فکر و نظر کا پورا پورا مرقع ہوتا ہے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ برک ہارٹ' سیمنڈز' سٹفین اور ٹرولس لنڈ جیسے ثقافتی مورخوں کی تحریریں ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی نئی نسلوں کے نزدیک پہلے جتنی جاذبیت' قبولیت اور اثر رکھتی ہیں۔

تاریخ تمدن کا مورخ مختلف معاشرتی رسوم و روایات' عادات و اطوار' آرائش و زیبائش' جنسی معمولات' خورد و نوش کی عادات اور احساسات و جذبات یا بشریات کے نقطہ نگاہ سے روشنی ڈالتے ہیں۔ اس سے [illegible] انداز میں قومی کردار اور قومی خصوصیات کے مطالعہ کے لیے ایک نیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلو نکل آتا ہے۔ تمدنی پہلو نے تاریخ کو جمہوری بنانے میں بڑی مدد دی ہے۔

تاریخ تمدن کے مورخ کو ماضی کے واقعات کو از سر نو زندہ کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی لیکن جو معلومات مہیا کر کے وہ کام میں لاتا ہے اس سے ماضی خود بخود روشن ہو جاتا ہے کیونکہ کیفیت کے اعتبار سے اس کی دلچسپیاں وہی ہوتی ہیں جو معاشرتی مورخ کا اصل سرمایہ ہیں۔ تاریخ تمدن کے مورخ کو بڑے بڑے طاقتور عظیم لوگوں کے کارناموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی مثلاً" مفکروں کے افکار و نظریات، سیاستدانوں کی خطابت، سالاروں کی مہارت فن حرب وغیرہ وغیرہ۔ ان امور میں اس کی دلچسپی صرف اس حد تک ہوتی ہے کہ قومی خصوصیات و اوصاف کی وضاحت میں معلومات و مدد مل سکے۔ فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے اس کی دلچسپی کا مرکز ایسی اشیاء ہوتی ہیں جیسے کھیل، آداب و محبت، عقائد و عبادت، خوراک و لباس، باہمی روابط و تعلقات اور نیکی و برائی کے بارے میں عوامی افکار و خیالات وغیرہ۔ ان امور کی جڑیں ماضی میں بہت گہری ہوتی ہیں۔ جو معلومات تاریخ تمدن کا مورخ ان متفرق ذرائع سے احتیاط کے ساتھ جمع کرتا ہے وہی بطور ردعمل تاریخ کا سرمایہ بن جاتا ہے۔

تاریخ رنگ و نسل کے امتیازات میں یقین نہیں رکھتی اور تمدن ہر قوم و نسل میں نشوونما پا سکتا ہے بشرطیکہ اس کے لیے موزوں حالات میسر ہوں۔ نسل سے تمدن نہیں بنتا بلکہ تمدن سے اقوام بنتی ہیں اور اقوام تاریخ کو جنم دیتی ہیں۔ تاریخ کا علم ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ تمدن امداد باہمی کی پیداوار ہے اور تقریباً" سب قوموں نے تمدن کی تعمیر میں حصہ لیا ہے لہٰذا تاریخ تمدن ہمارا مشترکہ ورثہ ہے۔

اوسولڈ **سپینگلر** (Oswald Spengler ۱۸۸۰ - ۱۹۳۶ء) کے مطابق ہر تمدن پر دو ادوار ضرور آتے ہیں۔ ایک تو مرکز مائل تنظیم کا دور جو ایک تہذیب کی تمام جہتوں کو یکجا کر کے اسے ایک یکتا، مربوط اور فنکارانہ تمدن کی صورت عطا کرتا ہے۔ دوسرا دور مرکز گریز بدنظمی کا ہوتا ہے۔ جس میں تمام عقائد اور تہذیب، اختلافات اور تنقید کا شکار ہو جاتی ہے۔ **نتیجتہً** انفرادیت پسندی، تشکیک پسندی اور فنکارانہ کج روی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔

ایک نکتے پر سب مورخین کا اتفاق ہے کہ تمدن پیدا ہوتے ہیں، پروان چڑھتے ہیں، روبہ زوال ہوتے ہیں اور بالاخر ختم ہو جاتے ہیں۔ یا پھر ان متعفن جوہڑوں کی مانند جو زندگی دینے والے دریاؤں یا ندیوں کا حصہ تھے یہ تمدن بھی کسمپرسی کے عالم میں گھٹتے رہتے ہیں۔

کیا ہم **سپینگلر** اور کئی علماء کی مانند یہ فرض کرلیں کہ ہر تمدن ایک جاندار کی مانند ہوتا ہے جس کے اندر فطری طور پر بڑھنے کی طاقت ہوتی ہے اور بالاخر فنا ہونا اس کا مقدر ہوتا ہے؟ اگر ہم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اقوام کے عروج و زوال کے عمل کی علم الابدان یا طبیعیات کی مثالوں سے تشریح کریں تو یہ بظاہر بڑا ہی پرکشش لگتا ہے۔ کسی بھی معاشرے کے انحطاط کی ایک جاندار کی طبعی زندگی کے خاتمے سے توجیہہ کی جائے یا پھر "طبیعیات کی اصطلاح میں" اسے اس کی اندرونی توانائی کے خاتمہ کا نتیجہ سمجھا جائے۔

لیکن اگر گروہ یا قوم بذات خود طبعی طور پر جاندار شے نہیں اگرچہ اس کے اجزاء جاندار افراد ہیں۔ کسی قوم کا "جانداروں کی طرح" نہ تو دماغ ہوتا ہے اور نہ کوئی معدہ۔ اس کی سوچ اور احساسات تو اس کے افراد کے دماغوں اور اعصاب کے حوالے سے تشکیل پاتے ہیں۔ جب کسی قوم یا تمدن کا زوال ہوتا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ اس قوم یا تمدن کی طبعی عمر کا اختتام ہو گیا ہے بلکہ یہ زوال تو اس معاشرہ کے سیاسی یا ذہنی راہنماؤں کے بدلے ہوئے حالات کے چیلنج کا مقابلہ کرنے میں ناکامی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کسی معاشرے کو پیش آنے والے حالات کے چیلنج کا مقابلہ کرنے میں ناکامی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کسی معاشرے کو پیش آنے والے چیلنج بے شمار وجوہات کی بنا پر ہو سکتے ہیں اور بعض اوقات ان کی شدت تباہ کن ہو جاتی ہے۔ جیسے کبھی بارش میں کمی کے باعث نخلستان اجڑ جاتے ہیں اور زمین خشک ہو کر بنجر ہو سکتی ہے۔

ایک ضابطہ اخلاق کے خاتمے اور اس کی جگہ نئے ضابطہ اخلاق کے نفاذ کا درمیانی وقفہ اخلاقی بے راہ روی کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس عبوری وقفے کے دوران افراد کی اکثریت تذبذب اور بے یقینی کے باعث تعیشات' بدعنوانی اور خاندان و اخلاق کی ابتری کا شکار ہو جاتی ہے۔ جب کہ باقی ماندہ لوگ پرانے طور طریقوں اور پابندیوں میں جکڑے رہتے ہیں۔ اس ابتری کے دور میں حب الوطنی کے جذبات بھی سرد پڑ جاتے ہیں اور نہایت کم لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ "اپنے ملک کے لیے جان دینا نہایت ہی قابل عزت اور عظیم کام ہے"۔ قیادت کی نااہلی کے باعث اندرونی خلفشار ملک کو کمزور کر دیتا ہے۔ اس صورت حال میں کسی جنگ میں فیصلہ کن شکست اس ملک و قوم اور معاشرے کے لیے آخری ضرب کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی بیرونی حملہ آوروں کا وحشیانہ پن اس قوم کی اندرونی وحشت و بربریت سے مل کر اس تمدن کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

انسان کے تعمیر کردہ ہر تمدن کا یہی انجام ہے!

کیا تمدن کے خاتمہ کی یہ صورت حال مایوس کن نہیں؟

ہم اسے مکمل طور پر مایوس کن بھی نہیں کہہ سکتے۔ خواہ انسان ہو یا اقوام اور ریاستیں۔ کسی کو بھی ابدی زندگی کا دعویٰ نہیں۔ موت تو اٹل ہے۔ لیکن اگر یہ موزوں وقت پر آئے تو یہ کسی حد تک قابل معافی اور [illegible]ید بی ہے۔ ایسے میں باشعور لوگ اس کی آمد کا برا نہیں مانتے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا تمدن حقیقتاً مرجاتے ہیں؟

اس کا جواب پھر وہی ہے کہ مکمل طور پر نہیں۔ یونانی تمدن حقیقتاً مردہ نہیں ہوا۔ صرف اس کا ڈھانچہ ختم ہو گیا ہے اور اس کا گہوارا تبدیل اور وسیع تر ہو چکا ہے۔ یہ اب نسلوں کے حافظوں میں زندہ ہے اور اس کی وسعت و گہرائی کا یہ عالم ہے کہ ایک زندگی میں خواہ وہ کتنی ہی طویل اور بھرپور کیوں نہ ہو اس کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ آج ہومر (Homer) کے قارئین کی تعداد اس کے اپنے زمانے اور اپنی سرزمین سے تعلق رکھنے والے قارئین سے بہت زیادہ ہے۔ آج یونانی شعراء اور مفکر ہر کالج میں موجود ہیں۔ آج افلاطون کے افکار کا مطالعہ کرنے والے لاکھوں ہیں جو فلسفے کی لازوال مسرتوں کے متلاشی اور زندگی کے حقائق کا فلسفیانہ تجزیہ کرنا چاہتے ہیں۔ تخلیقی اذہان و سوچ کی یہ منتخب بقاء ابدیت کی نہایت اعلیٰ اور حقیقی مثال ہے۔

قومیں ختم ہو جاتی ہیں۔ پرانے زرعی علاقے بنجر ہو جاتے ہیں یا کسی اور قسم کی تبدیلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تب مستقل مزاج انسان اپنے اوزار اور اپنے فنونِ لطیفہ کو ساتھ لے کر وہاں سے کوچ کر جاتا ہے اور ساتھ اپنی یادیں بھی لے جاتا ہے۔ تعلیم ان یادوں کو مزید وسعت و گہرائی دیتی ہے۔ اس طرح تمدن بھی اس کے ساتھ ساتھ ہجرت کر کے کسی نئی جگہ بسیرا کر لیتا ہے۔ اس نئی سرزمین میں وہ انسان بالکل نئے سرے سے آغاز نہیں کرتا اور اسے مقامی آبادی کا تعاون بھی حاصل ہوتا ہے۔ ذرائع مواصلات و آمدورفت اس کا تعلق اس کے آبائی وطن سے قائم رکھتے ہیں۔ رومیوں نے یونانی تہذیب درآمد کی اور پھر اسے مغربی یورپ تک پھیلایا۔ امریکہ نے یورپی تمدن سے استفادہ کیا اور اب اسے آگے پھیلانے کے لیے تیار ہے۔ اور اس تمدن کی اشاعت کے لیے جو تیکنیک استعمال ہو گی اس کی پہلے کوئی مثال نہیں ہے۔

انسانی تمدن تو روح انسانی کے پھیلاؤ کا مظہر ہے۔ جس طرح زندگی دوبارہ ظہور پا کر موت پر غالب آ جاتی ہے۔ اسی طرح کہن سالہ تہذیب اپنا ورثہ آنے والے زمانوں اور دوسری سرزمینوں کو منتقل کر کے اپنی حیات نو کا سامان کر لیتی ہے۔ حتیٰ کہ آج اس وقت تجارت' مواصلات' ریڈیو' ٹیلیفون اور دیگر ذرائع رسل و رسائل کے باعث قومیں اور تمدن ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور اسی طرح بنی نوع انسان کے مشترکہ ورثہ کی حفاظت پوری انسانیت کے لیے کی جا رہی ہے۔

II تاریخ آرٹ — The History of Art

تاریخ سائنس ہے یا آرٹ؟ کروچے اس موضوع پر تفصیل سے بحث کرتا ہے اور اس بات کی سختی سے مخالفت کرتا ہے کہ تاریخ سائنس ہے۔ اس کے نزدیک تاریخ آرٹ ہے۔ آرٹ لذت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیتا ہے نہ لذت کو اپنے آپ میں سموتا ہے۔ یہ فطرت کے رازوں اور حقائق سے پردہ اٹھاتا ہے نہ فطرت کی نمائندگی کا دعویدار ہے اور نہ ہی کشیدہ تعلقات کو خوشگوار بنانے میں حصہ لیتا ہے۔ بلکہ آرٹ ان تمام تصورات سے ہٹ کر فرد کی وجدانی کیفیت کا نام ہے۔ آرٹسٹ اس انفرادی کیفیت کو محسوس کرتا ہے اور اس کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس لیے آرٹ دیکھنے یا محسوس کرنے والے عمل کا نام ہے۔ سائنس اس کے برعکس ایک عمومی علم ہے۔ اس لیے یہ عمومی تعلقات پیدا کرتی ہے اور پھر ان میں رشتہ و تعلق قائم کرتی ہے۔[۴۲]

کروچے کا کہنا ہے کہ اگرچہ تاریخ اور آرٹ میں مماثلت ہے لیکن پھر بھی تاریخ ایک خاص قسم کا آرٹ ہے۔ آرٹسٹ جو محسوس کرتے ہیں اس کیفیت کو بیان کرتے ہیں اور مورخ بھی یہی کرتا ہے۔ لیکن مورخ دوسرے آرٹسٹوں کے برعکس اس پر یقین رکھتا ہے کہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ سچ اور حقیقت پر مبنی ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آرٹ مجموعی طور پر اسی کی نمائندگی کرتا ہے جو چیز وقوع پذیر ہو چکی ہے؟ اس لیے جو چیز ہو چکی ہے وہ ناممکن نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ عملی طور پر تشکیل پذیر ہو چکی ہے۔ حقیقت اسی میں پوشیدہ ہے جو ممکن ہو۔ حقیقت ممکن میں ہے اور تاریخ اس حقیقت کو بیان کرتی ہے۔ اس لیے تاریخ وہ آرٹ ہے جو ممکن کو بیان کرتی ہے۔ لیکن آرٹ خالص وجدانی کیفیت کا نام ہے۔ اس میں فکر کو دخل حاصل نہیں بلکہ احساسات ہیں۔ جب کہ حقیقت کو ممکن شے سے امتیاز کرنے کے لیے سوچنا پڑتا ہے تو اس صورت میں تاریخ کو "حقیقت کا وجدان کہا جا سکتا ہے" جب یہ کہا جاتا ہے تو اس کی حدود آرٹ سے بڑھ جاتی ہیں۔ لہٰذا کروچے کے مطابق تاریخ نہ تو کسی قانون کو دریافت کرتی ہے اور نہ ہی بناتی ہے اور نہ ہی یہ تصورات تخلیق کرتی ہے۔ یہ صرف بیان کرتی ہے۔

تاریخ بغیر فکر کے واقعات کی وضاحت و توضیح اور تشریح نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر تاریخ کو صرف بیان سے نکال کر فکر کا درجہ دے دیا جائے تو یہ آرٹ نہیں رہتی۔

بک ہارڈٹ کے نزدیک آرٹ سائنس سے زیادہ پیچیدہ اور روح کی سب سے حیرت انگیز تخلیق ہے۔ آرٹ، شاعری اور موسیقی یہ سب مذہبی رسومات کی شکل میں ظاہر ہوئے اور پھر ان میں ترقی ہوئی۔

آرٹ نہ تو کسی شئے کا کوئی قانون دریافت کرتا ہے اور نہ اشیاء کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیتا ہے۔ بلکہ یہ ایک اعلیٰ زندگی کی تخلیق کرتا ہے، جس کا وجود اس کے بغیر ممکن نہیں۔ آرٹ پراسرار لہروں کے ذریعہ روح سے تعلق قائم کرتا ہے۔

ابتداء میں آرٹ مذہب کے زیر اثر رہا۔ لیکن آرٹ نے مذہب کی زیر نگرانی کبھی اعلیٰ مقام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حاصل نہیں کیا کیونکہ مذہب انسان کی الہیائی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔جو کہ آرٹ کی محسوسات کے بغیر بھی ممکن ہو سکتی ہیں۔ اس لیے آرٹ کے بارے میں مذہب کا معاندانہ رویہ رہا ہے۔[۴۳]

آرٹ ہر شکل میں تحریک پیدا کرتا ہے لیکن جو آرٹ محسوسات اور خیالات سے زیادہ واقعات میں جکڑا جاتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے۔

قدیم آرٹ کی گمنامی میں شاید ایک خوبی یہ بھی ہو کہ مستقبل کا آرٹ آزادی کے ساتھ تخلیق ہو۔ اگر پندرھویں صدی میں یونانی سنگ تراشی کے تمام لوازمات اصل حالت میں دستیاب ہو جاتے تو شاید لیونارڈو، رافیل اور کوریگو شاندار مجسمے اور تصاویر بنانے کی جرات نہ کرتے کیونکہ یونان کی قدیم تخلیقات ان کے حوصلے پست کر دیتیں۔ اور ان کے ساتھ موازنہ کرتے وقت ذہنی طور پر وہ پیچھے رہ جاتے۔ اسی طرح اگر اٹھارویں صدی میں یونان کی عہد اول کی شاعری ظاہر ہو جاتی تو یہ جرمنی کی شاعری کو ماند کر دیتی۔ اس لیے قدیم آرٹ کا ایک خاص لمحہ پر ظاہر نہ ہونا آرٹ و ادب کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔[۴۴]

۱۲۔ تاریخ فلسفہ The History Of Philosophy

تاریخی واقعات کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھنا' ان کے اسباب و علل اور پس منظر کو بیان کرتے ہوئے ان کی تاویل پیش کرنا "فلسفہ تاریخ" کہلاتا ہے۔

فلسفہ تاریخ کی اصطلاح سب سے پہلے والٹیئر نے استعمال کی تھی۔ اس سے اس کی مراد یہ تھی کہ آزاد ذہن اور وسیع النظری کے ساتھ تاریخی واقعات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ بعد ازاں ہیگل نے اس اصطلاح کو وسیع معنوں میں استعمال کیا۔ اس کے نزدیک فلسفہ تاریخ سے مراد تمام عالم کی تاریخ ہے۔ ثبوتیت پسندوں (Positivists) نے فلسفہ تاریخ کو ایک مربوط اور جامع نظام بنا کر اس کے ذریعہ آفاقی اصول دریافت کئے۔ جن کی روشنی میں انہوں نے اقوام اور تہذیبوں کی تاریخ کو بیان کیا اور اقوام عالم اور تمدنوں کے عروج و زوال کو ان اصولوں کی روشنی میں دیکھا۔

کالنگ وڈ نے فلسفہ تاریخ کے بارے میں اپنا جداگانہ نظریہ پیش کیا۔ اس کے نزدیک فلسفیانہ ذہن کبھی بھی کسی شے (Object) کے بارے میں نہیں سوچتا بلکہ جب وہ کسی شے کے بارے میں غور و فکر کرتا ہے تو اس شے کے بارے میں اپنے خیال پر بھی غور کرتا ہے۔ اس غور و فکر کو فلسفہ یا سوچ کا دوسرا درجہ کہا جا سکتا ہے' یعنی یہ ایک خیال کا تصور ہے جب کہ فلسفہ کے برعکس نفسیات فکر کا پہلا درجہ ہے۔ وہ ذہن کو اس طرح سمجھتی اور پرکھتی ہے جس طرح حیاتیات زندگی کو۔ وہ کسی خیال اور شے میں کوئی رشتہ اور تعلق قائم نہیں کرتی بلکہ وہ خیال کو شے سے علیحدہ تصور کرتی ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب کہ فلسفہ، خیال یا سوچ کو اس کی انفرادی حالت میں نہیں دیکھتا بلکہ وہ اس شے سے تعلق کو دیکھتا ہے۔

کالنگ وڈ فلسفہ میں تبدیلی پر بحث کرتے ہوئے اس کی تاریخ بتاتا ہے کہ مغربی فلسفہ کی ابتداء یونان سے ہوئی۔ جہاں غور و فکر کی ابتداء ریاضی کے علم سے ہوئی۔ علم ریاضی یونان میں فلسفہ کا مرکز رہا لیکن قرون وسطیٰ میں فلسفہ علم ریاضی سے علم الہیات کی طرف منتقل ہو گیا اور "انسان اور خدا" کے تعلقات غور و فکر کا محور بن گئے۔

سولھویں صدی سے انیسویں صدی تک طبعی سائنس کے فروغ پانے کے بعد تاریخ فلسفہ کا محور بن گئی لیکن اس تمام عرصہ میں انسان تاریخی نقطہ نظر سے بھی واقعات و حوادث کا جائزہ لیتا رہا۔ اٹھارویں صدی میں اس تاریخی نقطہ نظر میں خاص اہمیت پیدا ہوئی کیونکہ ریاضی، الہیات اور طبعی سائنس انسان کے تمام مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ثابت نہ ہو سکی۔ خصوصیت کے ساتھ ماضی کے وہ واقعات جو ایک خاص جگہ اور وقت میں وقوع پذیر ہوئے ان واقعات کو ریاضی کی مدد سے نہیں سمجھا جا سکتا، کیونکہ ریاضی کی فکر اسی شے کو سمجھ سکتی ہے، جس کا زمان و مکان میں وجود نہ ہو۔ اسی طرح علم الہیات کا دائرہ بھی تنگ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ ایک لامحدود موضوع پر غور کرتی ہے جب کہ تاریخی واقعات محدود حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ سائنس تمام انسانی مسائل کو حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی کیونکہ سائنس جس حقیقت کو دریافت کرتی ہے اس کا سراغ وہ مشاہدات اور تجربہ کے ذریعے لگاتی ہے۔ جب کہ ماضی روپوش حقائق میں پناہ گزیں ہے جسے ہم مفروضات، مشاہدات اور تجربات کے ذریعہ ثابت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا تاریخ کے حقائق اور ماضی میں رونما ہونے والے حادثات و واقعات کو صرف فلسفۂ تاریخ کی مدد سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

۱۳- ڈپلومیٹک تاریخ Diplomatic History

ڈپلومیسی گفت و شنید کا وہ فن یا طریقہ کار ہے جس کے تحت قومیں اور ملک آپس میں اور بین الاقوامی طور پر تعلقات قائم کرتے اور برقرار رکھتے ہیں۔ اس طریقہ کار کے تحت سفیر یا سفارتی نمائندے معاملات اور معاہدات طے کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ڈپلومیسی فن، ذہانت اور مہارت کے اس استعمال کو کہتے ہیں جو ریاستوں اور حکومتوں کے مابین سرکاری تعلقات کے معاملے میں عمل میں لائی جاتی ہے۔

انسان کی معاشرتی زندگی اور اس زندگی کے مفادات کے حصول کی جدوجہد اور باہمی تعاون و اتحاد کے جذبے کی ضرورت نے اجتماعی زندگی کے اداروں کو جنم دیا۔ مختلف قوموں، ریاستوں اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ملکوں نے زندگی کی مادی اور اجتماعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے علاقائی توسیع اور دیگر مفادات کے لیے قوت کا استعمال کیا۔ جس سے وسیع پیمانے پر اختلافات نے جنم لیا اور انسانی امن کو نقصان پہنچایا۔ دشمنی اور نفرت کو ہوا دی۔ ان دشمنیوں' نفرتوں اور اختلافات کو کم یا ختم کرنے کے لیے ڈپلومیسی کے اصول اور لائحہ عمل کو اختیار کیا گیا۔ اس طرح اختلافات کی بنیاد بننے والے مسائل اور ضرورتوں کو گفت و شنید کے ذریعے حل کیا جانے لگا۔ لہٰذا علاقائی اور بین الاقوامی معاہدات عمل میں آنے لگے۔

آج کل ممالک اور ریاستوں کے درمیان تعلقات سفارتی نمائندوں کے ذریعے دفتر خارجہ کی ہدایات کے تحت عمل میں لائے جاتے ہیں۔ اسی طرح ممالک کے درمیان تعلق و واسطہ رکھا جاتا ہے اور اسی کے ذریعے اہم خدمات اور معاملات انجام دیئے جاتے ہیں۔ باہمی گفت و شنید سے لیکر تجارتی، ثقافتی اور صنعتی معاہدات طے کیے جاتے ہیں۔

ڈپلومیسی کو دنیا میں پرامن فضا پیدا کرنے اور تعلقات کو باہمی احترام کی فضا میں پروان چڑھانے کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ ڈپلومیسی کا طریقہ کار ایسا ہے کہ اس میں محض اپنا قومی مفاد ہی نہیں بلکہ دوسرے ملکوں اور قوموں کے مسائل' مفادات اور ضرورتوں کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اس طرح سے مفادات کے ٹکراؤ کی گنجائش کم سے کم تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

مسائل، مفادات اور مقاصد کے حصول کے لیے ڈپلومیسی کے ذریعے مثبت راہیں اور ذرائع تلاش کیے جاتے ہیں۔ اس طرح سے قومی اور بین الاقوامی معاملات پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ دائمی امن قائم کرنے کے لیے باہمی تعلقات میں نیک نیتی اور مثبت انداز فکر کے واضح طریق کار کو اپنایا جاتا ہے۔

ڈپلومیٹک تاریخ میں ڈپلومیسی کے تمام امور کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ اس میں ریاستوں' علاقوں اور ملکوں کے جنگی' معاشی، ثقافتی اور صنعتی معاہدوں کی زبان و متن کا تجزیہ و مواد پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں ملکوں کی خفیہ اور کھلی ڈپلومیسی کے تحت عمل میں آنے والے امن' جنگ اور تعلقات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس میں سفارت کاروں کے رویے' نقطہ نظر اور رازداری کی حکمت عملی، دلیلوں اور رجحانات کو قلم بند کیا جاتا ہے۔ گویا کہ ڈپلومیٹک تاریخ تجزیاتی تاریخ کا نام ہے۔

ڈپلومیٹک تاریخ میں اختلافی امور کو طے کرنے کے لیے منفی انداز فکر کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ باہمی تعلقات کو پر امن ماحول میں تعاون کی فضا میں مثبت انداز سے آگے بڑھانے کے رویے کو تقویت دی جاتی ہے۔ موجودہ دور میں اس قسم کی ڈپلومیسی کو بہت ترقی ملی ہے۔

جوں جوں دنیا ترقی کرتی جا رہی ہے اس کے شب و روز کے مسائل میں اضافہ ہوتا جا رہا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ بعض اوقات دو قوموں' ریاستوں اور ملکوں کے درمیان رنجش و اختلافات نہ صرف ان کے علاقائی امن کے لیے بلکہ بین الاقوامی امن کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں جیسے کویت پر عراق کے قبضے کے نتیجہ میں پینتیس ممالک کو عراق کے خلاف جنگ میں حصہ لینا پڑا۔ عراق کے خلاف امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی کامیاب جنگ امریکہ و اسرائیل کی کامیاب ڈپلومیسی کی اچھی مثال ہے۔ غرضیکہ بین الاقوامی امور اور مسائل کو حل کرنے کے لئے ڈپلومیسی بہترین اور اہم کردار ادا کرتی ہے۔

انسانی تاریخ میں جنگ یا امن کے معاملات کو نمائندوں کے ذریعے طے کرنے کی مثالیں بہت پرانی ہیں۔ زمانہ قدیم سے ہی ایک علاقے یا ملک کے نمائندوں کو دوسرے علاقے یا ملک میں بھیجا جاتا تھا تاکہ یہ لوگ دوسرے فریق سے معاملات طے کریں۔ ان نمائندوں کی مثالیں قدیم یونان کی شہری ریاستوں کے آپس میں اور دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات قدیم ہندوستان' مصر اور چین کے دوسری مملکتوں سے روابط اور رومی سلطنت کے دوسری ہم عصر حکومتوں سے تعلقات وغیرہ میں ملتی ہیں۔ رومیوں نے اس قسم کے معاملات کے بارے میں مذہبی افراد کی ایک جماعت بنا رکھی تھی جو صلح اور امن کی شرائط طے کرتی تھی۔ اسلامی ریاست کے ابتدائی دور میں بھی دوسری ریاستوں سے معاملات طے کرنے کے لیے نمائندے بھیجے جاتے تھے اور دوسری ریاستوں کے نمائندوں کو اپنے ہاں مدعو کیا جاتا تھا۔ معاہدات کی شرائط طے کرنے کے لیے دونوں طرف کے نمائندوں کو کام میں لایا جاتا تھا۔ صلح نامہ حدیبیہ کی شرائط اس قسم کے معاہدوں کی اور تاریخ کی واضح مثال ہے۔ ان نمائندوں کو جدید عہد میں سفیر کہا جانے لگا اور فن سفارت ترقی کرتے کرتے اور تاریخ کے مختلف مراحل طے کرتے کرتے ریاستوں اور ملکوں کے درمیان تعلقات کا سب سے موثر ذریعہ بن گیا۔

۱۴۔ سائنس کی تاریخ History Of Science

تاریخ کے مطالعہ کے دوران ہم قوموں' اخلاقی اصول و ضوابط اور مذاہب کے عروج و زوال کے اس پیش منظر میں انسانی ترقی کے بارے میں شکوک و ابہام کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ ہم بسا اوقات یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آیا ہر نسل کا اپنے آپ کو "جدید" قرار دینے کا دعویٰ محض بے کار اور روایتی طور پر ڈینگ ہانکنے کے مترادف تو نہیں؟

چونکہ ہم نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ اب تک کے تاریخی ادوار کے دوران انسانی فطرت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی ہے اس لیے تمام تر تکنیکی ترقی کو محض یہ سمجھ کر نظرانداز کیا جا سکتا ہے کہ یہ تو پرانے مقاصد اشیاء کے حصول یا جنس مخالف تک رسائی' مقابلہ میں کامیابی و جنگ میں فتح کے حصول [illegible] ذرائع ہیں۔ موجودہ صدی میں ہم جن بہت [illegible] حقائق سے روشناس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئے ہیں ان میں سے ایک حوصلہ شکن انکشاف یہ بھی ہے کہ سائنس انسانی احساسات و جذبات کے بارے میں غیر جانبدار ہے۔ یہ جس قدر مستعدی سے مریضوں کو صحت یاب کر سکتی ہے اسی تیزی سے انسانوں کو موت کے گھاٹ بھی اتار سکتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ تعمیر کی نسبت تخریب کا عمل سائنس زیادہ تیز رفتاری سے کر سکتی ہے۔ فرانسس بیکن (Francis Bacon) کا یہ فخریہ مقولہ آج کس قدر غیراہم لگتا ہے کہ "علم طاقت ہے" بعض اوقات ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ قرون وسطیٰ و نشاۃ ثانیہ کے عہد کے لوگ جو سائنسی علوم اور طاقت کے حصول کی نسبت دیو مالا اور فنون لطیفہ پر زیادہ توجہ دیتے تھے ہم لوگوں کی نسبت جو اپنے مقاصد میں کوئی بہتر تبدیلی پیدا کیے بغیر اپنے آلات کار کی قوت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیے جا رہے ہیں زیادہ عقل مند تھے۔[۴۵]

بلاشبہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ہم نے ترقی کی ہے لیکن یہ ترقی بھی قباحتوں سے خالی نہیں ہے۔ سہولتوں اور آسائشوں نے ہماری جسمانی قوت برداشت اور اخلاقی طاقت کو کمزور کر دیا ہے۔ ہم نے اپنے ذرائع آمدو رفت کو بہت ترقی دی ہے لیکن ہم میں سے ہی کچھ لوگ ان ترقی یافتہ ذرائع کو جرائم کے ارتکاب اور اپنے ساتھی انسانوں کی یا خود اپنی ہلاکت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ہم نے اپنی رفتار کو دگنا' **تگنا** بلکہ سو گنا بڑھا لیا ہے۔ لیکن اس عمل کے دوران ہم نے اپنے اعصاب تباہ کر لیے ہیں ہم میں اور عہد وحشت کے انسانوں میں رفتار کے علاوہ اور کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ جدید طب نے بہت زیادہ ترقی کی ہے لیکن علاج معالجے کی اس ترقی کو ہم اس وقت ہی سراہنے کے قابل ہوں گے اگر اس کی بناء پر اصل امراض سے بھی بدتر ذیلی اثرات پیدا نہ ہوں۔ نئی بیماریوں اور جراثیم کی روز افزوں مزاحمت کے خلاف ڈاکٹروں کی تندہی اور مشقت بلاشبہ قابل تعریف ہیں او ہم طبی سائنس میں ترقی کے باعث اوسط انسانی عمر میں اضافہ کے لیے شکرگزار ہوں گے بشرطیکہ زندگی میں ہونے والا یہ اضافہ محض بیماری معذوری اور اداسی کے بوجھل لمحے نہ ہوں۔ آج روئے زمین پر ہونے والے روز مرہ کے واقعات کے بارے میں ہماری باخبر رہنے اور ان کو بیان کرنے کی صلاحیت پہلے سے سو گنا بڑھ گئی ہے۔

کالنگ وڈ تاریخ کو تحقیق کی سائنس بیان کرتا ہے اور اسے ایک باقاعدہ سائنس کا درجہ دیتا ہے۔ تاریخ فکر کی وہ سائنس ہے جو ہمارے ذہنوں میں ماضی کے حوادث کے متعلق پیدا ہونے والے سوالات کا جواب دیتی ہے۔ ماضی کے تمام سائنسی تجربات کا ریکارڈ تاریخ بیان کرتی ہے۔ سائنس کو یہ حیثیت حاصل نہیں کہ وہ ماضی کی تاریخ بیان کر سکے بلکہ سائنس ان واقعات کو جو ماضی میں وقوع پذیر ہو چکے ہیں' انہیں مجتمع کر کے ان پر غور نہیں کرتی بلکہ ان واقعات اور اشیاء کا جن کا ہمیں علم نہیں ہوتا ان کی ماہیت کو دریافت کرتی ہے۔ لہٰذا سائنس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"ناواقفیت" سے ابتداء کرتی ہے اور واقعات و اشیاء کی ماہیت و حقیقت کو دریافت کرتی ہے۔ اس لحاظ سے تاریخ بھی سائنسی علوم کی صف میں شامل ہو جاتی ہے۔ یہ ماضی کی انسانی سرگرمیوں اور پوشیدہ حقائق کے سوالات کا جواب دیتی ہے۔ انسانی اعمال و حقائق کی توجیہات دریافت کرتی ہے۔ تاریخ وہ نظام فکر ہے جو طبعی سائنس اور معاشرتی سائنس کے تمام حوادث و اعمال کو محفوظ رکھتی ہے اور سائنسی انداز میں ان کے بارے میں پیدا ہونے والے تمام سوالات کا تسلی بخش جواب دیتی ہے۔ اس میں تمام طبی **سائنسوں** کی زندگیوں کے حقائق پوشیدہ ہیں۔ یہ حیاتیات' حیوانات' کیمیا' طبیعیات' نباتیات' ارضیات' بحر بیکراں اور فضائے لامحیط کے سربستہ رازوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ یہ تھلیس' فیثا غورث' ڈیموکراٹیس' ہپاکرٹیس' ارسطو' ارشمیدس' گیلن' **بطلومی**' راجر بیکن' کاسٹر' گیٹن برگ' کاپر **نیکس**' **پریسلیس**' ٹاکوبرا' ولیم ہاروے' جان **کیلپر**' گیلیلو' نیوٹن' لیوازر' لیمرک' فراڈے' پاسچر' ڈارون' گریگر مینڈل' ہرٹز' **لینگلے** اور آئن سٹائن جیسے عظیم سائنس دانوں کے عظیم کارناموں' کاوشوں' فارمولوں' ایجادات اور ان کی زندگیوں کے واقعات خوشبو کی طرح بکھیرتی ہے۔ یہ سائنس کی نہ ختم ہونے والی کہانی کو آغاز سے اب تک سلسلہ وار ترتیب سے بیان کرتی ہے۔ ہزاروں سالوں میں کتنی سلطنتوں کو عروج و زوال آیا۔ کتنی قومیں' **تہذیبیں** اور مذاہب قائم ہوئے اور مٹ گئے مگر سائنس کا سفر جاری رہا۔ اس دوران تاریخ ایک ہمراز ساتھی کی طرح ہردم ساتھ رہی اور پچیس صدیوں کی سائنسی ترقی کو قلمبند کرتی رہی[۴۷]۔ سائنس کی کہانی صرف ہم تاریخ کی زبانی ہی سن سکتے ہیں۔ بالآخر ہم کہیں گے کہ انسان نے سائنس کو تخلیق کیا اور بدل میں سائنس نے انسان اور اس کی تہذیب کو بنایا اور سنوارا۔ غرضیکہ تاریخ ایسی سائنس ہے جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کو سمیٹ کر عملی ترتیب دیتی ہے۔ لہٰذا انسان کی ذہنی اور شعوری ترقی کو سمجھنے کے لیے سائنس کی تاریخ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

۱۵- تیسری دنیا کی تاریخ Third World History

پہلی دنیا ترقی یافتہ مغربی یورپ اور امریکی بلاک کے سرمایہ دارانہ ممالک کہلاتے ہیں۔ دوسری دنیا مشرقی یورپ اور روسی بلاک کے اشتراکی ممالک کی ہے۔ تیسری دنیا ترقی پذیر' غیر ترقی یافتہ' افلاس زدہ' پسماندہ اور غیر جمہوری اقدار کے حامل ممالک ہیں۔ اس کی مزید وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظاموں کے حامل ممالک کی معاشی' عسکری' سائنسی اور صنعتی امداد کے زیر بار ہیں۔

تیسری دنیا کے اکثر ممالک کم علمی' جہالت اور غربت کا شکار ہیں۔ ان ممالک میں حکمران طبقہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے عوام کو اپنی رعایا تصور کیا اور ان کے ساتھ ہمیشہ جبر و تشدد کا ناروا سلوک روا رکھا۔ تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک دونوں بلاکوں (Super Powers) کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ ان ممالک کو اپنی تعلیم، عسکری، معاشی، سائنسی صنعتی، زراعتی اور دیگر ضروریات و نظریات کے لیے پہلی دو دنیاؤں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ان ممالک کے نظاموں اور حکمرانوں کی اشیرباد حاصل کرنا پڑتی ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک زیادہ طور پر اصول حکمرانی، حکومتی پالیسیاں اور احکامات بھی پہلی دو دنیاؤں کے دیوتاؤں سے حاصل کرتے ہیں اور ان کی حکومتیں بھی بالعموم اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی تک قائم و برقرار رہتی ہیں۔

تیسری دنیا کے حکمران طبقہ کی منشاء مرضی (Will of the sovereign) ہی قانون کا درجہ و حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح وہ اپنے یورپی آقاؤں اور دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں اسی طرح وہ خواہاں ہوتے ہیں کہ ان کے عوام رعایا بن کر ان کی خوشنودی (Blessing) حاصل کریں۔ ان کی ناراضگی دیوتاؤں کے قہر و غضب سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے۔ یہ مغربی جمہوری اقدار کو اپنے مفاد و اقتدار کے خلاف سمجھتے ہوئے اپنے معاشروں کی روایات کے منافی نظام قرار دیتے ہیں۔

تیسری دنیا کے عوام بنیادی انسانی حقوق اور بنیادی انسانی ضروریات سے محروم ہیں۔ حکمران طبقہ ان ممالک کی دولت زیادہ تر مغربی ممالک کے بینکوں اور کمپنیوں کے نام اپنے برے دنوں کے لیے جمع کرواتا رہتا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک کی دولت اور اعلیٰ عہدے صرف وہاں کے حکمران ٹولہ کا حق سمجھا جاتا ہے۔ ان ممالک میں مغربی جمہوریت کے نظریات، اقدار، روایات اور اداروں کو پنپنے کا موقعہ نہیں دیا جاتا۔

تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک مغرب کی صنعت اور سائنسی ترقی کو ہمیشہ مغرب کے لیے زہر ہلاہل قرار دیتے رہے اور یہ نتیجہ پیش کرتے رہے کہ اہل مغرب کی جدید تہذیب و ترقی اپنے خنجر سے ہی خودکشی کرے گی۔ نو آبادیاتی نظام میں اس قسم کے نظریات کو بڑا فروغ ملا کیونکہ یہ نظریہ مغربی اقوام کے مفاد میں تھا کہ مشرقی اور افریقی اقوام اپنے مذہبی و روحانی درجات و مقامات بلند کرتی رہیں تاکہ وہ ان کے ذرائع پیداوار اور انتظامی اداروں پر قابض رہ کر ان پر حکومت کرتی رہیں۔ مغرب کی اس مخالفت میں ترقی پذیر ممالک کی شکست خوردہ ذہنیت اور احساس کمتری کو بھی بڑا عمل دخل حاصل ہے۔ ان ممالک نے خود کو ذہنی، معاشی، صنعتی اور سائنسی طور پر مغرب کا دست نگر اور اسیر پایا۔ اب بھی اکیسویں صدی کے آغاز میں یہ اقوام خود کو مغرب کے مقابل بے دست وپا اور لاچار محسوس کرتی ہیں۔ تیسری دنیا کے ممالک اس دلیل سے خوشی و مسرت محسوس کرتے ہیں کہ اہل مغرب یعنی دو دنیاؤں کی یہ ترقی صرف ظاہری اور مادی ترقی ہے اور مذہب اور روحانیت کے معاملے میں ان سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہت پیچھے ہیں۔ ظاہری طور پر تیسری دنیا کا حکمران طبقہ یہ دلائل اپنے عوام کو مطمئن اور خوش کرنے کے لیے اور ان کے احساس محرومی کو دور کرنے کے لیے پیش کرتا ہے تاکہ انہیں جدید دنیا کی صنعتی و سائنسی ترقی اور مادی آسائشوں کی محرومیت کا احساس نہ ہونے پائے۔

تیسری دنیا کے ممالک میں فن تاریخ نویسی آزادانہ تنقیدی و تحقیقی انداز میں فروغ پانے میں ناکام رہی۔ ان ممالک کے زیادہ تر نقاد اور مورخ حکمران طبقہ کی عظمت، کارناموں اور ذاتی خصوصیات کو زیادہ خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور واقعات و حقائق کی صداقت کی تحقیق بہت کم کرتے ہیں۔ ان مورخوں اور تاریخ کے پاسبانوں اور باغبانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی توجہ قوم کی ترقی، عروج، تعمیر، پالیسوں، قومی کارناموں، ادب، تہذیب اور دیگر ایسے پہلوؤں کا جائزہ پیش کریں کہ جن سے مردہ و خوابیدہ احساسات زندہ و بیدار ہوں، قوم ذہنی ارتقاء کی منزلیں طے کرے اور زندہ و ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شامل ہو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھٹا باب

حوالہ جات

(۱) ہزرعیل (اسرائیل) کا ایک شخص جس کا تاکستان سامریہ کے بادشاہ اخی اب کے محل سے ملحق تھا۔ بادشاہ اور اس کی بیوی نے اسے مروا کر اس کے تاکستان پر قبضہ کرایا تھا۔

(۲) یونانی سوانح نگار (۴۸ ۔ ۱۲۲ء)

(۳) تھامس کارلائل' آن ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ' پہلا لیکچر

(۴) ڈاکٹر جانسن کا شہرہ آفاق سوانح نگار (۱۷۴۰ ۔ ۱۷۹۵ء)

(۵) انگریزی ادب کا مشہور ادیب اور لغت نگار (۱۷۰۹ ۔ ۱۷۸۴ء)

(۶) سروالٹر سکاٹ کا داماد اور سوانح نگار (۱۷۸۴ ۔ ۱۸۵۵ء)

(۷) انگلستان کا مشہور ناول نگار اور شاعر (۱۷۷۱ ۔ ۱۸۳۲ء)

(۸) انگلستان کا مشہور مدبر اور وزیر اعظم (۱۸۰۹ ۔ ۱۸۹۸ء)

(۹) انگریز سپہ سالار جس کا نام جان چرچل تھا (۱۶۵۰ ۔ ۱۷۲۲ء) ڈیوک آف ماربرو چرچل کا جد اعلیٰ تھا۔

(۱۰) اطالوی محب وطن جس نے اٹلی کی آزادی کے لیے پوری زندگی مسلسل جدوجہد کی (۱۸۰۷ ۔ ۱۸۸۲ء)

(۱۱) امریکی قانون دان اور سپریم کورٹ کا دوسرا چیف جسٹس جس نے امریکی آئین کو پورا تحفظ عطا کیا (۱۷۵۵ ۔ ۱۸۳۵ء)

(۱۲) (۱۸۵۶ ۔ ۱۹۲۴ء) امریکہ کا دو مرتبہ صدر رہا (۱۹۱۲ ۔ ۱۹۲۰ء) اس کے چودہ نکات پر پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی اور اسی کے زیر اثر معاہدہ وارسائی اور لیگ آف نیشن معرض وجود میں آئی۔

(۱۳) امریکی فلسفی (۱۸۱۱ ۔ ۱۸۹۲ء)

(۱۴) ہولڈز ورتھ نے تاریخ انگلستان کو پندرہ جلدوں میں تحریر کیا۔ انگریزی قانون کی تاریخ میں اس کے برابر کوئی دوسری کتاب نہیں۔

(۱۵) (۱۵۵۳ ۔ ۱۶۳۴ء)

(۱۶) (۱۷۲۳ ۔ ۱۷۸۰ء)

(۱۷) (۱۷۰۵ ۔ ۱۷۹۳ء)

(۱۸) (۱۷۴۵ ۔ ۱۸۳۲ء)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱۹) (۱۷۷۸ - ۱۸۶۸ء)

(۲۰) (۱۷۵۱ - ۱۸۳۸ء)

(۲۱) (۱۷۹۵ - ۱۸۴۵ء)

(۲۲) (۱۸۳۹ - ۱۹۰۳ء)

(۲۳) گیٹل پی "پولٹیکل سائنس" ص ۴ - ۳

(۲۴) ول ڈیورانٹ (مترجم ظفرالمحسن پیرزادہ) "تاریخ کیا سکھاتی ہے؟" ص ۶۱

(۲۵) پلوٹارک "لائف آف سولون۔"

(۲۶) پلوٹارک "ٹائبرلیس۔"

(۲۷) کارل مارکس "داس کیپٹل۔"

(۲۸) بعض مورخین کے نزدیک مستند تحریری انسانی تاریخ تقریباً ساڑھے تین ہزار سالوں پر مشتمل ہے۔ ملاحظہ ہو ول ڈیورانٹ "دی لیسنز آف ہسٹری" ص ۹۷

(۲۹) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ول ڈیورانٹ "تاریخ کیا سکھاتی ہے؟" ص ۵۹ - ۴۹

(۳۰) ڈاکٹر مبارک علی "تاریخ کے نظریات" (نگارشات لاہور N.D.) ص ۷۹ - ۷۵

(۳۱) جیولیٹ گارڈنر "وٹ از ہسٹری ٹوڈے" ص ۱۰۵

(۳۲) سر آئزک نیوٹن کی شہرہ آفاق کتاب "Principa Mathematica" ہے۔

(۳۳) دیکارت کی مشہور تصنیف "اصول فلسفہ" (Principles of Philosophy) اور "جذبات روح" (Passions of the Soul) ہیں۔

(۳۴) جان لاک کی شہرہ آفاق کتاب "(Essay Concerning Human Understanding" ہے۔

(۳۵) ڈیوڈ ہیوم کی کتاب "رسالہ فطرت انسانی" (Treaties on Human Nature) ہے۔

(۳۶) دیدیرو نے "قاموس العلوم" (Grande Encyclopedie) مرتب کی۔ انسائیکلوپیڈیا کی یہ ضخیم کتاب ۲۸ جلدوں پر مشتمل تھی۔

(۳۷) مفکرین کی یہ تحریریں بعد ازاں انقلاب فرانس کا محرک ثابت ہوئیں۔

(۳۸) شبلی نعمانی "سیرۃ النبی" (ناشران قرآن لمیٹڈ لاہور ۱۹۹۰) ص ۹

(۳۹) ڈاکٹر حمید اللہ "رسول اکرم کی سیاسی زندگی" (دارالاشاعت، کراچی N.D.) ص ۱۶

(۴۰) ڈاکٹر سجاد باقر رضوی "تہذیب و تخلیق" (مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۷) ص ۶۶

(۴۱) ول ڈیورانٹ "تاریخ کیا سکھاتی ہے؟" ص ۱۰۵

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۴۲) ڈاکٹر مبارک علی "تاریخ کے نظریات" (نگارشات لاہور .N.D) ص' ۱۶۳ - ۱۶۲

(۴۳) ایضاً" ص' ۸۰ - ۷۹

(۴۴) ایضاً" ص' ۹۵

(۴۵) ول ڈیورانٹ "دی لیسنز آف ہسٹری" ص' ۱۱۵

(۴۶) Grove Wilson, Great Men of Science, (Garden city Publishing Co., New York, ۱۹۲۹ء) P,6

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتواں باب

دستاویزات

DOCUMENTS

آغازِ فنِ تحریر

انسان جب جنگلوں' بیابانوں' پہاڑوں کی غاروں اور درختوں کی شاخوں پر رہتا تھا تو اشاروں کنایوں اور مختلف رمزوں سے اپنی بات دوسروں تک پہنچاتا تھا۔ غم و غصہ کا اظہار چیخ و پکار سے کرتا۔ رفتہ رفتہ رموز و اشارات مفرد الفاظ میں ڈھل گئے اور وہ ان مفرد الفاظ کو بول کر اپنی ضروریات و احتیاجات کا اظہار دوسروں کے سامنے کرنے لگا۔

جنگلوں' غاروں اور پہاڑوں سے نکل کر معاشرتی زندگی کا آغاز کیا۔ جھونپڑیاں اور گھر بار بنا کر رہنے لگا تو تمدنی اقدار کا آغاز ہوا اور یوں تہذیب و تمدن کا آغاز ہوا۔ باہمی میل جول اور کاروبار زندگی سے زبان میں وسعت و شائستگی آتی گئی۔ مختلف زبانوں' تمدنوں اور تہذیبوں کے ملاپ سے نئے معاشرے وجود میں آتے گئے اور یہ عمل یوں ہزاروں سالوں سے یعنی انسان کی ابتداء سے اب تک جاری ہے۔

ابتدائی تمدنی دور میں انسان مخصوص زبان و الفاظ کے ذریعے اپنے احساسات و خیالات اور جذبات دوسروں تک پہنچانے کے قابل ہو گیا تھا لیکن پڑھنے لکھنے کے فن سے ابھی نابلد تھا۔ لہٰذا تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے ساتھ اسے یہ احساس ہوا کہ حاضر و موجود شخص کے ساتھ تو گفتگو ہو سکتی ہے مگر جو شخص حاضر و موجود نہیں ہے' کہیں دور رہتا ہے اس کے ساتھ گفتگو کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟ یا آئندہ نسلوں کے لئے کوئی پیغام یا رہنما اصول کیسے چھوڑے جائیں؟ کوئی ایسا طریقہ یا فن ہو جس کی بدولت وہ اپنے خیالات و احساسات ان تک پہنچائے اور جس سے اس کی شناخت ہو۔ لہٰذا اسی نظریہ ضرورت کے تحت فنِ تحریر ایجاد ہوا۔

دنیا کا سب سے پہلا فن تحریر' جو انسان نے وضع کیا' وہ تصویری اشکال تھیں۔ انسان پتھروں' لکڑیوں اور پتوں وغیرہ پر تصویری خطوط کھینچ کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے۔ یہ تصویریں سادہ لکیروں سے بنائی جاتی تھیں۔ اس خط تصویری کی ترقی یافتہ شکل آج کا چینی و جاپانی رسم الخط ہے جو اوپر سے نیچے کی طرف لکھا جاتا ہے۔ خط تصویری ایک مشکل رسم الخط تھا اور ہر کوئی اس کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ہر شخص مصور یا آرٹسٹ نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور نہ ہی ہر شخص اچھی تصویریں بنا سکتا تھا۔ بعض لوگوں کی تصویریں واضح نہیں ہوتی تھیں اس لیے ان کے خیالات کا صحیح ابلاغ نہیں ہوتا تھا۔

دوسری جگہوں پر خط میخی ایجاد ہوا۔ خط میخی چٹانوں یا زمین پر میخیں گاڑھ کر یا میخوں کی شکل بنا کر لکھا جاتا تھا۔ اس خط کا انداز یہ تھا کہ جس طرح انسان اپنے منہ' حلق یا نرخرے سے آوازیں نکالتا تھا' اسی انداز سے میخیں زمین پر گاڑھی جاتی تھی۔ مثلاً منہ سے نکلنے والی "آ" کی آواز کو سیدھی میخ بنا کر ↕ لکھا جاتا تھا۔ اسی طرح "ب" کی آواز لیٹی ہوئی میخ → سے ظاہر کی جاتی تھی۔ یہی میخی علامتیں ارتقائی منازل طے کرتی ہوئیں۔ ا۔ ب کی شکلوں میں ڈھل گئیں اور یوں موجودہ عربی' فارسی اور بعد ازاں اردو ابجد معرض وجود میں آ گئے[1]۔

تحریر کا فن سب سے پہلے دجلہ اور فرات کی وادی میں وضع ہوا۔ گو **فونیقیوں** اور مصریوں نے بھی یہ ہنر جلد ہی سیکھ لیا۔ لیکن اولیت بہرحال قدیم عراق کو حاصل ہے۔ یہ انقلابی ایجاد اب سے تقریباً" ساڑھے پانچ ہزار سال قبل سومیر کے ایک شہر اُروک (URUK) کے ایک معبد میں ہوئی۔ اروک اس وقت عراق کا سب سے خوشحال اور ترقی یافتہ شہر تھا۔ ورقہ کے ٹیلوں کی کھدائی سے جرمنوں نے ایک تختی دریافت کی تھی جس پر تصویری حروف کندہ ہیں۔ اس تختی پر بیل کا سر مرتبان اور کئی قسم کی بھیڑیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ انسان کی پہلی تحریر تھی جو ۳۵۰۰ ق م کے قریب لکھی گئی۔ اس تصویری تحریر کا مفہوم خاصا واضح ہے مثلاً مرتبان کی شکل فقط مرتبان کی علامت نہیں بلکہ مرتبان میں رکھی ہوئی کسی چیز یعنی گھی تیل وغیرہ کا وزن بھی بتاتی ہے۔ اس تختی سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تختی پر معبد کی املاک کا حساب درج ہے۔

بعض مورخین کے نزدیک رسم الخط کی ابتداء حضرت عیسیٰؑ سے پندرہ ہزار سال قبل مصریوں نے اپنے افکار و خیالات کو ظاہر کرنے کے لیے انسانی اور حیوانی اشکال سے کام لیا۔ مثلاً اظہار حمیت کے لیے کبوتر کی شکل۔ عداوت کے لیے سانپ کی اور جنگ و جدل کے لیے شیر۔ صلح و سلامتی کے لیے طنبورا بجاتی ہوئی عورت یا ناچتا ہوا مرد۔ عیاری و جاسوسی کے لیے گیدڑ اور اسی طرح کے دوسرے معاملات کے لیے دیگر اشکال تجویز کیں۔ اہل یورپ نے اس خط کو ہیرو کلیفی (HIEEROCLYPHICS) اور عرب ہیرو غلفی کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اس کی ترقی یافتہ شکلوں کو ہیرو تیتقی' دیمو تیتقی' تیتقی' ارامی' شطرنجی یا سطرنجیلی نبطی کہتے ہیں۔

رسم خط کی پتہ رسانی اور اس کی تاریخ مرتب کرنے میں سب سے پہلے جو چیز مصر میں دستیاب ہوئی وہ ایک سیاہ پتھر تھا' جس کو مصری حجرالرشید (ROSELTA STONE) کہتے ہیں جو آج کل لندن میوزیم میں محفوظ ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس پتھر پر پہلی سطر ہیرو غلفی کی ہے دوسری سطر قدیم یونانی خط کی ہے۔ اس طرح چار مختلف رسم الخط ایک ہی عبارت کے لیے استعمال کئے گئے ہیں۔ اس کی بابت محققین کی رائے ہے کہ یہ پتھر ایک سو چھیانوے سال قبل از مسیح کا کندہ شدہ ہے۔ یہ پتھر ۱۷۹۹ء میں نپولین کے حملہ کے وقت ایک فوجی افسر کو دستیاب ہوا تھا۔

دراصل تحریر کا فن مندروں کی معاشی ضرورت کے تحت وجود میں آیا۔ مندروں کی دولت چونکہ دیوتاؤں کی ملکیت ہوتی تھی اس لیے پروہتوں کو باقاعدہ اس کا حساب رکھنا ہوتا تھا۔ زرعی پیداوار کا حساب' بیج' آلات' اوزار کا حساب' چڑھاوے اور قربانی کا حساب' کاریگروں کی مزدوری کا حساب۔ اب ظاہر ہے کوئی پروہت اتنے زیادہ حسابات اپنے ذہن میں نہ رکھ سکتا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ حسابات کوئی نجی معاملہ نہ تھے بلکہ ایک طبقے کی معاش اس سے وابستہ تھی۔ یہ تصویری حروف صرف اشیاء کی علامت بن سکتے تھے لیکن کسی خیال یا جذبے کی ترجمانی نہ کر سکتے تھے۔ کوئی ہدایت نہ کر سکتے تھے کوئی سوال نہ پوچھ سکتے تھے۔ اروک (URUK) کے دور میں تصویری حروف کی تعداد دو ہزار سے متجاوز تھی۔ رفتہ رفتہ ان میں تخفیف ہوتی گئی۔ اہل سومیر گیلی مٹی کی چھوٹی لوحوں پر سرکنڈے' بید اور مشک کے قلم سے لکھتے تھے۔ مصری قرطاس (PAPYRUS) پر روشنائی سے لکھتے تھے۔ اس لیے ان کے تصویری حروف زیادہ حسین معلوم ہوتے ہیں۔ ۲۰۰۰ ق م میں اہل بابل نے عکادی زبان کے تقاضوں کے پیش نظر سومیری رسم الخط میں مزید اصلاحات کیں۔ ان کی زبان کو اتنا فروغ حاصل ہوا کہ کچھ عرصے بعد عکادی زبان پورے مشرق قریب کی تہذیب اور امور سلطنت کی زبان ہو گئی اور سومیری زبان کا رواج رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔ آریاؤں نے بھی تین ہزار آٹھ سو سال قبل از مسیح میں ایک نیا رسم الخط نقطوں اور دیگر علامات کی شکل میں ایجاد کیا تھا۔ اس خط کو مسماری' میخی یا پیکانی خط کہا جاتا ہے۔

حکیم محمود علی خان ماہر لسانیات کے مطابق موجودہ مروج رسم الخط کے موجد قبیلہ بولان جو قبیلہ طے کی ایک شاخ تھا' کے تین اشخاص مرامر بن مرہ' اسلم بن سدرہ اور عامر بن جدلمہ ہیں۔ یہ لوگ عراق میں رہا کرتے تھے اور انہوں نے مختلف حروف کے نقوش ایجاد کئے۔ اہل عراق نے ان سے تعلیم حاصل کی حتیٰ کہ کوفیوں نے ان لوگوں سے یہ فن حاصل کیا۔ بہرحال ان جملہ رسوم خط میں حسب ضرورت اصلاحات و ترامیم ہوتی رہیں اور ان کو آسان بنانے کی کاوشیں ہر دور میں کی گئیں جن کی تفاصیل لسانی تحقیقات کی کتب میں موجود ہیں۔

عرب دنیا میں فن خطاطی کا آغاز اسلام سے صدیوں قبل ہو چکا تھا اور یہ اعزاز خط **نبطی** کو حاصل ہے جس نے یہاں خط کا آغاز کیا۔ **نبطی** قوم حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کی نسلی توسیع

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ حضرت اسمٰعیل کے صاحبزادے نیابط کے نام پر نبطی قوم کی بنیاد پڑی۔ نبطی خط پانچویں صدی عیسوی تک نظر آتا رہا۔ دوسری صدی کے اوائل میں رومیوں کے ہاتھوں تباہ ہونے کے بعد اس قوم نے عرب کے دوسرے علاقوں کا رخ کیا بلکہ قبل از مسیح یہ لوگ دمشق تک آتے تھے چنانچہ نبطی قوم کے یہی لوگ حیرہ اور انبار میں آباد ہو گئے[2]۔

اس طرح انسان نے تحریر کے ذریعہ اپنے خیالات و احساسات دوسروں تک پہنچانے کا طریقہ ایجاد کیا۔ فن تحریر کا فائدہ یہ ہوا کہ انسان نے اپنے آس پاس کے حوادث اور انسانی کارناموں کو تحریر کرنا شروع کر دیا۔ جب تمدن نے فروغ پایا تو قصے کہانیاں' داستانیں اور افسانے قلمبند ہونا شروع ہو گئے اور یوں تاریخی ادب تخلیق ہوا۔ دوسرے علوم و فنون کے ساتھ ساتھ انسانی افعال و اعمال کی تاریخ بھی عمل میں آنا شروع ہو گئی۔ چودھویں صدی عیسوی تک تو ہاتھ سے کتابیں لکھی جاتی تھیں اور قلمی نسخے تیار ہوتے تھے مگر جب احیائے علوم کے دور میں چھاپہ خانہ ایجاد ہوا تو قلمی نسخوں کی جگہ کتابیں چھپ کر منظر عام پر آنے لگیں یوں علوم و فنون کو فروغ حاصل ہوا اور دنیا کے ہر خطہ میں ہر قسم کے علوم و فنون رواج پانے لگے اور دستاویزات کی صورت میں تاریخ کے لئے بیش بہا خزانے کی صورت اختیار کرنے لگے۔

تحریر کی ایجاد ضرورت ابلاغ کی رہین منت ہے اور ابلاغ انسانی فطرت کا ایک لازمی تقاضا اور ایک حد تک اجتماعی عمل بھی ہے۔ اجتماعی رابطے کا کوئی عمل بھی یعنی دو انسانوں کا باہمی میل ملاپ یا افہام و تفہیم ابلاغ کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر صوفیانہ' عارفانہ انداز میں گفتگو کی جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خود ذات باری تعالیٰ بھی ابلاغ کی مشتاق و آرزو مند ہے۔ حضرت آدمؑ سے لیکر نبی آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ۳۱۴ صحیفے (تاریخ کی زبان میں دستاویزات) خود خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ذریعہ ابلاغ کا واضح ثبوت ہیں۔

انسانی معاشرے میں ابلاغ ہی تمام تمدنوں کی اساس اولیٰ ہے جس کے بغیر مدنیت تو درکنار انسانیت تک قائم و برقرار نہیں رہ سکتی۔ تحریر کی ایجاد انسانی ذہن کے دور ارتقاء کی سب سے اہم ایجاد ہے۔ یہ انسان کی معاشرتی مجبوریوں کی وجہ سے معرض وجود میں آئی۔ تحریر کی ایجاد نے انسان کی زمان و مکان کی قید اور فاصلوں کو ختم کر دیا اور پھر تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی دنیا میں انسان نے جو کمالات دکھائے وہ تحریر ہی کی بدولت ہے۔

مورخین کے نزدیک تحریر کی بنیادی غرض و غایت علمی اور معلوماتی فائدے حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ اس کے ذریعہ زمانہ ماضی کا پورا ریکارڈ جو دستاویزات کی صورت میں یعنی ادب' قانون ' آرٹ' تعمیرات' مجلسی ادارے' مذہب' فلسفہ' انسانی سرگرمیاں غرضیکہ جو کچھ بھی ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دستاویزات میں محفوظ ہے اسے زندہ کیا جائے اور منظر عام پر لایا جائے کیونکہ دستاویزوں کی تعبیر میں تخلیقی شان پیدا ہوتی ہے۔ ماضی سے بہت سی مثالیں اخذ کی جا سکتی ہیں۔ جب متعدد مثبت مثالیں مہیا ہو جاتی ہیں تو بنیادی معاملات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتے ہیں۔

دستاویز کا مفہوم

دستاویز کے لغوی معنی کسی امر کا تحریری ثبوت ہے یا کوئی ایسی سند جس سے اپنے حق' قول اور تمسک کو ثابت کیا جا سکے۔ عمومی طور پر اس سے مراد کوئی ایسا تحریری یا غیر تحریری مواد' ثبوت' اشکال' حروف' اطلاع' شہادت' علامت یا اشارہ جو سرکاری یا غیر سرکاری تحریری یا غیر تحریری طور پر کسی امر کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کرے دستاویز کہلاتا ہے۔

عام طور پر ہر وہ نقش یا تحریر جو ماضی و حال سے سروکار رکھتی ہو' خواہ طویل ہو یا مختصر پرانا پمفلٹ' اخبار کا ٹکڑا' یا کوئی ایسا نقش و تحریر جو انسانی حوادث و سرگرمیوں کی تلاش میں مددگار ثابت ہو' ہم اسے دستاویز کہیں گے۔

دستاویزات اپنی زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتیں بلکہ یہ ہماری زبانوں سے سب کچھ سناتی ہیں۔ یہ وہی کچھ سناتی ہیں جو کچھ ہم سننا چاہتے ہیں اور ان کی سینکڑوں تعبیریں ہیں۔ مثلاً پاکستان کی تاریخ کی دو نہایت اہم دستاویزات لے لیں۔ ایک اعلان آزادی' دوسری دستور پاکستان۔ اعلان آزادی کا متن بھی ایک پر پیچ معاملہ ہے۔ اعلان کے سیاسی' معاشرتی' معاشی ' مذہبی اور فلسفیانہ پہلوؤں پر غور کریں۔ کہا جاتا ہے کہ اعلان آزادی کے الفاظ غیرفانی الفاظ ہیں۔ لیکن ان کا غیر فانی ہونا اصل الفاظ میں مضمر نہیں بلکہ بعد کی نسلوں نے انہیں یہ حیثیت دی۔ ان دستاویزات کے ارتقائی عمل کو سمجھنے کے لیے عرصہ دراز کا مطالعہ درکار ہے۔ مختلف مورخین ان کی مختلف توضیحات کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شہرہ آفاق دستاویز اپنی ترجمانی آپ نہیں کرتی۔ اب دستور پاکستان کی دستاویز پر غور کیجئے جو بڑی احتیاط سے تیار کی گئی۔ یہ سادہ' عام فہم اور منطقی حیثیت رکھتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دستور پاکستان اپنا ترجمان آپ ہے۔ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے۔ اگر یہ اپنی ترجمانی آپ کر سکتا تو اس کی توضیح و تعبیر کے لیے سپریم کورٹ کی رو دادوں کی ضرورت کیوں پڑتی؟

غرضیکہ دستاویز کے کئی معنی ہو سکتے ہیں؟ اس کے معنی کا تعین معاصرانہ تاریخ کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس عقل' مزاج اور رجحانات کے تحت سمجھی جا سکتی ہے جو مورخ پیدا کرتا ہے اور اسے ان علامتوں کے ذریعہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جن پر یہ مبنی ہوتی ہے۔ چونکہ ہر مورخ حقائق کی تعبیر اپنی عقل و مزاج کے مطابق کرتا ہے۔ اس لیے ہر شخص جب دستاویز کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑھے گا تو وہ بھی اس کا تجزیہ اپنے طریق اور اپنے رنگ کے مطابق کرے گا۔

دستاویز کے مفہوم کے لئے ثانوی لفظ آثار استعمال ہوتا ہے۔ دستاویزات کو بنیادی طور پر تین حصوں (۱) مادی (۲) غیر مادی اور (۳) تحریری میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ مادی آثارات

مادی آثارات سے مراد ایسی اشیاء جو زمانہ ماضی کی انسانی سرگرمیوں کا ثبوت ہیں۔ ان میں قدیم عمارات، کتبے، اسٹوپے، آرٹ، فرنیچر، ہتھیار، اوزار، برتن اور کھدائی کے ذریعہ برآمد ہونے والی دیگر قدیمی اشیاء و مواد شامل ہے۔ کسی حد تک سکے بھی مادی آثارات کا حصہ ہیں۔ چونکہ بعض سکوں پر تحریریں بھی کندہ ہوتی ہیں اس لئے مورخین ان کو بھی تحریری آثارات میں شامل کرتے ہیں۔

۲۔ غیر مادی آثارات

غیر مادی آثارات سے مراد وہ علوم و اشیاء ہیں جنہیں ہم حواس خمسہ کی بجائے عقل و دلائل سے سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ لانگ لائیس کے مطابق :

> "غیر مادی آثارات ان اشیاء کو کہتے ہیں جو ابھی تک معاشرے میں اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہیں مثلاً لوگوں کی رسوم و روایات، عقائد، نظریات، اخلاقی اصول و ضوابط، معاشرتی ادارے، افسانے اور توہمات وغیرہ۔"

۳۔ تحریری آثارات

تحریری آثارات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ اس میں ہر وہ سرکاری و غیر سرکاری تحریر جس کا تعلق انسان کی ماضی کی سرگرمیوں سے ہو، آتی ہے مثلاً اخبار، پمفلٹ، کتابیں، سوانح عمریاں، سفرنامے، چارٹر، عدالتی ریکارڈ، رپورٹیں، اعلانات، معاہدات، اقرار نامے، وصیت نامے، روز نامچے، بہی کھاتے اور خطوط وغیرہ[۳]۔

مورخ سب سے زیادہ دلچسپی تحریری آثارات میں لیتا ہے کیونکہ انہیں سمجھنے کا ذریعہ تحریر ہوتی ہے اور مورخ اس تحریری زبان سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے۔ یہ دستاویزات بالکل طبعی اور اتفاقات کا نتیجہ ہوتی ہیں کیونکہ ماضی کے انسانوں نے کوئی زیادہ تحریری ریکارڈ نہیں چھوڑا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دستاویزات کی اہمیت

"دستاویزات کے بغیر تاریخ کا کوئی وجود نہیں"

"NO DOCUMENTS, NO HISTORY"

ماضی کے واقعات کو حال، یا مستقبل میں دہرانا ناممکن ہے۔ کیوں کہ تاریخ خود کو کبھی نہیں دہراتی۔ ہیگل، **اسپینگر**، ٹائن بی اور انیسویں و بیسویں صدی کے دیگر بہت سے مورخین و مفکرین نے اس نظریہ کو غلط قرار دیا ہے کہ "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔" یہ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوئی کہ انسانی فطرت کو ناقابل فہم اور ناقابل تغیر سمجھ لیا گیا۔ اگر انسانی فطرت ایک جیسی ہے اور ایک جیسی رہتی ہے تو حالات و واقعات بھی ہمیشہ ایک جیسے وقوع پذیر ہونے چاہیں۔ بلاتفریق ماضی، حال اور مستقبل کے حالات میں کسی قسم کا تغیر نہیں آنا چاہیے خواہ کوئی عہد و زمانہ ہو۔ اگر انسانی فطرت مستقل ہے تو یہ تاریخ کی انتہائی تغیرپذیر رفتار کی توجیہہ پیش نہیں کر سکتی۔ چونکہ انسان تنوع پسند ہے اور اس کی فطرت تغیرپذیر ہے لہٰذا اس کی اپنی تبدیلی تاریخ کی ترقی سے متعین ہوتی ہے۔ ہیگل کا خیال ہے کہ کائنات کی ہر شے انفرادی طور پر ارتقائی عمل سے گزر رہی ہے۔ اس طرح تاریخ کا عمل بھی انفرادی طور پر رواں دواں ہے۔ جب واقعات از سر نو وقوع پذیر ہوتے ہیں تو ان کی نوعیت اور نتائج ہمیشہ پہلے کے واقعات سے مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً جنگیں ہوتی رہتی ہیں لیکن ہر جنگ کے نتائج مختلف ہوتے ہیں[4]۔ تاریخ کے اس تمام اضدادی عمل کی تصویر ہم دستاویزات سے حاصل کرتے ہیں۔

ماضی کے واقعات کو اب دہرانا ناممکن ہے اور ہم گزرے ہوئے حالات و واقعات کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ یعنی ہم جنگ کربلا، جنگ واٹرلو، ہندوستان کی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور ۱۹۴۷ء میں مسلمانانِ ہند کی پاکستان کی جانب ہجرت کے درد ناک واقعات کو دہرا نہیں سکتے۔ لیکن یہ تمام واقعات اپنے نشانات چھوڑ جاتے ہیں۔ کچھ واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جو کوئی نشان نہیں چھوڑتے اور بہت سی نشانیاں کالعدم ہو جاتی ہیں۔ کچھ نشانیاں موجود ہیں مگر لاپتہ ہیں اور وقتاً فوقتاً" ظہور میں آتی رہتی ہیں اور واقعات پر نئی روشنی ڈالتی ہیں۔ ماضی کا مطالعہ ان نشانیوں کے بغیر ناممکن ہے اسی لیے لانگ لائیس نے کہا تھا۔

" NO DOCUMENTS, NO HISTORY. "

یعنی "دستاویزات کے بغیر تاریخ کا کوئی وجود نہیں[5]۔" ماضی کا مطالعہ انہی نشانیوں کے ذریعہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مورخین کا کہنا ہے کہ ہر وہ چیز جو اس وقت موجود ہے وہ ماضی کی نشانی یا دستاویز ہے اور یہ ماضی پر روشنی ڈالتی ہے۔ مثلاً کھنڈرات، عمارتیں، ڈھانچے، اوزار، لباس، اسلحہ، سکے، کتبے، کتب اور تصاویر کی صورت میں دستاویزات میسر ہیں؟ ان میں سے بعض اصلی ہوتی ہیں اور بعض نقلی یعنی کسی نے انکی نقل اصل سے کی ہے جبکہ اصل ضائع ہو گئی اور نقلی ان معنوں میں بھی کہ وہ بالکل جھوٹی ہوتی ہیں اور ان میں قطعاً" اصلیت نہیں ہوتی۔

اول تو دستاویزات آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں اور پھر ان سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ نامکمل ہوتی ہیں۔ دستاویزات ماضی کے محدود حصہ پر روشنی ڈالتی ہیں۔ دستاویزات گویا مورخ کے چراغ ہیں، جن کو لے کر مورخ ماضی کے لق و دق اور تاریک صحرا میں گھوم رہا ہوتا ہے۔ جو کچھ اسے نظر آ جاتا ہے اس کو قلمبند کر لیتا ہے۔ ماضی کے حالات و واقعات دریافت کرنے کے لیے پہلے تو مورخ کو تمام متعلقہ دستاویزات کو جمع کرنا پڑتا ہے۔ جتنی زیادہ دستاویزات مل جاتی ہیں اتنی ہی زیادہ مکمل اور صحیح تاریخ رقم کی جا سکتی ہے اور اتنی ہی زیادہ صحیح معلومات فراہم کی جا سکتی ہیں۔ جتنا بعید کا زمانہ ہوتا ہے اتنی ہی کم دستاویزات ملتی ہیں اور جتنا قریب کا زمانہ ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ مکمل دستاویزات میسر آتی ہیں۔ بہت قدیم زمانے کو زمانہ قبل از تاریخ اسی لیے کہا جاتا ہے کیونکہ اس زمانے کی دستاویزات نہیں مل سکیں اور قیاسات پر تاریخ مرتب کر لی گئی ہے۔

سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ماضی کا براہ راست مشاہدہ ناممکن ہے۔ تاریخ کی صورت میں جو کچھ بھی موجود ہے وہ ماضی کے مادی، غیرمادی اور تحریری آثارات سے جمع کیا گیا ہے۔ اور وہ دستاویزات، جو مادی آثارات کی صورت میں (ماضی کے مردہ ماخذوں سے) جمع کی گئی ہیں، نامکمل ہیں اور ماضی کے بہت محدود حصہ پر روشنی ڈالتی ہیں۔ مورخ غور و فکر سے کام لے کر مادی آثارات کے ٹکڑوں کو جوڑتے ہیں اور تاریخی خلاء کو پر کرتے ہیں۔ اس میں زیادہ حصہ قیاس اور استخراج پر مبنی ہوتا ہے۔ غیرمادی اور تحریری آثارات کے ماہر مورخ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کی حقیقت کو سمجھے۔

لانگ لائیس کا کہنا ہے کہ " NO PAST, NO HISTORY " یعنی "ماضی کے بغیر تاریخ کا کوئی وجود نہیں" یہاں ماضی سے لانگ لائیس کی مراد ماضی کی نشانیاں، آثارات اور دستاویزات ہیں۔ کیونکہ ان دستاویزات کے بغیر گم شدہ تاریک ماضی کو تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دستاویزات ہی تو ہیں جو ماضی کے تاریک گوشوں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اس کی مردہ ہڈیوں کا ڈھانچہ تیار کر کے اس میں یادداشتوں، نشانیوں اور آثارات کی روح ڈال کر باشعور اور زندہ جاوید انسانوں کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صف میں لا کھڑا کرتی ہیں۔

چونکہ دستاویزات کے بغیر تاریخ کا کوئی وجود نہیں جو لوگ تاریخ نہیں رکھتے یا تاریخ سے نا آشنا ہیں انکی حیثیت اس فرد کی سی ہے جو قوت حافظہ سے محروم ہے۔ وہ ہر وقت ایک ہی قسم کی دریافتیں کرتا جائے گا جو بارہا زمانہ ماضی میں دریافت ہو چکیں۔ ایک ہی قسم کی مہارت اور ٹیکنیک ایجاد کرے گا۔ ایک ہی قسم کے مسائل کا سامنا کرے گا۔ ایک ہی قسم کی غلطیاں بار بار کرے گا۔ پھر وہ یادداشت کی نہایت بیش قیمت مسرتوں سے بھی محروم رہے گا۔ جس طرح دستاویزات کے بغیر تاریخ کا وجود ناممکن ہے اسی طرح تاریخ کے بغیر انسانی تہذیب کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ فریڈرک ہیری سن اس بارے میں اپنا نظریہ یوں پیش کرتا ہے:

"فرض کیجئے کہ تہذیب کی تدریجی ترقی یا فنون حیات اور طبعی علوم کی آہستہ آہستہ تکمیل کے متعلق تمام معلومات محو کر دی جائیں۔ فرض کیجئے کہ ابتدائی نسلوں کی تمام جدوجہد اور سعی و کوشش یا بڑے آدمیوں کے تمام کارنامے مٹ جائیں۔ تاریخ کا کوئی ایسا نشان قائم نہ رہے جس سے مختلف زمانوں کا اندازہ ہو سکے۔ جس کی وجہ سے ہر قوم، نسل یا شہر کو دور ماضی کے دوسرے شہروں یا نسلوں یا ملکوں سے امتیاز حاصل ہو۔ کچھ معلوم نہ ہو سکے کہ انسانوں نے کیا کچھ کیا یا کیا کچھ کر سکتے تھے۔ انکی بہت سی ناکامیوں' کامیابیوں اور امیدوں کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکے۔ ایک لمحے کے لیے فرض کر لیجے کہ تمام کتابیں' تمام روائتیں' زمانہ ماضی کی تمام عمارتیں روئے زمین سے ناپید ہو جائیں۔ ان کے ساتھ ہی معاشرے کے ادارے' تمام سیاسی اوضاع' تمام سیاسی اصول' تمام نظام ہائے فکر' تمام یومیہ مراسم' تمام شناسا فنون' غرض کہ کوئی چیز باقی نہ رہے۔ فرض کیجئے کہ خاندان' گھر بار' جائداد اور انصاف کے تصورات بے معنی رہ جائیں۔ غرض وہ تمام مراسم جو پیدائش سے موت تک ہمیں گھیرے رہتے ہیں' ختم کر دیئے جائیں اور انسانوں کی ایک ایسی نسل وجود میں آ جائے جن کے قلوب قدرت کی ایک عجیب و غریب ضرب کی بنا پر یاد سے بالکل معرا کر دیئے جائیں' جن کے لیے یہ دنیا بالکل نئی ہو؟

کیا ہم اپنے ذہنوں میں اس کامل بے چارگی' ذہنی پریشانی اور مصیبت کا تصور پیش کر سکتے ہیں جو ان لوگوں کو پیش آئے گی۔"

واضح رہے کہ دستاویزات کی اہمیت کا جو تصور یہاں پیش کیا گیا ہے ان میں زیادہ تر وہی پہلو شامل ہیں جن کا دعویٰ اکثر مورخوں نے کیا ہے۔ مثلاً زمانہ ماضی کا پورا مادی' غیرمادی اور تحریری ریکارڈ' آرٹ' تعمیرات' مجلسی ادارے' مذہب' فلسفہ اور قانون غرضیکہ وہ سب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کچھ جو انسانی حافظے میں دستاویزات کے ذریعہ زندہ ہے اور انہی کے ذریعہ منظر عام پر آتا ہے۔ دستاویزات دراصل منظم حافظہ ہیں اور اس کا تنظیمی پہلو ہر لحاظ اور درجہ سے ضروری ہے۔ منظم حافظے کی صورت میں تاریخ بے شمار شکلیں اختیار کرتی ہے اور بے شمار مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنتی ہے۔

تاریخ ماضی کے حالات پر مبنی ایک ریکارڈ ہے۔ اس میں وہ حقائق مرتب کیے جاتے ہیں جو مہیا ہو سکیں اور ان میں باہم تعلق ہو۔ نیز ان کے لیے پہلے سے کوئی نہ کوئی ڈھانچہ تیار کر لیا گیا ہو۔ لہٰذا ان حقائق کو پیش کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ کار تو ہونا چاہیے۔ ماضی کے واقعات کو ڈھانچہ اور طریقہ کار کے ساتھ پیش کرنے کے ذریعہ کو دستاویزات کا ذریعہ کہتے ہیں۔ دستاویزات تاریخی واقعات و حقائق کے لیے ایک نظم، ہم آہنگی اور طریق پیش کش مہیا کرتی ہے جو متفرقات کا غیر مرتب انبار ہو۔ لیکن دستاویزات کے اس ریکارڈ پر بھی بھاری پابندیاں ہیں۔ نیز دستاویزات کو تاریخ کی شکل میں تبدیل کرنا بھی ہرگز سہل نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ کوئی پریشانی برداشت کیے بغیر دستاویزات کی موجودہ حیثیت کو تسلیم کر لیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ماضی کی دستاویزات کا جو بھی ریکارڈ ہمارے سامنے آئے گا وہ بہرحال جزوی اور نامکمل ہو گا۔ چھاپہ خانے کی ایجاد سے پیشتر کئی ہزار سال کی تاریخ کے متعلق تو یہ بات خصوصیت سے درست ہے۔ بہت سی ایسی قومیں ہیں جو پندرھویں صدی کے وسط کے بعد بھی چھاپہ خانہ سے آشنا نہ ہو سکیں۔ مثلاً امریکہ میں بسنے والے اصل باشندے جنہیں "ریڈ انڈین" کہا جاتا ہے یا افریقہ کی مختلف قومیں جن کی تاریخ بڑی حد تک ضبط تحریر میں نہیں آئی۔ دور حاضر کی تاریخ کے بیشتر حصے کے متعلق بظاہر ریکارڈ قریباً" مکمل معلوم ہوتے ہیں مثلاً پینٹاگان[6] کے دفتر میں مختلف الماریاں میلوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جن میں جنگ عظیم دوم کے متعلق دستاویز جمع ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہاں بھی ریکارڈ نامکمل ہے۔ مثلاً ہم کیوں کر جان سکتے ہیں کہ دوران جنگ کروڑوں نازی اور اتحادی طاقتوں کے فوجیوں میں سے ایک ایک کو کیا حالات پیش آئے؟ ہم کیوں کر جان سکتے ہیں کہ ان کروڑوں شہریوں کو کن حالات سے دو چار ہونا پڑا جو جنگ میں الجھ گئے تھے۔ ان میں سے بعض شریک جنگ تھے، بعض جنگ کا ہدف بنے اور بعض محض تماشائی تھے۔ دستاویزات کے اس ریکارڈ کے نامکمل ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر مورخ کے لیے وقت، قوت عمل، ذہن و فکر، عملی اور فنی ماخذ کا سلسلہ محدود ہے۔ پھر ہر مورخ کی دلچسپی مہارت اور پسند و ناپسند کا دائرہ کار بھی مختلف ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں عام حالات میں کوئی مورخ اگرچہ اس کے ساتھ مورخوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہی کیوں نہ ہو وہ میلوں میں پھیلی ہوئی الماریوں میں بند تمام دستاویزوں کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑھ نہیں سکتے یعنی تمام اخبارات اور دوسری جنگ عظیم میں حصہ لینے والے ملکوں کے جنگ آزماؤں میں سے ایک ایک کا ذاتی ریکارڈ کون دیکھ سکتا ہے؟

دستاویزات کا یہ ریکارڈ نامکمل ہی نہیں بلکہ ناہموار اور جانبدارانہ بھی ہے۔ اس کے سوا ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ دستاویزات کا بیشتر حصہ محض اتفاقی حیثیت رکھتا ہے۔ ماضی کے متعلق ہمارا علم صرف ان دستاویزات پر مبنی ہے جو اتفاق سے محفوظ رہ گئیں۔ محفوظ شدہ دستاویزات پورے ریکارڈ کا نہایت مختصر بلکہ بالکل ناقابل ذکر ریکارڈ ہے۔ بیشتر ریکارڈ آگ اور تلوار کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔

اسکندریہ و بغداد کے کتب خانے تباہ و برباد کیے گئے۔ جنگ عظیم دوئم میں بمباری سے بہت کچھ تباہ کر دیا گیا۔ بہت سا ریکارڈ مذہبی و قومی تعصب کی بنا پر برباد ہو گیا۔ بہت سا ریکارڈ وقت کے ہاتھوں ضائع ہو گیا۔ بہت سے فاتح اپنے دشمنوں کے ریکارڈ دانستہ تباہ کرتے رہے تاکہ ان کی آواز کوئی سن نہ سکے۔ بعض اوقات فاتح اور بادشاہ اپنے مخالف مورخ اور دشمنوں کے مورخوں کو موت کی سزا دیتے رہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ بھی جزوا" اس قوم کی دستاویز ہے جو دوسروں پر مسلط ہو گئی ہے اور جس نے دوسری قوموں کو شکستیں دے کر برباد کر دیا اور یوں صدیوں سے تاریخ محض فاتح قومیں ہی لکھتی رہی ہیں۔ مفتوح ہمیشہ اس سعادت سے محروم ہی رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہاں نہ کوئی منطق ہے اور نہ ہی کوئی مسلم اصول و نمونہ۔ جو کچھ محفوظ رہ گیا ہے وہ محض قسمت اور اتفاق کی بات ہے۔

جب تک تاریخ کا انحصار تحریری دستاویزوں پر رہا تو جو تحریری دستاویزیں ہمارے سامنے ہیں ان کی بنا پر جو کچھ پیش آیا وہ بالکل طبعی اور قریبا" ناگزیر تھا۔ کیونکہ ماضی کے انسانوں کی بہت بڑی اکثریت نے کوئی تحریری ریکارڈ نہیں چھوڑا۔ جو مورخ یہ جاننا چاہتا ہے کہ لوگوں کی بڑی تعداد نے کیونکر زندگی بسر کی تو وہ مجبور ہے کہ ان مصنوعات پر انحصار کرے جو اتفاقات سے باقی رہ گئیں۔ مثلاً اوزار' اسلحہ' لباس' عوامی فنون یا عوامی منظوم داستانیں' لوک گیت یا وہ ریکارڈ جو کلیسا کے کارکنوں یا سرکاری افسروں نے باقی رکھے۔ یعنی پیدائش' شادی اور موت کے اندراجات یا فوجی خدمت کے ریکارڈ' عدالتوں کے فیصلے' تحصیل داروں کے اعداد و شمار وغیرہ۔ دور حاضر میں اخبارات نے ان میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ ایسی ہی اشیاء نے باشعور مورخوں کے لیے نہایت قیمتی مواد مہیا کیا ہے۔ لیکن اکثر مورخ ایسی چیزوں سے تغافل برتتے رہے۔

سب سے بڑی مشکل تو یہ ہے کہ ماضی کا براہ راست مشاہدہ ناممکن ہے جو کچھ واقعات و حالات جمع کیے گئے ہیں وہ ماضی کے مردہ ماخذوں اور دستاویزوں سے جمع کیے گئے ہیں۔ جو نامکمل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں اور ماضی کے بہت محدود حصہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مورخ اور محقق غور و فکر سے کام لے کر معلومات کے ٹکڑوں کو جوڑتے ہیں اور خلاء کو پر کرتے ہیں۔ اس میں زیادہ حصہ قیاس اور استخراج پر مبنی ہوتا ہے اور مورخ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کی حقیقت کو سمجھے۔ چونکہ تاریخی مواد اب اس قدر زیادہ ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اس لیے محقق اور مورخ کے لیے اس پر عبور حاصل کرنا اور اس میں سے انتخاب کرنا مشکل پڑ جاتا ہے۔

دستاویزات کی اقسام

دستاویزوں کی بہت سی اقسام اور صورتیں ہیں۔ ان کی صحیح تعداد کا اندازہ تو مشکل ہے۔ لیکن ان میں مشہور اصناف سرکاری اور نجی دستاویزات' تنسیخی اور غیر تنسیخی دستاویزات' منشور' فرامین' اسناد' شہادت' چارٹر' گرانٹ' عطیات' مراعات' خطابات' عدالتی ریکارڈ' رٹ' رپورٹیں' اعلانات' اقرار نامے' معاہدات' بہی کھاتے' روز نامچے' سفر نامے' خود نوشت سوانح عمریاں' خطوط' تقرر نامے' بیعہ نامے' وصیت نامے اور فتاویٰ وغیرہ ہیں۔ تاریخ کی بنیاد انہی دستاویزات پر ہوتی ہے۔ ان کی عدم موجودگی میں ہم تاریخ نویسی کا تصور تک بھی نہیں کر سکتے۔ دوسرے الفاظ میں ہر وہ تحریر جو ماضی سے متعلق ہو' خواہ طویل ہو یا قلیل' سوانح عمری کی صورت میں ہو یا پرانا اخبار ہو' جو بھی پرانے واقعات پر مشتمل ہو گی اسے ہم دستاویز ہی کہیں گے۔ چونکہ مورخ کا سروکار بھی ماضی کے حالات و واقعات سے ہوتا ہے لہٰذا اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان دستاویزات کا کھوج لگائے۔ ان کے آثارات کو معلوم کرنے کے بعد ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائے اور اس تمام مواد کی تحقیق کرے جو کہ تاریخ نویسی کے سلسلہ میں خام مال کی حیثیت رکھتا ہے اور ان میں سے اسے اہم اور قابل اعتماد دستاویز کو منتخب کرنا ہوگا۔

دستاویزات کو پڑھنے' سمجھنے اور ان پر تنقید کرنے کے جدید طریقوں نے مورخ کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ انہیں بہتر طور پر سمجھ سکے۔ ان پر بھروسہ کر سکے اور اس کے بعد وہ جو کچھ بیان کرنا چاہے اسے بہتر پیرائے میں بیان کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

ان دستاویزات کو آسانی سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) سرکاری دستاویزات۔ (۲) غیر سرکاری دستاویزات۔

(۱) سرکاری دستاویزات

وہ مسودات ہوتے ہیں جو فرائض کی انجام دہی یا سلسلہ کاروبار ریاست کے دوران ضبط تحریر میں لائے جاتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۲) غیر سرکاری دستاویزات

غیر سرکاری دستاویزات وہ مسودات ہوتے ہیں جو کسی خاص جذبہ یا احساس سے نہیں لکھے جاتے اور نہ ہی وہ نئی نسلوں کے لیے کوئی خاص نقطہء نظر پیش کرتے ہیں۔ سرکاری دستاویزات کو ہم مزید دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ () رسمی سرکاری دستاویزات (Formal Officail Documents) (۲) غیر رسمی سرکاری دستاویزات (Informal Official Documents)

(ا) رسمی سرکاری دستاویزات سے مراد وہ مسودات ہیں جو فرائض کی انجام دہی کے دوران لکھے جائیں مگر ان کو تحریر کرتے وقت کچھ اصول و ضوابط' خاص تنظیم و طریقہ کار اور کسی ڈھانچے کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔[9] ان میں زیادہ اہم مندرجہ ذیل ہیں۔

(ا) معاہدات (۲) چارٹر (۳) گرانٹس یا عطیات (۴) عدالتی کارروائیاں (۵) رٹ یعنی درخواست برائے حکم امتناعی وغیرہ۔

رسمی سرکاری دستاویزات میں ہم کسی حکمران جماعت کے کسی ممبر کے طبقہ عوام میں اقدامات کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔

(۲) غیر رسمی سرکاری دستاویزات کی اس قسم میں درج بالا ضابطے مدنظر نہیں رکھے جاتے۔ اگرچہ یہ بھی سرکاری حیثیت میں فرائض کی انجام دہی کے سلسلہ میں یا پھر کاروباری نوعیت کے لحاظ سے دائرہ تحریر میں لائی جاتی ہیں مگر انہیں تحریر کرتے وقت اصول و ضوابط کی پروا نہیں کی جاتی اور یہ مسودات ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان میں ہم مندرجہ ذیل کو شامل کرتے ہیں۔

(ا) خطوط ۔ سرکاری اور غیر سرکاری خطوط یعنی کاروبار ریاست کے متعلق اور ذاتی خواہشات کے خطوط وغیرہ۔ (۲) رپورٹیں (۳) اعلانات

ا۔ رسمی سرکاری دستاویزات Formal Official Documents

اب ہم رسمی سرکاری دستاویزات کی جزئیات کا بہ نظر غائر جائزہ لیتے ہیں۔

ا۔ معاہدات

معاہدہ سے مراد دو یا دو سے زیادہ افراد' پارٹیوں' گروہوں' ریاستوں' قوموں اور ملکوں کے درمیان معاونت و مفادات کا باہم قول و قرار ہے۔ اس قسم کی دستاویزات کا باعث یا تو حکمران بذات خود ہوتے ہیں یا پھر ان کا کوئی مقرر کردہ کارندہ ہوتا ہے اور ان کے طے کردہ معاہدوں کو ہم رسمی سرکاری دستاویز کا نام دے دیتے ہیں کیونکہ یہ بین الاقوامی حیثیت کے شمار میں آ جاتی ہیں اور پھر ان معاہدوں میں افہام تفہیم کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے تاکہ فریقین کو ایک دوسرے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مفادات، نظریات اور اغراض کو سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری حائل نہ رہے[1]۔ سرکاری حیثیت کے معاہدات جو مختلف ممالک کے درمیان طے پاتے ہیں ان میں ہم سیٹو اور سینٹو کی مثال دے سکتے ہیں۔ واقعات سے متعلق معاہدات سب سے زیادہ مستند قسم کی شہادت ہوتے ہیں۔ معاہدات کی بھی کئی اقسام ہوتی ہیں مثلاً تجارتی، ثقافتی، معاشی، سیاسی، عسکری اور صلح و جنگ کے معاہدات وغیرہ۔ سیاسی اور ڈپلومیٹک معاہدات وغیرہ میں دستخط کنندگان بعض اوقات اپنی اپنی منشاء کے مطابق تاویل کر لیتے ہیں اور اپنی پسند کے معنی اخذ کر لیتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ معاہدوں میں ذو معنی قسم کی زبان استعمال کی جاتی ہے جسے ہم "ڈپلومیٹک زبان" کہتے ہیں۔ اس بنا پر مورخ کو ان معاہدوں کے سمجھنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ صورت حال سے صحیح نتائج اخذ کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس ضمن میں کسی حد تک تاشقند اور شملہ معاہدوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان معاہدوں کا متن کچھ اس قسم کا تھا کہ بھارتی ان کی دفعات سے خوش فہمی میں مبتلا ہیں اور پاکستانی ان کو اپنی فتح کی دلیل بتاتے ہیں۔ جدید دور میں سیاسی معاہدات کافی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ جنگ و صلح کے معاہدوں میں بعض ممالک اپنی سرحدوں اور لڑائی وغیرہ کے مختلف تصفیہ طلب مسائل کے متعلق معاہدات طے کرتے ہیں۔

وہ معاہدات جو مختلف گروہوں اور انتظامیہ کے درمیان طے پاتے ہیں ان موضوعات پر بے شمار مفکرین نے خامہ فرسائی کی ہے۔ مثلاً قدیم ادب میں چندر گپت موریہ کے وزیر کوٹلیہ نے اپنی کتاب "ارتھ شاستر" میں ان کا ذکر کیا ہے[1]۔ یونانی سوفسطائیوں، سقراط، افلاطون اور ارسطو نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے۔ عیسائی پیشواؤں نے بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ سب سے پہلا فرد جس نے ان قدیم معاہدات پر باقاعدہ طور پر لکھا وہ نویں اور دسویں صدی کا مفکر ابو نصر فارابی تھا۔ گیارہویں صدی میں مفکر مینی گولڈ (Manegold) نے بھی ان پر لکھا۔ ۱۵۶۴ء میں ہوکر (Hocker) نے زیادہ صاف لفظوں میں ان کا ذکر کیا۔ اس کے بعد ہابز، لاک اور روسو نے ان قدیمی معاہدات کو نظریات کی صورت میں پیش کیا ہے[2]۔ درحقیقت قدیمی معاہدات مورخ کے لیے تاریخی حقائق کی دریافت کی راہ میں نہایت ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ جن سے عصری تعین "نسبتاً" آسان ہو جاتا ہے کیونکہ یہ سربستہ رازوں کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔

ان معاہدات سے ہم مندرجہ ذیل نتائج معلوم کرتے ہیں۔

(۱) کیا یہ معاہدات آثارات کے حامل اور قابل بھروسہ ہیں؟

(۲) یہ معاہدات کن وجوہات کی بنا پر، کن حالات کے تحت، کس مقام پر کون سے فریقین کے درمیان طے پائے اور پھر ان سے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۳) ان معاہدوں میں کون سے مسائل زیادہ زیر گفتگو رہے اور کون سے پہلوؤں پر کیوں زیادہ زور دیا گیا؟

(۴) یہ معاہدات کسی ملک کے معاشی' معاشرتی' سیاسی' خارجی اور داخلی مفادات کے پہلوؤں پر اہم روشنی ڈالتے ہیں۔

(۵) ان معاہدات سے ہمیں اس دور کے مروجہ رسوم و رواجات اوراصول و ضوابط کا پتہ چلتا ہے۔

۲- پروانہ استحقاق Charter

پروانہ استحقاق یا چارٹر اس رسمی سرکاری دستاویز کو کہتے ہیں جو مقتدر اعلیٰ اوراس کی رعایا کے درمیان تعلقات کو بیان کرے۔ تعلقات کی ضمانت دینے والا بالعموم یا تو حکمران ہوتا ہے یا اس کی طرف سے اس کا مقرر کردہ کوئی رکن اعلیٰ ہوتا ہے۔ جب کہ ضمانت حاصل کرنے والی کوئی متفقہ جماعت یا کوئی اہم شخصیت ہوتی ہے۔ چارٹر کی زبان معاہدات کی طرح بڑی پختہ اور غلطیوں سے مبرا ہوتی ہے۔ یہ پارٹیاں جب چارٹر پر دستخط کرتی ہیں تو ہرگز یہ ظاہر نہیں ہونے دیتیں کہ ان میں سے کون اعلیٰ حیثیت کی مالک ہے۔

چارٹر کو پرکھنے اور جانچنے کا جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہ کافی حد تک سائنٹفک ہوتا ہے۔ مورخ کو اس میں سے اپنے مقصد کے حقائق کی تلاش کرنا ہوتی ہے۔

(۱) کیا یہ چارٹر مقتدر اعلیٰ کی طرف سے ٹھونسا گیا تھا یا کہ دوسری پارٹیوں کی باہمی رضا مندی سے عمل میں آیا تھا؟

(۲) اس میں اعلیٰ و ادنیٰ کے حقوق و تعلقات کی تشریح کس طرح سے کی گئی ہے اور فریقین کے درمیان تعلقات کس نہج پر تھے؟

(۳) ملک کا سیاسی ڈھانچہ کس قسم کا تھا اور یہ کون سے مقام پر کس وقت وجود میں آیا؟

(۴) چارٹر میں درج شدہ امور کی ضمانت کن وجوہات کی بنا پر دی گئی ہے؟

اس کے علاوہ چارٹر سے مورخ کو مختلف قسم کا مواد مہیا ہوتا ہے۔ واقعات و وجوہات ' وقت اور مقام کا تعین ہو جاتا ہے۔ کب اور کہاں کا جواب مل جاتا ہے۔ مختلف پارٹیوں کے سرکردہ لیڈروں اور ان کی شخصیات کا علم ہو جاتا ہے۔ (جن کا تعلق چارٹر سے ہوتا ہے) اور ان شخصیات کی سیاست سے وابستگی کا پتہ چل جاتا ہے۔ اور یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ آیا انہوں نے چارٹر پر دستخط کئے تھے یا کہ نہیں۔ یہ سب چیزیں مورخ کو تاریخ لکھتے وقت بنیادی ڈھانچہ فراہم کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ معاہدات کے بعد چارٹر ہی اہمیت کے دوسرے درجہ پر پورے اترتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں۔

۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملکہ الزبتھ سے چارٹر حاصل کیا اور ہندوستان کے مغل حکمرانوں کے ساتھ تجارتی روابط قائم کیے۔ ۱۶۰۴ء میں فرانس کے پہلے بوربون حکمران ہنری چہارم نے فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی کو چارٹر عطا کیا۔

۳۔ عطیات GRANTS

عطیہ سے مراد انعام اور بخشش کے ہیں۔ اس سے مراد گورنمنٹ کی طرف سے عطا کردہ کوئی رعایت یا انعام ہے۔ اس میں کسی فرد کو زمین و تجارتی حقوق و مراعات یا کوئی اور خصوصی رعایت دینا مقصود ہوتا ہے۔ عطا کرنے والا کسی خصوصی عہدے پر فائز ہوتا ہے اور وصول کنندہ کسی کم عہدہ پر ہوتا ہے۔ ہمیشہ مختلف حکومتیں اور قومیں اپنی رعایا اور مفتوح اقوام کو طرح طرح کی رعایتوں سے نوازتی رہی ہیں۔

۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملکہ الزبتھ سے چارٹر حاصل کیا اور مغل شہنشاہوں سے تجارتی حقوق و مراعات کے لیے ہندوستان کی طرف رجوع کیا۔ ۱۶۱۵ء میں سر ٹامس رو اور کیپٹن ڈبلیو ہاکنز شاہی سفیر آف برطانیہ نے نور الدین جہانگیر سے کمپنی کے لیے کچھ تجارتی مراعات حاصل کیں۔ ۱۶۳۵ء اور ۱۶۵۷ء میں حکومت برطانیہ نے کمپنی کو چارٹر کی رو سے مزید مراعات سے نوازا۔ ۱۶۶۱ء میں چارلس دوئم نے کمپنی کو ہندوستان کے لیے مزید جنگی، عدالتی اور انتظامی مراعات سے نوازا۔ ۱۷۱۷ء میں شہنشاہ فرخ سیر سے واٹر ولیم ہملٹن نے تین گرانٹس حاصل کیں جن کی رو سے کمپنی کو بنگال میں بلا محصول آزادانہ تجارت کرنے، تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے اور فیکٹریاں بنانے کی اجازت مل گئی۔

شہنشاہ شاہجہان نے اپنے دربار سے مراعات و عطیات کے جو فرمان صادر کئے ان میں سے بعض اب بھی لاہور میوزیم میں محفوظ ہیں۔

اس سے ہمیں گرانٹ بخشنے والے کی عظمت و رتبہ کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے درباروں کی شان و شوکت، خوشحالی و طاقت، طریق کار کا نمایاں طور پر پتہ چلتا ہے۔ گرانٹ حاصل کرنے کے متعلق کافی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یعنی مختلف طبقوں، لوگوں اور علاقوں کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یعنی کونسا طبقہ حکومت کا منظور نظر تھا، وہ حکومت کے لیے کس قسم کی خدمات سر انجام دیتا تھا اور حکومت انہیں کس قسم کے عطیات سے نوازتی تھی۔ اس قسم کی دستاویزات سے بعض اوقات مختلف خاندانوں کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے، کیونکہ برصغیر پاک و ہند میں جاگیرداروں کے پاس آج جو جاگیریں موجود ہیں وہ ان کی ذاتی کوششوں کا صلہ و نتیجہ نہیں بلکہ وہ ان کے آباؤ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

و اجداد کو صلہ خدمت گزاری کے طور پر مغل یا انگریز حکمرانوں نے عطا کیں تھیں۔ یہ جاگیریں عطیہ سلطانی یا عطیہ انگریز شاہی ہیں۔

بالعموم گرانٹ عطا کرنے والی ہستی کوئی مقتدر اعلیٰ ہوتی ہے اور دوسری طرف وصول کنندہ نسبتاً" کم حیثیت ہستی ہوتی ہے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ بعض اوقات حکومتیں کسی فرد کی خدمات سے خوش ہو کر اسے کوئی قطعہ زمین یا کوئی اور منفعت بخش ذریعہ آمدن عطا کر دیتی ہیں اور پھر اس عطائیگی کے لیے مقتدر اعلیٰ کی جانب سے خاص دستاویز جاری ہوتی ہے۔

۴- عدالتی ریکارڈ Rolls

تاریخی ماخذوں میں سرکاری و غیر سرکاری ریکارڈ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ بعض اوقات ہمیں سابقہ ریکارڈ اور فائلوں کے مطالعہ سے بڑی اہم اور تاریخ ساز معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ تاریخ ان دستاویزات کے بغیر نامکمل ہوتی ہے اس لئے ہمیں ہر صورت میں اس ریکارڈ کو حاصل کرنا ہوتا ہے۔ عدلیہ کی کارروائیاں اس ضمن میں سرفہرست ہیں۔ برطانوی عدلیہ سرکاری رسمی دستاویزات کو محفوظ رکھنے میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ ان دستاویزات کو سرکاری ریکارڈ کی طرح محفوظ رکھنے کے لیے باقاعدہ انتظامی یونٹ اور غیر لچکدار قسم کے اصول و ضوابط مقرر نہیں ہوتے مگر پھر بھی ان کا ایک خاص طریقہ کار ہوتا ہے اور ان کا سرو کار عوام کی پرائیویٹ زندگی سے ہوتا ہے۔ ججوں کو فصل خصومات کے لیے ایک طریقہ کار (قانون) کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بسا اوقات مقدمات اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں اور جرم اتنی چالاکی سے کئے جاتے ہیں کہ صحیح واقعات تک پہنچنا ناممکن ہو جاتا ہے یا کوئی ایسا مقدمہ سامنے آ جاتا ہے کہ جن سے کوئی قانون مطابقت نہیں رکھتا' اس وقت قانون کی توضیح و تشریح اور واقعات کی تفتیش و تحقیق کے امور جج کے فرائض میں آ جاتے ہیں۔ اس بحث سے ہمیں سروکار نہیں۔ یہ چیزیں عدلیہ کے وظائف کے باب میں آتی ہیں مگر ایک مورخ پر یہاں یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ معاملات کی تہہ تک پہنچے اور صحیح نتائج اخذ کرے۔ مورخ کو عام طور پر عدالتی کارروائیوں سے درج ذیل امور کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) لڑائی جھگڑے کی اصل وجہ

(۲) افراد کے ذاتی حالات

(۳) معاشرتی جرائم کی اقسام

(۴) ملک [illegible] اور قانونی ڈھانچے کی ساخت

(۵) انتظا[illegible] کار کردگی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۶) افراد کے بنیادی حقوق

(۷) عدلیہ کی مقننہ اور عاملہ کے ساتھ حیثیت

(۸) شہریوں کے حقوق و فرائض

غرضیکہ مورخ کو عدالتی ریکارڈ سے بیش بہا معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ حکومت اور عوام کے متعلق ہمہ گیر معلومات بہم پہنچتی ہیں۔ کسی قوم کے سماجی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ مقامی حکومت کی کمزوریاں' مرکز و صوبہ جات یا وفاق میں شامل مختلف یونٹوں کے افسروں کے رجحانات اور عوام کے اخلاق و اقدار کا علم ہوتا ہے۔

ان معلومات میں نقص یہ ہے کہ انہیں ہم مثالی عصری اکائی کی حیثیت نہیں دے سکتے کیونکہ حال میں ماضی کی تصویر کا عکس نہیں بلکہ جھلک ہو سکتی ہے۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے مورخ کو چاہئے کہ وہ ریکارڈ کی فائلوں میں درج شدہ واقعات کی درستگی پر قناعت نہ کرے بلکہ واقعات کو پرکھنے کے لیے تاریخی تنقید کا طریقہ استعمال کرے۔

۵- رٹ Writt

رٹ کو عدالتی نظرثانی (Judiciai Review) بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد حکم امتناعی ہوتا ہے۔ حکم امتناعی (Injuction) ایک عدالتی کارروائی ہے جس کی رو سے ایک فریق کو کوئی خاص کام کرنے کے لیے یا اس کام سے باز رکھنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ یہ حکم امتناعی داد رسی کی نوعیت کا ہوتا ہے جو ایک فریق مقدمہ کو عطا کیا جاتا ہے کیونکہ وہ فریق اس بات کا اندیشہ' خدشہ اور خطرہ محسوس کرتا ہے کہ اس کو مستقبل میں ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس کا مقصد وقتی طور پر تحفظ پہنچانا ہے۔

رٹ یا اپیل (Writt OR Appeal) سے مراد ایک سبب (Cause) کا ادنیٰ عدالت سے اعلیٰ عدالت میں انتقال۔ ادنیٰ عدالت (Lower Court) کے فیصلہ کی معقولیت کو پرکھنے کے لیے اس طرح قانون نے ایک طریقہ حصول داد رسی فراہم کیا ہے تاکہ ادنیٰ عدالت کی مصدرہ ڈگری کو منسوخ کیا جائے۔ دراصل یہ ایک شکایت ہے جو ادنیٰ عدالت کے فیصلہ کے خلاف اعلیٰ عدالت میں بدیں امر کی جاتی ہے کہ ادنیٰ عدالت کا فیصلہ غیر معقول اور غلط ہے۔ ایک رٹ یا اپیل ایک نیا مقدمہ نہیں ہوتا بلکہ مقدمہ میں اصل کارروائی کے جاری رہنے کے عمل کا ایک مرحلہ ہے۔

ضابطہ دیوانی (C.P.C. Order 39, Rule I) میں اپیل کی چار اقسام بیان کی گئی ہیں :

(۱) ابتدائی ڈگری کے خلاف اپیل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۳) احکام (Orders) کے خلاف اپیل

(۴) سپریم کورٹ میں اپیل

رٹ بالعموم اس وقت دائر کی جاتی ہے کہ جب کمزور لوگوں کے حقوق طاقتور لوگ خواہ مخواہ غصب کرنے کے درپے ہو جائیں۔ یہ صورت حال نہ صرف عوامی سطح پر ہی پیش آتی ہے بلکہ بعض دفعہ خود حکومت کا ہی کوئی اہلکار کسی فرد کے بنیادی حقوق کا احترام نہیں کرتا۔ ایسے حالات میں عدلیہ کا یہ فرض ہے کہ مظلوم افراد کے حقوق کی پوری حفاظت کرے۔ عدلیہ ان مقاصد کے حصول کے لیے پروانوں اور امتناعات (Writts and Injunction) کا اجراء کرتی ہے جن کی خلاف ورزی توہین عدالت میں شمار ہوتی ہے۔ جابر اور بددیانت انتظامیہ کے خلاف عوام کے ہاتھوں میں یہ بڑا مضبوط ہتھیار ہے۔ اس کی افادیت یہ ہے کہ اس سے وقت' تاریخ اور اختیارات (عدلیہ اور عاملہ کے) کی نوعیت کا پتہ چل جاتا ہے اور انفرادی وجود کی شخصیت سے بھی واقفیت ہو جاتی ہے۔

۶- رپورٹیں Reports.

رسمی سرکاری دستاویزات کے ضمن میں رپورٹیں مورخ کے لیے خاص اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ قدیم و جدید عہدوں میں حکمرانوں کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ اپنے کارندوں کی کارکردگی اور ملکی حالات سے اپنے آپ کو باخبر رکھنے کے لیے وقائع نگار ملازم رکھتے تھے۔ برصغیر کی عہد قدیم کی تاریخ سے بھی ان خبر رسانوں کی رپورٹوں کا پتہ ملتا ہے۔ **میگستھینز** اپنی کتاب "انڈیکا" میں اور کوٹلیہ "ارتھ شاشتر" میں چندر گپت موریہ (۳۲۲ ق م سے ۲۹۸ ق م) کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ چندر گپت موریہ نے ملک کے متفرق لوگوں اور عمال حکومت کی سرگرمیوں سے باخبر رہنے کے لیے ملک میں جابجا مخبر (رپورٹر) مقرر کر رکھے تھے' جو بڑے بڑے صوبوں' شہروں' قصبوں اور حتیٰ کہ شاہی محل تک کی خبریں اور ملک کے گوشے گوشے کے حالات سے (اس محکمہ جاسوسی کے افراد) باخبر رکھتے تھے[۱۳]۔ عہد مغلیہ میں بھی خصوصاً شیر شاہ سوری کے عہد میں وقائع نگاروں کا ایک باقاعدہ شعبہ "محکمہ اطلاعات و خفیہ معلومات" کے نام سے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ عہد شاہجہانی میں تو ان وقائع نگاروں کی باقاعدہ طور پر ایک شاندار فہرست نظر آتی ہے۔

ان خبر رسانوں کے فرائض بہت ہی اہم اور نازک ہوتے تھے۔ وہ حکومت کے مقرر کردہ عمال کی کارکردگی پر نظر رکھتے اور ان کی خامیوں اور خوبیوں کو بادشاہ تک پہنچاتے' اس طرح شہنشاہ پایہء تخت حکومت (مرکز) میں رہ کر دور دراز کے علاقوں کے حالات سے فوری طور پر آگاہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو جاتا اور کسی بھی جگہ رونما ہونے والی بدانتظامی کو آسانی سے دور کر دیا جاتا۔ عمال محاسبہ کے خوف سے ہر وقت اپنے آپ کو بادشاہ کے سامنے جوابدہ تصور کرتے اور اپنے فرائض کو احسن طریقہ سے سرانجام دیتے۔

رپورٹوں کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک خفیہ رپورٹیں، دوسری غیر خفیہ رپورٹیں۔ درج بالا رپورٹیں خفیہ رپورٹوں کے شمار میں آتی ہیں جو عام طور پر محکمہ جاسوسی کے کارکن یا اعلیٰ ملازمین اپنے ماتحت ملازمین کے بارے میں مرتب کرتے ہیں۔ یہ رپورٹیں صیغہ راز میں رکھی جاتی ہیں اور وقت سے پہلے ان کو اخفا نہیں کیا جاتا۔

تاریخ کے دامن میں مختلف عہدوں کے وقائع نگاروں کی بہت سی تحریریں آج تک محفوظ ہیں اور وہ مورخ کے لیے انمول خزانہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان وقائع سے وہ تفصیلات حاصل ہوتی ہیں جن کا حصول عام حالات میں تقریباً" ناممکن ہوتا ہے کیونکہ یہ وقائع نگار حکمرانوں کے خاص معتمد اور پروردہ ہوتے تھے جس بنا پر وہ بلا خوف و خطر اپنے فرائض سرانجام دیتے تھے، اور جو دیکھتے تھے وہی احاطہء تحریر میں لاتے تھے۔ ان کو مقامی افسروں کی خوشنودی حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی لہٰذا ان کی تحریریں (رپورٹیں) تاریخ نویسی کے سلسلہ میں بڑی جامع اور ٹھوس معلومات کی حامل متصور ہوتی ہیں۔ ان تحریروں سے معلومات حاصل کرنے والا انسان ہی تو ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ انہیں سمجھنے میں کہیں غلطی بھی کر بیٹھے۔ اور ہو سکتا ہے کہ کہیں وقائع نگار نے بھی ذاتی عناد و حسد کی بنا پر جانبداری سے کام لیا ہو۔ لہٰذا ان کی تحریریں (رپورٹیں) تاریخ نویسی کے سلسلہ میں بڑی جامع اور ٹھوس معلومات کی حامل متصور ہوتی ہیں۔ لہٰذا یہاں پر مورخ کو خاص احتیاط سے تاریخی تنقید کا سہارا لینا پڑتا ہے تاکہ وہ واقعات کی صحیح روح کو جانچ سکے۔

دوسری قسم کے وقائع یعنی غیر خفیہ رپورٹیں عموماً" قومی مسائل کے متعلق ہوتیں ہیں۔ جدید دور کی حکومتیں جو کمیشن مقرر کرتی ہیں، ان کی رپورٹوں کو ہم اس دائرہ کار میں شمار کرتے ہیں۔ یہ کام حکومت یا لیگ کسی ماہر اعلیٰ فرد کے ذمہ کسی خاص مسئلہ کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے بارے میں سپرد کرتی ہے، تو وہ ماہر اعلیٰ اس مسئلہ کا ہر پہلو سے جائزہ لیتا ہے۔ مختلف افراد، کے ساتھ بحث و تمحیص سے مطلوبہ معلومات فراہم کرنے کے بعد اپنی رپورٹ کو آخری شکل دے کر حکومت یا لیگ کو پیش کر دیتا ہے۔ جو درپیش مسئلہ کو سمجھنے اور حل کرنے میں مدد دیتی ہے۔ مثلاً ۱۹۱۹ء میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد "وارسائی امن کانفرنس" میں فتح یاب اتحادیوں نے شکست خوردہ ترکی پر نئے فیصلے عائد کرنے کی کوشش کی تو اس امن کانفرنس کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شروع میں آرمینیہ کی جدید جمہوریت نے اناطولیہ کے شمالی علاقوں کے الحاق کا دعویٰ کر دیا۔ آرمینیہ کے اس مسئلہ کا جائزہ لینے کے لیے امریکی صدر ولسن نے ایک کمیشن میجر جنرل جیمز جی ہاربرڈ کی سربراہی میں مقرر کیا۔ کمیشن نے ایشائے کوچک کا دورہ کیا اور اکتوبر ۱۹۱۹ء میں اپنی رپورٹ میں یہ سفارش کی کہ ترکی اور ٹرانس کو کاسیہ پر ایک ہی انتدابی نظام قائم کیا جائے جس کی وجہ بعض نسلی اور اقتصادی وجوہات تھیں جس کے پیش نظر اس قسم کا انتظام ناگزیر تھا۔[۱۴]

حکومت برطانیہ نے ۱۹۲۸ میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مطالبات اور اصلاحات کا جائزہ لینے کے لیے سائمن کمیشن بھیجا۔[۱۵]

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے لیے ناقابل فراموش سرحدی کمیشن جو 4 جون ۱۹۴۷ء کو ریڈ کلف کی سربراہی میں مقرر کیا گیا' اس نے بندر بانٹ کا مضحکہ خیز اور عجیب و غریب فیصلہ ۱۸ اگست ۱۹۴۷ کی رپورٹ میں دیا جو ہمیشہ اس کی ستم ظریفی اور بے انصافی پر شاہد رہے گا۔

مورخ کے لیے یہ رپورٹیں کافی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ جن سے اس وقت کے مسائل کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کے پس منظر' اصل وجوہات' ان پر عمل درآمد اور فوائد و نقصانات وغیرہ کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہاں پر مورخ کو وقائع نگار کی رپورٹ' جانبداری' غیر جانبداری اور نسلی و علاقائی مسائل کو مدنظر رکھ کر ناقدانہ نظر سے معلومات کو اخذ کرنا ہو گا۔

۷- اعلانات Announcements.

بسا اوقات حکومتیں بعض مواقع پر مخصوص مسائل و حالات کے بارے میں اعلانات جاری کرتی ہیں۔ یہ اعلانات' صلح و جنگ' مراعات و اصلاحات' حقوق و تحفظ وغیرہ کے بارے میں ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد حکومت کے عندیہ کو لوگوں پر واضح کرنا ہوتا ہے۔ دوسری طرف ان کا مقصد عوام و حکومت کے درمیان بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیشہ عوام کو بدلے ہوئے حالات اور درپیش مسائل سے آگاہ کرنا بھی ہوتا ہے۔ برصغیر میں ۱۸۵۸ء کا ملکہ وکٹوریہ کا رعایا پروری اور تحفظ مذہبی اقدار وغیرہ کا اعلان کافی اہمیت کا حامل ہے۔ پھر ۳ جون ۱۹۴۷ء کا اعلان تقسیم ہند بھی نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔

یہ اعلانات اس لئے بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں کہ یہ مورخ کو حکومت کے نقطہ نظر' عوام کے تاثرات' ان کے ردعمل' ماضی کے حقائق اور مستقبل کی پالیسیوں سے آگاہ کرتے ہیں۔

مورخ کو اعلانات کا مطالعہ کرتے وقت بعض امور کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے کیونکہ حکومتیں جو اعلان جاری کرتی ہیں وہ مخصوص حالات کے تحت کئے گئے ہوتے ہیں۔ ان کے پس منظر میں کچھ امور ہوتا ہے۔ اعلان کے الفاظ کچھ اور قسم کے ہوتے ہیں' اور حکومت کا اعلان سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقصد کچھ اور ہوتا ہے۔ اصل نوعیت کا اس وقت پتہ چلتا ہے کہ جب اعلانات پر عمل درآمد ہوتا ہے۔

غرضیکہ اعلانات مورخ کو وسیع معلومات بہم پہنچاتے ہیں جن سے اسے خاص اعلانات کا پس منظر معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اعلان میں کیا کچھ کہا گیا؟ اس پر کہاں تک عمل ہوا اور اس نے آنے والی تاریخ پر کیا اثرات مرتب کئے وغیرہ۔

ماضی کی تاریخ کو مرتب کرتے وقت اعلانات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر ان میں نقص یہ ہے کہ یہ تصویر کے ایک ہی رخ کو پیش کرتے ہیں اور مورخ ان پر کامل بھروسہ نہیں کر سکتا۔

غیر سرکاری دستاویزات Non - Official Documents

سرکاری دستاویزات کی طرح غیر سرکاری دستاویزات کو بھی ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(ا) رسمی غیر سرکاری دستاویزات (Formal Non - Official Documents)

(۲) غیر رسمی غیر سرکاری دستاویزات (Informal Non - Official Documents)

(ا) اول الذکر رسمی غیر سرکاری دستاویزات وہ ہوتی ہیں جو افراد غیر سرکاری حیثیت یعنی ذاتی حیثیت میں ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔ اس ضمن میں وصیت نامے' اقرار نامے اور حساب کی کتابیں وغیرہ آتی ہیں۔ ان دستاویزات کا موخرالذکر دستاویزات سے نمایاں طور پر امتیاز ہو سکتا ہے۔ اول یہ کہ ان رسمی غیر سرکاری دستاویزات کا تعلق غیر اہم قسم کے واقعات سے ہوتا ہے اور یہ لازمی طور پر پرائیویٹ' غیر سرکاری چارٹر ہوتے ہیں۔ یہ دستاویزات مورخین کو اہم اور مفید معلومات سے بہرہ ور کرتی ہیں۔ ان میں مندرجہ ذیل امور نظر آتے ہیں۔

(ا) تاریخ کا صحیح تعین ہوتا ہے۔

(۲) صحیح مقام کا ذکر ہوتا ہے۔

(۳) انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے واقعات کا ذکر ہوتا ہے۔

رسمی غیر سرکاری دستاویزات میں ایک نقص یہ ہوتا ہے کہ یہ پرائیویٹ طور پر انفرادی لحاظ سے مالی امور سے سروکار رکھتی ہیں اور اس قسم کی دستاویزات میں جعلسازی کا امکان ہوتا ہے اور بعض اوقات جعلسازی کا معلوم کرنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔

ا- وصیت نامہ Will

جب کوئی فرد سفر کو جاتے وقت یا زندگی کے آخری لمحوں میں تحریری طور پر اپنے بعد کچھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنے یا کچھ نہ کرنے کی ہدایت کرتا ہے تو اس کا وہ ہدایت نامہ وصیت نامہ کہلاتا ہے جو قانوناً واجب پابندی ہے۔

غیر سرکاری رسمی دستاویزات میں وصیت نامہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مروجہ رسمی زبان میں تحریر کیا جاتا ہے۔ اسے پرائیویٹ افراد یا سرکاری افراد اپنی ذاتی حیثیت میں تحریر کرتے ہیں۔ ان دستاویزات سے ہم مندرجہ ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں۔

(۱) تاریخ اور مقام کا تعین ہوتا ہے' جس سے ہمیں واقعات کو ترتیب وار سلسلہ (Chronology) کے ساتھ مرتب کرنے میں مدد ملتی ہے۔

(۲) وصیت کنندہ کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ اگر اس نے اپنی جائیداد کسی فلاحی ادارے یا کسی عزیز کے نام مرقوم کی ہے تو اس سے اس کے معاشرتی' سماجی اور اخلاقی پہلو ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔

(۳) وصیت کنندہ کی مالی حالت کا پتہ چلتا ہے۔

(۴) وہ فرد جو وصیت نامہ لکھتے وقت موجود ہو وہ وصیت کنندہ کی مخفی باتوں سے آگاہ کرتا ہے جس سے اس کے سیاسی اور سماجی رجحانات پر روشنی پڑتی ہے۔

(۵) وصیت کنندہ نے اپنے عزیز و اقارب میں اپنی جائیداد جس تناسب سے تقسیم کی ہو گی اس سے اس کی اقربا نوازی' صلہ رحمی اور سلسلہ نسب کا پتہ چلتا ہے۔

(۶) وصیت کنندہ کے آخری ایام کس حال میں گزرے اور ان دنوں اس کے خیالات میں کوئی تغیر رونما ہوا یا کہ نہیں۔

مورخ وصیت نامہ کا مطالعہ کرنے کے بعد وصیت کنندہ کے متعلق کوئی رائے اور نظریہ قائم کرتا ہے جو تاریخ کے لیے خام مال کی حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً اکتوبر ۱۶۰۵ء جب اکبر اعظم بستر مرگ پر دراز تھا تو راجہ مان سنگھ اور دوسرے آزاد خیال مسلمانوں کا خیال تھا کہ وہ اپنے پوتے خسرو کو اپنا جانشین مقرر کرے گا مگر ۲۴ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو اس نے اپنے بیٹے سلیم کو اپنا جانشین مقرر کیا[16]۔ اور سلیم کی جانشینی کے بارے میں وصیت کی۔ جہانگیر بھی وصیت کے وقت موجود تھا۔ بعد میں جب لوگوں نے اکبر کے مذہبی عقائد کے متعلق اعتراضات و سوالات کیے تو اس نے جواب دیا کہ "میرے باپ نے مرتے وقت سورۃ یٰسین پڑھوا کر سنی' کلمہ شہادت دہرایا اور بطور مسلمان مرا[17]۔ اور وصیت کے موقعہ پر موجود عیسائی پادری بھی اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ اکبر دینِ محمدی پر رہے[18]

غرض

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رائے قائم کر کے تاریخ کے لیے خام مواد مہیا کرتا ہے جس سے حقائق پر مبنی تاریخ رقم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

۲۔ اقرار نامہ (Bond)

اقرار نامہ سے مراد وہ دستاویز ہے جس میں عہد و پیمان، قول و قرار اور کسی بات کا وعدہ لکھا ہو۔ یہ لوگوں کے قرض لیتے یا دیتے وقت عموماً مالی امور پر سودے بازی ہوتی ہے جسے قانونی حدود کے اندر تحریر کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہم **شکسپیئر** کے حالات زندگی کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ ان اقرار ناموں کا مطالعہ نہ کریں جو اس نے قرض لیتے وقت لکھ کر دیئے تھے۔ **شکسپیئر** کی زندگی کا وہ اہم موڑ جب وہ عالم مجبوری میں بھیڑیں چراتا ہے اور خوش قسمتی سے وینس کے ایک سوداگر سے اس کی ملاقات ہو جاتی ہے جو اسے ایک یہودی ساہوکار کا پتہ بتاتا ہے جو ضرورت مند افراد کو قرض دیتا ہے۔ **شکسپیئر** اس یہودی کے پاس جا کر اقرار نامہ پر شرائط طے کر کے قرض حاصل کرتا ہے۔ یہودیوں کی تاریخ تو قریباً اس قسم کے اقرار ناموں سے بھری پڑی ہے۔

اقرار نامہ لکھتے وقت کچھ شرائط ساہوکار قرض خواہ پر عائد کرتا ہے مثال کے طور پر وہ مقروض کو ایک خاص مدت کی رعایت دیتا ہے۔ عوضانہ میں کچھ منفعت مانگتا ہے۔ عدم ادائیگی کی صورت میں وہ مقروض کے خلاف کارروائی کا مرتکب ہو سکتا ہے وغیرہ۔

اقرار نامے مورخ کے نزدیک کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ جدید دور میں حکومتیں دوسری حکومتوں سے مالی امور پر لین دین کرتے وقت بعض شرائط کی پابند بنا دی جاتی ہیں جو اقرار نامے کے ہی ضمن میں آتا ہے۔ اقرار ناموں سے قرض دہندہ اور مقروض دونوں کے مالی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ قرض لینے کی وجوہات، عوضانہ کی نوعیت اور لین دین کے طریقہ کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً ہندو ساہوکار بالعموم چند روپے قرض دیتے وقت مسلمانوں سے اقرار ناموں پر سینکڑوں روپے درج کروا لیتے تھے۔ پھر مقررہ مدت میں عدم ادائیگی کی صورت میں ان کے مکانات اور زمین رہن رکھ لیتے تھے کیونکہ مسلمان اقرار ناموں کی وجہ سے مجبور ہوتے تھے۔ اقرار ناموں کے مطالعہ سے برصغیر کے مسلمانوں کی مالی زبوں حالی اور ہندوؤں کی معاشی خوشحالی کا پتہ چلتا ہے۔ مورخ ان دستاویزات سے کسی صورت بھی روگردانی نہیں کرسکتا۔

(۳) بہی کھاتے Accounts

بہی کھاتے وہ رجسٹر اور روزنامچے ہیں جن پر حساب اور حسابات سے متعلق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یادداشتیں لکھتے ہیں۔ ہند سے ادوار گذشتہ کی تاریخ کو بیان کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے لیکن اس کے باوجود یہ وہ قابل قدر مواد مہیا کرتے ہیں جو ماضی کی تاریخ مرتب کرتے وقت نہایت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان بہی کھاتوں میں مقررہ وقت کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ، نفع و نقصان وغیرہ کا اندراج ہوتا ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حساب و کتاب کی کتابیں بعض مسائل کے متعلق مورخ کو قابل قدر معلومات سے نوازتی ہیں۔ ان کے مطالعہ کے بغیر ہم کمپنی کے حالات کے متعلق مکمل طور پر آگاہ نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ کمپنی کی یہ حساب کی کتابیں تجارتی قسم کی تھیں۔ اس سے کمپنی کی خوشحالی، اس کی سیاسی حیثیت جس کے تحت اس نے تجارت شروع کی اور چارٹر حاصل کیے اور حصہ داران کمپنی کی معاشی حالت جن کے تجارتی، اغراض و مقاصد اور تجارت میں دلچسپی کی بنا پر وجود میں آئی کا پتہ چلتا ہے۔ کمپنی کے بہی کھاتوں سے کمپنی کی حکومت کے بارے میں کافی اہم اور مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

ہندسوں کی زبان کا ادراک کوئی آسان امر نہیں ہے۔ مورخ کو ان کا مطالعہ بہت ہی محتاط انداز میں کرنا چاہیئے کیونکہ کہیں پر بھٹک جانے کا امکان ہوتا ہے۔ بسا اوقات ہند سے ماضی کی تاریخ کی تصویر کشی کرتے وقت مکمل عکس نہیں دیتے۔ اگر ان غلطیوں اور خامیوں کو تلاش کیا جائے تو پھر مالی ابلاغ کے ریکارڈ کی بہترین تصویر سامنے آ جاتی ہے اور تب بمشکل ہی کسی قسم کا اختلاف نظر آئے گا۔ حقائق کی یہ درستگی تاریخی مواد کے لیے کافی قدر و اہمیت رکھتی ہے۔

غیر رسمی غیر سرکاری دستاویزات

Informal Non-official Documents

غیر رسمی غیر سرکاری قسم کا مواد بہتات سے مل جاتا ہے اور مورخ ماضی کی تاریخ کو لکھتے وقت اس کا فراخدلانہ استعمال کرتا ہے۔ یہ مواد ڈھیروں کی صورت میں میسر ہے اور سرکاری دستاویزات سے قدرے مختلف حیثیت رکھتا ہے۔ غیر رسمی غیر سرکاری دستاویزات کی مورخ کو ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب وہ کسی کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہے۔ اس ضمن میں روزنامچے، سوانح حیات، سفرنامے، ڈائریاں، **یادداشتیں** اور خطوط وغیرہ آتے ہیں۔

درحقیقت یہ دستاویزات افراد نے ذاتی حیثیت سے بغیر کسی اصول و ضوابط کے تحریر کی ہوتی ہیں۔ ان کا مطالعہ مورخ کو زندگی کے سفر کی بعض صعوبتوں اور تجربات سے روشناس کراتا ہے۔

[illegible] انہیں سمجھنے [illegible]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱- روزنامچے Chronicles

روز مرہ کے واقعات اور حساب لکھنے کی کتاب ڈائری اور ریکارڈ کو روزنامچہ کہتے ہیں۔ روزنامچے واقعات کو ان کے وقوع پذیر ہونے کی نسبت سے بیان کرتے ہیں۔ بعض افراد کو روزمرہ کے پیش آنے والے واقعات کو تحریر کرنے کا بھی شوق ہوتا ہے۔ ان کا یہی ذوق مورخ کے لیے مفید معلومات کا باعث بنتا ہے۔ لیکن بعض وجوہات کی بنا پر ہم روزنامچوں کو تاریخ کے مساوی حیثیت نہیں دیتے کیونکہ :

(۱) روزنامچے صرف معلوماتی ڈھانچے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۲) ان کا مقصد تحقیقاتی نہیں بلکہ معلوماتی ہوتا ہے۔

(۳) یہ ثانوی معلوماتی درجہ (Secondary information) رکھتے ہیں۔

(۴) یہ واقعات کی علل و معلول کو بیان نہیں کرتے اگرچہ یہ بغیر کسی موضوع کے سالانہ رپورٹ کی صورت میں ہوتے ہیں۔

(۵) یہ کھوکھلی قسم کی معلومات ہوتی ہیں۔

(۶) یہ زیادہ طور پر واقعات کی صرف ظاہری شکل و صورت سے ہی بحث کرتی ہیں اور جداگانہ قسم کا مواد ہوتا ہے۔

(۷) یہ نیم معلوماتی قسم کے واقعات ہوتے ہیں۔

روزنامچوں کو اگر ہم تاریخ کی بجائے تاریخی معلوماتی ڈھانچہ کہیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔ زمانہ قدیم و جدید میں ہمیں ایسے بے شمار افراد نظر آتے ہیں جو روزمرہ کے واقعات باقاعدگی سے تحریر کرتے رہے ہیں۔ قدیم زمانے کے حکمران تو ایسے لوگوں کو اپنے درباروں میں ملازم رکھتے تھے جو روز کی ڈائری لکھتے۔ مثلاً سکندر اعظم کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے واقعات کی تفصیلات جو ہمیں اس کے وقائع نویسوں کی تحریروں سے ملتی ہیں ہندوستانی مورخین کی کتابوں میں ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ یونانی روزنامچہ نویسوں کی تحریروں سے ہندوستانی تاریخ کے واقعات صاف اور واضح نظر آتے ہیں۔ بعض شہنشاہوں کو خود بھی روزنامچے لکھنے کا شوق رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ایران کے مظفر الدین شاہ قاچار (۱۸۹۶ - ۱۹۰۶ء) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مغل تاجدار اپنے درباروں اور مختلف علاقوں میں واقعات کو قلمبند کرنے کے لیے وقائع نویس مقرر کرتے تھے۔

تاہم روزنامچہ نویس مستقبل کے مورخ کے لیے ٹھوس خام مواد مہیا کرتے ہیں جنہیں ہم مکمل طور پر تاریخ نہیں بلکہ تاریخی ڈھانچہ کہہ سکتے ہیں۔ بعض روزنامچوں میں عوامی واقعات و مسائل کا بہت کم ذکر ہوتا ہے۔ زیادہ حالات و واقعات مصنف کی زندگی کے متعلق ہوتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روزنامچہ نویس واقعات کو پرکھے بغیر جیسے نظر آتے ہیں ویسے ہی انہیں تحریر کردیتا ہے۔ وہ واقعات کی اندرونی روح کو نہیں دیکھتا بلکہ سطحی لحاظ سے ہی انہیں رقم کردیتا ہے اور تحقیق و تنقیدی جائزہ کا کام مورخ کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ تاہم روزنامچے مورخ کے نزدیک کافی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کیونکہ یہ واقعات کا خاکہ پیش کردیتے ہیں۔

۲۔ سیاحت نامے Travellers Accounts

مورخ کو تاریخ نویسی کے لیے بعض اوقات معاصرانہ ماخذوں کی عدم موجودگی کی بنا پر سیاحوں کی تحریروں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ سیاحوں کی تحریریں کسی ملک یا علاقہ کے متعلق جو معلومات بہم پہنچاتی ہیں بہت کارآمد ہوتی ہیں۔

ابن بطوطہ اور مارکو پولو کے سفرنامے عہد وسطیٰ کے ہندوستان، مشرقی یورپ اور چین کے متعلق معلومات کا گرانقدر خزانہ ہیں۔ ان کے اقتباسات سے کافی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

قدیم ہندوستان میں موریہ خاندان کے حالات و واقعات سیلوکس کے سفیر **میگستھینز** نے جو چندر گپت موریہ کے دربار میں سفیر تھا (۳۰۲ - ۲۹۸ ق م) اپنے سفرنامہ "انڈیکا" میں تحریر کئے ہیں۔ وہ کسی اور تاریخی ماخذ سے حاصل نہیں ہوتے۔ بدقسمتی سے یہ کتاب اپنی اصل صورت میں ہم تک نہیں پہنچ سکی مگر اس کے باوجود اس سے چندر گپت موریہ کے عہد حکومت پر گرانقدر روشنی پڑتی ہے۔

چینی سیاح فاہیان کا سفرنامہ (وہ ۴۰۵ء - ۴۱۱ء تک ہندوستان میں رہا) قدیم تاریخ ہندوستان بالخصوص گپت عہد کا ایک اور بہت بڑا ماخذ ہے۔ فاہیان نے وکرمادتیہ دور کے معاشی و معاشرتی حالات اور تہذیب و تمدن پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کا سفرنامہ مختلف قسم کی معلومات سے اٹا پڑا ہے۔ ہرش وردھن کے عہد کے حالات و واقعات کا سب سے زیادہ مستند ماخذ ایک اور چینی سیاح ہیون سانگ کا سفرنامہ ہے (وہ ۶۲۹ء - ۶۴۵ء تک ہندوستان میں رہا)۔ اسے بدھ مت سے بے حد لگاؤ تھا اور وہ بدھ کے مقدس ملک کو دیکھنا چاہتا تھا لہٰذا اس کا ہندوستان کا سفر اور شوق سیاحت انہی مذہبی عقائد کا نتیجہ تھا۔

سر تامس رو ۱۶۱۵ء میں شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں مغل دربار کی شان و شوکت، ملک کی اہم شخصیتوں، تہواروں، کسانوں، شاہراؤں اور مقامی نظم و نسق کے متعلق تحریر کیا ہے۔ تاریخ کے لئے یہ بہت مفید معلومات ہیں۔ کیپٹن ڈبلیو ہاکنز ۱۶۰۸ء میں جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوا۔ وہ دربار کے مختلف حالات، درباری رسم و رواج، عوام کے حالات اور ملک کے مقامی معاملات کے متعلق کافی اہم معلومات تحریر کرتا ہے۔ غرضیکہ سیاحوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی تحریروں پر ہم ملکی وقائع نویسوں سے زیادہ اعتماد کر سکتے ہیں کیونکہ ان کے پیش نظر کوئی مصلحت، کسی کی خوشامد اور نہ ہی کسی قسم کا دباؤ ہوتا ہے جس بنا پر وہ واقعات کو صحیح طور پر قلمبند کرتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیاح کسی خاص واقعہ کے وقوع پذیر ہو جانے کے بعد وارد ہوتا ہے تو وہ اس واقعہ کو قلمبند کرنے کے لیے سنی سنائی باتوں پر بھروسہ کر کے احاطہ ء تحریر میں لاتا ہے جس سے واقعہ کی اصل شکل چھپ جاتی ہے۔ یہاں پر مورخ کو تنقیدی جائزہ لینا پڑتا ہے تاکہ وہ رونما ہونے والے واقعات کی صحیح صورت کو واضح کر سکے۔ سفرناموں کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہوتی ہیں۔

(ا) یہ غیر جانبدارانہ نقطہ ء نظر پیش کرتے ہیں۔

(۲) تمام معلومات ذاتی مشاہدے سے حاصل کی گئی ہوتی ہیں۔

(۳) یہ بغیر کسی مصلحت، لالچ اور خوشامد کے لکھے جاتے ہیں۔

ان میں چند خامیاں بھی ہوتی ہیں۔

(ا) یہ واقعات کے حادثاتی پہلوؤں کو زیادہ اجاگر کرتے ہیں اور ملک کے حالات کی نامکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔

(۲) سفرنامے عموماً" مشاہدات کے کافی عرصہ بعد لکھے جاتے ہیں۔ اس لئے مصنف یا تو کچھ چیزیں بھول جاتا ہے یا وہ نامکمل رہ جاتی ہیں۔

(۳) بعض واقعات غلط جگہوں اور مختلف ہستیوں سے غلط طور پر منسوب کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ابن بطوطہ نے سلطان محمد تغلق کے پایہء تخت کی تبدیلی کے بارے میں اور رضیہ سلطانہ اور اس کے حبشی غلام جلال الدین یاقوت کے عشق کا افسانہ محض سنی سنائی باتوں کی بنا پر غیر محققانہ طور پر لکھے ہیں۔

(۴) سفرناموں میں غیر ضروری واقعات کی بھتات ہوتی ہے۔

سیاحوں کے سفرناموں سے متعلق بحث کے خاتمہ پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی تاریخی حیثیت و اہمیت سے کسی طور پر بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں ان میں خوبیاں ہیں وہاں خامیاں بھی موجود ہیں، ان میں تاریخی حقائق قصے کہانیاں اور حکائتیں درج ہوتی ہیں۔ یہاں مورخ پر اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان سفرناموں کو تاریخی ماخذ کے طور پر استعمال کرتے وقت محض تنقیدی نقطہ ء نظر سے کام لے اور اسی بات کو شامل تاریخ کرے جو تاریخی تحقیق و تنقید کی میزان پر پوری اترے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳- خود نوشت سوانح عمریاں Autobiographies

اس قسم کی دستاویز مصنف کی زندگی کے حالات و واقعات' خیالات و نظریات اور تجربات پر مشتمل ہوتی ہے جو اس نے خود تحریر کی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں عموماً" عظیم شخصیات آتی ہیں جو اپنے وقت میں نہایت اہم مقام پر فائز رہی ہوتی ہیں۔ ہم انہیں بوڑھے آدمی کی فرصت کے اوقات کی پیداوار بھی کہہ سکتے ہیں اور یہ مختلف مقاصد کے پیش نظر لکھی جاتی ہیں۔

ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی فرد کسی دوسرے فرد کے حالات زندگی کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے تو فریق ثانی نقاد کے سوالات کے جواب میں اپنے حالات کو قلمبند کرتا ہے۔

بعض اوقات کسی فرد کے ذہن میں چند مفید باتیں اور تجربات محفوظ ہوتے ہیں ' وہ تصور کرتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ مستقبل کا مورخ ان کا کہیں ذکر نہ کرے لہٰذا میں خود ہی انہیں احاطۂ تحریر میں کیوں نہ لاؤں تاکہ دوسرے بھی اس سے فائدہ اٹھائیں۔ جہاں تک خود نوشت سوانح عمریوں کے مواد کا تعلق ہے ان کی صداقت کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کیونکہ اس میں مصنف نے اپنی خواہشات' نظریات اور خیالات کے مطابق واقعات قلمبند کئے ہوتے ہیں اور ان میں اس کی شخصیت کے رنگ کی آمیزش نظر آئے گی۔ لہٰذا صحیح چیز قدرے مشکل سے دکھائی دے گی۔ مگر اس وقت کے معاشی' معاشرتی اور سیاسی حالات کا عکس نظر آئے گا۔ خود نوشت سوانح عمریاں کسی شخصیت کی وہ تصویر ہوتی ہیں جو دوسرے وقائع نگار پیش نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یہ ان کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں۔

برصغیر کی تاریخ میں خاندان مغلیہ کے بانی ظہیر الدین بابر کی خودنوشت "تزک بابری" اپنی مثال آپ ہے۔ سادگیء تحریر کے اعتبار سے یہ ایک یگانہء روز گار تصنیف ہے۔ یہی وہ تصنیف ہے جس کی بنا پر بابر ایک عظیم مصنف قرار دیا گیا۔ بابر نے یہ تصنیف ترکی زبان میں تحریر کی تھی۔ بعد میں اس کے پوتے شہنشاہ اکبر کے ایک رفیق عبدالرحیم خان خانان' جو بیرم خان کا بیٹا تھا نے ترکی سے فارسی میں منتقل کیا۔ اور دنیا کو پہلی بار معلوم ہوا کہ عظیم تاجدار بابر اقلیم سخن کا بھی شہنشاہ تھا۔

گو بابر نے اپنی اس تزک میں اپنے دور کے مصنفین کی طرح خوبصورت الفاظ اور پرشکوہ کلمات کے محلات استوار نہیں کئے۔ رنگا رنگ لفظی بیل بوٹوں سے اپنی کشت تصنیف کو نہیں سجایا۔ لیکن جس سادہ اور آسان اسلوب میں اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کیا' اس نے اسے اپنے وقت کے تمام مصنفین پر سبقت بخش دی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ظہیر الدین بابر نے تزک تصنیف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صدی کے یورپی مصنفین نے اپنا کر حیات جاوداں حاصل کی اور پھر اس کے پوتے نور الدین جہانگیر نے بھی اس راہ پر چل کر اپنی خود نوشت "تزک جہانگیری" تحریر کی۔ یہ دونوں خودنوشت سوانح عمریاں معلومات کے بیش بہا خزانے ہیں۔

جدید دور میں امریکہ کے صدر آئزن ہاور کی "At Ease"، سابق صدر ایوب خان کی "Friends Not Master"، فیروز خان نون کی "From Memory"، جواہر لال نہرو کی "میری کہانی" خود نوشت سوانح عمریوں کی چند مثالیں ہیں۔ ان مصنفین نے اپنی سوانح عمریوں میں ذاتی حالات کے علاوہ ملک کی معروف شخصیتوں، ان کے کارناموں اور ملک کے معاشی و سیاسی حالات وغیرہ کی بھی تفصیلات بیان کی ہیں۔ خود نوشت سوانح عمریوں میں مورخ کو کافی مواد مہیا ہو جاتا ہے لیکن انہیں ہم مکمل تاریخ کا نام نہیں دے سکتے۔ مورخ کا فرض ہے کہ وہ ان خود نوشت سوانح عمریوں سے کار آمد مواد کو باقاعدہ تحقیقی و تنقیدی کسوٹی پر پرکھ کر جزو تاریخ بنائے۔

اپنے حالات زندگی خود تحریر کرنا انتہائی کٹھن کام ہے کیونکہ اپنی غلطیوں اور خامیوں کا کھلم کھلا اعتراف کر لینا بہت مشکل ہوتا ہے۔

اس تمام بحث کے بعد خود نوشت سوانح عمریوں کی اہمیت کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ:

(۱) یہ اس وقت کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔
(۲) اس شخصیت کے کردار، نظریات اور خیالات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔
(۳) مصنف کے کارناموں، غلطیوں اور خامیوں کا پتہ دیتی ہیں۔
(۴) ان سے معاشرے کے سیاسی نظام میں مصنف کے مقام کا پتہ چلتا ہے۔
(۵) وقوع پذیر ہونے والے واقعہ کے بارے میں مصنف کا اپنا کیا کردار تھا؟
(۶) مصنف کے دوستوں رشتہ داروں اور دیگر احباب سے تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔
مثلاً "تزک بابری" میں بابر اپنے رشتہ داروں کا ذکر کتنے خلوص و محبت سے کرتا ہے اور جب اس کا ایک دوست فوت ہو جاتا ہے تو وہ کئی روز تک اس کا سوگ مناتا ہے جب اس کا دوست خواجہ کلاں ہندوستان سے کابل واپس چلا جاتا ہے تو بابر لکھتا ہے کہ "مجھے یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ خواجہ کلاں واپس چلا گیا۔ ظالم کو ایسے وقت میں جبکہ میں یہاں تھا میرا ہی خیال کرنا چاہیے تھا"[19]۔ اس سے بابر کی دوستوں اور عزیزوں کے لیے انتہائی محبت ظاہر ہوتی ہے۔
(۷) ان میں واقعات کو غیر جانبدارانہ انداز میں نہیں لکھا جاتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۸) ان میں مصنف کی زندگی کے روشن پہلو نظر آتے ہیں مگر اس کے مخالفین کا ذکر بہت کم ہوتا ہے۔

(۹) مصنف بعض اوقات اپنے کارنامے کو بیان کرتے وقت مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے جس سے واقعات کا چہرہ مسخ ہو جاتا ہے۔

(۱۰) چونکہ سوانح عمریوں میں خود پسندی اور خود نمائی کے عناصر نمایاں ہوتے ہیں لہٰذا مورخ کیلئے احتیاط لازمی ہے۔

بعض اوقات کئی سوانح نگار ذاتی تعصب کی بنا پر اپنے ہی عہد کی بعض اہم شخصیات کا اپنی سوانح عمریوں میں معمولی سا ذکر بھی نہیں کرتے۔ ذاتی اختلافات اور تعصب تاریخ کے چہرے کو مسخ کر دیتا ہے۔ مورخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ واقعات کی صحیح روح کو سمجھنے کے لیے دیگر ہم عصر ماخذوں سے بھی صورت حال کا درست جائزہ لے۔ محض واقعات کی ظاہری صورت سے ہی متاثر نہ ہو بلکہ تصویر کے دوسرے رخ کا بھی جائزہ لے۔

۴ سوانح عمریاں Biographies

سوانح عمری وہ تصنیف ہوتی ہے جس میں کسی مشہور' اہم اور مقتدر شخصیت کے حالات زندگی کسی دوسرے فرد نے تحریر کئے ہوتے ہیں۔ لکھنے والا دوست اور دشمن دونوں ہو سکتے ہیں۔

سوانح عمری کا مصنف اگر ممدوح کا رشتہ دار' پروردہ یا زیر اثر ہو تو ظاہر ہے کہ وہ ایسی صورت میں ہیرو کے ساتھ جانبداری سے کام لے گا۔ اس کے روشن کارناموں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرے گا۔ اس کی غلطیوں اور خامیوں کو نظرانداز کر دے گا۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصنف کو ممدوح سے ذہنی اور روحانی عقیدت ہو اور وہ اپنے ہیرو کی خامیوں کو خوبیوں کے رنگ میں پیش کرے گا۔ لہٰذا ایسی سوانح عمریاں مورخ کے نزدیک ناقابل اعتماد ہوتی ہیں اور ان سے استفادہ کرنے سے پیشتران کی دیگر ماخذوں سے تصدیق کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم بلا جھجک علامی ابوالفضل کے "اکبر نامہ" کا نام لے سکتے ہیں۔

دوسری طرف اگر سوانح عمری کے مصنف کو ہیرو کے خیالات و نظریات سے اتفاق نہیں ہے یا وہ اس کے زیر عتاب ہے یا ہیرو نے اسے اس کی توقعات کے مطابق نہیں نوازا' تو یہاں پر مصنف تعصب کا شکار ہو کر حالات کو خلط ملط کر ڈالے گا۔ اس کی ہر خوبی کو برائی اور نیکی کو گناہ کے رنگ میں بیان کرے گا۔ یہاں پر مورخ کو مصنف اور ہیرو کے حالات کو تحقیق و تدقیق کی میزان پر پرکھنا ہو گا تاکہ وہ جھوٹ اور سچ' غلط اور صحیح میں امتیاز کر سکے۔ اس سلسلہ میں عبدالقادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" آتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مندرجہ بالا ہر دو اقسام کی سوانح عمریوں کے برعکس مورخ کو غیر جانبدار مصنف کی سوانح عمریوں سے زیادہ سروکار ہوتا ہے کیونکہ اسے کسی قسم کا دباؤ' لالچ یا عقیدت نہیں ہوتی- اس کا مقصد حقائق کو صحیح صورت میں پیش کرنا ہوتا ہے- وہ جہاں ہیرو کی خوبیاں گنواتا ہے وہاں اس کی خامیاں بھی نظرانداز نہیں کرتا اور تصویر کے ہر دو رخ پر روشنی ڈالتا ہے- تاریخی نقطہ نظر سے اس قسم کی سوانح عمریاں قابل اعتبار ہوتی ہیں اور ان پر زیادہ بھروسہ کیا جا سکتا ہے- اس ضمن میں مولانا الطاف حسین حالی کی "حیات جاوید" شبلی کی "حیات سعدی" اور گلبدن بیگم کے "ہمایوں نامہ" کا نام لیا جا سکتا ہے- مگر اس قسم کی محققانہ' غیرجانبدارانہ اور صحیح سوانح عمریوں کی تعداد قلیل ہے-

۵- خطوط (Letters)

زبان اظہار مطلب کا ذریعہ ہے- اس کے دو طریقے ہیں- (ا) تقریر (۲) تحریر- جب مخاطب حاضر یا موجود ہو تو تقریر یعنی گفتگو سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا جاتا ہے یا دریافت طلب باتیں دریافت کر لی جاتی ہیں- لیکن جب مخاطب موجود نہ ہو تو وہی باتیں کاغذ پر لکھ کر مطلب براری کی جاتی ہے- اس طریقہ کو خط و کتابت اور جس کاغذ پر لکھا جائے اسے خط' چھٹی' رقعہ اور درخواست کہتے ہیں- خطوط نویسی کو ایک فن کا درجہ دیا گیا ہے- خطوط عموماً" تین قسم کے ہوتے ہیں-

(ا) ذاتی یا نجی خطوط (۲) کاروباری خطوط- (۳) سرکاری خطوط-

(ا) ذاتی یا نجی خطوط : یہ خطوط عزیزوں' رشتہ داروں' دوستوں' استادوں اور اجنبیوں کو لکھے جاتے ہیں- ان خطوط میں ذاتی حالات و واقعات اور باہمی خیر و عافیت کی باتیں لکھی جاتی ہیں-

(۲) کاروباری خطوط : یہ وہ خطوط ہوتے ہیں جو کاروبار کے سلسلے میں لکھے جاتے ہیں- مثلاً ایک گاہک دوکاندار کو یا دوکاندار گاہک کو لکھتا ہے- ایک کارخانہ دار دوسرے کارخانہ دار' گاہک اور اپنے ایجنٹ یا کسی دوسری فرم کو لکھتا ہے- ان خطوط میں بے تکلف باتیں نہیں ہوتیں صرف کاروبار کے متعلق ضروری باتیں ہوتی ہیں-

(۳) سرکاری خطوط :- یہ وہ خطوط ہوتے ہیں جو حکام ایک دوسرے کو لکھتے ہیں یا عوام حکام کو لکھتے ہیں یا افسران غیر سرکاری حضرات کو لکھتے ہیں- مورخ کا زیادہ تر اسی قسم کے خطوط سے سروکار ہوتا ہے-

خطوط سرکاری ہوں یا غیر سرکاری وہ کسی عہد کے واقعات کا بہترین مرقع ہوتے ہیں- وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے عہد کے واقعات کی بہترین تصویر پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ سوانح عمریوں کی طرح زیادہ دلچسپ نہیں ہوتے۔ یہ انفرادی تاثرات اور جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔

مورخین نے اپنی سہولت کے لیے خطوط کو تین اقسام میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) وہ خطوط جو مرحوم اپنی زندگی میں شائع کرتا ہے۔ یہ خطوط قیمتی تو ہو سکتے ہیں مگر مورخ کے نزدیک کوئی زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتے کیونکہ ان میں وہ اپنے کردار کو اپنی خواہش کے مطابق ظاہر کرے گا۔ وہ کبھی بھی ایسا خط نہیں شائع کرے گا کہ جس کی وجہ سے اس پر کوئی الزام عائد ہو یا دوسروں کا اس پر عتاب نازل ہو اور نہ ہی وہ اپنے کردار کی خامیوں کو ظاہر کرے گا۔ وہ صرف انہی واقعات کا ذکر کرے گا جنہیں وہ خود اہم سمجھتا ہے۔ بعض اوقات وہ ان افراد کے متعلق غلط نظریہ اپناتا ہے جو حقیقت میں نیک' صالح اور ایماندار ہوتے ہیں مگر وہ انہیں ذلیل' بدمعاش اور بدکردار کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ وہ ایسے خطوط کبھی شائع نہیں کرے گا جن میں موجودہ زندہ افراد نے اس پر تنقید کی ہو۔

(۲) دوسری قسم کے وہ خطوط ہوتے ہیں جو مصنف کے کسی رشتہ دار یا دوست نے شائع کیے ہوں۔ ان خطوط میں بھی پہلی قسم کے خطوط کی سی خامیاں اور نقائص ہیں کیونکہ رشتہ دار اور دوست ہمیشہ مصنف سے انس کی وجہ سے اس کے کردار کے روشن پہلوؤں کو برسرعام لانے کی کوشش کریں گے اور وہ کبھی بھی اس کے کردار کو داغدار کرنے والے خطوط کو شائع نہیں کریں گے۔ اس کی کمزوریوں اور غلط نظریات کی تشہیر نہیں کریں گے۔ مورخ کے نزدیک دوسری قسم کے خطوط بھی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔

(۳) تیسری قسم کے وہ خطوط ہوتے ہیں جنہیں کسی غیر جانبدار پبلشر نے ماضی کے واقعات کو محفوظ رکھنے کے لیے شائع کروایا ہو اور یہ خطوط صورت حال کو صحیح طور پر واضح کرتے ہیں۔ مورخ کے نزدیک یہی خطوط قابل اعتبار اور اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ناشر کو مصنف کے ساتھ کسی قسم کا لالچ 'انس' رشتہ داری یا دوستی نہیں ہوتی۔ وہ اچھے اور برے پہلوؤں کو منظرعام پر لاتا ہے اور صحیح حقائق پیش کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں خطوط غالب' مکتوبات امام ربانی' آداب عالم گیری' رمزو اشارہ ہائے عالمگیری اور رقعات عالمگیری کا نام آتا ہے۔ غرضیکہ ان خطوط سے اس عہد کے سیاسی حالات سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور یہ حقائق پر مبنی تاریخ لکھنے میں بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶- ڈائریاں Diarys.

بعض افراد کو روزمرہ کے پیش آمدہ واقعات، کسی اہم شخصیت کی گفتگو اور مخصوص مسائل کو احاطہ تحریر میں لانے کا شوق ہوتا ہے۔ جنہیں وہ ڈائری کی صورت میں رقم کرتے ہیں۔ اوز ان کا یہی ذوق و شوق مستقبل کے مورخ کے لئے کافی مفید ثابت ہوتا ہے۔ یہاں پر ڈائری اور خود نوشت سوانح حیات میں کسی حد تک مماثلت نظر آتی ہے۔ یہ ڈائریاں عظیم شخصیات کی نفسیات کو جاننے کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں اور تاریخ لکھنے کے لئے صاف ستھرا مواد مہیا کرتی ہیں۔

ان ڈائریوں سے ہم مصنف کے ذاتی کردار، حالات، اور خیالات و نظریات کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً نپولین کی ڈائری، اس کے کردار اور جذبہ حب الوطنی کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔

۷- یادداشتیں Memoirs.

یادداشتیں بھی ڈائریوں کے اصول پر تحریر کی جاتی ہیں۔ دراصل یہ ایسی دستاویزات ہوتی ہیں جنہیں سرکاری یا غیر سرکاری افراد فرصت کے اوقات میں ورطہء تحریر میں لاتے ہیں۔ ان میں عموماً افراد اپنی زندگی کے تجربات کو بیان کرتے ہیں اور آئندہ نسلوں کے لئے رموز و نصائح لکھتے ہیں تاکہ انہیں یاد رکھا جائے اور فراموش نہ کیا جائے۔ چونکہ یادداشتوں میں یادداشت لکھنے والوں کا کردار اور شخصیت زیادہ نمایاں ہوتی ہے اس لئے مورخ کے نزدیک یہ کافی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔

باب کے اختتام پر میں یہ کہوں گا کہ تمام ماخذ جن کا میں نے سرکاری یا غیر سرکاری دستاویزات کے طور پر ذکر کیا ہے بذات خود تاریخ نہیں ہیں بلکہ تاریخ نویسی کے لیے خام مال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مورخ کا فرض ہے کہ وہ ان ماخذوں سے استفادہ کرتے وقت تاریخ و سنین، مصنف کے معاشی، معاشرتی اور اخلاقی پہلوؤں کا جائزہ محققانہ طور پر لے اور تنقید و تحقیق کے طریقوں سے واقعات کو پرکھ کر اس خام مال سے صحیح تاریخ مرتب کرے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سانواں باب

حوالہ جات

(۱) ابجد یا حروف تہجی جو عربی میں ۲۸، فارسی میں ۳۲ اور اردو میں ۳۵ ہیں۔

(۲) محمد اقبال بھٹہ ''آغاز فن تحریر و اسلامی خطاطی'' (ماہنامہ فرمان، لاہور) ص ۵۔۱۴

(۳) لانگ لائیس ص، ۴۱۔ ۱۹

(۴) کالنگ وڈ ص، ۵۔ ۱۱۴

(۵)لانگ لائیس ص، ۱۷

(۶) پنٹاگان دارالحکومت واشنگٹن میں امریکہ کا فوجی ہیڈ کوارٹر ہے۔

(۷) اٹیلا کے ہاتھوں سقوط روم، ہلاکو خان کے ہاتھوں سقوط بغداد و دمشق اور صلیبیوں کے ہاتھوں اسکندریہ وغیرہ کے کتب خانے تباہ و برباد ہوئے۔

(۸) پولی بئیس نے (۲۰۵۔ ۱۲۵ ق م) نے تاریخ کی چالیس (۴۰) جلدیں لکھی تھیں، اب صرف پانچ (۵) باقی رہ گئی ہیں۔ لوی (۵۹۔ ۱۷ ق م) نے تاریخ رومہ کی ایک سو بیالیس (۱۴۲) جلدیں مرتب کی تھیں ان میں سے ہمارے ہاتھ صرف پینتیس جلدیں آئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں نہ کوئی منطق ہے نہ کوئی مسلم نمونہ جو کچھ محفوظ رہ گیا، وہ محض قسمت اور اتفاق کی بات ہے۔

(۹) ای۔ ایچ۔ کار، ''وٹ از ہسٹری'' ص، ۱۰

(۱۰) ڈاکٹر محمد اسلم قریشی، ''اے سٹڈی آف ہسٹروگرافی'' ص، ۱۴

(۱۱) رالپسن، ''دی کیمرج ہسٹری آف انڈیا'' جلد اول، ص، ۴۲۵

(۱۲) اس ضمن میں جن چار مفکرین فارابی، ہابز، لاک اور روسو کا ذکر کیا ہے ان کی خوبی یہ ہے کہ ان مفکرین نے اپنے دور کے سیاسی حالات سے متاثر ہو کر بگڑے ہوئے حالات کو سدھارنے کے لیے تاریخ سے رہنمائی حاصل کی اور قدیم تاریخی معاہدوں کو اپنے نظریات کی صورت میں پیش کیا مثلاً ابو نصر فارابی مدینتہ الفاضلہ (Ideal state) کا ذکر کرتا ہے۔ روسو معاہدہ عمرانی ''فطری دور کے معاہدہ'' (Natural state) کا ذکر کرتا ہے۔ ہابز ''دور وحشت'' (State of Nature) کا ذکر کرتا ہے اور جان لاک ''قانون فطرت'' کے دور کے معاہدہ کا ذکر کرتا ہے لیکن یہ مفکرین نظریات کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے سیاسی نظریہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

(۱۳) آر۔ ایم۔ مکرجی ''چندر گپت موریہ اینڈ ہز ٹائمز'' ص، ۳۵

(۱۴) لینزاسکی، ''مڈل ایسٹ ان ورلڈ آفیرز'' ص، ۹۸

(۱۵) سید نور احمد ''مارشل لاء سے مارشل لاء تک'' ص، ۹۳

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱۶) ترپاٹھی، "رائز اینڈ فال آف دی مغل ایمپائر" (الہ آباد ۱۹۶۰) ص، ۲۸۳

(۱۷) ڈاکٹر شیخ اکرام "رودِ کوثر" (لاہور، ۱۹۶۸ء) ص، ۱۶۰

(۱۸) "تزکِ جہانگیری" (لاہور، ۱۹۶۷ء) ص، ۲۹

(۱۹) "تزکِ بابری" (لاہور، ۱۹۶۵) ص، ۲۰۸

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آٹھواں باب

تاریخ کے امدادی و ذیلی علوم

AUXILIARY AND ANCILLARY SCIENCES OF HISTORY

دستاویزات کے مطالعہ کے دوران مورخ کو اس مسئلہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ کیا یہ دستاویزات قابل اعتبار ہیں یا کہ نہیں؟ کیا یہ تحقیق و تنقید کے میزان پر پرکھی جا چکی ہیں کہ نہیں؟ اگر ایسا نہیں کیا گیا ہوتا تو پھر مورخ کو انہیں پرکھنے کے لیے خود طریقہ کار اپنانا پڑتا ہے۔ اس کے لیے اسے بعض دوسرے علوم سے مدد لینا پڑتی ہے تاکہ وہ دستاویزات کو تحقیق و تدقیق کی کسوٹی پر پرکھ سکے۔ جن علوم کی مدد سے وہ اپنی تحقیق مکمل کرتا ہے انہیں تاریخ کے امدادی علوم (Auxiliary discipline) کہتے ہیں۔ ان علوم کی تاریخ سے اپنی علیحدہ حیثیت ہوتی ہے۔ ہم انہیں شامل تاریخ اس لیے کرتے ہیں کہ ان کی مدد سے دستاویزات و حقائق کو تلاش کیا جا سکے اور ان کی اصل کو معلوم کیا جا سکے۔

تاریخ کے امدادی علوم کی اپنی جداگانہ حیثیت ہوتی ہے۔ وہ تاریخ کے تابع نہیں بلکہ تاریخ کے معاون و مددگار ہوتے ہیں مثلاً" ڈپلومیسی، سوشیالوجی، فلسفہ، ارضیات، معاشیات، سیاسیات، دینیات، لسانیات، کرونالوجی، پیلوگرافی، ایپی گرافی اور آثار قدیمہ وغیرہ۔

تاریخ کے ذیلی علوم (Ancillary Discipline) وہ ہوتے ہیں جن کی جداگانہ حیثیت نہیں ہوتی بلکہ وہ تاریخ کے مطیع و ماتحت (Subordinate) ہوتے ہیں۔ تاریخ مرتب کرنے میں یہ مضامین مورخ کے لیے کار آمد ثابت ہوتے ہیں اور تاریخ کی دستگیری (Assist) کرتے ہیں مثلاً" مسکوکات، موسمیات، بحری جغرافیہ، علم سیل، مصوری، خطاطی، میوزیالوجی وغیرہ۔

بعض علوم تاریخ کے لیے امدادی و ذیلی ہردو حیثیتوں سے کام آتے ہیں۔ ان علوم کی تاریخ سے علیحدہ حیثیت ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی ہوتی مثلاً" علم آثار قدیمہ، علم الانسان اور علم بین الاقوام وغیرہ۔

دستاویزات کی تلاش کے بعد سب سے نمایاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ تمام دستاویزات تحقیق و تنقید کی میزان سے گزر چکی ہیں یا ابھی تک تفتیش و تحقیق کے دائرہ کار میں ہیں یا کہ ابھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تک خام مواد کی حیثیت رکھتی ہیں؟ یہ سوالات کتابی علم کے محققین (Bibliographical Researchers) کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی تحقیق کا منطقی حصہ ہیں۔

جہاں تک سوال کے پہلے حصہ کا تعلق ہے وہ یہ کہ جب دستاویزات پہلے ہی تحقیقی دائرہ کار میں داخل ہو چکی ہوں تو ضروری ہے کہ ان کی صحت کی تصدیق تنقیدی طریقہ کار کے ذریعے کر لی جائے۔

سوال کے دوسرے حصہ کے مطابق جہاں پر دستاویزات خام مواد کی صورت میں موجود ہوں مثلاً" ڈائریاں، خطوط، یادداشتیں، وصیت نامے، اقرار نامے اور خود نوشت سوانح حیات وغیرہ تو وہاں مورخ اور محقق حقائق کی خود تفتیش و تحقیق کرے۔ سوال کی ان ہر دو صورتوں میں مثبت طور پر تاریخ کے امدادی اور ذیلی علوم سے مدد لینا پڑتی ہے تب کہیں اصل حقائق دستیاب ہوتے ہیں۔ اخذ حقائق کے سلسلہ میں امدادی علوم کے بغیر تحقیق کے دوران غلط دلائل اور منطق کی بنا پر غلط مطالب بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ یا اپنی کم علمی، کم فہمی اور ناواقفیت کی بنا پر بھی تو غلط مطالب اور غلط معانی اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ تاریخ دان کا پیشہ بھی ایک فنی پیشہ ہے۔ اس کے آلات فنی تخیلات (Technical notions) ہیں جن کی مدد سے وہ منتشر واقعات اور خام مواد سے حقائق منتخب کرتا ہے۔ ان فنی آلات و تخیلات کی عدم موجودگی میں قدرتی ذرائع و وسائل حقائق کو مثبت طور پر اخذ کرنے میں مدد نہیں کرتے۔ مورخ کا اولین فنی آلہ لسانیات (Philology) ہے۔ کسی دستاویز کو سمجھنے کے لیے اس کی زبان اور استعمال کے قانون کا علم ہونا ضروری ہے۔ تاریخ کے امدادی علوم میں علم السانیات بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

میبلے (Mably) کا کہنا ہے کہ دستاویزات کی تحقیق کے لیے جن امدادی علوم کی ضرورت ہے اس میں قانون فطرت، عوامی قانون، علم سیاست اور اخلاق (Law of nature, Public law, Political Science and Moral) کی ضرورت ہے۔[1]

ڈینو (Daunou) تاریخ کے امدادی و ذیلی مضامین کی تقسیم پیش کرتے ہوئے مورخ کے لیے ان علوم میں پیشہ وارانہ مہارت حاصل کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے مطابق مورخ کو ادبی تاریخ، فلسفیانہ تاریخ اور تاریخی ادب کے اعلیٰ نمونوں کا مطالعہ اور ان سے شناسائی ضرور حاصل کرنی چاہیے۔ وہ رزمیہ عہد کے ادب و شاعری پر بہت زور دیتا ہے۔[2]

مورخ کو جدید ادب اور ناول کا علم و مطالعہ بھی ہونا چاہیے کیونکہ ناول فنی مہارت کے ساتھ نسانوں اور واقعات کو ملانے، تفصیلات کو تقسیم کرنے، کہانی کے بیان کو مہارت کے ساتھ جاری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رکھنے اور تجسّس و تسلسل کے ساتھ قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول رکھنے میں تخلیقی روح کو پیش کرتا ہے۔ قدیم یونانی ادب و تاریخ میں ہیروڈوٹس، تھیوسی ڈائیڈز، پولی بئیس اور پلوٹارک کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ دور روما میں سیزر، لوی، اور ٹیسی ٹس کی مثالیں دی جا سکتی ہیں اور عہد جدید میں میکاولی، ہیوم، گبن اور بودین، مانٹیسکو، لاک، روسو، مبیلے اور والٹیئر وغیرہ کی تحقیقات کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اس کے علاوہ اور بھی بے شمار تاریخی اسٹائل پیش کئے جا سکتے ہیں مگر مورخ کے لیے درج بالا مورخین کے اسٹائل تاریخ نویسی کے اعلیٰ ترین نمونہ جات ہیں۔ تاریخ کے امدادی اور ذیلی علوم درج ذیل ہیں۔

(1) حکمت عملی	(2) جغرافیہ	(11) علم سیل
(3) ارضیات	(4) آثار قدیمہ	(12) علم الانساب
(5) میوزیالوجی	(6) مسکوکات	(13) شوشیالوجی
(7) مصوری	(8) خطاطی	(14) کرونالوجی
(9) کتبہ کاری	(10) علم قدیم طرز تحریر	

حکمت عملی
Diplomacy

ڈپلومیسی انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی "قوموں اور ریاستوں کے درمیان گفت و شنید کرنے کا فن اور مشق ہے" یا "ایسا ہنر جس کے ذریعے اختلافات و مسائل کو گفت و شنید کے ذریعے بغیر عداوت و جارحیت کے حل کیا جائے" اردو میں اس کا عمومی ترجمہ حکمت عملی کیا جاتا ہے جس کا مطلب کسی واقعہ یا مسئلہ کے بارے میں مصلحت آمیز یا دور اندیشی پر مبنی پالیسی ہے۔ عرف عام میں اسے منافقت سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔

ڈپلومیسی یونانی زبان کے لفظ ڈپلوما سے اخذ شدہ ہے جس کے معنی کسی کاغذ، دستاویز یا شے کو دو تہیں دینا ہوتا ہے۔ جب کہ ڈپلوما کے معنی کسی سرکاری دستاویز یا کسی ادارے کی تعلیمی سند، ڈگری اور سرٹیفکیٹ کے ہیں۔

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں ڈپلومیسی کی مربوط تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طریقہء کار جس کے تحت ریاستوں کے درمیان تعلقات قائم کیے اور برقرار رکھے جاتے ہیں یا وہ طریقہء کار جو سفیر یا سفارتی نمائندے معاملات میں فنی طور پر استعمال میں لاتے ہیں[5]"۔

کچھ عرصہ پہلے برطانوی سفیروں کی رہنمائی کے لیے ایک کتاب "گائیڈ ٹو ڈپلومیٹک پریکٹس" لکھی گئی تھی جو عرصہء دراز تک برطانوی سفارتی عملہ میں اہم حیثیت رکھتی تھی۔ اس کتاب کے مصنف ارنسٹ نے لکھا ہے کہ "ڈپلومیسی ذہانت اور مہارت کے اس استعمال کو کہتے ہیں جو ریاستوں کی حکومتوں کے مابین سرکاری تعلقات کے معاملے میں عمل میں لائی جاتی ہے۔

ڈپلومیسی کے مفہوم کے بارے میں بعض ماہرین خارجہ پالیسی کو بھی اس میں ملا لیتے ہیں۔ حالانکہ خارجہ پالیسی ریاستوں کے درمیان تعلقات کا متبادل ہوتی ہے۔ جب کہ ڈپلومیسی دراصل وہ طریقہ کار ہے جو اس پالیسی پر عمل درآمد کرنے کے لیے جاری رہتا ہے۔ خارجہ پالیسی ریاست کے ذمہ دار افراد بلکہ حکمران بناتے ہیں اور اس پر عمل ڈپلومیسی کے ذریعے ہوتا ہے۔ تاہم خارجہ پالیسی کے طور پر ڈپلومیسی کا مقصد ملکی سالمیت کا تحفظ پر امن ذرائع سے کرنا ہوتا ہے لیکن اگر جنگ ناگزیر ہو جائے تو یہ فوجی قوت میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ جس کی مثال گذشتہ دونوں عظیم جنگوں کے دوران طریقہ کار سے اور عراق اور امریکہ کے ۱۶ جنوری ۱۹۹۱ء اور ۱۴ سے ۱۶ جنوری ۱۹۹۳ء کے درمیان جنگ سے ملتی ہے۔

انسان کی معاشرتی زندگی کے مفادات کے حصوں کی جدوجہد اور باہمی تعاون و اتحاد کے جذبے کی ضرورت نے اجتماعی زندگی کے اداروں کو جنم دیا۔ خاندان، گروہ اور قبیلے، قوموں کی شکل اختیار کر کے دنیا کے مختلف خطوں میں آباد ہو گئے۔ جہاں جہاں ان قوموں نے ڈیرہ جمایا وہاں وہاں انہوں نے اپنا اقتدار قائم کیا اور ریاست و حکومت کو تشکیل کیا۔

ان قوموں نے زندگی کی مادی اور غیر مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے جب اپنے محدود علاقے کو ناکافی پایا تو دوسرے علاقوں سے اپنی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کی۔ ضروریات زندگی حاصل کرنے کی جدوجہد نے ان کو دوسرے علاقوں سے روشناس کرایا اور اس طرح ان علاقوں کی قوموں سے رابطہ قائم ہوا۔ اپنے مفادات کے حصول کے لیے باہر جانے سے دوسری قوموں اور ریاستوں پر اس کا اثر پڑا اور جہاں جہاں ان کے مفادات ٹکرائے وہاں جھگڑوں اور تنازعات نے جنم لیا۔ اس طرح رنجشوں میں اضافہ ہوا اور بعض اوقات ان تنازعات نے لڑائی جھگڑوں سے آگے بڑھ کر بڑی بڑی جنگوں کی شکل اختیار کر لی۔

قوت کو استعمال کرنے کے طریقے رائج ہوئے اور وسیع پیمانے پر انسانوں اور ذرائع کا نقصان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوا۔ انسان نے جب ان حالات کا بغور مطالعہ کیا تو ان جنگی نقصانات کو سامنے رکھتے ہوئے امن کے اصولوں پر مبنی ایک نیا لائحہ عمل اختیار کیا تاکہ سب کی ضرورتیں بھی پوری ہو جائیں اور جانی و مالی نقصان بھی نہ اٹھانا پڑے۔ اختلافات کی بنیاد بننے والے واقعات اور مسائل کو گفت و شنید کے ذریعے حل کرنے پر زور دیا گیا۔ اس طرح قوموں اور ریاستوں کے درمیان معاہدات عمل میں آئے۔ ان معاہدوں میں فریقین نے شرائط بھی طے کیں اور قوموں کے درمیان اختلافات کو ختم کرنے کے لیے کچھ اصول و ضوابط وضع کرنے پر زور دیا گیا تاکہ مفادات اور حق و انصاف کے حصول کے لیے ان اصولوں کو مدنظر رکھا جائے۔ امن اور جنگ کی صورتوں میں گفت و شنید کے لیے کچھ افراد کو نمائندوں کی حیثیت سے دوسرے حکمرانوں کے پاس بھیجا گیا جن کو روایتی طور پر نہ صرف تحفظ کی ضمانت حاصل ہوتی تھی بلکہ ان کو بہت سی مراعات بھی دی جاتی تھیں۔ یہ افراد ریاستوں کے حکمرانوں کے درمیان پیغام رسانی کا کام کرتے تھے اور خاص ذہانت' مہارت اور اعتماد کے حامل ہوتے تھے ان لوگوں کو یہ حق حاصل ہوتا تھا کہ اپنے ملک کے حکمران یا بادشاہ کی طرف سے اختلافی معاملات کو طے کرنے میں نمائندگی کر سکیں اور مخالف فریقین سے بات چیت کر سکیں۔ انسانی تاریخ میں اس قسم کے بے شمار واقعات ملتے ہیں۔ ان افراد کو جنگ یا امن دونوں حالات میں دیگر ممالک میں بھیجا جاتا تھا تاکہ یہ لوگ دوسرے فریق سے معاملات طے کریں۔

حکومتوں اور ریاستوں کے ان نمائندوں کی مثالیں قدیم یونان کی شہری ریاستوں کے آپس میں اور دوسرے ممالک کے ساتھ روابط' قدیم ہندوستان' ایران' مصر اور چین کے دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات اور رومی سلطنت کے دوسری ہم عصر مملکتوں کے ساتھ روابط و تعلقات کی ملتی ہیں۔ اہل رومہ نے سلطنت کے خارجی تعلقات سے متعلق ایک کونسل بنا رکھی تھی جو صلح و امن کے معاملات اور شرائط طے کرتی تھی۔ اسلامی ریاست کے ابتدائی دور میں بھی دوسری مملکتوں کے ساتھ تعلقات تھے۔ دوسری مملکتوں میں وفود بھیجے جاتے تھے۔ دوسرے ممالک سے نمائندے اور وفود وہاں آتے تھے۔ معاہدات و مسائل کو طے کرنے کے لیے دونوں طرف کے نمائندوں کو کام میں لایا جاتا تھا۔ صلح نامہ حدیبیہ اس قسم کے معاہدوں کی ایک تاریخی مثال ہے۔ ان نمائندوں کو ریاست و حکومت کی ترقی کے ساتھ سفیر کہا جانے لگا اور فن سفارت تاریخ کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے ریاستوں کے درمیان تعلقات کا موثر ذریعہ اور شعبہ بن گیا۔ اور بعد میں یہ ہر ریاست کا مستقل ادارہ بن گیا۔ اس طرح ریاستوں اور مملکتوں کے درمیان باہمی گفت و شنید سے معاملات و مسائل کو طے کرنے کے طریقہ کار کو ڈپلومیسی کہا جانے لگا۔

ابتدائی طور پر اس میں یہ خامی تھی کہ یہ خفیہ معاہدوں' خفیہ اتحاد اور جارحیت کے غیر ذمہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دارانہ بلکہ دھوکہ دہی کے خطوط پر چلایا گیا جس سے اس لفظ کو بین الاقوامی تعلقات میں ایک خاص مدت تک اچھے معنوں میں استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ کھلی گفت و شنید واضح شرائط کی بنیاد پر معاہدات و اتحاد کے طریقوں نے ڈپلومیسی کو ترقی دے کر آج کے حالات میں ریاستوں کے درمیان تعلقات میں ایک خاص مقام دے دیا اور سیاسی حکمت عملی کے طور پر اب اس لفظ کو مخصوص اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ آج انسانیت کا سب سے بڑا مسئلہ عالمی سطح پر امن و امان برقرار رکھنا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ریاستوں کے درمیان بہتر تعلقات قائم رہیں اور یہ صرف ڈپلومیسی سے ہی ممکن ہے۔

ابتدائی طور پر ریاستوں کے درمیان معاہدے اور معاملات ہوتے ہیں۔ ڈپلومیسی کی اس صورت کے نتائج اکثر جنگوں کی صورت میں برآمد ہوتے تھے۔ اس لیے جمہوری طرز عمل میں اور خاص طور پر پہلی جنگ عظیم کے بعد کھلی ڈپلومیسی کا مطالبہ عام ہو گیا۔ خفیہ بات چیت، خفیہ معاہدے اور خفیہ طریقہء کار کی حوصلہ شکنی ہونے لگی۔ کھلی ڈپلومیسی کے اصول کو مجلس اقوام کے منشور میں شامل کیا گیا تھا اور بعد میں منشور اقوام متحدہ میں بھی خاص اہمیت دی گئی۔ تاہم عملی زندگی میں بعض اوقات کھلی ڈپلومیسی کو ناممکن طریقہ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس لیے کہ ریاستوں کے مابین بات چیت میں بعض ایسے مسائل بھی طے کیے جاتے ہیں جن کو کھلے عام واضح کرنے سے ان کے مقاصد ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ تاہم اہم مسائل پر گفت و شنید کے لیے پہلے معاملات کی وضاحت کی جا سکتی ہے اور بات چیت سے جو متفقہ فیصلہ ہو اس کا اعلان کیا جائے۔ اس سلسلے میں بعض ماہرین کا خیال ہے کہ "رازداری" کو اس طرح ختم کیا جائے کہ ڈپلومیسی متاثر نہ ہو۔

اس سلسلے میں خفیہ معاہدات کے تجربات نے ماضی میں بہت سے سبق آموز واقعات کو جنم دیا ہے۔ لیکن آج بھی روس اور اس کے زیر اثر ریاستوں کے درمیان نہ جانے کتنے خفیہ معاہدے موجود ہیں۔ یہ طرز عمل دراصل آمریت کی پیداوار ہے لیکن بعض اتحادی معاہدوں میں خفیہ شرائط کو شامل کیا جاتا ہے۔ جیسے برطانیہ اور فرانس کے درمیان ۱۹۰۴ء کے ENTENTE CORDIALE معاہدوں وغیرہ میں ہیں۔ اسی طرح ۱۹۴۵ء کے معاہدہ مالٹا کی خفیہ شرائط جب سامنے آئیں تو یہ بین الاقوامی سطح پر ایک حیرت انگیز انکشاف تھا۔ بعض اوقات جنگی نقطہء نظر سے بھی اس قسم کی راز داری رکھی جاتی ہے۔ لیکن یہ استدلال بھی ٹھوس حقائق پر مبنی نہیں ہے جس سے بہرحال بین الاقوامی تعلقات میں شک و شبہات کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔

بین الاقوامی سطح پر ڈپلومیسی عموماً" خفیہ بات چیت پر محیط ہے یا کم از کم اس کی زیادہ تشہیر نہیں کی جاتی۔ تاہم اہم مسائل کے حل کے لیے کھلی گفت و شنید کی راہ مہیا کرتی ہے۔ لیکن بعض

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ماہرین کے نزدیک یہ طریقہ ڈپلومیسی کی حدود میں شامل نہیں ہے۔ اگرچہ اقوام متحدہ کھلی ڈپلومیسی کا واضح کردہ طریقہ مہیا کرتی ہے لیکن اصل کام ان کمپنیوں کے سپرد کیا جاتا ہے جو تمام تر مسائل کا تجزیہ پس پردہ ہی کرتی ہیں۔ اس لیے جمہوری ریاستوں کے قائدین کو بین الاقوامی معاملات اور خارجہ تعلقات کے اہم مسائل عوام کے سامنے واضح کرنے چاہئیں تاکہ ملک کی سالمیت کے لیے کیے گئے اقدامات کی سمت کا تعین ہو سکے۔ لیکن دنیا کی تمام جمہوری ریاستوں میں نہ سہی زیادہ تر حکومتوں سے عوام کو یہی شکایت ہوتی ہے کہ وہ پالیسیوں کے معاملات کو عوام کے سامنے پیش نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ اکثر ممالک کی مجلس قانون ساز کے ممبران کو بھی اس طرح کی شکایات رہتی ہیں۔

ان تمام مباحث سے قطع نظر اگر حقائق کی دنیا میں ریاستوں کے تعلقات میں لازمی راز داری کے نقطہء نظر کو ڈپلومیسی کی نسبت سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اگرچہ خفیہ معاہدات و راز داری کے نتائج ہمیشہ خطرناک اور تکلیف دہ ہوتے ہیں لیکن جمہوری طرز فکر کا یہ استدلال کہ تمام مسائل کو کھلی ڈپلومیسی کے تحت لایا جائے مناسب نہیں۔ ڈپلومیسی کو راز داری میں نہیں رکھا جانا چاہئے لیکن دفاعی مسائل اور جنگی نقطہ نظر کے کچھ ایسے معاملات بھی ہوتے ہیں جنہیں خفیہ رکھنا ضروری ہوتا ہے اور خاص طور سے آج جب کہ نظریاتی طور پر پوری دنیا بلاکوں میں منقسم ہے۔ اس کی ضرورت اور بھی اہم ہو گئی ہے۔ تعلقات بین الاقوام کے ماہر اور جدید معاشرے کے لوگوں کا خیال ہے کہ ہمیں پیشہ ورانہ اور معتبر ڈپلومیسی کی طرف واپس لوٹ جانا چاہئے۔ اس لیے کہ ہمیں ایسے طرز عمل سے بہر حال کوئی فائدہ نہیں ہو گا جو کہ آئندہ کے نقصانات پر محیط ہو۔ لیکن ایک جمہوری معاشرے میں یہ انداز فکر ترقی کر گیا ہے کہ عوام اپنے قومی مفادات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں اور ان مقاصد میں وہ راہنماؤں کے مقابلے میں بھی زیادہ دلچسپی اور دلجوئی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور تحریر و تقریر کی آزادی تجزیات کی روشنی میں حکمرانوں کو بہتر طرز عمل کی طرف عوامی رجحان سے آگاہ کرتی ہے۔

کھلی گفت و شنید' گفت و شنید کرنے والوں میں یہ رجحان پیدا کرتی ہے کہ وہ اپنے وقار کا لحاظ' اپنے حکمرانوں کا احترام' ان کے مفاد اور ان کی دلیلوں کا لحاظ اس غیر ضروری ضد کے ساتھ کریں کہ یہ چیز بسا اوقات انہیں ان دلیلوں کو مان لینے سے بھی باز رکھے جو نسبتاً زیادہ وزن رکھتی ہیں۔

ماہرین ڈپلومیسی نے تاریخی بنیادوں پر یونان کی شہری ریاستوں کے درمیان تعلقات کو اس کی ابتدا قرار دیا ہے حالانکہ یہ عمل اس سے بھی زیادہ قدیم ہے جو شام کے ختی بادشاہوں سے مصر کے سلوکس دوم کے معاہدات کی مثال چودھویں صدی قبل مسیح کی بات ہے جب کہ یونان کی شہری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ریاستوں کے درمیان اس طرح کے تعلقات ۴۰۰ق م سے سامنے آتے ہیں۔ بہرحال چونکہ ڈپلومیٹک ہسٹری پر عرصہ دراز سے مغربی مصنفین کی اجارہ داری قائم ہو گئی ہے اس لیے وہ شعوری یا لاشعوری طور پر سیاست کے ہر معاملے کا سہرا یونانیوں کے سرباندھتے ہیں۔ ان مصنفین کی رو سے بین الاقوامی تعلقات میں ڈپلومیسی کی ابتداء یونان ہی سے ہوئی اور اجتماعی اقدامات کے معاملے میں یونانیوں کے ہاں ایک کانفرنس کے انعقاد کا پتہ چلتا ہے جو ۴۳۲ قبل مسیح میں انہوں نے سپارٹا میں ایتھنز کے خلاف کارروائی کے لیے بلائی تھی۔ یونان کے زوال کے بعد دور روما آتا ہے۔ اگرچہ اہل روما نے قانون بین الاقوام کی ترقی میں کافی حصہ لیا لیکن مذاکرات کے ذریعے ڈپلومیسی کی ترقی میں انہوں نے کوئی غیر معمولی کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ عہد وسطیٰ میں اور خاص طور سے انیسویں صدی تک ڈپلومیسی کا مقصد مذاکرات سے مفادات کے تحفظ کا معاملہ طے کرنا تھا۔ تاہم جدید ڈپلومیسی کا ارتقاء اٹلی سے ہوا۔ میکاولی نے اپنی کتاب "پرنس" (THE PRINCE) میں اٹلی کے حکمرانوں کے طریقہ کار اور ریاستوں کے درمیان تعلقات پر بحث کی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اسی زمانے میں مستقل نمائندوں کے تقرر کا سلسلہ شروع ہوا اور کلیسا کے نمائندے مختلف ریاستوں میں مستقل قیام کرنے لگے۔ لیکن یہ فن نہ تو ترقی یافتہ تھا اور نہ ہی معیاری قواعد پر مشتمل تھا۔ اس کی اہمیت صرف اس قدر تھی کہ بعض نمائندے بادشاہوں کی طرف سے دوسرے بادشاہوں کے درباروں میں جاتے تھے اور قیام کرتے تھے۔ قواعد و طریقہ کار کی عدم موجودگی میں مراعات یا کسی قسم کے نقصانات کی صورت میں چونکہ یہ نمائندے بادشاہ کے ذاتی نمائندے کہلاتے تھے اس لیے کئی بار لڑائی جھگڑے بھی پیدا ہوئے۔

سترھویں صدی تک فن سفارت کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ قومیت کی بنیاد پر قومی ریاستوں کی تشکیل سے اسے مزید تقویت پہنچی اور خاص طور سے ۱۶۴۸ء کے "معاہدہ ویسٹ فلیا" نے ریاستوں کی تشکیل کے جس قاعدہ کو تسلیم کیا تھا اس میں قومی ریاستوں کا مسئلہ اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ قومی ریاستوں کی تشکیل کو مرتب کیا جانے لگا اور مضبوط و مستحکم بادشاہتیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہر ممکنہ ذرائع کو بروئے کار لانے لگیں۔

اٹھارہویں صدی تک صنعتی ترقی سے مواصلات کی بے شمار سہولتیں اور پھر انقلاب فرانس اور امریکہ کی خانہ جنگی نے ڈپلومیسی کو ایک نئی روح فراہم کی۔ عوامی خواہشات اور جذبات میں شدت پیدا ہوئی اور ان کا دباؤ حکومتوں کی پالیسیوں پر پڑنے لگا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ سفارتی نمائندگی محض بادشاہوں یا حکمرانوں کی طرف سے نہ کی جائے بلکہ وہ پوری قوم اور ریاست کے عوام کے احساسات کی ترجمانی کے طور پر عمل میں لائی جائے۔ اس سے اگرچہ ڈپلومیسی کے طریقہ کار میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کافی تبدیلی رونما ہوئی اور وہ محض حکمرانوں کی نمائندگی کی بجائے قوم کی نمائندگی کا فن بن گیا لیکن پھر بھی سفارتی نمائندوں میں بڑے بڑے مالدار لوگوں کو شامل کیا جاتا تھا۔ تاہم ڈپلومیسی کے قواعد کو مخصوص طریقہ کار مہیا کیا گیا تھا اور اس سلسلے میں ۱۸۱۵ء کی وائنا کانگریس نے بہت سے بنیادی معاملات کو اجاگر کیا۔ سفارتی نمائندوں کے عہدوں کی تقسیم اور مراعات کا واضح تعین کیا گیا اور ڈپلومیسی کو جمہوری قدروں کے مطابق ترقی دی گئی۔ اس طرح سے جدید ڈپلومیسی کا آغاز ہوا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں جمہوری ڈپلومیسی کی اصطلاح عام ہو گئی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ صنعتی ترقی نے مواصلات اور ذرائع نقل و حمل کو اتنی ترقی دے دی کہ ریاستوں کے درمیان تعلقات میں محض حکومت کو ہی مخصوص حیثیت حاصل نہیں تھی بلکہ ایک ریاست کے عوام بھی دوسری ریاست کے افراد سے مربوط ہوتے جا رہے تھے۔ اس تبدیلی سے وہ اندازہ بھی ختم ہو گیا کہ محض مال و دولت اور رتبے کی بنا پر یا حکمرانوں کے تقرر ہی سے کسی کو نمائندگی کا حق پیدا ہوتا ہے۔

پرانے طریقے نئے تقاضوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ اب سفارتی خدمات کے لیے باقاعدہ پیشہ ورانہ بنیادوں پر انتخاب پر عمل درآمد سے یہ فن کچھ اس طرح کی شکل اختیار کرتا گیا کہ جس میں نمائندوں کی خدمات پیشہ ورانہ بنیاد پر غیر سیاسی طور پر بروئے کار لائی جاتی تھیں۔ اس طرز عمل کو آہستہ آہستہ ترقی حاصل ہوتی رہی اور آج کل عام طور پر ممالک کے درمیان تعلقات سفارتی نمائندوں کے ذریعے دفتر خارجہ کی ہدایات و تجزیات کے مرہون منت ہوتے ہیں اور اس طریقے سے دوسرے ممالک کے درمیان تعلق اور واسطہ رکھا جاتا ہے اور اسی ذریعے سے اہم خدمات انجام دی جاتی ہیں۔ باہمی گفت و شنید سے لیکر تجارتی معاہدوں اور ثقافتی معاملات تک کا اختیار سفارتی نمائندوں کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان ذرائع کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے اور بعض اہم معاملات کو طے کرنے یا باہمی سمجھوتے کے لیے ایک اور طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ کانفرنسیں منعقد کرنے کا ہے۔ متعلقہ ممالک کانفرنسیں منعقد کر کے اور مذاکرات کر کے اپنے معاملات اور مسائل طے کرتے ہیں۔

اس طریقہء کار کا اجراء جنگ عظیم دوم کے بعد ہوا اور اس کے بعد مسائل اور مذاکرات کو کانفرنسوں کے ذریعے طے کرنے کا رواج عام ہو گیا۔ یہ طریقہ بھی دور جدید کی ڈپلومیسی کی ایک شکل ہے۔ اس نظریئے کو مجلس اقوام کی تشکیل اور اجتماعی تحفظ کے نظریہ سے تقویت پہنچی جو کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد تعلقات بین الاقوام کی ایک کڑی بن گئی۔

ایک اندازے کے مطابق آج کل ہر سال چھ ہزار سے لے کر دس ہزار تک بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں جن میں متعلقہ ممالک باہمی گفت و شنید سے اپنے مسائل اور معاملات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتے ہیں۔ بعض کانفرنسیں صرف فنی مسائل سے متعلق ہوتی ہیں جن میں زیادہ تر ماہرین شرکت کرتے ہیں۔ دوسری عام قسم کی کانفرنسیں ہوتی ہیں جن میں سینکڑوں افراد شرکت کرتے ہیں۔ ان میں مختلف ریاستوں کے وزراء خارجہ اور سفارتی نمائندے سب ہی شامل ہوتے ہیں۔ آج کل اس طرح کی کانفرنسیں زیادہ تر اقوام متحدہ اور اس کے اداروں کے تحت منعقد ہوتی ہیں۔

کانفرنسوں کے ذریعے ڈپلومیسی کی مقبولیت ظاہر کرتی ہے کہ باہمی مسائل کے تجزیہ کا پرامن انداز ترقی کر رہا ہے اور بعض ماہرین سیاست کا خیال ہے کہ دنیا میں امن و امان قائم رکھنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اس قسم کی ڈپلومیسی روبہ عروج ہو۔ اقوام متحدہ کے علاوہ بھی کئی ریاستوں کے اشتراک سے کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں جن میں بہت سے اہم مسائل کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ اور ان کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی کانفرنسوں کی مثالیں یورپ کے علاوہ افرو ایشیائی کانفرنس کا انعقاد بھی ہے۔ جس میں ایشیاء اور افریقہ کی ترقی پذیر ریاستوں کو درپیش بہت سے مسائل پر باہمی گفت و شنید سے کوئی مثبت حل تلاش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں برصغیر جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کی قائم کردہ سارک تنظیم (SAARC) ہے جس نے علاقائی معاشی' ثقافتی' تجارتی' عسکری اور دیگر مسائل کو باہمی طور پر حل کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کانفرنس کے سالانہ اجلاس یکے بعد دیگرے ممبر ممالک میں منعقد ہوتے ہیں جس میں علاقائی مسائل پر غور کیا جاتا ہے اور انہیں باہمی گفت و شنید کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ برا عظموں کی بنیاد پر اس طرح کی کانفرنسیں منعقد کرنے میں بعض اوقات یہ معاملہ بھی درپیش ہوتا ہے کہ عالمی سطح پر بڑی طاقتوں بالخصوص امریکہ کی اقوام متحدہ میں اجارہ داری سے ترقی پذیر ممالک کو اپنے مفادات کے تحفظ کی ضمانت نہیں ملتی بلکہ الٹا ان ممالک کو مختلف سازشوں کے ذریعے طرح طرح کے مسائل میں مبتلا رکھا جاتا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کا مسئلہ ایک ایسی عالمی سازش ہے کہ پچھلے کئی سالوں سے عالم اسلام کے احتجاج اور جدوجہد کے باوجود اس کا کوئی حل تلاش نہیں کیا جا سکا۔ اور اس کے لیے عربوں کو دو دفعہ ہولناک جنگ کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس لیے آئے دن اس مسئلہ سے نبرد آزما ہونے کے لیے عرب ممالک کے سربراہوں کی کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں جن میں مشترکہ طور پر کسی متفقہ طریق کار پر عملدر آمد کی راہ تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ۱۹۶۹ء میں تاریخ میں پہلی بار تمام مسلمان ریاستوں کے سربراہوں کی ایک کانفرنس مراکش کے دارالحکومت رباط میں منعقد ہوئی تھی جس میں عالم اسلام کو درپیش مسائل پر غور کیا گیا۔ اس کے بعد دوسری بار عالم اسلام کے مسائل پر اور خاص طور پر بیت المقدس کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے پاکستان کے شہر لاہور میں تمام دنیا کے اسلامی ملکوں کے سربراہوں اور نمائندوں نے اسلامی کانفرنس میں ۱۹۷۳ء میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شرکت کی جس میں مسئلہ فلسطین کو خاص طور پر زیر بحث لایا گیا۔ غرضیکہ آج کے دور میں کانفرنسوں کے ذریعے ڈپلومیسی کے اس جدید نظریہ کو بہت ترقی ملی ہے۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود دنیا میں امن و امان قائم رکھنا کافی مشکل ہو گیا ہے۔ بڑے بڑے اداروں پر بڑی طاقتوں کی اجارہ داری سے بین الاقوامی تعلقات کافی متاثر ہوتے ہیں۔ ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک ترقی یافتہ ملکوں کے دست نگر ہو کر رہ گئے ہیں۔ بڑی طاقتیں امداد کے نام پر اپنے فیصلے چھوٹے چھوٹے ممالک پر ٹھونستی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مخلصانہ ڈپلومیسی ریاستوں کے تعلقات میں نہ ہونے کے برابر ہے۔

ڈپلومیسی کے طریقے کو خواہ وہ جمہوری طرز فکر کے تحت ہو یا آمریت کے زیر نگیں ہو وہ بجائے خود اچھی یا بری شئے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا استعمال نتائج کے اعتبار سے مختلف رہا ہے۔ اگر ڈپلومیسی کے عملدر آمد میں حقیقت پسندی' مثبت انداز فکر' قومی اخلاقیات کا اعلیٰ معیار' بے لوث تدبر اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کوئی اخلاقی فلسفہ' جیسے مذہبی تعلیمات خاص طور سے اسلامی تصور زندگی جائز و ناجائز' نیک اور بدی وغیرہ کارفرما ہوں تو اس طریقے کو ریاستوں کے درمیان تعلقات کے آلہ کے طور پر اس طرح استعمال میں لایا جا سکتا ہے کہ "جیو اور جینے دو" کا اصول بنیادی حیثیت رکھتا ہو۔ اس لیے ڈپلومیسی کے ذریعے خواہ وہ خفیہ ہو' کھلی ہو یا کانفرنسوں کے ذریعے عمل میں آئے دنیا میں بہتر اور پرامن فضا کے علاوہ دائمی امن بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔

اقوام متحدہ میں بحث و مباحثہ پر اکتفا کرنے کی بجائے مسلمہ اخلاقی اصولوں کی روشنی میں مفاہمانہ انداز فکر کو اپنانے کا مسئلہ ہی سب سے اہم ہے۔ اگر مسائل کے حل کے لیے اور قومی مفادات کے حصول کے لیے انداز فکر میں مثبت عنصر شامل ہوں تو تلخیاں تعاون کی فضا میں بدل سکتی ہیں۔

ڈپلومیسی کو دنیا میں پرامن فضا پیدا کرنے اور تعلقات کو باہمی احترام کی فضا میں بڑھانے کے لیے استعمال میں لایا جائے۔ ڈپلومیسی کا طریقہء کار ایسا ہو کہ محض اپنے قومی مفاد کے حصول پر ہی نظر نہ رکھی جائے بلکہ دوسروں کے مسائل کو بھی زیر نظر رکھا جائے۔ اس طرح مفادات اور جدوجہد کے تقابلی جائزے سے مفادات کے ٹکراؤ کی گنجائش کم سے کم ہوتی جائے گی۔

مقاصد اور مفادات کے حصول کے لیے ڈپلومیسی کے ذریعے مثبت راہیں اور ذرائع تلاش کیے جائیں۔ اس طرح کے معاملات میں زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے جو کسی وقت بھی تنازعات کا موجب بن سکتے ہوں۔ دائمی امن قائم کرنے کے لیے باہمی تعلقات میں نیک نیتی اور مثبت انداز فکر کے واضح طریقہ کار کو اپنایا جائے۔ اپنا حق اپنے پاس رکھ کر اور دوسرے کا حق چھین لینے کی خواہش قوموں کو تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس طرح ڈپلومیسی کو اس طرح کے حالات کے تجزیات کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے استعمال میں لایا جائے اور اس کے نتائج پر مستقل مزاجی اور خلوص سے عمل کیا جائے تاکہ دنیا میں زیادہ سے زیادہ امن و امان قائم ہو سکے۔

لفظ ڈپلومیسی سب سے پہلے ۱۶۸۱ء میں سینٹ جرہ کے پادری مو بیلٹن نے اپنے خطوط میں استعمال کیا۔ آہستہ آہستہ یہ لفظ مذہبی اداروں سے نکل کر سرکاری خطوط اور دستاویزات میں استعمال ہونے لگا۔ چونکہ اس لفظ اور عبارت کے دوہرے معانی نکلتے تھے یہ اتنا مقبول ہوا کہ اٹھارھویں صدی کے شروع تک ایک باقاعدہ فن کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اٹھارھویں صدی کے وسط میں باقاعدہ مضمون اور علم کے ماہرین پیدا ہو گئے جنہوں نے قانون' معاہدات' دستاویزات' خطوط' حکمرانوں اور سفارت کاروں کے لیے اسلوب گفتگو و تحریر کے لیے باقاعدہ زبان دانی کے فارمولے اور اصول وضع کیے۔ اس کے بعد حکومتیں' سفارت کار انجمنیں' سیاسی ادارے اور قانون دان دستاویزات میں دوہرے پن کی محتاط زبان کی ترکیب استعمال کرنے لگے۔مثلاً" وائنا کانگریس کے موقعہ پر فرانس کے وزیر خارجہ ٹیلی رانڈ کی تقریر ڈپلومیسی کی دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ لبسمارک کی ڈپلومیسی سے فرانس کو شکست فاش ہوئی اور پرشیا متحدہ جرمنی کی شکل میں نمودار ہوا۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد معاہدہ امن تاشقند اور ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ کے بعد معاہدہ شملہ کی ڈپلومیٹک زبان ایسی ہے کہ دونوں ممالک کے قائدین اور سیاستدان ہمیشہ اپنے اپنے مطلب اور مفاد کے معانی و تراکیب نکالتے ہیں۔ اس علم کے مخصوص فارمولے' اصول' اسلوب تحریر' اختصار' اشارے و کنائیے اور خاص اندازے و تراکیب ہیں جو معاہدوں اور دستاویزات میں استعمال کیے جاتے ہیں۔

کسی ڈپلومیٹک دستاویز کی شناخت' تصدیق' تحقیق اور اصلیت جاننے کے لیے عام طور پر دو اصول اپنائے جاتے ہیں جن کے ذریعے ڈپلومیسی کی تراکیب کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اول تاریخ کا وسیع علم اور مطالعہ، دوئم مضبوط قوت استدلال۔ ڈپلومیسی میں ہمیشہ آغاز گفتگو مثبت مبینہ اعداد و شمار کی روشنی میں کیا جانا چاہئے۔ ان میں دلائل اس قدر تحقیق کے ساتھ منظم طور پر پیش کیے جانے چاہئیں کہ وہ مربوط نتائج پیش کریں اور انہیں باسانی سمجھا' سیکھا اور ان پر عمل کیا جا سکتا ہو۔ یہ فن گفتگو و تحریر وہاں پر اور بھی آسان ہو جاتا ہے جہاں پر اصولوں (Doctrine) کی موجودگی، معلومات کا خزانہ اور مشاہدات کا ذخیرہ موجود ہو تاکہ ان کا موازنہ و مقابلہ ہو سکے' اور انہیں تنقیدی و تجزیاتی اصولوں پر پرکھا جا سکے۔ پیلوگرافی' ایپی گرافی اور لسانیات کے علوم ڈپلومیسی کے امدادی و معاون علوم ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جغرافیہ
Geography

جغرافیہ کی اصطلاح کا جو ماریوس الصوری (Marinos of Tyre) ۷۰ تا ۱۳۰) اور **بطلمیوس** (Claudius Ptolemy ۹۰ - ۱۶۸ء) کی تصنیفات کے عنوان کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ اس کا عربی ترجمہ "صورۃ الارض" کیا گیا۔ چنانچہ بعض عرب جغرافیہ نگاروں نے اپنی تصنیفات کا بھی یہی عنوان رکھا۔ المسعودی (م ۳۴۵ھ / ۹۵۶ء) نے اس اصطلاح کی تشریح "قطع الارض" کی، جس کے معنی زمین کی مساحت و پیمائش ہے۔ بہرحال یہ اصطلاح سب سے پہلے رسائل اخوان الصفاء میں نقشہء عالم کے معنی میں استعمال ہوئی تھی۔ یہ **جغرافیے** کے اس جدید علمی تصور سے مختلف ہے کہ یہ ایک جامع و مانع علم ہے۔ عربوں کا جغرافیائی ادب متعدد انواع میں منقسم تھا، چنانچہ **جغرافیے** کے مختلف پہلوؤں پر علیحدہ علیحدہ 'یک موضوعی' تصنیفات قلمبند کی گئیں' مثلاً" کتاب البلدان' صورۃ الارض' المسالک و الممالک اور علم الطرق وغیرہ۔ البیرونی کے نزدیک "المسالک" ایک ایسا علم ہے جس کا تعلق مقامات کا جغرافیائی محل وقوع متعین کرنے سے ہے۔ المقدسی نے احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم میں **جغرافیے** کے بیشتر پہلوؤں سے بحث کی ہے' چنانچہ وہ اس کی جامعیت کے تصور کے قریب تر پہنچ گیا ہے۔ جغرافیے کی اصطلاح کا موجودہ مفہوم اور استعمال عربی میں مقابلتاً" نیا ہے۔ تاریخ کا جغرافیہ سے ایک گہرا تعلق ہے۔ کسی ملک کے تاریخی حالات معلوم کرنے سے پہلے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس ملک کے طبعی حالات معلوم کریں۔ کیونکہ ان کا اثر وہاں کے باشندوں کی شکل و شباہت' طرز معاشرت اور تہذیب و تمدن پر پڑتا ہے۔

جغرافیہ وہ علم ہے جو سطح زمین' اس کی آبادی' نباتات' حیوانات اور طبعی تقسیم کے حالات بتاتا ہے۔ جغرافیہ کہ ہم تاریخ کا منبع و ماخذ' اس کو پروان چڑھانے اور اس کی تنظیم کرنے والا کہہ سکتے ہیں۔ جغرافیہ امّ التاریخ بھی کہلاتا ہے۔ زمین کے جغرافیائی عناصر اور خدوخال یعنی دریا' جھیلیں' نخلستان اور سمندر آبادی کو اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ کیونکہ پانی میں ہی جانداروں اور شہروں کی زندگی پنہاں ہے۔ یہی آمدورفت اور تجارت کے ارزاں راستے فراہم کرتا ہے۔ مصر کو "تحفہ نیل" کہا جاتا تھا۔ میسوپوٹیمیا (Mesopotamia) میں دریاؤں کے درمیان اور ان نہروں کے ساتھ ساتھ مسلسل کئی **تہذیبیں** پروان چڑھیں۔ ہندوستان میں وادی سندھ کی تہذیب دریائے سندھ کے ساتھ پروان چڑھی۔ ہندوستان کے دیگر تمدن اور **تہذیبیں** گنگا' برہم پتر اور دیگر دریاؤں کی مرہون منت تھیں۔ چین میں انسانوں کی زندگی و موت کا دارومدار اور انحصار ان دریاؤں پر تھا جو سیلاب سے زمینوں کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زرخیز بنا دیتے تھے۔ چین کی ابتدائی تہذیب دریائے زرد (Yellow River Civilization) کی مرہون منت تھی۔ تہذیب روم کی شان و شوکت ٹائبر (Tiber) آرنو (Arno) اور پو (Po) دریاؤں کی وادیوں کی بدولت تھی۔ آسٹریا کی ترقی و خوشحالی دریائے ڈینیوب (Danube) کی وجہ سے تھی۔ جرمنی کی تجارت و صنعت دریائے البہ (Elbe) اور دریائے رائن (Rhine) کی بدولت تھی۔ فرانس کی تہذیب و ترقی کا راز دریائے لائرے (Loir)، دریائے رہون (The Rhone) اور دریائے سین (Seine) تھے۔ پیٹرا (Petra) پامیرا (Palmyra) کے شہر نخلستانوں کے باعث آباد تھے۔

جب یونان کی آبادیوں میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ ان کا اپنی سرحدوں میں سمانا مشکل ہو گیا تو انہوں نے بحیرہ روم اور بحیرہ اسود کے ساتھ ساتھ اپنی نئی آبادیاں قائم کر لیں۔ ۱۴۹۲ء میں کولمبس اور ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما کی بحری مہمات کے باعث نئی دنیاؤں کی دریافت ہوئی۔ اس طرح نئے بحری راستوں کی دریافت سے بحری تجارت اور سفر کے شوق میں اضافہ ہوا۔ تب بحیرہ روم کی اہمیت و مرکزیت کی عظمت کم ہو گئی اور جینوا، فلورنس اور وینس کی شان و شوکت ماند پڑ گئی۔ بحر اوقیانوس کی قوموں نے عروج حاصل کیا اور آخر کار اپنی فرمانروائی کا جال پوری دنیا پر پھیلا دیا۔ اس طرح سے مغرب کی صنعت، تجارت، ٹیکنالوجی اور استعماریت کا پھیلاؤ اور بہاؤ مشرق کی طرف چلا اور بڑھا۔

اس طرح بظاہر، مصر یونان اور روم کی قدیم تہذیبیں مواقع اور معاشی و سیاسی ترقی کی پیداوار تھیں نہ کہ نسلی ترکیب کی۔ اور ان کے تمدن کا بیشتر حصہ مشرق سے تعلق رکھتا تھا۔ اس سلسلہ میں تاریخ کا ایک اعلان یوں بھی ہے۔

> "جنوب کے لوگ تہذیبیں پیدا کرتے ہیں، شمال کے رہنے والے انہیں فتح کر لیتے ہیں، برباد کر دیتے ہیں اور پھر انہی سے "عاریتاً" تہذیبیں لیکر انہیں آگے پھیلاتے ہیں۔"

اگر افریقہ کے نیگرو کوئی بڑی تہذیب پیدا نہیں کر سکے تو اس کی ممکنہ وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ آب و ہوا اور جغرافیائی حالات نے انہیں مایوس و ناکام کر دیا کیونکہ جغرافیائی حالات ایک تہذیب کو جنم دیتے ہیں۔

زمانہء قبل اسلام میں عربوں کی جغرافیائی معلومات بعض روایتی اور قدیم جغرافیائی تصورات یا جزیرۂ عرب کے مقامات اور آس پاس کے علاقوں کے مقامات کے ناموں تک محدود تھیں۔ یہ معلومات ... اور قدیم عربی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شاعری۔

قدیم عربی شاعری میں جو جغرافیائی تصورات و معلومات موجود ہیں ان سے اسلام سے پہلے کے عربوں کے ہاں جغرافیائی مظاہر کے مفہوم اور ان کے علم کی حدود کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں جغرافیہ و کائنات کے متعلق جو تصورات ملتے ہیں ان کے علاوہ حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ (م ۴۰ھ / ۶۶۰ء)، حضرت ابن عباسؓ (م ۶۶ - ۶۹ھ / ۶۸۶ - ۶۸۸ء) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اور دیگر صحابہؓ سے منسوب ایسی روایات بھی موجود ہیں جن کا تعلق کائنات، **جغرافیے** اور دیگر متعلقہ مسائل سے ہے۔ لیکن بظاہر یہ روایات، جن میں عربوں کے قدیم جغرافیائی تصورات جھلکتے ہیں، آہستہ آہستہ جمع ہوئیں اور ان سے مقصود یہ تھا کہ **جغرافیے** کے بارے میں ان علمی معلومات کا ذخیرہ تیار کیا جائے جو اس زمانے کے عربوں میں مقبول ہو چکا تھا۔ تاہم یہ روایات بعض عرب جغرافیہ دانوں نے اپنی کتابوں میں قابل اعتماد علمی ذخیرے کے طور پر پیش کیں۔ اگرچہ علمی **جغرافیے** نے بھی ترقی کی، مگر بعض پرانی روایات نے عربوں کے جغرافیائی افکار اور نقشہ نگاری پر گہرا اثر ڈالا، مثلاً" وہ تمثیلی روایت جس کی رو سے زمین کو ایک ایسے عظیم الجثہ پرندے سے تشبیہ دی گئی ہے جس کا سر چین، دایاں پر ہندوستان، بایاں پر الخزر، سینہ مکہ، حجاز، شام، عراق اور مصر اور دم شمالی افریقہ ہے۔ یہ روایات بلخی مکتب فکر کی جغرافیائی تحریروں کی بنیاد بن گئیں۔ بعید از امکان نہیں کہ اس تصور کی بنیاد کوئی پرانا (خیالی) نقشہ ہو جو عربوں کی نظر سے گزرا ہو۔

افریقہ اور ایشیا میں اشاعت اسلام کے بعد سیاسی عمل داری میں وسعت کی بدولت عربوں کو معلومات جمع کرنے اور ان مختلف ممالک کے بارے میں اپنے تجربات و مشاہدات کو قلم بند کرنے کے مواقع حاصل ہو گئے جو یا تو براہ راست ان کی حکمرانی میں تھے یا سلطنت اسلامی کے آس پاس واقع تھے۔ ان معلومات کے جمع کرنے کا مقصد فوجی مہمات ہوں یا کچھ اور بہرحال یہ بات واضح ہے کہ مسلمانوں کے علم جغرافیہ کی ترقی میں قرآن مجید، فن حدیث و رجال اور عام تحقیقی و مشاہداتی ذوق نے بڑا حصہ لیا۔

عباسی عہد حکومت کے آغاز اور بغداد کے دارالخلافت بن جانے کے بعد ہی عربوں کے ہاں زیادہ وسعت سے علم جغرافیہ سے شناسائی پیدا ہوئی۔ ایران، مصر اور سندھ کی فتوحات نے عربوں کو ایک طرف تو قدیم تمدن کے ان وارثوں کے علمی و ثقافتی سرمائے سے براہ راست مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا اور دوسری طرف ان علاقوں کے علمی مراکز، تجربہ گاہیں اور رصدگاہیں ان کے قبضے یا علم میں آ گئیں۔ بہرحال غیر ملکی زبانوں کے علمی ذخائر کو حاصل کرنے اور انہیں عربی میں منتقل کرنے کا آغاز بانی بغداد خلیفہ ابو جعفر المنصور کے عہد (۱۳۵ھ / ۱۵۸ھ تا ۷۵۳ء / ۷۷۵ء) سے پہلے نہ ہو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سکا۔ اس نے علمی کارناموں کو عربی میں منتقل کرنے میں عملی طور پر بڑی دلچسپی لی اور یہ کام دو سو سال تک اسلامی دنیا میں جاری رہا۔ برامکہ نے دربار خلافت میں علمی سرگرمیوں کو ترقی دینے میں بڑا حصہ لیا۔ اکثر و بیشتر مترجمین خود معتبر عالم ہوتے تھے' جن کی کوششوں سے عربی زبان ہند' ایران اور یونان کے جغرافیائی' فلکیاتی اور فلسفیانہ معلومات سے مالا مال ہو گئی۔

ہند کی جغرافیائی و فلکیاتی معلومات سنسکرت کی کتاب سوریہ سدھانت کے عربی ترجمے کے ذریعے عربوں تک پہنچیں جو المنصور کے عہد حکومت میں ہوا۔ (نہ کہ **برھمپسھت** سدھانت کے ترجمے سے جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے) سوریہ سدھانت پر ابتدائی یونانی اثرات بھی نمایاں ہیں[8]۔ لیکن جب اس کا عربی میں ترجمہ ہو گیا تو یہ عربوں کے لیے ہند کی فلکیاتی و جغرافیائی معلومات کا واحد ماخذ قرار پایا اور اس عہد کی بہت سی تصانیف کی بنیاد ثابت ہوا' مثلاً" ابراہیم بن حبیب الفزاری: کتاب الزیج (جو ۱۷۰ھ / ۷۸۶ء کے بعد لکھی گئی) محمد بن موسیٰ الخوارزمی (۲۳۲ھ / ۸۴۷ء): السند ہند الصغیر'حبش بن عبداللہ المروزی البغدادی: السند ہند (تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے آخر میں) اور دیگر تصنیفات۔

ہندی **جغرافیے** کی بہ نسبت ہندی فلکیات نے عربوں کے افکار پر زیادہ گہرا اثر ڈالا۔ اگرچہ یونانی و ایرانی افکار گہرے اور دیرپا اثرات کے حامل تھے' تاہم **جغرافیے** کے ہندی منہاج و تصورات بھی خوب معروف تھے۔ **جغرافیے** کے میدان میں صلاحیت اور کارناموں کے لحاظ سے ہندیوں کا مقابلہ یونانیوں سے کیا جاتا تھا مگر یونانیوں کو اس میدان میں زیادہ کامل خیال کیا جاتا تھا[9]۔

ان متعدد جغرافیائی تصورات میں' جن سے عرب علماء متعارف ہوئے آریا بھٹ کا یہ نظریہ بھی شامل تھا کہ آسمانوں کی روزانہ گردش فقط ظاہری ہے' جس کا سبب زمین کی محوری گردش ہے۔ روئے زمین پر خشکی اور پانی کا تناسب نصف نصف ہے۔ خشکی جو کچھوے کی مانند ہے' ہر طرف سے پانی میں گھری ہوئی ہے۔ اس کی صورت ایک گنبد کی سی ہے' جس کا بلند ترین نقطہ کوہ میرو (Meru) (ایک خیالی پہاڑ) ہے جو عین قطب شمالی کے نیچے واقع ہے۔ صرف شمالی نصف کرہ ہی زمین کا آباد حصہ ہے' جس کا حدود اربعہ یہ ہے: جمکوٹ مشرق میں' روم مغرب میں' لنکا جو بمنزلہ قبہ (Cupola) کے ہے اور سید پور اور زمین کا آباد حصہ نو ٹکڑوں میں منقسم ہے۔ اہل ہند اپنے طول بلد کا حساب لنکا سے لگاتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ نصف النہار اول اجین سے ہو کر گزرتا ہے۔ عربوں نے شاید یہیں سے یہ خیال اخذ کیا کہ سیلون زمین کا قبہ ہے' لیکن بعد میں انہوں نے یہ حیثیت اجین کو دے دی' جس کا سبب ان کی یہ غلط فہمی تھی کہ ہندی طول بلد کا اندازہ اسی نقطے سے کرتے ہیں۔

ایرانیوں کے بہت سے جغرافیائی تصورات و روایات کو عربوں نے اپنایا۔ ان میں سے ہفت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کشور (ہفت اقلیم) کا تصور سب سے اہم ہے' جس کے مطابق تمام دنیا سات مساوی اقلیدسی دائروں میں منقسم ہے اور ان میں سے ہر دائرے کو ایک کشور کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ تقسیم اس طرح تھی کہ چوتھا دائرہ وسط میں تھا اور باقی چھ دائرے اس کے ارد گرد تھے۔ اس وسطی دائرے میں ایران شہر بھی شامل تھا' جس میں سب سے زیادہ مرکزی حیثیت السواد کو حاصل تھی۔ ایک طویل عرصے تک عرب جغرافیہ دانوں پر اس نظام کا اثر قائم رہا اور البیرونی کے اس نظریے کے باوجود کہ اس نظام کی کوئی علمی یا طبیعی بنیاد نہیں اور یہ کہ یونانیوں کی تقسیم اس سے زیادہ علمی تھی' وہ یونانیوں کے اس تصور سے کبھی متاثر نہ ہوئے۔ جس کی رو سے دنیا تین یا چار برا عظموں میں منقسم ہے۔ نظریہء ذوالبحرین بھی کئی صدیوں تک عرب جغرافیہ و نقشہ نگاری کو متاثر کرتا رہا' جس کے مطابق بحیرہ روم (Mediterranean Sea) اور بحرہند (فارس) (Indian Ocean) بحرالمحیط سے زمین میں داخل ہوتے ہیں' ایک شمال مغرب یعنی بحراوقیانوس (Atlantic) سے اور دوسرا مشرق یعنی بحرالکاہل سے' لیکن البرزخ ("سد": خاکنائے سویز) انہیں ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے جیسا کہ H. Kramers J. نے توجہ دلائی ہے یہ تصور بنیادی طور پر تو **بطلمیوس** (Ptolemy) سے ماخوذ ہے' لیکن بحرہند کو بحرفارس کا نام دیا جانا ایک ایسی حقیقت ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کم سے کم یہ سمندر ایرانیوں کے اصلی جغرافیائی نقشوں میں شامل تھا۔ مگر اس نقشے کی اصلیت کے بارے میں ہم وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔

ایرانی روایات نے عربوں کی جہاز رانی اور اس سے متعلقہ ادب پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ اس کی شہادت جہاز رانی سے متعلق ایسے کئی عربی الفاظ سے ملتی ہے جن کی اصل فارسی ہے' مثلاً" بندر' ناخدا' رحمانی (جہاز رانی کی کتاب ہدایات) دفتر (جہاز رانی کی ہدایات) وغیرہ۔ اسی طرح بعض فارسی نام' جیسے خن (Thumb) اور قطب الجاہ (Pole) وغیرہ' بھی عرب جغرافیہ نویسی پر فارسی اثرات کا ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ اس قسم کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ عرب نقشہ سازی پر بھی فارسی اثرات ظاہر ہیں' جس کا ثبوت ان فارسی اصطلاحات سے ملتا ہے جو عربوں نے سواحل کی خاص اشکال کے سلسلے میں استعمال کی ہیں' جیسے **طیلسان**' شابورہ اور قوارہ وغیرہ۔ یہ **اصطلاحات**' جو اصل میں خاص خاص کپڑوں کے لیے تھیں' ساتویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی میں مستعمل ہوئیں۔ ان سے قدیم ایران میں نقشوں کی موجودگی کا بھی پتا چلتا ہے۔

ان علماء اور دیگر یونانی ماہرین فلکیات و فلسفہ کی کتابوں کا جب عربی میں ترجمہ ہوا تو اس سے عربوں کو نظریات' تصورات اور فلکیاتی تجربات کے نتائج کی شکل میں کافی مواد میسر آگیا جس کے باعث عربی جغرافیہ نگاری کے لیے علمی بنیاد پر ترقی کرنا آسان ہو گیا۔ بلاشبہ علاقائی اور بیانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جغرافیے نیز نقشہ سازی میں فارسی اثرات واضح تھے' لیکن یونانی اثرات عملی طور پر عرب جغرافیے کے سارے پہلوؤں پر حاوی ہو گئے' حتیٰ کہ جن میدانوں میں یونانی اور ایرانی نظریات و منہاجات کسی نہ کسی شکل میں ایک دوسرے کے مقابل آئے' مثلاً" ایرانی نظام کشور اور یونانی نظام اقالیم' وہاں یونانی غالب و مقبول رہے۔ عرب جغرافیے کی یونانی بنیاد سب سے زیادہ ریاضیات' طبیعات اور انسانی و حیاتی جغرافیے کے میدان میں نمایاں رہی۔ یونانی جغرافیے کا اثر بڑا دیرپا ثابت ہوا' حتی کہ انیسویں صدی تک یہی اس کی اساس بنا رہا۔ انیسویں صدی میں جو جغرافیے فارسی میں بلکہ ہندوستان کے اندر اردو میں بھی لکھے گئے ان میں بھی اس کے آثار موجود ہیں۔ حالانکہ یورپی ذہن پر اس سے بہت عرصہ قبل بطلمیوسی اثرات کم ہو چکے تھے۔ بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس پورے دور میں یونانی علماء کے نظریاتی اصولوں اور اس زمانے کے تاجروں' ملاحوں اور سیاحوں کے عملی مشاہدات کے درمیان ایک غیر محسوس تصادم جاری رہا۔

تمام قوموں کی تاریخیں ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن جغرافیہ اور آب و ہوا یعنی ماحول اسی طرح تاریخی رفتار کا فیصلہ کرتا ہے جس طرح میراث اور مورخ ماحول کو اپنا نقطہء آغاز بنا سکتا ہے اور اسے ڈھانچے کے طور پر قبول کر سکتا ہے۔ لیکن یہاں ایک خطرہ ہے جس کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے

ہنری ٹامس بکل جس نے انگلستان کی تہذیب کی تاریخ لکھی' اس نے جغرافیے کو محض نقطہء آغاز ہی نہ بنایا بلکہ تاریخ کی تہذیب کا انحصار اس پر رکھا اور وہ اپنے دعوے کو مقبول عام بنانے میں بری طرح ناکام رہا۔ کیونکہ تمدن انسان پیدا کرتا ہے زمین نہیں۔ تاہم جغرافیے کو ایک تنظیمی اصل کے طور پر استعمال کیا جائے اور فلسفیانہ توضیحات کا مرکز نہ بنایا جائے تو یہ ہمارے لیے فائدہ مند ہو سکتا ہے۔

موجود دور میں آب و ہوا انسانی ترقی پر اس قدر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتی جتنا کہ مانٹیسکوؒ (Montesquieu) یا بکلؒ (Buckle) کا خیال تھا۔ البتہ یہ انسانی ترقی کو محدود ضرور کر سکتی ہے۔ ٹیکنالوجی میں روز افزوں ترقی کی بدولت انسان نے اکثر ارضیاتی رکاوٹوں اور جغرافیائی مشکلات پر قابو حاصل کر لیا ہے۔ انسان ریگستانوں کو سیراب' صحراؤں کو ائرکنڈیشنڈ' پہاڑوں کو تسخیر اور فضاؤں کو عبور کرنے کی قدرت و مہارت رکھتا ہے۔ انسان نے نسلوں کی محنت اور خوش تدبیری کے بعد روئے زمین پر دسترس حاصل کر لی ہے۔

جغرافیائی حالات انسانی طرز معاشرت اور بود و باش پر بھی گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ یہ اثرات ہر سطح پر ہر ملک و قوم کی تاریخ میں پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر شمالی ہندوستان کی گرم مرطوب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آب و ہوا یہاں کے باشندوں پر ہمیشہ غالب رہی۔ اس خطہ کے باشندے معمولی سی محنت مشقت کرنے سے آسانی کے ساتھ اپنی ضروریات زندگی بہم پہنچا سکتے ہیں۔ لہٰذا اس علاقہ کے باشندے برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں اپنی تساہل کیشی' کاہلی اور آرام پسندی کے لیے مشہور رہے ہیں۔ شجاعت اور بہادری کے جوہر ان میں کم نمایاں رہے ہیں۔ انہوں نے کبھی بھی بیرونی حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ نہیں کیا اور اکثر معمولی مزاحمت کے بعد راہ فرار اختیار کرلی۔ اس سے ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ برصغیر کی تاریخ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر نو وارد فاتح نے پنجاب کا علاقہ بغیر زیادہ مزاحمت کے فتح کر لیا اور پھر اسے بنگال تک علاقہ فتح کرنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی۔

جغرافیائی حالات کا لوگوں کی عادات' لباس' رسومات اور مذہبی روایات پر بھی گہرا اثر ہوتا ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ ملکی نظام حکومت پر بھی جغرافیائی حالات اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اس امر کو یاد رکھا جائے کہ نظام حکومت کا تعلق زیادہ تر حکمرانوں کی ذہنی نشوونما سے ہوتا ہے مگر یہ بات ضروری ہے کہ نظام حکومت کے خاکے کو عملی جامہ پہناتے وقت بعض انتظامی امور کو جغرافیائی حالات کے پیش نظر بدلنا پڑتا ہے مثلاً" ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں نے صوبوں کی تقسیم میں جغرافیائی تفاصیل و حدود کو ہمیشہ مدنظر رکھا اور صوبہ داروں کا تقرر کرتے وقت بھی صوبوں کی عسکری' دفاعی اور جغرافیائی حالت کا خیال رکھا اور جو صوبہ دار جس علاقہ کے لیے موزوں خیال کیا جاتا اسے وہیں متعین کیا جاتا۔

غرضیکہ ہر ملک و ملت کی تاریخ جغرافیائی حالات سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ملکی روایات اور قومی کردار پر جغرافیائی عوامل بہت حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہر ملک کی صنعت و حرفت' زراعت' تجارت' ذرائع آمد و رفت اور تہذیب و تمدن کا انحصار اس کے جغرافیائی حالات پر ہی ہوتا ہے۔ اس لیے کسی ملک کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کے جغرافیائی عوامل یعنی آب و ہوا' حدود اربعہ اور پیداوار وغیرہ کا جائزہ لیا جائے لہٰذا مورخ کو بھی اپنی جغرافیائی عوامل کو پیش نظر رکھتے ہوئے حالات و واقعات کو قلمبند کرنا ہوتا ہے۔

ہوائی جہازوں کی ترقی کے باعث ایک بار پھر تمدن کے نقشہ میں تبدیلی کا امکان غالب نظر آ رہا ہے۔ بحری تجارت اور سفروں کے لیے دریاؤں اور سمندروں کا استعمال کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ اشیاء اور مسافر زیادہ سے زیادہ براہ راست فضائی راستوں سے اپنی منزل تک پہنچ رہے ہیں۔ نقل و حمل اور میدان جنگ میں بحری قوت کی جگہ پوری طرح ہوائی قوت استعمال ہونے لگی ہے۔ ٹیکنالوجی کی ترقی نے جغرافیائی عوامل کا اثر و رسوخ کم کر دیا ہے۔ کسی علاقے کی ساخت اور طبعی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خدوخال وہاں زراعت' کان کنی یا تجارت کے مواقع فراہم کر سکتے ہیں۔ لیکن ان امکانات کو حقیقت میں ڈھالنے کا انحصار صرف وہاں کے راہنماؤں کی قوت متخیلہ اور قوت فیصلہ کی صلاحیت' پیش قدمی اور جفاکشی و محنت پر ہے۔

ارضیات
Geology

ارضیات زمین کے طبقوں کا علم ہے۔ تاریخ علم ارضیات سے عبارت ہے۔ ہر روز کہیں نہ کہیں سمندر سطح زمین پر پھیل جاتا ہے یا پھر زمین سمندر سے نمودار ہو جاتی ہے۔ شہر غرقاب ہو جاتے ہیں اور ڈوبے ہوئے شہروں اور جزیروں کی تباہی و غرقابی کی افسوناک کہانیاں نوحہ کناں سنائی دیتی ہیں۔ تعمیرو تخریب کے عمل میں پہاڑ بڑھتے گھٹتے رہتے ہیں۔ دریا کبھی سیلاب لاتے' کبھی خشک ہوتے یا اپنا راستہ بدلتے نظر آتے ہیں۔ ارضیاتی نقطہ نظر سے سطح زمین مستقل شکل بدل رہی ہے اور اس پر انسان کا رہنا سہنا اتنا ہی خطرناک اور غیر محفوظ ہے جتنا کہ مریخ یا کسی اور سیارے کی طرف جانا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جیالوجی کیا ہے؟ کیا یہ دوسری معاشرتی **سائنسوں** مثلاً" جغرافیہ' سوشیالوجی اور معاشیات کی طرح کی ایک سائنس ہے یا کہ یہ نباتیات (Botonical) کی طرح کی قدرتی سائنس ہے؟ جیالوجی ان **سائنسوں** میں سے ایک سائنس ہے جو اپنا تعلق و سلسلہ زمین کے ساتھ وابستہ کرتی ہیں اور ارضیاتی سائنس (Geo Science) کہلاتی ہے۔ مورخ کا تعلق بھی جیالوجی کی برانچ ارضیاتی سائنس سے ہے' طبقات الارض کے طریقوں کے علم سے نہیں۔

جیالوجی وہ سائنس ہے جو زمین (Earth) کا مطالعہ کر کے کرہ ارض (Globe) کے بارے میں تفصیلی تحقیق پیش کرتی ہے۔ عام طور پر جیالوجی' نباتات کی روئیدگی کے قوانین اور کرہ ارض (کرہ ارض + نباتات) کے قوانین کا انسانی معاشرے اور نیچر کے ساتھ تعلق کو بیان کرتی ہے۔ جیالوجی کے نباتات اور انسانی معاشرے کے ساتھ تعلق' علم اور دائرہ کار کو ارضیاتی سائنس کا نام دیتے ہیں۔ جس سے نیچر کے ساتھ انسان کے تعلق کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ارضیاتی سائنس (Geo Science) کا موجودہ علم نہایت ہی ترقی یافتہ ہے۔ ارضیائی سائنس کا بڑا مقصد انسان کے نیچر کے بارے میں عمومی قوانین کا مطالعہ ہے۔ مورخ کا تعلق زمین کی ساخت' ابتدا' بالائی طبقات' اندرونی طبقات' سمندروں اور دریائی وغیرہ کی ہیئت وغیرہ سے نہیں اور نہ ہی نظریہء تخلیق کائنات سے ہے بلکہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرہ ارض کے تغیرات کا انسانی معاشرے اور تمدن پر اثرات سے ہے۔

آثار قدیمہ
Archaeology

خزانے کی تلاش میں کھدائی کے کام نے آثارات قدیمہ کو دریافت کیا اور یوں آثار قدیمہ کا فن، علم اور سائنس وجود میں آئی۔ انسان کی قدیم ترین زندگی سے علم کی جو شاخ بحث کرتی ہے وہ آثار قدیمہ ہے۔ آثار قدیمہ کی تعریف یہ کی جا سکتی ہے کہ یہ قدیم انسانی معاشروں کی تاریخ تمدن ہے جس کا پتہ پرانے شہروں وغیرہ کی کھدائی سے لگایا جاتا ہے۔ علم الاقوام یا علم الانسان (Anthropology) اس کی توجیہہ کی کوشش کرتا ہے کہ انسانی معاشرے کی گوناگوں روایات، باہمی تعلقات اور تہذیبیں کیونکر وجود میں آئیں۔ یعنی علم الاقوام قوموں کی ذہنی، روحانی اور تمدنی زندگی کی تاریخ سے بحث کرتا ہے۔

علم آثار قدیمہ ایک فن بھی ہے اور سائنس بھی۔ یہ علم تاریخ کے اس حصہ سے بحث کرتا ہے جس کی کوئی تحریری روائداد موجود نہ ہو۔ گویا آثار قدیمہ قوموں کی وہ تاریخ ہے جو تاریخ کے دائرے سے باہر ہو۔ اس علم کی بدولت ہمیں قبل تاریخ قوموں کے اوزار، ظروف، طرز تعمیر اور فنون لطیفہ سے واقفیت ہوتی ہے۔

آثار قدیمہ کی دریافت نہ صرف تہذیب کے مختلف نمونوں کی تقسیم کے متعلق بلکہ ان کے زمانے کے متعلق بھی شہادت دیتی ہے مثلاً" وادی سندھ میں موہنجودارو اور ہڑپہ کے مقامات پہ آثار قدیمہ کی تحقیقات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان شہروں کے نقشوں، اوزاروں، زیوروں، مذہبی تبرکات، صنعت، طرز تعمیر اور سنگ تراشی مشرق کی صنعت وغیرہ سے نمایاں مشابہت رکھتی ہے۔ وادی سندھ کی یہ تہذیب جنوب مغربی ہندوستان کی قبل آریائی اور موجودہ تہذیب سے بھی بہت کچھ مشابہت اور قریبی تعلق رکھتی ہے اور اس سے صریحی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جنوبی ہند کی دراوڑی قوموں اور بحر روم کے ساحل پر رہنے والی قوموں میں باہمی تاریخی تعلقات پائے جاتے ہیں۔ اس طرح آثار قدیمہ نے ہمیں اس تہذیب کا زمانہ اور وسعت معلوم کرنے میں بڑی مدد دی ہے۔ یہ علم اپنے خاص طریق تحقیق کے مطابق اس نتیجہ پر پہنچا کہ وادی سندھ کی تہذیب آج سے چھ ہزار سال پہلے پورے شباب پر ہوگی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قبل آریائی تہذیب جو آج کل جنوبی ہندوستان میں رائج ہے بہت قدیم روایات پر مبنی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی کھدائی میں جو کھوپڑیاں ملی ہیں وہ بھی اس کا پتہ دیتی ہیں کہ یہاں کے رہنے والوں، جنوبی ہندوستان اور ساحل روم کے باشندوں کی نسلوں میں جسمانی ساخت کے اعتبار سے بھی باہمی تعلق پایا جاتا ہے۔ غرضیکہ علم آثار قدیمہ دوسرے تاریخی علوم کو مدد دیتا ہے اور خود بھی ان سے بہت کچھ مدد لیتا ہے۔ جب، کسی مقام پر مورخ کو متعلقہ اور مطلوبہ تاریخی شہادتیں دستیاب نہیں ہوتیں اور نہ ہی کسی قسم کی تحریر و دستاویز میسر آتی ہے تو وہاں وہ آثار قدیمہ سے مدد لے کر ادوار گذشتہ کی تاریخ کو مکمل کرتا ہے۔ گویا آثار قدیمہ ماضی کی مدفون و پوشیدہ تاریخ ہے اور گم گشتہ عہدوں کی تاریخ کا بہترین نعم البدل ہے۔

موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی کھدائی و دریافت سے وادی سندھ کی تہذیب کا تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ اس سے عہد قدیم (۴۵۰۰ - ۳۵۰۰ ق م) کے باشندوں کی خشت سازی، مکانات، شاہراہیں، گلیاں، کنویں، صفائی کی نالیاں، غسل خانے، حمام، صنعت و حرفت، کوزہ گری، تانبے اور کانسی کے ظروف، اسلحہ، اوزار، سنگ تراشی، مواصلات و تجارت، معاشرت، مذہب اور تدفین کے طریقوں کا پتہ چلتا ہے۔

قدیم مصر کی تاریخ مرتب کرتے وقت مورخ کسی طرح بھی اہرام اور قدیم مصری عمارات کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ قدیم مصری محلوں سے ساغر و مینا، کرسیاں، مسہریاں اور راحت و آرام کا دیگر سامان دستیاب ہوا ہے۔ ظروف اور زیورات پر سونے چاندی اور ہاتھی دانت کا کام دیکھ کر فراعین مصر کی عظمت رفتہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ غرضیکہ آثار قدیمہ تاریخی خلاء کو پر کرنے میں مورخ کی مدد کرتے ہیں۔ لہٰذا مورخ کو آثار قدیمہ کا بنیادی علم ہونا چاہئے۔

آثار قدیمہ میں قدیم عمارات، کھنڈرات، زیر زمین دستیاب ہونے والے آثارات، مجسمے، مورتیاں، اسٹوپے، لاٹھیں، روزمرہ کی اشیاء کھلونے، زیورات، اسلحہ، اوزار، ڈھانچے اور ہڈیاں وغیرہ شامل ہیں۔ مورخ کے لیے یہ آثارات بیش بہا خزانے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ خصوصاً" اس وقت جب مورخ کے پاس عہد قدیم کی تاریخ کو مرتب کرنے کے لیے شواہد موجود نہ ہوں تو پھر یہ ٹوٹی پھوٹی اشیاء اپنے اندر بے پناہ تاریخی معلومات کا خزانہ رکھتی ہیں۔ مورخ ان ٹوٹی پھوٹی اشیاء کا سلسلہ جوڑ کر گھروندے بناتا ہے اور پھر ان گھروندوں کی بنیاد پر محلات تعمیر کرتا ہے۔ بابل، نینوا، اسیرین اور میسوپوٹیما کی تہذیبوں کے محلات انہی خدوخال اور سلسلوں سے اٹھائے گئے ہیں۔

علم آثار قدیمہ کے بانی اہل برطانیہ ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے یونان اور ایشائے کوچک کے قدیم مقامات پر نہایت منظم اور سائنسی انداز میں کھدائی کی۔ اسٹورٹ اور ریوٹ (Stuart and Revett) نے ایتھنز کے قدیم مقامات کی کھدائی کے بعد "قدیم تاریخ یونان" چار جلدوں میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مرتب کی۔ برطانوی ماہرین نے اسٹورٹ اور ریوٹ کے کام کو جاری رکھا اور انیسویں صدی کے شروع میں برٹش میوزم کے لیے چند پارتھین مجسمے روانہ کیے۔ اس کے بعد ہنیوریک شیومن (Heinrich Schliemann) نے ٹرائے، مائی سونیا اور ٹائرن[12] کے مقامات پر، سر ہنری لئیرڈ (Sir Henry Layard) نے ایشائے کوچک[13] اور سر فلنڈرز پیٹرائی (Sir Flinders Petrie) نے مصر کے قدیم مقامات کی دریافت کے لیے بہت کام کیا۔

۱۷۲۰ء میں ہر ہیکلانیم[14] اور ۱۷۴۸ء میں پامپائی[15] کی دریافت نے کلاسیکل آرکیالوجی کے نئے ابواب کھولے۔ والٹیئر، ہیوم اور گبن کے ادوار میں علم آثار قدیمہ کی روح دریافت کرنے کے نئے اصولوں اور طریقوں سے زیادہ بہرور ہوئی۔

۱۷۵۲-۵۴ء کے دوران کونٹ ڈی کیلس (Count de Caylus) کی سات جلدوں پر مشتمل "تاریخ قدیم" منظر عام پر آئی۔ اس کے ایک عشرہ بعد جے۔ جے وینکلمین (J.J. Winckelmann) کی "تاریخ قدیم آرٹ[16]" شائع ہوئی۔ یہ دونوں ماہر اور محقق کلاسیکل آرکیالوجی کے موجد کہلاتے ہیں۔

اہل برطانیہ علم آثار قدیمہ کو تین ادوار پر منقسم کرتے ہیں۔ پہلا دور سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں کا ہے۔ جان ایبری[17] اور ولیم سٹکلے[18] نے پرانی یادگاروں کی کھدائی کر کے ان سے دریافت ہونے والے آثارات کی تاریخی اہمیت اور ان کے خدوخال کو بیان کیا۔

دوسرا دور انیسویں صدی کا ہے جس میں کیننگٹن اور کولٹ ہور[19] نے قدیمی یادگاروں اور آثارات کو جمع کیا۔ انیسویں صدی میں کھدائی زیادہ بہتر اصولوں اور سازو سامان کے ساتھ کی جانے لگی۔ اب دریافت ہونے والے آثارات کی تاریخی اہمیت علم ارضیات اور علم حیاتیات کے سائنسی اصولوں کے مطابق کی جانے لگی۔

تیسرا دور انیسویں صدی کے اختتام کا سائنسی دور ہے۔ اس میں قدیم مقامات و آثارات کا معائنہ اور مطالعہ سائنسی ذرائع کے مطابق ایک مخصوص مہارت اور علم کے ساتھ کیا جاتا۔ جنہیں پٹ ریورز اصول (Pitt Rivers Methods) کہا جاتا ہے۔ جنگ عظیم اول و دوئم کی تباہ کاریوں سے قدیم مقامات و آثارات کو شدید نقصان پہنچا۔ آثار قدیمہ کے لیے علم الاقوام، نقشوں کا علم اور ثقافتی و معاشرتی علم الانسان کا ہونا ضروری ہے۔

علم آثار قدیمہ خود ایک سائنس ہے۔ اس شعبہ میں وہ افراد کام کرتے ہیں جنھوں نے اپنے پیشہ میں فنی تربیت حاصل کی ہوتی ہے۔ مورخ ماہر آثار قدیمہ کی رائے پر کافی انحصار کرتا ہے۔ اس کا ماہر بتاتا ہے کہ دریا کے کنارے سندھ ایک قدیم ٹیلہ کب اور کیوں آباد تھا؟ یہاں پر کس نسل، قبیلہ اور قوم کے افراد آباد تھے۔ یہ لوگ کہاں سے آئے تھے؟ ان کا رہن سہن کیسا تھا؟ کس قسم کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گھروں میں یہ لوگ رہتے تھے؟ اپنے دشمنوں کے خلاف کس طرح کا دفاع اختیار کرتے تھے؟ کتنی تعداد میں تھے اور بالآخر ان کے ساتھ کیا ہوا؟ ان کی تہذیب کیوں کر ختم ہو گئی؟ ان سوالات کا جواب اندازوں سے نہیں بلکہ سائنسی طریقوں اور کیمیائی تجزیوں کے ذریعے حاصل ہوتا ہے جو تاریخی خلاء کو پر کرنے میں مدد دیتا ہے۔

جہاں پر تاریخ مبہم دھندلکوں کا شکار ہو جائے یا زمانہ قدیم کی حقانیت کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں تو تاریخ کا راستہ واضح کرنے کے لیے آثار و باقیات مددگار و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ رسکن کا بیان ہے کہ:

> "کسی عہد کی عمارات و آرٹ اس عہد کے لوگوں کے اخلاقی و روحانی جذبات' ان کے عادات و اطوار اور قومی تصورات و خیالات کو آشکار کرتا ہے[2]۔"

آثار قدیمہ کا مطالعہ تاریخ قدیم کے لیے ناگزیر حیثیت رکھتا ہے۔ امریکہ جیسے نئے آباد ملک میں جارج واشنگٹن' ابرہیم لنکن اور مارک ٹون کے گھروں کو جہاں پر انہوں نے بچپن کے ایام بسر کیے' بطور یادگار محفوظ کر رکھے ہیں۔ کولمبس سے پہلے امریکہ میں ریڈ انڈین اور دیگر باشندوں کی قدیم آباد کاری اور سرگرمیوں کا باقاعدہ ریکارڈ نہیں ملتا۔ لہٰذا ہم کولمبس سے قبل کے امریکہ کو دور قبل از تاریخ قرار دیکر اس عہد کے باشندوں کی تاریخ مفروضات پر قائم کرتے ہیں۔ چونکہ قدیم آثارات و کھنڈرات سے قبل تاریخ کے حالات کی تصویر سامنے آ جاتی ہے لہٰذا آثارات قدیمہ کی مدد سے عہد قدیم کی تاریخ کو مرتب کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ علم آثار قدیمہ زمانہ قبل از تاریخ کا بہترین نعم البدل ہے۔

میوزیالوجی
Museology

میوزیالوجی سے مراد وہ علم و فن ہے جو قدیم اشیاء اور نوادرات کو کسی مخصوص عمارت "میوزیم" میں منظم طریقہ سے محفوظ رکھنے کے طریق کار سے آگاہ کرے۔ میوزیم وہ عجائب خانہ ہے جہاں پر قوموں اور تہذیبوں کے قدیم آثارات اور ورثہ کو محفوظ رکھا جاتا ہے۔ جس طرح سے مدفون آثارات کو کھود کر نکالنے کے لیے فنی صلاحیت اور علم کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح میوزیم میں قدیم اشیاء کا بندوبست کرنے' انہیں محفوظ رکھنے اور ان کی نمود و نمائش کرنے کے لیے بھی ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خاص فن اور مہارت درکار ہوتی ہے۔ یورپی ممالک میں فن میوزیم میں مہارت (Techniques) حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ تربیتی ادارے قائم ہیں۔ بعض ممالک میں میوزیم میں کام کرنے کے لیے ہر پوسٹ پر تعیناتی کے لیے قدیم علوم' قدیم زبانیں' تاریخ قدیم اور آثار قدیمہ میں خاص معیار تک تعلیم اور مہارت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ مختلف کورسز میں تربیت دی جاتی ہے اور مختلف علوم و فنون سکھائے جاتے ہیں مثلاً علم مجسمہ سازی' علم مسکوکات اور قدیم اشیاء' کپڑوں' اوزاروں اور فرنیچر وغیرہ کو سائنسی طریقہ کار سے محفوظ رکھنے کا علم وغیرہ۔ نیز قدیم عمارات' آثارات اور مقامات کی کھدائی اور کھدائی سے برآمد ہونے والے آثارات کو جاننے اور ان کی ابتداء و تاریخ (Date) کا علم بھی میوزیالوجی کے زمرے میں ہی آتا ہے۔ میوزیالوجی میں قدیم مصر' بابل اور نینوا میں عہد قدیم میں میوزیم کی ابتدا اور ترقی کے مختلف ادوار کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

عہد جدید میں علوم و فنون کے فروغ کی بدولت مختلف فنون اور آثارات کی وجہ سے میوزیم کی بھی مختلف اقسام نشوونما پا چکی ہیں مثلاً" ائیر میوزیم' نیول میوزیم اور آرمی میوزیم وغیرہ کی اصطلاحات و اقسام رواج پا چکی ہیں۔ اس کے علاوہ طبعی علوم کے میوزیم بھی وجود میں آ چکے ہیں۔ مثلاً" جیالوجیکل میوزیم' زوالوجیکل میوزیم' بوٹنیکل میوزیم اور سپیس سائنس میوزیم' آرٹ میوزیم' نیچرل ہسٹری میوزیم اور نیچر سائنس میوزیم وغیرہ۔

اب تو عوامی دلچسپی کے لیے ویکس میوزیم رواج پا رہا ہے مثلاً" انگلستان میں مادام تساؤو کے ویکس میوزیم (Wax - Museum) میں ہر بین الاقوامی سیاسی اور علمی اہم شخصیت کا ویکس مجسمہ قائم کیا جاتا ہے۔

یوں تو میوزیم کی بے شمار اقسام ہیں اور ہر علم و فن کے علیحدہ علیحدہ میوزیم قائم ہو گئے ہیں۔ ہر میوزیم میں متعلقہ شعبہ کے آثارات اور تحقیقات کو محفوظ رکھنے اور نمود و نمائش کے لیے تربیت یافتہ عملہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

مغربی اقوام کا میوزیم کے ذریعہ قدیم قوموں کی تہذیبوں کے آثارات و نوادرات کو جمع و محفوظ کر کے نمود و نمائش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ موجودہ نسلوں کو قدیم اقوام سے روشناس کرایا جائے اور ان کے علم میں اضافہ کیا جائے تاکہ وہ قدیم اور جدید وسائل' علم و فن' سائنس' معاشرتی ترقی اور نظریات کا موازنہ و تقابل کر سکیں۔

میوزیم قائم کرنے کا رواج تحریک احیائے علوم کے دور سے ہوا۔ سولھویں صدی عیسوی میں قدیم اشیاء' نوادرات' مجسمے' بادشاہوں' امراء اور جاگیرداروں کی مصوری اور نقاشی کو محفوظ کیا گیا۔ ۱۴۹۲ء میں نئی دنیاؤں کی دریافت کے بعد کولمبس بہت سی اشیاء اور نوادرات یورپ لایا تھا' ان سب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو میوزیم میں محفوظ کر لیا گیا۔

سولھویں صدی سے انیسویں صدی کے آغاز تک زیادہ تر میوزیم ذاتی حیثیت (Private) میں قائم کیے گئے جن سے واقف کار' دوست و احباب اور بڑے لوگ لطف اندوز ہوتے تھے۔ ان تک عوامی رسائی "تقریباً" ناممکن تھی۔ انیسویں صدی کے شروع میں پیرس میں ایک میوزیم کو محدود عوام (Limited Public) کے لیے کھولا گیا۔ جس نے بعدازاں عوامی دلچسپی کو جنم دیا اور انیسویں صدی کے آخر تک سرکاری اور ذاتی میوزیم عام لوگوں کے لیے کھول دیئے گئے۔ درحقیقت ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس کے بعد یورپی ممالک میں قومی میوزیم قائم کرنے کا ذوق و شوق پیدا ہوا اور انیسویں صدی کے وسط میں امریکہ اور یورپ کے ہر ملک میں قومی میوزیم قائم ہو گئے۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں آثار قدیمہ کے میوزیم' آرٹ میوزیم' نیچرل ہسٹری میوزیم' میوزیم آف اپلائیڈ سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی (Museum of Applied Sciences and Technology) اور انڈسٹریل میوزیم یورپ کے ہر ملک میں قائم ہو گئے۔

جاپان میں آٹھویں صدی عیسوی میں قائم ہونے والا "نارا نیشنل میوزیم" (بدھی خانقاہ Buddhist Shrine) دنیا کا قدیم ترین میوزیم تصور کیا جاتا ہے۔ دنیا کا سب سے مشہور "برٹش میوزیم" ۱۷۵۳ء میں قائم ہوا۔ مختلف علوم میں تحقیق کے لیے یہ بے مثال عجائب خانہ کتب و دستاویز ہے۔

برٹش انڈیا میں "انڈین میوزیم آف کلکتہ" ۱۸۱۴ء میں قائم ہوا۔

کراچی میں "وکٹوریہ میوزیم" ۱۸۵۱ء میں قائم ہوا۔

لاہور میں "لاہور میوزیم" ۱۸۶۴ء میں قائم ہوا۔

پشاور میں "پشاور میوزیم" جو کہ گندھارا آرٹ کے لیے مشہور ہے ۱۹۰۷ء میں قائم ہوا۔

محکمہ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی ۱۹۷۰ء کے بعد مختلف نمایاں مقامات (Major Sites) پر میوزیم قائم کئے گئے۔ ان میں **بھنبھور**' موہنجوڈارو' ہڑپہ' عمرکوٹ' بہاول پور' ٹیکسلا' سوات اور دیر زیادہ مشہور ہیں۔

لاہور میں پرائیوٹ "فقیر خانہ میوزیم" ۱۹۳۷ء میں قائم ہوا۔ یہ فیملی میوزیم ہے اور اس میں تمام اشیاء اور نودرات سکھ دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

ڈیرہ نواب صاحب کے مقام پر (احمد پور شرقیہ کے قریب) ایک پرائیوٹ میوزیم "سلطانی میوزیم" ہے جس کے قائم ہونے کی حتمی تاریخ کا علم نہیں مگر یہ میوزیم ۱۹۳۸ء سے لازمی طور پر قائم ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسی طرح ایک اور پرائیوٹ فیملی میوزیم حیدر آباد کے قریب ٹنڈو نور محمد میں "تالپور ہاؤس میوزیم" قائم ہے۔ یہ سندھ کی سابق حکمران فیملی کے نوادرات ہیں۔ ان اشیاء کا تعلق اس عہد سے ہے جب تالپور ہاؤس کی یہ عمارت ۶۴ - ۱۸۶۰ء میں تعمیر کی گئی تھی۔ افسوس کہ یہ میوزیم ابھی تک عوام کے لیے نہیں کھولا گیا۔ وقتاً فوقتاً تالپور فیملی اسے بڑے بڑے لوگوں اور ملکی و غیر ملکی اعلیٰ مہمانوں کے لیے کھولتی ہے۔

کوئٹہ کا میکمن میوزیم (Mac Mahon Museum) ۱۹۳۵ء کے زلزلہ میں تباہ ہو گیا تھا۔ سابق امیر بہاول پور نے ۱۹۴۵ء میں بہاول پور میں "نیچرل ہسٹری میوزیم" قائم کیا۔ اس کے علاوہ حکومت پاکستان کی وساطت سے مندرجہ ذیل میوزیم قائم کیے گئے ہیں۔

فیصل آباد میں "ایگریکلچرل میوزیم" ۱۹۰۹ء (برٹش انڈیا) میں قائم ہوا۔

لاہور میں "انڈسٹریل اینڈ کمرشل میوزیم" ۱۹۵۰ء میں قائم ہوا۔

ایبٹ آباد میں "فارسٹ میوزیم" ۱۹۵۲ء میں قائم ہوا۔

کراچی میں "آرکیالوجی میوزیم" ۱۹۵۵ء میں قائم ہوا۔

کراچی میں "نیچرل ہسٹری میوزیم" ۱۹۵۰ء میں قائم ہوا۔

حیدر آباد میں "ایجوکیشن میوزیم" سندھ یونیورسٹی میں ۱۹۵۹ء میں قائم ہوا۔

لاہور میں "علامہ اقبال میوزیم" ۱۹۶۰ء میں قائم ہوا۔

سیالکوٹ میں "علامہ اقبال میوزیم" ۱۹۷۷ء میں قائم ہوا۔

کراچی میں "قائداعظم میوزیم" ۱۹۵۳ء میں قائم ہوا۔

لاہور میں "دی نیشنل میوزیم آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی" ۱۹۷۶ء میں قائم ہوا۔

لاہور میں "چغتائی میوزیم" ۱۹۷۷ء میں قائم ہوا۔

گدو کے مقام پر "گدو بیراج میوزیم" قائم ہوا۔

میوزیالوجی کے وسیع فن کے پیش نظر پاکستان میں بیشمار فنون کے ابھی تک کئی میوزیم قائم نہیں کئے جا سکے مثلاً میوزیم علم الاقوام اور نسل انسانی (Ethnological Museum)، نیشنل میوزیم، ہسٹری میوزیم، میوزیم علم الانسان (Anthropological Museum)، چلڈرن میوزیم، ہم عصر آرٹس میوزیم، فائن آرٹس میوزیم، مرکنٹائل میوزیم، کرافٹ میوزیم اور فوک آرٹ میوزیم (Folk Art Museum) موجود نہیں ہیں۔ اگرچہ کچھ عرصہ پہلے حکومت پاکستان نے اسلام آباد میں "لوک ورثہ ثقافتی میوزیم" (Folklore And Cultural heritage) قائم کیا۔ مگر پھر بھی ہمیں وسیع تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب میوزیم بعذریہ سلائیڈز' مائیکرو فلمز' مائیکرو فش' فلموں' مصوری اور فوٹوگرافی کے قومی نوادرات' کلچر اور دستاویزات کو محفوظ رکھ رہے ہیں۔ ماہر میوزیم کو ان جدید فنی مہارتوں اور فنون کا بھی ماہر ہونا چاہیے۔ میوزیم کا فرض اولین ہے کہ یہ لوگوں کو تعلیم و مسرت مہیا کرے۔ دوئم یہ کہ محققین کو ماضی کے مواد' آثارات' نوادرات اور دستاویزات کو پرکھنے اور مطالعہ کرنے کا موقع فراہم کرے۔

میوزیالوجی میں میوزیم کے علاقائی' مقامی اور قومی فرائض کا فرق معلوم ہونا چاہیے۔ نیز میوزیم کی عمارت ' سروس' اسٹور' محفوظ خانہ' نمائش' ریکارڈنگ' محافظت' فوٹو گرافی' تعلیمی سروس' اشاعت' لائبریری' ایڈیٹوریم' کمرشل حصوں' ورکشاپ' مہمانوں اور ملاقاتیوں کی سہولتوں (Facilities for Visitors) کا علم ہونا چاہیے۔

مسکوکات

Numismatic

تاریخی حقائق کے تعین میں سکوں کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں۔ آج کل سکوں کا مطالعہ ایک علم اور فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ قدیم تاریخ نویسی میں تاریخی خلاء کو پر کرنے میں سکے اہم معاون کی حیثیت رکھتے ہیں اور اپنے مخصوص عہد کے متعلق معلومات کا بیش بہا خزانہ لیے ہوتے ہیں۔ سکوں پر "عموماً" جاری کنندہ حکمران کا نام' مقام' سن اور کوئی شناختی علامت یا عبارت موجود ہوتی ہے۔ مختلف زمانوں میں سکوں کے اوزان اور ڈھلائی کی نوعیت مختلف رہی ہے۔ قدیم سکوں پر دیوتاؤں' بادشاہوں' جانوروں اور پرندوں کی تصاویر کندہ ہیں اور بعض پر مختلف نشانات ابھرے ہوئے ہیں جو اپنے عہد کی سماجی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ مختلف حکمران تخت نشینی کے وقت سکے جاری کرتے رہے ہیں جن سے ان کا عہد حکومت معلوم کیا جا سکتا ہے۔

سکے تاریخوں کا تعین کرنے میں مورخین کی بڑی مدد کرتے ہیں "مثلاً" موریہ خاندان کے سکے جو پاٹلی پترا سے برآمد کیے گئے ہیں اس عہد کی تاریخ کا بہت اہم ماخذ ہیں۔ اس طرح سمندر گپت اور راجہ کنشک کے سکے ان کی شخصیتوں کے آئینہ دار ہیں۔ غرضیکہ سکوں کے مطالعہ سے حاصل کی ہوئی معلومات سے ہم تاریخ کے مطالعہ میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتے ہیں۔

دنیا کے قدیم ترین سکے ایران' یونان اور رومہ کے ہیں جو وافر مقدار میں دستیاب ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں تغلق اور مغل بادشاہوں کے عہدوں کے سکے بکثرت موجود ہیں۔ سلطان محمد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تغلق نے بہت سے سکے بنوائے جو وضع اور تراش میں پہلے بادشاہوں کے سکوں سے بہت مختلف ہیں- ان سکوں کو دیکھ کر محمد تغلق کی جدت پسندی کا پتہ چلتا ہے- سکے مندرجہ ذیل تاریخی اہمیت اور خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں-

(1) سکوں کی مدد سے تاریخ کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں بڑی مدد ملتی ہے- بعض سکے تو کسی عہد کی تاریخ اور دور حکومت پر بہترین تبصرہ ہوتے ہیں-

(2) سکے اپنے مخصوص عہد کے متعلق معلومات کا بیش بہا خزانہ ہوتے ہیں-

(3) سکوں کی مدد سے مختلف حکمرانوں کی وسعت سلطنت کے بارے میں معلومات میسر آتی ہیں- جس جس علاقے اور مقام سے کسی حکمران کے نام اور عہد کے سکے دستیاب ہوں گے' ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ وہ علاقے اس کی سلطنت میں شامل ہوں گے-

(4) سکوں کی مدد سے اس زمانہ کے لوگوں کی فنی مہارت کا پتہ چلتا ہے- سکے مختلف دھاتوں سے بنائے جاتے ہیں- بعض سکے ایک سے زیادہ دھاتوں کے مرکب سے تیار کیے جاتے تھے- یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ قدیم عہد کے لوگ دھاتوں کے مرکب کے استعمال سے واقفیت رکھتے تھے-

(5) سکوں کی مدد سے تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا پتہ چلتا ہے- عہد قدیم کے سکے شکل و صورت کے لحاظ سے بھدے ہیں- ان کی ساخت میں بہت کم نفاست ہے- زمانے کی ترقی کی رفتار کے ساتھ ساتھ سکہ سازی میں بھی تبدیلی رونما ہوتی گئی- شاہجہان' اورنگ زیب اور ان کے جانشینوں کے عہدوں کے سکے اپنی نفاست اور فنی معیار کے لحاظ سے اپنے سے پہلے حکمرانوں کے سکوں سے بہت ہی بلند پایہ ہیں- لہٰذا یہ سکے انسانی تہذیب کے ارتقاء کی ایک جھلک دکھاتے ہیں-

(6) بعض سکے کسی تہذیب کی کہانی سناتے ہیں اور کسی خاص تاریخی عہد کی نقاب کشائی کرتے ہیں مثلاً" مغل شہنشاہ جہانگیر پر اس کی ملکہ نور جہاں کے اثر و رسوخ اور انتظام سلطنت میں اس کے عمل دخل کا اندازہ عہد جہانگیری کے ان سکوں سے لگایا جا سکتا ہے کہ جن پر شہنشاہ جہانگیر کے ساتھ نور جہاں کا نام بھی نقش ملتا ہے-

(7) سکوں سے کسی عہد حکومت کی معاشی حالت کا بھی اندازہ ہوتا ہے- سکے اگر وزن دار اور قیمتی دھات مثلاً" سونے چاندی کے ہوں گے تو یہ اس عہد حکومت کی معاشی خوشحالی کو ظاہر کریں گے- سکے اگر کم وزن اور ارزاں دھات مثلاً" تابنے' کانسی اور لوہے کے ہوں گے تو یہ اس حکومت کی معاشی بدحالی کی دلیل سمجھے جائیں گے- ہو سکتا ہے ایسی حکومت سیاسی اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فوجی لحاظ سے بھی کمزور ہو اور روبہ زوال بھی ہو۔

غرضیکہ سکوں کی تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ سکے تاریخی مواد اور عہد کو زیادہ صحت کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جس عہد کی تاریخ نامعلوم ہو اور وہاں کی تاریخ کے تسلسل میں خلاء پایا جاتا ہو تو سکے تاریخی معاون کی حیثیت سے اس عہد کی تاریخ کے تسلسل کو مکمل کرنے اور جاری و ساری رکھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں اور بہت حد تک ایک خاص عہد کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ سکوں کو معلوماتی جامعیت کا درجہ کبھی نہیں دیا گیا۔ ان کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر مسکوکات کو تاریخ کے ذیلی علوم میں شمار کیا گیا ہے۔

قدیم زمانوں کے سکوں کو ہر ملک نے اپنے قومی عجائب گھروں میں نہایت منظم طریقوں سے نفاست کے ساتھ ترتیب دے رکھا ہے۔ ان سکوں کے ساتھ ساتھ ان کی تاریخی اہمیت کو بھی تحریری طور پر رکھا جاتا ہے تاکہ تاریخ میں دلچسپی رکھنے والے افراد ان سے خاطر خواہ استفادہ کر سکیں مثلاً" وکٹوریہ میوزیم لندن میں دنیا کے ہر حصے سے دستیاب ہونے والے سکوں کو نہایت اعلیٰ ترتیب کے ساتھ رکھا گیا ہے جو تاریخ کے شائقین کو بہت حد تک تاریخ کے مختلف ادوار کے بارے میں خاطر خواہ معلومات فراہم کرتے ہیں۔ لاہور اور کراچی میوزیم میں برصغیر پاک و ہند کے عہد قدیم سے موجودہ پاکستانی دور تک مختلف شہنشاہوں کے عہدوں کے سکوں کو جدید ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اگرچہ کراچی میوزیم میں سکوں کا ذخیرہ لاہور میوزیم کے مجموعہ سے کہیں زیادہ ہے لیکن کراچی میوزیم میں سکوں سے استفادہ کے لیے کوئی تحریری گائیڈ موجود نہیں جبکہ لاہور میوزیم میں سکوں کی جدید ترتیب و نمائش کے لیے ایک گیلری مختص ہے جہاں پر برصغیر پاک و ہند اور جنوبی ایشیاء کا پانچویں صدی قبل مسیح سے موجودہ پاکستانی دور تک جنوبی ایشیائی ملکوں کا سب سے بڑا مجموعہ موجود ہے۔ لاہور میوزیم میں جنوبی ایشیاء کے ہر حصے سے ملنے والے قدیم و جدید سکوں کو خاص نفاست اور ترتیب کے ساتھ اس طرح رکھا گیا ہے کہ وہ بہت حد تک ایک خاص عہد اور اس کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال سکیں۔ تاریخ کے شائقین اور سیاحوں کو سکوں کی اہمیت سے روشناس کرانے کے لیے تحریری گائیڈ بھی موجود ہے۔

مصوری

Painting

مصوری سے مراد تصویر کشی یا تصویریں بنانے کا فن ہے۔ تصویر بنانے والے کو مصور،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آرٹسٹ اور نقاش کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ سے ایک نام المصور بمعنی شکل و صورت بنانے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ صفاتی نام قرآن مجید میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے:

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ (۵۹ [الحشر]: ۲۴)

یعنی وہی اللہ پیدا کرنے والا، وجود بخشنے والا، شکل و صورت بنانے والا ہے۔ اس کے بڑے اچھے اچھے نام ہیں۔

اسلام نے عقیدۂ توحید کے ساتھ اس بات کا بھی اعلان کیا کہ ہر چیز کا خالق (پیدا کرنے والا) اللہ تعالیٰ ہے۔ اس نے ہر شے کو وجود بخشا اور ہر چیز کو مناسب اور موزوں شکل و صورت عطا کی۔ قرآن مجید میں فرمایا:

هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ (۳ [آل عمران]: ۶)

یعنی وہی تو ہے جو ماں کے پیٹ میں تمہاری شکل و صورت بناتا ہے، جس طرح چاہتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ (۷ [الاعراف]: ۱۱)

یعنی ہمیں نے تم کو پیدا کیا، پھر ہمیں نے تمہاری شکل و صورت بنائی۔

اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنا مزید احسان جتاتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے تمہاری شکل و صورت بنائی اور بہت خوب بنائی، یعنی شکل و صورت میں اور زیبائش و جمال کو خاص انعام و اکرام میں شمار فرمایا:

یعنی اسی اللہ نے تمہاری شکل و صورت بنائی اور تمہاری صورتوں کو بہت خوب بنایا۔

اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ صفت تخلیق و تکوین اور ایجاد میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی مادہ و روح اور صورت و ہیولیٰ سب کا موجد اور خالق ہے۔ وہی ہر چیز کو عدم سے وجود میں لاتا ہے اور نیست سے ہست بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنا ارادہ اور مشیت ہے۔ اس کی اپنی حکمت ہے اور اس کے مطابق عمل تخلیق جاری و ساری ہے۔ انسان و حیوانات کی تخلیق و ترکیب کسی حادثے یا اتفاقی اجتماع عناصر کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس کے پیچھے مشیت الٰہی اور حکمت رب العالمین کارفرما ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی تمام موجودات کو عدم سے معرض وجود میں لاتا ہے۔ وہی شکلوں اور صورتوں سے نوازتا ہے۔ اس نے ان گنت شکلیں بنائی ہیں، لیکن اس کی کبریائی اور خالقیت اور مصوریت کا کمال ہے کہ کثرت مخلوقات کے باوجود ہر انسان کی شکل و صورت اپنی منفرد ہیئت کی وجہ سے دوسرے سے ممتاز اور الگ ہے۔

صورت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے عرب لغت نویس لکھتے ہیں کہ کسی مادی چیز کے ظاہری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خدوخال اور نشان جن سے اسے پہچانا جا سکے اور دوسری چیزوں سے اس کا امتیاز ہو سکے۔ صورت کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ (1) محسوس' جن کا ہر خاص و عام ادراک کر سکتا ہے' بلکہ انسان کے علاوہ بہت سے حیوانات بھی اس کا ادراک کر سکتے ہیں جیسے انسان' گھوڑا گائے وغیرہ کی صورتیں دیکھنے سے پہچانی جا سکتی ہیں۔ (2) معقول یعنی صورت عقلیہ' جس کا ادراک خاص خاص لوگ ہی کر سکتے ہیں' اور عوام کے فہم و ادراک سے بلند و بالا ہوتی ہے' جیسے انسانی عقل و فکر کی صورت یا وہ خصائص جو ایک چیز میں دوسری چیز سے الگ پائے جاتے ہیں۔

مصوری اور خطاطی میں جو قدر مشترک سمجھی جاتی ہے وہ فنکار کی سوچ ہوتی ہے وہ اسلامی نقطہ نظر سے ایک جذبے سے سرشار ہو کر اپنے قلم اور برش سے ایک نیا تخیل پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے اسلامی فن پاروں میں قلم اور موقلم کا حسن جگمگاتا ہوا نظر آتا ہے۔ تاریخ اسلام میں فن کتابت کے سلسلے میں جو پہلا نام نظر آتا وہ خالد بن ابی الھیاج کا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس فن کی ابتدا شاید پہلے عربی زبان ہی میں ہوئی۔

قرآنی آیات کی خطاطی میں کسی کے ہاں اسلامی تعمیرات کا عکس جھلکتا ہے تو کہیں رنگوں سے قوس و قزاح پیدا کرتا نظر آتا ہے۔ کیونکہ گذشتہ برسوں سے قرآنی آیات کی مصورانہ خطاطی نے جو ترقی کی ہے اس میں اسلامی خطاطی کی تصاویر کو بھی بڑا دخل ہے۔ قرآنی آیات اور اسلامی فن تعمیر میں اسے ایک خاص مقام حاصل ہے۔

جب ہم تاریخ میں فنون لطیفہ کی ترقی پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کی ترقی میں بادشاہوں اور امراء کا ہاتھ نمایاں نظر آتا ہے۔ اور یہ ان کی سرپرستی میں پروان چڑھا۔ تہذیب و تمدن کے ساتھ پروان چڑھنے والے فنون میں مصوری نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تہذیب و تمدن کی ترقی میں کس حد تک مصوری کو عمل دخل حاصل ہے؟ یہ کس حد تک اپنے وقت میں عوام کی نمائندہ رہی ہے اور اس سے کس حد تک عوام کو فائدہ پہنچا؟ یا اس نے عام آدمی کی ذہنی تربیت میں کیا کردار ادا کیا؟

فن مصوری ہر دور میں کسی حد تک شخصی اور ذاتی قدروں پر قائم ہوا ہے۔ اس میں ہر دور کا ایک خاص انداز' طریقہ ' روشنی اور ثقافتی رنگ جھلکتا ہے۔ فن مصوری ہر دور میں معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں ہر عہد کے خاص و عام کے تصورات و نظریات جھلکتے ہیں۔ مصوری کے فن پاروں کو دیکھ کر اس عہد کی شان و شوکت' ذہنی اختراع اور بالیدگی کا احساس ہوتا ہے۔ مصوری ایک پیمانہ ہے جس سے کسی دور کی ثقافت کو ناپا جا سکتا ہے۔ اس سے معاشرے کی سیاسی' اقتصادی' سماجی' مذہبی اور ثقافتی زندگی کے بارے میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عہد قدیم میں غاروں، مندروں، کلیساؤں اور دیگر مذہبی خانقاہوں سے ملنے والی تصاویر اس عہد کے معاشرتی تصور اور ذہنی شعور کی نمائندگی کرتی ہیں۔ دور بادشاہی میں بادشاہ قوت و طاقت کا سرچشمہ تھے اور وہ اپنی رعایا کے ذہنوں کو مرعوب کرنے کے لیے اپنی شان و شوکت کا اظہار چاہتے تھے۔ لہٰذا دور بادشاہت کے مصوروں نے حکمرانوں، جاگیرداروں اور طبقہ امراء کے محلات، باغات، قلعوں، مقبروں، مسجدوں، درباروں، فتح کی یاد میں تعمیر ہونے والی عمارتیں اور مینار، حرم کی زندگی، شاہی استعمال کی سواریوں، پرندوں، جانوروں، اشیاء اور شہزادوں و شہزادیوں کے روز و شب کو اپنا موضوع بنایا ہے اور ان کو خوبصورت اور عالی شان منظر کے ساتھ محفوظ کیا ہے۔ ایسی تصاویر شاذ و نادر ہی ملتی ہیں جن کا مقصد طبقاتی مفاد کے علاوہ عوامی مفاد یا بہبود ہو یا جن سے عوامی ثقافت کی جھلک نظر آئے۔

عہد جدید میں اقدار و روایات بدل گئیں ہیں۔ اب بادشاہ اور امراء مصوروں کا موضوع انتخاب نہیں۔ اب ان کا انتخاب قانون فطرت کے تحت عمل میں آنے والے قدرتی خوبصورت مناظر ہیں اور مصور اپنے اردگرد ہر شئے کو حسین و خوبصورت انداز میں پیش کر رہا ہے۔ تاریخ تہذیب و ثقافت اور اقدار و روایات کی تبدیلیوں کی نگہبان ہے۔

عہد جدید کا مصور مظاہرات فطرت سے بڑی حد تک متاثر ہے۔ آج کا مصور انسان اور فطرت کے تعلق پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ مختلف موسموں، گردش لیل و نہار، خوبصورت باغوں، پہاڑوں، دریاؤں، سمندروں، جنگلوں، صحراؤں، جانوروں اور فطرت کے مختلف کرداروں پر جو زندگی کی تعمیر میں حصہ لے رہے ہیں اور مظاہر قدرت میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں، کے متعلق خیالات و نظریات پیش کر رہا ہے۔ گوئٹے نے ایک جگہ کہا ہے کہ "تاریخ بھی فطرت کی طرح ہے، یہ بھی ہر وقت بنتی اور بگڑتی رہتی ہے۔ اس کی تعمیر اور شکست سے تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔"

۱۹۴۷ء سے پہلے برصغیر پاک و ہند میں مصوری کی روایت آزاد نہ تھی بلکہ مغربیت کی اندھی تقلید تھی۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کا مصوری کا دور انتہائی رنگا رنگ ہے اور بین الاقوامی میلانات کے اثرات کا حامل ہے اور اجتماعی روایت کا حصہ ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان کی مصوری میں سیاسی، مذہبی اور اخلاقی پہلو کھل کر سامنے آئے، قومی نظریات نے فروغ پایا، یہ مغرب کی تقلید سے آزاد ہوئی اور اس میں انفرادیت قائم ہوئی۔

پاکستانی مصوروں کی تصویروں میں اخلاقی پہلوؤں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ان میں ہیئت پرستی، مبہم اور پراسرار میلانات نظر نہیں آتے۔ اگرچہ بسا اوقات یہ مصور بعض پرانی روایات کی ہنسی بھی اڑاتے نظر آتے ہیں۔ ان کی تصویروں میں بیانیہ پہلو اور علامتیں جرات آمیز انداز میں سامنے آتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں۔ ادیبوں کی طرح مصوروں نے بھی رنگوں کی زبان میں نظریات اور فکر کے احساسات و سوالات کو پیدا کیا ہے۔

اب مصوری شوکت پسندی کی علامت نہیں رہی بلکہ سلسلہ حیات کو قائم رکھنے کا ذریعہ بھی ہے۔ اگرچہ پاکستان میں مصوری سے زیادہ خطاطی نے ترقی کی ہے مگر اس کے باوجود پاکستان میں اچھے مصوروں کی کبھی بھی کمی نہیں رہی۔ صادقین کی شہرت تو عالمی سرحدوں کو چھوتی ہے۔ اس کے علاوہ عبدالرحمٰن چغتائی' زین العابدین' شاکر علی' علی امام' قطب شیخ' گل جی اور سلیمہ ہاشمی بھی اعلیٰ مصوروں کی صف میں شامل ہیں۔ لاہور کے مصوروں کی تصویروں میں فکری عنصر زیادہ نمایاں ہیں اور تخلیقی پہلو بھی زیادہ طاقتور ہیں۔ ان کی مصوری مشرقی' پاکستانی اور برصغیر کی روایات کی حامل ہے۔ لاہور کے عجائب گھر میں تصاویر کی ایک الگ گیلری قائم کی گئی ہے۔

خطاطی
Calligraphy

مسلمان صرف عمدہ کتابوں کے مصنف ہی نہ تھے بلکہ کتب کو جمع کرنے اور انہیں مفاد عامہ کے لیے مرتب لائبریریوں کی صورت میں رکھنے کے شوقین بھی تھے۔ ان کا یہ جذبہ جنون کی کیفیت اختیار کر گیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ذاتی لائبریریوں کو وقار کا باعث بھی سمجھتے تھے۔ اس کے نتیجہ میں مختلف اسلامی علوم و فنون کو ترقی ملی جن میں خطاطی سرفہرست ہے۔

اسلامی خطاطی جملہ فنون لطیفہ میں بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ کلام اللہ سے منسلک ہونے کی بناء پر یہ فن اپنے تقدس کی وجہ سے تمام فنون سے بالاتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں "علم" اور "قلم" کے ذکر کو یکجا کر کے اسے وقار بخشا ہے۔ اسی وجہ سے اسلامی تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں نے خطاطی کو اختیار کرنا عین عبادت سمجھا۔ خطاطی ایک ایسا فن ہے جو انسان کے ذوق جمال کی تسکین کرتا ہے اور اپنے اندر ایک رعنائی دلکشی اور دل پذیری رکھتا ہے اور خطاطی کی اس اہمیت کی بناء پر اس کا سیکھنا دین اسلام میں لازمی قرار دیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں قرآن مجید کی سورۃ العلق میں ارشاد ہوتا ہے:

اقرأ وربك الاكرم الذی علم بالقلم

"پڑھ تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین اسلام کی ترویج و اشاعت کے لیے خط کو اہم رکن گردانتے ہوئے اپنے اقوال و افعال میں اس کی اہمیت اور تربیت پر نہایت زور دیا ہے۔ آپ کی حدیث مبارکہ ہے کہ:

"جس کسی نے بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو **خوشخطی** سے لکھا وہ جنت میں داخل ہو گا۔"

آپؐ کے بعد صحابہ کرامؓ نے خط کی ترقی و ترویج کے لیے ہر طرح کے انتظامات فرمائے۔ اسی سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ:

"اپنی اولاد کو لکھنا سکھاؤ، کیونکہ لکھنے والے لوگ ہی حاکم اور بادشاہ ہوں گے۔"

ایک اور جگہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ارشاد فرمایا:

"حسن خط اختیار کرو کیونکہ یہ رزق کی کنجی ہے۔"

اسلامی خطاطی اپنے آغاز ہی سے نہایت اہم رہی ہے۔ یہ اس کی فطرت ازلی ہے کہ یہ زمانہ کے زیر و بم کے باوجود آج بھی اپنی تمامتر رعنائیوں کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ اسلامی خطاطی جملہ اسلامی فنون کو ایک پرکشش فن کی حیثیت سے متعارف کراتی ہے۔ اس کا مشاہدہ ہمیں نقاشی، طلا کاری اور صنعت روشنائی، کاغذ سازی جیسے فنون سے روشناس کراتا ہے۔ خطاطی کے محفوظ ذخیرے محققین کو تحقیق کے نئے نئے موضوعات سمجھاتے اور جدید تحقیق کے لیے راہیں استوار کرتے ہیں۔ جب ہماری نظر اسلاف کے فن پاروں کا مشاہدہ کرتی ہے تو ان کے حسن و جمال سے ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

فن خطاطی کی اہمیت کے پیش نظر مسلمانوں نے اسے ہر دور میں ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرنے کی تگ و دو کی۔ ایک زمانہ تھا کہ تعلیم اور خوشخطی باہم لازم و ملزوم تھے اور خوشخط ہونا پڑھے لکھے ہونے کی علامت سمجھا جاتا تھا مگر مادی دور میں خطاطی کا یہ فن پس پردہ چلا گیا۔

اسلامی خط کو بڑے بڑے جلیل القدر شہنشاہوں نے سینے سے لگایا اور اس کی ترقی کے لیے عملاً سرپرستی کی۔ اسی طرح ان کے امراء نے بھی خطاطی کی ترقی کے لیے فراخدلانہ سلوک کیا۔ یہ ایک معجزہ ہے کہ چودہ صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی یہ فن زندہ و تابندہ ہے بالخصوص آج کے مادی دور میں قابل [illegible] وہ خطاط جو دیدہ ریزی اور اپنی انگلیوں کی آہنی گرفت سے قلم کو جنبش

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیتے اور حروف کی نوک پلک کو سنوار کر انہیں نکھارتے اور باغ و بہار بناتے ہیں۔

اسلامی خطاطی کی ابتداء مدینہ منورہ سے ہوئی اور برصغیر میں اسلامی خطاطی محمد بن قاسم کی فتح سندھ (۸۶ھ / ۷۱۲ء) کے ساتھ شروع ہوئی۔ اس ابتدائی دور میں حکومت کا دائرہ اثر سندھ اور ملتان کے گرد و نواح تک محصور تھا۔ اس وقت اسلامی خطاطی قرآنی مخطوطات اور عمارتی کتبات تک محدود رہی۔ خط نستعلیق کی ایجاد سے قبل محمود غزنوی کے دور فتح لاہور (۴۱۳ھ) سے لے کر بابر کے فتح ہند تک کا عہد خط کوفی اور نسخ اور ان میں اختراعات تک محدود رہا۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ سلطان محمود غزنوی علم و فن کی قدر دانی میں اپنے تمام معاصرین میں پیش پیش تھا اور وہ ہر سال علماء، شعراء اور خوشنویسوں کی سرپرستی پر کثیر سرمایہ صرف کرتا تھا۔ اس نے غزنی میں ایک دارالعلوم بھی قائم کیا۔ سلطان مسعود بن سلطان محمود خطاطی میں اعلیٰ مہارت رکھتا تھا۔ وہ ہر سال اپنے ہاتھ سے دو قرآن پاک لکھتا تھا۔ ایک مکہ مکرمہ اور دوسرا مدینہ منورہ بھیجتا۔ اسی عہد کے دو خطاط جمال الدین لاہوری اور معزالاسلام نجیب الدین ابوبکر الترمذی کا ذکر عوفی نے اچھے الفاظ میں کیا ہے اور انہیں ابن مقلہ کی طرز پر لکھنے میں ماہر جانا ہے۔

خاندان غلاماں (۶۰۲ - ۶۸۹ھ / ۱۲۰۰ - ۱۱۰۷ء) سلاطین ہند کے دور حکومت میں علوم و فنون نے بے پناہ ترقی کی یہ لوگ شاعروں' ادیبوں' مورخوں' مصوروں' خطاطوں اور دوسرے باکمال لوگوں کی عزت افزائی کرتے' سلطان شمس الدین التمش (۶۰۷ - ۶۳۳ھ / ۱۲۱۰ - ۱۲۳۶ء) کا شمار بہترین خطاطان قرآن میں ہوتا ہے اسی طرح سلطان ناصرالدین محمود (۶۴۲ - ۶۶۴ھ ۱۲۴۵ - ۱۲۶۵ء) کا ذریعہ معاش خطاطی ہی تھا ۔ یہ سلطان قرآن مجید کی کتابت کے ذریعہ اپنے لیے رزق حلال کا سامان پیدا کرتا۔ سلطان محمد تغلق (۷۲۵ - ۷۵۲ھ / ۱۳۲۴ - ۱۳۵۱ء) بہت بڑا خطاط' جید عالم اور ماہر معاشیات تھا۔ سلطان غیاث الدین بلبن کا لڑکا شہزادہ محمد سلطان ایک بہترین خطاط تھا۔

نسخ اور ثلث چوتھی صدی ہجری میں رائج ہوئے۔ جبکہ نستعلیق تغلق عہد میں رائج ہوا۔ لیکن تاحال نستعلیق کا اجراء نہیں ہوا تھا۔ نستعلیق مغلیہ دور میں رائج ہوا اور اسی دور میں بعض نئے خطوط معرض وجود میں آئے جن میں خط بہار بھی شامل ہے۔ پانچویں چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں برصغیر میں کوفی کا زوال شروع ہوا۔ کتبوں میں کوفی کا استعمال کم اور قرآن نویسی میں خط نسخ کا استعمال عام ہونے لگا۔

تاریخ فیروز شاہی کے مطابق جو کاتب قرآن مجید لکھ کر بادشاہ کے سامنے پیش کرتے وہ اس کو ہدیہ دیتے اس طرح اجرت پر خطاطی کا رواج بھی تھا۔

برصغیر میں خطاطی کا ایک عظیم باب عہد مغلیہ ۱۵۲۶ء میں شروع ہو کر اورنگ زیب کے عہد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکومت ۱۷۰۷ء پر ختم ہوتا ہے- اس دور میں خطاطی کو بے حد فروغ ملا اکثر مغل حکمران یا تو خود ماہر خطاط تھے یا پھر خطاطی کے دلدادہ تھے- انہوں نے اس فن کی ترقی کے لیے دیگر فنون کی طرح اس فن پر بھی پوری پوری توجہ دی اور خطاط اساتذہ کی سرپرستی کی اور ان کے فن پاروں کو شاہی لائبریریوں میں سجایا- اس عہد میں آرائش عمارات کے طور پر جو خطاطی کی گئی وہ اپنی مثال آپ ہے- پہلا حکمران شہنشاہ بابر خط بابری کا موجد تھا- اسی زمانہ ہی میں نستعلیق برصغیر میں وارد ہوا جو اپنی خوبصورتی، کشش، نزاکت شستگی اور لطافت کے اعتبار سے نسخ سے کہیں زیادہ رواج پا گیا-

ہمایوں کے عہد (۹۳۷ھ - ۹۶۳ھ) میں مولانا شہاب الدین جن کے کتبے حضرت نظام الدین کے مزار پر موجود ہیں- اس کے علاوہ سلطان بھی مشہور خطاط تھے- شہاب الدین کے بیٹے کمال ابن شہاب کی کتاب کا نمونہ لاہور عجائب گھر میں موجود ہے-

عہد اکبری (۹۶۳ - ۱۰۱۴ھ) میں شاہی سرپرستی میں اس فن پر ترقی کی نئی راہیں کھل گئیں محمد اصغر ہفت قلم، خواجہ عبدالصمد شیریں قلم، محمد حسین کشمیری، راجہ ٹوڈرمل، مرزا عبدالرحیم خانخاناں، عبدالرحیم عنبریں قلم وغیرہ اس دور کے قابل ذکر خطاط ہیں-

جہانگیر نے بھی مشہور فنکاروں کی حوصلہ افزائی کی- شاہجہان کے چاروں بیٹے اعلیٰ پایہ کے خطاط تھے- اورنگ زیب نے قرآنی کتابت کو ذریعہ معاش بنایا اور زمانہ شاہزادگی ہی میں ایک قرآن پاک کتابت کر کے مسجد نبویؐ کے لیے ارسال کیا- تخت نشینی کے بعد بھی ایک قرآن پاک لکھ کر کعبتہ اللہ ارسال کیا- اس عہد کے ہدایت اللہ زریں رقم، سید علی جواہر رقم اور محمد باقر وغیرہ بلند پایہ خوشنویسوں میں شمار ہوتے تھے- ہدایت اللہ زریں رقم، شہزادگان کا خطاطی میں اتالیق تھا-

اورنگ زیب کے عہد سے بہادر شاہ ظفر کے عہد تک نستعلیق میں بڑے بڑے امام فن پیدا ہوئے- جن میں محمد افضل لاہوری جنہیں آقائے ثانی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے- محمد مقیم میر محمد موسیٰ سرہندی، مولوی حیات علی، محمد حفیظ قاضی، عصمت اللہ میر، عباد اللہ بیگ، حافظ محمد حسین لاہوری، محمد عارف یاقوت رقم، میر کدائی، حافظ ابوالحسن، میر کرم غنی، حافظ مسعود، عنایت اللہ اور اردو کے غزل گو شاعر میر سودا بہت اچھے خطاط تھے-

مغلیہ دور زوال کے بعد پریس کی ایجاد سے کتابوں کا اشاعتی دور شروع ہوا جس کے نتیجے میں خوشنویسی کو بہت نقصان پہنچا- ساتھ ہی عربی فارسی کی جگہ آہستہ آہستہ انگریزی ادب نے لینی شروع کر دی- اس دور میں خطاطی پورے برصغیر سے سمٹ کر ان تین شہروں میں مرکوز ہو کر رہ گئی: لکھنؤ، دہلی اور لاہور- لکھنؤ میں خطاطی کی تاریخ نواب شجاع الدولہ ۱۷۵۲ - ۱۷۷۴ء ... شروع ہوتی ہے- یہ اودھ کے تیسرے نظام اور پہلے وزیر تھے- ان کی سرپرستی میں اس فن نے خوب ترقی کی-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لاہور میں امام وبردی، مولوی سعید احمد امین آبادی، منشی عبدالمجید پروین رقم اور تاج الدین زریں رقم، منشی عبدالغنی شیریں قلم، مولوی محمد عبداللہ وارثی جیسے فنکاروں نے اپنے خون جگر سے اس فن کی آبیاری کی۔[۲۱]

1983ء میں لاہور کے عجائب گھر میں مخطوطات اور خطاطی کی ایک گیلری کا قیام عمل میں آیا اور یہ گیلری یقیناً سکالروں کے لیے عطیہ گراں بہا ہے۔

اس گیلری میں مختلف اسلامی ممالک سے متعلق مخطوطات، خطاطی اور جلد بندی کے نمونے زیر نمائش ہیں جو ساتویں صدی سے بیسویں صدی کے عہد پر محیط ہیں۔ مخطوطات کو تاریخی اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا قرآنی سیکشن دوسرا فارسی اور تیسرا پنجابی، سنسکرت اور دوسری زبانوں پر مشتمل ہے۔ پہلے سیکشن میں قرآن و حدیث دوسرے میں تاریخ، معلومات عامہ، تذکرہ جات، شجرہ نساب، مثنویات، دیوان، کلیات اور مناجات جیسے موضوعات پر مشتمل ہے جو خط کوفی، نسخ، ثلث، مغربی، بہار، نستعلیق، شکستہ، دیوناگری، طرز تحریر کا نمونہ ہیں۔

کتبہ کاری
Epigraphy

ایپی گرافی سے مراد کندہ کاری، قلم کاری یا نقاشی کرنا ہے۔ اس فن میں قلم کار کسی پتھر، دھات اور لکڑی پر نقش و نگار کھودتا ہے یا کسی عبارت، تصویر اور آثارات کو کندہ و منقش کرتا ہے۔ یہ خطاطی، مصوری، سنگتراشی اور مجسمہ سازی کے مجموعی فن کا علم ہے۔ اس لیے ایپی گرافی کو علم جامع القلم کہنا حق بجانب ہوگا۔

ایپی گرافی کا پیلوگرافی کے علم کے ساتھ قریبی تعلق ہے۔ پیلوگرافی میں مورخ قدیم قلمی نوشتوں کے حروف و اشکال کا مطالعہ کرتا ہے اور ان کی جگہ اور وقت کا تعین کرتا ہے جب کہ ایپی گرافی میں مورخ ٹھوس اشیاء مثلاً سنگ و دھات کے کتبوں، مجسموں، استوپوں، تمغوں، مورتیوں اور مدفون آثارات پر کندہ اور نقش شدہ حروف کا مطالعہ کرتا ہے۔[۲۲] نقش شدہ عبارت کو پڑھنے کے لیے محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس زبان کا ماہر ہو اور کاتب کے اختصاری طرز تحریر کے طریقہ کار سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔ ایپی گرافی کے یہ نمونے اور آثارات تاریخ نویسی کے لیے خام مواد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ محقق کو چاہیے اس خام مواد کو تاریخ کے تحقیقی اصولوں کے مطابق اس طرح منظم طریقے سے ترتیب دے کہ یہ معلومات ایک باقاعدہ تاریخ کی صورت میں ظاہر ہوں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ابی گرافی سے مورخ کو کسی دور کی تہذیب و ثقافت' علم و فن' معاشی' سماجی' سیاسی اور مذہبی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے مختلف بادشاہوں اور خاندانوں کے ناموں' فرامین' عہد ناموں اور سلطنتوں کی حدود وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔

ابی گرافی کے ذریعے زمانہ قدیم کے فن سنگ تراشی اور انجنیئرنگ کے کمال کا پتہ چلتا ہے۔ پہاڑوں کے اندر بڑے بڑے ہال تراش کر ان پر حروف کندہ کرنا اور پتھروں پر مختلف کتبوں کا کھودنا کوئی آسان کام نہیں۔ پھر کندہ کاری کے کاموں کو اس طرح انجام دینا کہ انہیں بقائے دوام کی سند مل جائے اور زمانے کے مٹا دینے والے ہاتھ بھی انہیں نہ بگاڑ سکیں۔ ایسے حیرت انگیز کارنامے ابی گرافی کی بدولت ہی معرض وجود میں آتے ہیں۔

اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ابی گرافی کے آثارات' عمارات اور کتبے اپنے عہد کی تہذیب و ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ابی گرافی کو تاریخ کے ذیلی ماخذوں میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ وسط ہند سے پتھروں پر نقش ابی گرافی کے چند پرانے آثارات برآمد ہوئے ہیں کہ جن سے ہندوستان میں آریوں کی آمد سے پہلے کی دراوڑ تہذیب کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کتبوں سے تاریخ کے کئی تاریک گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

کتبے کئی لحاظ سے قدیم پاک و ہند تاریخ کے بہت ہی مفید و موثر معاون ہیں۔ تاریخی مواد کے فقدان نے ان کتبوں کی اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے۔ یہاں پر بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ برصغیر کی قدیم تاریخ کے لیے یہ کتبے روشنی کا مینار ہیں۔

کتبوں کی بھی تین اقسام ہیں۔

(1) اول وہ کتبے ہیں جنہیں کسی بڑے واقعہ کی یاد میں کندہ کیا گیا۔

(2) دوسرے وہ کتبے ہیں جنہیں مذہبی تبلیغ کے سلسلہ میں نسب کیا گیا۔

(3) اور تیسرے زیادہ تر تانبے کی چادروں کے وہ کتبے ہیں جو شاہی انعامات کے ساتھ امرآء کو دیئے جاتے تھے۔

اشوک اعظم کے کتبے بذات خود ایک علیحدہ حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ کتبے تبلیغ اور فرمانوں کی صورت میں چٹانوں' میناروں اور غاروں میں پائے جاتے ہیں۔ اس وقت برصغیر میں ایک ہزار سے زائد کتبے دریافت کئے جا چکے ہیں۔ ان ملکی کتبوں کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی چند ایسے کتبے دریافت کئے گئے ہیں کہ جن سے قدیم تاریخ ہندوستان پر روشنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر ایشیائے کوچک میں بوگزکوئی (Bughaz - Koi) کا کتبہ ہے۔ اس کتبہ سے آریوں کی پاک و ہند کی طرف روانگی کا سراغ ملتا ہے۔ اس کتبہ پر کندہ کی گئی تاریخ ۱۴۰۰ ق م ہے۔ نیز اس کتبہ میں ویدک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیوتاؤں کے نام بھی ملتے ہیں۔ اسی طرح ایران میں نقش رستم اور دیگر کتبے دریافت کئے گئے ہیں۔ ان میں شمال مغربی سرحدی صوبہ پر ایرانی غلبہ کا ذکر ملتا ہے۔ اسی قسم کے بہت سے کتبے افغانستان، لنکا، برما، کمبوڈیا اور جاوا میں ملتے ہیں۔ جن سے برصغیر کے لوگوں کا ان ممالک سے سیاسی اور ثقافتی روابط کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح پاکستان میں سوات، مانسہرہ اور صوبہ سرحد کے دیگر مقامات سے اشوک اعظم کے کتبات ملے ہیں جو اس نے تبلیغ کے سلسلہ میں ملکی سرحدوں اور شاہراہوں پر نسب کروا رکھے تھے۔ ان کتبوں سے اشوک اعظم کی مذہبی رواداری کی پالیسی کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح اندرون ملک دریافت ہونے والے دیگر کتبے بھی کچھ کم کارآمد نہیں۔ ان میں قدیم ترین پپ را (Pipraw) کا کتبہ ہے۔ یہ کتبے مختلف زبانوں مثلاً سنسکرت، پراکرت تامل، تلنگو اور کناری میں لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں چند ایک کھروشی رسم الخط میں کندہ ہیں جو عربی، فارسی اور اردو کی طرح دائیں سے بائیں کو لکھا جاتا تھا۔ بعض کتبوں کی زبان فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ معیار لیے ہوئے ہے۔ مثلاً الہ آباد میں سمندر گپت کا کتبہ خاصی ادبی خوبیوں کا حامل ہے۔

ایپی گرافی کے فن اور کتبوں کی تاریخی اہمیت سے تاریخ کا کوئی طالب علم انکار نہیں کر سکتا۔ اشوک جیسے نامور اور پارسا حکمران کے حالات زندگی تاریکی میں رہتے اگر اس کے اپنے کندہ کروائے ہوئے کتبے ہماری رہبری کے لیے موجود نہ ہوتے۔ کتبوں سے سن (Date) کا تسلسل قائم کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور بعض کتبوں میں تو پورے عہد کی تاریخ قلمبند کر دی گئی ہے۔ مثلاً سمندر گپت کا الہ آباد کا کتبہ اس کے دور حکومت پر بہترین تبصرہ ہے۔ غرضیکہ ایپی گرافی کی مدد سے سنگ و دھات کے کتبوں، مجسموں، اسٹوپوں اور دیگر کندہ آثارات سے حاصل ہونے والی معلومات مطالعہ تاریخ میں خاطرخواہ اضافہ کرتی ہیں۔ ان منقش آثارات سے تاریخ کے کئی تاریک گوشوں کا سراغ ملتا ہے۔

علم قدیم طرز تحریر
Palaeograpy

پیلوگرافی کے لغوی معنی قدیم طرز تحریر کا مطالعہ ہے۔ اس علم کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب مورخ کے سامنے قدیم قلمی نوشتہ ہوتا ہے تاکہ وہ اسے بالکل درست پڑھے اور حروف کی شناخت کے بعد انہیں ان کے صحیح مقام پر متعین کر سکے۔ یہاں پر وہ اسی امر کا جائزہ لیتا ہے کہ عہد قدیم میں لوگ حروف تہجی کی اشکال کس طرح وضع کرتے تھے اور حروف کی یہ اشکال کس طرح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مختلف جگہوں اور مختلف ادوار میں منفرد حیثیت حاصل کئے ہوئے تھیں۔ چنانچہ پیلوگرافی میں حروف کی اشکال' ان کے زمانے اور مقامات کے متعلق پڑھتے وقت اس علم کے ماہر کو دو امور کو پیش نظر رکھنا ہو گا۔

(1) تحریر کو درست پڑھنا۔

(2) دستاویزات کے مقام اور وقت کا تعین کرنا۔

دراصل یہ مشکل اس لیے پیش آئی کہ لوگوں نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے طرز تحریر یعنی حروف کی اشکال کو بھی بدلا ہے اور پھر ایک خطہ کے حروف دوسرے خطوں کے حروف سے بالکل مختلف رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں تعلیم کے فروغ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ بسا اوقات قلمی نوشتوں کو رقم کرتے وقت ایسا بھی ہوتا تھا کہ مورخین واقعات کو اختصار سے بیان کرتے تھے۔

قرون وسطیٰ میں چھاپہ خانہ کی ایجاد سے قبل مصنفین تحریروں میں بالعموم اختصار کو کافی حد تک اختیار کرتے تھے۔ اس لیے ان کی تحریروں کو سمجھنے کے لیے پیلوگرافی کا مطالعہ ضروری ہے۔

ایک چیز ابھی تک مورخین کے لیے موجب پریشانی ہے اور وہ طریقہ تحریر ہے۔ ابھی تک کوئی ایسی دستاویز نہیں پائی گئی جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ آج سے پانچ ہزار برس پہلے وادیء سندھ کے لوگوں کا طرز تحریر کیا تھا۔ مہروں اور تعویذوں پر کندہ شدہ حروف ضرور ملتے ہیں مگر علم قدیم طرز تحریر کے ماہرین کی شب و روز کی کاوش ان حروف کے معنی دریافت نہیں کر سکی۔ بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ قدیم تحریر مصر' سومیر اور ایلام کے تصویری طرز تحریر سے مشابہ ہے۔ بعض ماہرین کی رائے ہے کہ موجودہ ہندی ابجد ان حروف سے ماخذ ہے۔ مگر ابھی تک کوئی متفقہ رائے اس معاملہ میں قائم نہیں کی جا سکی۔

ہڑپہ کے مقام پر ایک مہر برآمد ہوئی ہے جس کو ماتا دیوی قرار دیا گیا ہے۔ اس مہر پر ایک ننگی عورت کی تصویر ہے جس کے رحم سے ایک پودا اگا ہوا ہے۔ اس پر چھ حروف کندہ ہیں جو ابھی تک پڑھے نہیں جا سکے۔ مہر کی دوسری طرف حیوانوں کا ایک جوڑا اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہے۔ اس دیوی کے ساتھ ایک دیوتا کی بھی پوجا ہوتی تھی۔ جس کی شکل و صورت ہندوؤں کے شیو دیوتا سے ملتی ہے۔ اب یہ چیز پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ موجودہ ہندو دھرم کے بہت سے عقائد اس قدیم سندھی مذہب سے ماخذ ہیں۔

پیلوگرافی مذاہب عالم کی مشہور قدیمی کتابوں مثلاً زبور' توریت' انجیل' ویدوں[23]' پرانوں[24] اور وینا بیتاکا[25] کے قدیم طرز تحریر' ان زبانوں کی ابتداء' جدید نشوونما اور تاریخ کے مسائل کی گتھی سلجھاتی ہے۔ پیلوگرافی کتابوں کے عہد' جگہوں اور تاریخی اہمیت کو بھی واضح کرتی ہے۔ مثلاً برصغیر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاک و ہند میں یونانی سفیر میگستھنیز[26]، چینی سیاح سوما کیان (Sa'uma Chieu) فاہیان[27] ہیون تسانگ[28]، اسکندر اعظم کے ہمراہ آئے یونانی مورخین اور مسلمان مورخ ابو ریحان البیرونی کی قدیم اور گمشدہ تحریروں کی جامعیت کا اندازہ لگاتی ہے۔ اسی طرح یہ قدیم عمارات' آثارات' کتبوں اور سکوں پر تحریر کردہ زبان سے تاریخ قدیم کے گمشدہ ابواب کا سراغ لگانے میں مدد دیتی ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ ہر محقق کو پیلوگرافی کے علم پر پوری طرح عبور حاصل ہو لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اہم توجیہات کسی ایسے جملے یا لفظ میں پوشیدہ ہوتی ہیں کہ جن کو عام نظر میں پس انداز کر دیا جاتا ہے۔ اگر اس وقت ان دستاویزات کا مطالعہ کرنے والا محقق ان توجیہات کو نظر انداز کر جائے تو تاریخ کے ساتھ یہ ناانصافی اور بددیانتی ہوتی ہے۔

جہاں تک دستاویزات کے مقام اور تاریخ کے تعین کا تعلق ہے ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ پیلوگرافی کی نشاندہی کی گئی تاریخیں اور مقامات حتمی طور پر درست ہوتے ہیں۔ یہ اس لیے ممکن نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ بعض سرکاری یا غیر سرکاری دستاویزات پرانے رسم الخط میں تحریر کی گئی ہوں۔ تاہم پیلوگرافی ہمیں زیادہ سے زیادہ اس دور اور خطے سے آگاہ کرتی ہے چنانچہ ہم جگہ اور تاریخ میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے پیلوگرافی کا استعمال کرتے ہیں اور نہ کہ مقام اور تاریخ کا پتہ لگانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جب کبھی ہمارے سامنے نامعلوم حدود والی تحریر آ جائے تو ہم اس کی فہرست مضامین' قانونی نکات' مہر' کاغذ اور سیاہی وغیرہ اور سب سے اہم چیز واٹر مارک (Watermark) کا مطالعہ کرتے ہیں۔

بعض اوقات مورخ کو فریب کاری اور دھوکے سے بچنے کے لیے محتاط ہونا پڑتا ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کسی تازہ دستاویز کو کسی پرانے کاغذ پر نقل کر دیا گیا ہو یا کسی جدید مواد کو اس طریقہ سے استعمال کیا گیا ہو کہ وہ ہمیں بالکل قدیمی نظر آئے تو اس قسم کی چیزیں عموماً جرائم سے متعلقہ دستاویزات میں پائی جاتی ہیں تو ایسی صورت میں ہم ان دستاویزات کا جسمانی معائنہ کرتے ہیں اور اس میں استعمال کی جانے والی سیاہی کا کیمیائی تجزیہ کیا جاتا ہے اور جس چیز سے یہ تحریر وضع کی گئی ہو اس کی ماہیئت (Shape) معلوم کرتے ہیں۔

پیلوگرافی ایک وسیع علم ہے اور اس کی کئی شاخیں ہیں۔ ان میں سے زیادہ مشہور دو ہیں۔ (i) فیلوگرافی (Philography) (ii) گریفالوجی (Graphology) - درج ذیل میں ان کا مختصر سا جائزہ لیتے ہیں۔

(I) فیلوگرافی

اس کا تعلق لسانیات سے ہے اور یہ ہمیں بتاتی ہے کہ کونسی زبان کونسے زمانے میں، زندہ و

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رائج تھی۔ یہ زبان اپنی ابتداء سے انتہا تک کس قسم کے تغیرات سے دو چار ہوئی اور پایہ تکمیل تک کون کون سے مراحل کو طے کیا؟ اس پر کونسی قوموں' خطوں اور زبانوں کے نمایاں اثرات ہیں مثلاً" سنسکرت کس طرح پروان چڑھی اور اس کی فصاحت و بلاغت کا کیا معیار ہے؟ اردو زبان ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکومت میں ہندو و مسلم تہذیب و تمدن کے امتزاج سے پیدا ہوئی۔ اس میں ترکی' عربی ' فارسی' سنسکرت اور علاقائی زبانوں کی آمیزش نے خاص ترقی کی اور یوں ان مختلف زبانوں کے میل ملاپ نے ایک نئی زبان اردو کو جنم دیا۔ غرضیکہ فیلوگرافی کی مدد سے ہم آسانی کے ساتھ تاریخ تمدن کا سراغ لگا کر اسے قلمبند کرتے ہیں۔

پیلوگرافی زبانوں کی ابتداء' نشوونما اور اس کی ترقی کے مختلف مراحل بیان کرتی ہے۔ قدیم لاطینی' عربی' فارسی اور انگریزی زبانیں جو اب متروک ہو چکی ہیں یا کلاسیک کہلاتی ہیں' کی تاریخ اور دوسری زبانوں پر اثرات کا جائزہ پیش کرتی ہے مثلاً" قبل مسیح کی بہت سی تحریریں اور سولھویں صدی انگلستان میں شکسپیئر کی انگریزی زبان اب متروک ہے اور کلاسیک انگریزی کہلاتی ہے۔ تمام یورپی زبانیں کسی نہ کسی طرح سے لاطینی زبان سے مشتق ہیں کیونکہ سلطنت رومہ نہایت وسیع علاقوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ اہل یورپ پر رومن تہذیب و تمدن اور مذہب کے اثرات بہت دیرپا ثابت ہوئے۔

(2) گریفالوجی

اس کا تعلق تحریر کی شرح اور وضاحت سے ہے۔ اس کے ذریعے ہم کاتب کے طرز تحریر سے اس کے کردار اور ذہنی کیفیات کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اس علم کے ماہرین کا خیال ہے کہ گریفالوجی کی مدد سے نہ صرف ہم کاتب کے ذہن و کردار کا اندازہ لگا سکتے ہیں بلکہ اس کے طرز تحریر سے اس کی معاشرتی حیثیت' تعلیم اور خیالات و نظریات کا بھی اندازہ لگاتے ہیں۔ کاتب کے طرز تحریر سے یہ بتایا جا سکتا ہے کہ تحریر جلدی میں' پریشانی' مجبوری' دباؤ یا فرصت کے اوقات اور کس عالم میں لکھی گئی ہے۔ اس کا لکھنے والا کوئی مرد تھا یا عورت۔ یہ کسی جوان ذہن کے جذبات کا عکس ہے یا کسی پختہ شعور آدمی کے افکار ہیں۔ طرز تحریر کاتب کی غلطیوں' ذہانت' معاملہ فہمی' دور اندیشی' بداندیشی' کم فہمی اور کم علمی وغیرہ کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔ ان عوامل کو ہم سائنٹیفک قرار تو نہیں دے سکتے مگر جامع اور مدلل لوازمات کا درجہ ضرور دے سکتے ہیں جو کسی تحریر کے ذریعے حقائق و واقعات کا ہلکا سا خاکہ اور عکس پیش کرتے ہیں اور تجسس کی روح کو بیدار کر کے کاتب کے کردار کے دوسرے پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ علم خطاطی اس میں کافی حد تک معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علم سیل
sigillography

علم سیل ان مہروں کے مطالعہ کا نام ہے جو سرکاری دستاویزات پر ثبت کی جاتی ہیں۔ اس میں نہ صرف مہروں کی شکل و صورت کا مطالعہ کیا جاتا ہے بلکہ ان کی بناوٹ اور دستاویزات پر ثبت کرنے کے طریق کار کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے۔ بعض مہریں اس قسم کی ہوتی ہیں کہ ان پر تحریر کی بجائے کوئی نشان یا کسی جانور کی شبیہہ ہوتی ہے۔ ان نشانات (Emblems) علامتوں اور تصویروں کا مطالعہ ہم فن نقابت (Heraldy) کی مدد سے کرتے ہیں۔ بعض اشارات مثلاً" القابات، سرنامے، نقش کاری، مناجات اور توثیق و تصدیق (Titles, Greetings, Inscription, Invocation, corroboration) وغیرہ دستاویزات کے مقامات اور جگہوں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

جہاں تک مہروں کی اختراع کا تعلق ہے یہ زمانہ قدیم سے ہی دنیا کے ہر خطے میں مختلف شکل و صورت میں استعمال کی جاتی تھیں۔ قدیم برصغیر پاک و ہند میں پانچ ہزار برس پہلے وادیء سندھ میں موہنجو دارو اور ہڑپہ کے مقامات پر کندہ شدہ حروف والی مہریں اور تعویذ ملے ہیں۔ قدیم سندھی لوگوں کے مذہب کے متعلق ہماری معلومات کے ماخذ مہریں اور پتھر کے بت ہیں۔

قدیم عرب میں دستاویزات پر مہروں کی صورت میں مختلف انواع کی امتیازی خصوصیات، علامات، عبارتیں، اعداد اور یادداشتیں استعمال کی جاتی تھیں۔ اسلامی مملکت مدینہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مختلف حکمرانوں کو جو خطوط لکھے ان پر اپنی انگوٹھی جس پر محمد الرسول اللہ نقش تھا، کی مہر ثبت فرمائی تھی۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں بھی تمام اہم دستاویزات پر مہریں لگائی جاتی تھیں۔ ھامر (Hammar) کے زمانے سے یورپ میں بھی عربی طرز کی شکل و صورت سے مشابہ مہروں کے استعمال اور دلچسپی کی مثالیں ملتی ہیں۔ انگلستان کے بادشاہ جان (John) نے 1215ء میں آزادی کے منشور "میگنا کارٹا" کے کاغذ پر اپنی مہر لگائی۔

مہریں لگانے کی مختلف غایتوں کا بھی امتیاز ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ یعنی توثیق کے لیے دستخط کی بجائے مہر لگانا، شناخت اور تصدیق کے لیے مہر لگانا اور گواہوں کی طرف سے مہر لگانا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علم الانساب
Geneology

نسب کی جمع انساب ہے اور نسب کے معنی خاندان کے ہیں۔ علم الانساب وہ علم ہے جس سے کسی فرد' گروہ یا خاندان کا اس کے آباء و اجداد کے ساتھ نسب' واسطہ' تعلق' اور سلسلہ تلاش کیا جاتا ہے۔ جنیالوجی (Geneology) کا لفظ یونانی زبان کے Genos اور Logos الفاظ کا مجموعہ ہے جس کا مطلب نظریہء خاندان (Theory of family) ہے۔ اس میں ماہر الانساب کسی فرد یا خاندان کے حسب و نسب' اس کی اصل' علاقائی تعلق' خاندانی روایات' خصوصیات اور پرانے تعلقات کا مطالعہ کرتا ہے۔

علم الانساب ایک قدیم علم ہے جس کا پتہ مصریوں' عربوں' یونانیوں اور ہندوستانیوں کے ہاں ملتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں میں عصبیت بری طرح مسلط تھی۔ ہر عرب حسب و نسب میں اپنے آپ کو دوسرے سے برتر سمجھتا تھا' شجرہ نسب کی بنا پر ایک دوسرے پر برتری کا احساس کرتے تھے لیکن جب اسلام آیا تو اس نے تمام عربوں کو ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا۔ تمام قبیلوں اور خاندانوں کے اختلافات ختم کر کے انہیں ایک قوم اور گروہ کی حیثیت دے دی۔ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں جب فتوحات میں وسعت ہوئی تو کثرت مال سے قومی خزانہ بھر گیا تو آپؓ نے وہ اصحابؓ جنہوں نے اسلام کی راہ میں خدمات انجام دی تھیں' ان کے وظائف جاری کرنے کے مقصد کے لیے دیوان الجند کے نام سے ایک دفتر قائم کیا۔ اس سلسلہ میں آپؓ نے حضرت عقیل بن ابی طالب اور حضرت جبیر بن مطعم جیسے ماہر الانساب اصحابؓ کو حکم دیا کہ وہ تمام عرب اور قبائل کے مسلمانوں' ان کے اہل و عیال' خدام اور غلاموں کے ناموں کے رجسٹر تیار کریں۔

تاریخ اسلام میں اسماء الرجال کے علم کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصیتوں کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔ مسلمان محدثین نے حالات کے بہم پہنچانے میں کسی شخص کے رتبے اور حیثیت کی پروا نہ کی۔ بادشاہوں سے لیکر بڑے بڑے مقتداؤں تک کی اخلاقی سراغ رسانیاں کیں اور حوالہ جات کا فن ایجاد کیا۔ تاریخ عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اسماء الرجال کی سند کے بغیر کوئی حدیث قبول نہیں کی جاتی۔ سولھویں صدی کے بعد یورپین مورخوں نے تاریخ نگاری کے لیے مسلمان محدثین اور مورخین کے حوالہ جات کے طریق کار کو اپنایا۔ اب جدید تاریخ نویسی میں معلومات بہم پہنچانے کے جات کی سند لازمی حیثیت رکھتی ہے۔

ہندوستان کے جاگیردارانہ معاشرے میں نسل' خاندان اور ذات پات اہم تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ یہاں نسلی و خاندانی بنیادوں پر منصب و عہدے تقسیم کیے گئے کے نتیجے میں چند خاندان سیاست و اقتدار پر قابض ہو گئے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاگیردارانہ اقتدار و کردار کو قائم دائم رکھنے کے لیے نسل' خاندان اور ذات پات کے نظریات کو فروغ دیا تاکہ معاشرے کی اکثریت کو ذہنی طور پر متاثر کر کے انہیں نچلے و کمتر درجے پر مطمئن رکھا جا سکے۔ شہنشاہوں نے جاگیریں' خطاب اور عہدے عطا کرتے وقت عموماً" حسب و نسب کو مدنظر رکھا اور حتیٰ المقدور اعلیٰ درجے پر نچلے و کمتر درجے کے افراد کو فائز کرنے سے اجتناب کیا اور انہیں سماجی' معاشرتی اور سیاسی زندگی میں برابر کا درجہ نہ دیا گیا مثلاً" جب سلطانہ رضیہ نے ملک یاقوت کا عہدہ بڑھایا تو ترک امراء نے اسے ناپسند کیا اور بغاوت کر کے اسے تخت و تاج سے محروم کر دیا۔

جب سلطان غیاث الدین بلبن تخت نشیں ہوا تو اس نے ترک امراء کی حمایت حاصل کرنے اور انہیں مطمئن کرنے کی غرض سے نسلی فخر کی پالیسی کو فروغ دیا اور سختی کے ساتھ اس پر عمل کیا کہ حکومت اور اقتدار کے کسی شعبہ میں کمتر درجے کے افراد کو چاہے وہ مسلمان ہوں یا ہندو' انہیں شریک نہ کیا جائے۔ عہد سلاطین کے مشہور مورخ ضیاء الدین برنی نے سلطان کے ان اقدامات کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ:

> "اس نے کسی رذیل' بے کار' کم اصل کمینے اور پست ہمت شخص کو کوئی عہدہ نہیں دیا بلکہ ایسے لوگوں کے محل کے قریب آنے کا بھی روادار نہ تھا جب تک وہ آدمی کی اصل اور بنیاد کو نہ جان لیتا' کوئی شغل یا کام اس کے سپرد نہ کرتا۔"[۳۰]

نسبی امتیاز بلبن کے نظریہء بادشاہت میں پوری طرح نمایاں تھا جس کا اظہار وہ اس طرح سے کرتا ہے:

> اگر بادشاہ سفلوں' کم ظرفوں' مفردوں' سپاہیوں' نالائقوں' نااہلوں' سوداگروں' دوکانداروں' مسخروں' اور بد اصل لوگوں سے بات کرے گا تو وہ حشمت بادشاہی اور ہیبت اولامری کو خود اپنے ہاتھ سے تباہ کر دے گا۔"[۳۱]

برنی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک عہدے کے لیے ایک شخص کا انتخاب ہوا' جس کا نام کمال مہیار تھا۔ جب بلبن نے اس سے مہیار کے معنی پوچھے تو اس نے کہا: "مہیار میرا باپ ہے اور وہ ہندو غلام تھا۔" بادشاہ یہ سنتے ہی غضب کے عالم میں دربار سے اٹھ کر چلا گیا اور بعد میں اپنے امراء سے کہا:

> میں کسی کم اصل' کمینے' رذیل اور ذلیل کو کسی شغل ' مرتبے یا عزت کی جگہ پر نہیں لگا سکتا [illegible]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

> کی تمام رگیں حرکت میں آ جاتی ہیں۔ میں کسی کمین، نااہل کے لڑکے کو حکومت میں جو مجھ کو خدا کی طرف سے ملی ہے، شریک نہیں کر سکتا۔ اگر اس کے بعد کسی خدمت، اقطاع، خواجگی، مشرفی یا مدبری پر تقرر کے سلسلہ میں کسی کمینے، بداصل یا ذلیل زادہ کو ان کارکنوں نے میرے سامنے پیش کیا، چاہے وہ ہزار ہنرمند ہو تو میں ان کے ساتھ وہ برتاؤ کروں گا جس سے دنیا کے لوگ عبرت حاصل کریں گے[۳۲]۔"

اس سلسلہ میں بلبن ہی نے اپنے امراء کو یہ واقعہ سنایا کہ سلطان التتمش کے زمانہ میں بھی ایک مرتبہ اس سے یہ شکایت کی گئی کہ اس کے وزیر نے کم اصل لوگوں کو عہدے دے رکھے ہیں تو سلطان نے فوراً حکم دیا کہ ایسے لوگوں کے حسب و نسب کی تفتیش کی جائے۔ اس پر تینتیس عہدے دار ایسے نکلے جو کم اصل تھے چنانچہ انہیں فوراً ملازمت سے برطرف کر دیا گیا[۳۳]۔

برنی اس بات پر زور دیتا ہے کہ اقتدار میں سوائے اعلیٰ نسل کے کسی اور کو اس میں شریک نہ کیا جائے، چاہے عالی نسبوں کے تقرر سے حکومت کو نقصان نظر آئے اور کم اصلوں کے تقرر سے فائدہ۔ مگر کسی بھی صورت میں حسب و نسب میں کم لوگوں کو عہدے نہ دیئے جائیں۔

نسلی برتری و تفخر کے حامی طبقہ کی نمائندگی، ضیاء الدین برنی نے کی ہے اور اپنے خیالات و افکار کے ذریعہ اس نے انہیں نظریاتی بنیادیں فراہم کیں۔ اپنے خیالات کا اظہار اس نے فتویٰ جہانداری" میں کیا ہے۔ جو نہ صرف برنی کے بلکہ اس عہد کے حکمران طبقہ کے ذہن کی عکاسی کرتی ہے۔ برنی اس بات کا قائل ہے کہ انسان مساوی طور پر پیدا نہیں ہوا بلکہ ازل سے اس میں شرافت اور شرارت پیدا کر دی گئی ہے۔ اس طرح ابتداء ہی سے ہر فن، پیشہ و ہنر کی صلاحیت اس میں پیدا کر دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے معاشرے میں ان لوگوں کو فضیلت دی ہے جو نفیس اور اعلیٰ پیشے اختیار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خدا بہترین اوصاف سے نوازتا ہے جیسے:

> وفاداری، بصیرت، عدل، ان لوگوں کو اشراف، آزاد، عالی نسب اور نجیب الطرفین کہا جاتا ہے۔ یہ طبقہ اس کا اہل ہوتا ہے کہ اسے حکومت میں اعلیٰ عہدے دیئے جائیں۔ دوسری طرف کم اصل لوگ ہیں جو حقیر پیشے اختیار کرتے ہیں۔ یہ لوگ صرف برائیوں کے لائق ہوتے ہیں۔ جیسے گستاخی، دروغ بیانی، بخل، غبن، حرام کاری، احسان فراموشی، گندگی، ناانصافی، بے غیرتی، بدقماشی، عیاری اور بے دینی۔ ایسے لوگوں کو کم اصل بازاری، رذیل، کمین، نالائق، پنچ ذات، بے شرم اور ناپاک کہا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کی ترقی سے اس دنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا کیونکہ یہ خدا کی مصلحت کے خلاف ہے[۳۴]۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اختلاف نہیں کہ رذیل، کم اصل اور بے دین، کسی دینی یا دنیوی کام کو پورا نہیں کر سکتے۔ اگر بادشاہ کم اصل لوگوں کو عہدے دے گا تو اسے خدا کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ اس لیے اسے چاہیے کہ عالی نسب لوگوں کو عہدے دے تاکہ روز محشر اسے نجات مل سکے۔[۳۵]

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر کمین کم اصل ایک سو خوبیوں سے بھی مزین ہو تب بھی ملک کا نظم و ضبط نہیں چلا سکے گا اور سیاسی قیادت و اعتماد کا اہل نہیں ہو گا۔[۳۶]

برنی ان سلاطین پر تنقید کرتا ہے جو حسب و نسب دیکھے بغیر لوگوں کو محض وفاداری کی بنیاد پر ملازمتیں دے دیتے ہیں۔ ایسے بادشاہوں کو وہ تنبیہہ کرتا ہے کہ ان کا انجام برا ہو گا بلکہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ کم اصلوں کو ترقی دے کر خود سلطان اپنی کم اصلی کا ثبوت دیتا ہے۔[۳۷]

اس کے نزدیک فوج کے اعلیٰ عہدیداروں کے لیے اعلیٰ نسب کا ہونا ضروری ہے کیونکہ رذیل شخص کی موجودگی میں سپاہی اس کا حکم نہیں مانیں گے۔ اور وہ دین و دنیا کی حفاظت نہیں کر سکے گا۔

اسلام میں تقویٰ کی بنیاد پر جو بزرگی اور عظمت کا درجہ دیا گیا ہے اس پر برنی کہتا ہے کہ :

> "یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ نجس اور نجس ذات کمین اور کم اصل میں تقویٰ نہیں ہو سکتا اگر ایک رذیل بازاری انسان میں تقویٰ دکھائی دے تو سمجھ لو یقیناً اس کے بزرگوں کا خون شریف خون سے مخلوط ہو گیا ہو گا۔[۳۸]

نسلی فخر، خاندان اور ذات پات کے نظریات مغلوں کے دور میں بھی قائم و دائم رہے۔ اس سلسلہ میں آئین اکبری میں اعلیٰ و ادنیٰ خاندان کے افراد پر جرمانوں کی تفصیلات بڑی دلچسپ ہیں مثلاً" اگر کم مرتبہ، رذیل کسی عالی رتبہ اور شریف شخص کو گالی دے تو اس سے جرمانہ کے طور پر ساڑھے بارہ درم لیے جائیں اگر برابر درجہ کے ایک دوسرے کو گالی دیں تو اس کا نصف، اگر عالی مرتبت شریف آدمی گالی دے تو اس سے چوتھائی وصول کیا جائے۔[۳۹]

نسلی فرق اور خاندانی امتیاز کے نظریات مغلیہ دور میں باقی رہے۔ مغل حکومت میں خاندانی امراء کو رعایت دی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر شہنشاہ اکبر نے ایک مرتبہ ہدایات جاری کیں کہ :

> "قدیم خاندانوں کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اسلاف اور بزرگوں کے کمالات کو پیش نظر رکھ کر ان کے نااہل جانشینوں کا بھی خیال رکھا جائے۔[۴۰]"

علم الانساب کی اہمیت بعض یورپی ممالک میں بھی تسلیم کی جاتی ہے مثلاً" برطانیہ میں جب ہاؤس آف لارڈز کا کوئی ممبر انتقال کر جاتا ہے یا کسی اور وجہ یا خصوصیات کی بنا پر کسی اور کو ہاؤس آف لارڈز کی ممبر شپ عطا کی جاتی ہے تو ممبر شپ عطا کرتے وقت اس کے حسب و نسب کو مد نظر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رکھا جاتا ہے۔

قرون وسطیٰ میں فرانس میں ایک طبقہ جنہیں بادشاہ نے جاگیروں' خطابوں اور دوسری مراعات سے نواز رکھا تھا وہ ملکی ٹیکسوں سے مستثنیٰ تھے۔ بعض حریص خاندانوں نے ناموں کی مشابہت اور خود ساختہ رشتہ داریوں کی بنا پر خود کو انہی جاگیردار طبقوں کے نسب سے ظاہر کر کے مراعات سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد جب فرانس کے ایک وزیر خزانہ کولبرٹ نے ان خاندانوں کے شجرہ نسب کی تحقیق کروائی تو ایسے خود ساختہ خاندانوں کو ان مراعات سے محروم ہونا پڑا۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مختلف خاندانی خصوصیات وراثتاً افراد میں اجاگر ہوتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ہوتی ہیں مگر ہوتی ضرور ہیں۔ مثلاً بعض اوقات مغلوں کا اپنے جد اعلیٰ چنگیز و تیمور کی طرح بے دریغ خون بہانا۔

بعض اوقات کسی خاندان کی تاریخ پڑھتے ہوئے یا کسی ہیرو کے حالات زندگی کا مطالعہ کرتے وقت بعض افراد میں یہ شوق پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس خاندان یا اس شخص کے شجرہ نسب سے ظاہر کریں اور پھر یہ خود ساختہ رشتہ داریاں تاریخ اور ماہر النساب کے لیے معمہ بن جاتی ہیں۔ اس وجہ سے بھی علم الانساب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

بعض اوقات مورخ کو کثیر الازاجگی میں کثرت اولاد اور متبنیٰ کی صورت میں جائداد کی تقسیم کے وقت نسب ناموں کو جاننے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود ساختہ ماہرالنساب (میراثی) انعام حاصل کرنے کے لالچ میں یا اپنے سامعین کو خوش کرنے کے لیے اور دوسرے کی کم علمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے حسب و نسب کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور مبالغہ آرائی سے ان کے حسب و نسب کے ساتھ غلط نسب منسوب کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ ناموں کی مشابہت یا خود ساختہ شجروں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور بڑی مہارت و کامیابی سے ایک خاندان کا سلسلہ دوسرے خاندان سے جوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ ان امور سے علم الانساب کے مطالعہ کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کم تر اور نچلے درجے کے افراد اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں تو وہ اعلیٰ ذات' خاندان اور شریف خون کے انساب سے تعلق و واسطہ ظاہر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور بسا اوقات لوگ جب دیہاتوں سے شہروں کی طرف' ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کی طرف ہجرت کرتے ہیں تو ادنیٰ اور نچلی ذات کے لوگ اپنا سلسلہ اعلیٰ ذات اور خاندان سے ظاہر کرتے ہیں۔ تو ایسے حالات میں مورخ کو خود ماہرالنساب ہونا پڑتا ہے اور نسب ناموں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کے معاشرے میں ذات پات اور اونچ نیچ کی تقسیم اس قدر گہری ہے کہ ان نسلی اور خاندانی فخر و مباہات کے حامل نظریات نے اہم تاریخی اثرات مرتب کیے ہیں۔ اہل یورپ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے نسل و خاندان اور ذات پات کے بتوں کو مکمل تباہ کر کے اپنے معاشرے میں مساوات قائم کر کے اونچ نیچ کی طبقاتی تقسیم کے تمام راستے بند کر دیئے ہیں۔

سوشیالوجی
Sociology

سوشیالوجی انسانی معاشرے کی سائنس ہے۔ یہ علم الانسان اور علم حیاتیات کی طرح علم معاشرت کی سائنس ہے۔ اس کے ذریعے انسانی تمدن کی ابتداء نشوونما اور ارتقاء کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ سوشیالوجی کا لفظ پہلی مرتبہ انگریزی زبان میں سوشل فزکس (Social Physics) کے معنوں میں ۱۸۳۹ء میں استعمال کیا گیا۔ دراصل یہ یونانی اور لاطینی زبانوں کا مخلوط لفظ ہے جو معاشرتی پہلوؤں کے بنیادی اصولوں کے مثبت مطالعہ کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں یہ لفظ تاریخ اور سیاسیات میں عام استعمال ہونے لگا۔

سوشیالوجی کو سوشل اکنامی، سوشل فلاسفی اور سوشل سائنس کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ سوشیالوجی اور پولیٹکل سائنس میں یہ فرق ہے کہ پولٹیکل سائنس معاشرے میں ضرورت حکومت، قانون، اقتدار اعلیٰ، حکومت کی ابتداء اور حکومت کی اقسام وغیرہ سے متعلق ہے جبکہ سوشیالوجی میں اجتماع کے وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ، معاشرتی بندھن، باہمی روابط اور تمدنی اکائیوں کی نشوونما کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ تاریخ کا تعلق انسان کی اجتماعی سرگرمیوں سے ہے اور اس میں انسانی تمدن اور ریاست و حکومت کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

جغرافیائی حالات انسانی معاشرے اور تمدن کو سب سے زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ ملکی روایات اور قومی کردار پر ملک کے جغرافیائی حالات کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ملک کی صنعت و حرفت، زراعت و تجارت، ذرائع آمدورفت اور اکثر حالتوں میں تہذیب و تمدن کا انحصار (سرد، گرم اور معتدل آب و ہوا والے خطے) جغرافیائی حالات پر بھی ہوتا ہے۔ اس لیے کسی ملک کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس ملک کے جغرافیہ یعنی آب و ہوا، پیداوار اور حدود اربعہ کا جائزہ لیا جائے۔ علم سوشیالوجی ان تمام جغرافیائی اکائیوں کا مطالعہ کرتا ہے جس میں طرز معاشرت، بود و باش، روایات اور تہذیب و تمدن کی یگانگت اور ہم آہنگی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

ابن خلدون کا کہنا ہے کہ "انسان معاشرتی حیوان ہے" انسانی زندگی کے لیے اجتماع ضروری ہے۔ کیونکہ انسان فطرتاً" اجتماع کی جانب میلان رکھتا ہے اور اس کے بغیر انسان کا وجود نامکمل ہے۔ ابن خلدون علم سوشیالوجی کا بانی ہے۔ اس نے علم معاشرت اور اجتماع کے قواعد کی تدوین کی۔ اس لحاظ سے ابن خلدون یورپ کے تمام مصنفین کا پیش رو ہے۔ اس میدان میں اس سے قبل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سوائے فلاسفہ یونان کے کسی نے قدم نہیں رکھا۔ اس علم کی بدولت ابن خلدون نے مشرق و مغرب کے علماء کو اجتماع کے نئے فلسفے سے روشناس کرایا۔ ابن خلدون نے اس نظریے کے لیے ایسے اصولِ اور حقائق دریافت کئے کہ جن سے یونانی فلسفی نا آشنا تھے۔ اس نے انسانی اور حیوانی اجتماع میں امتیاز کیا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ حیوانی اجتماع عادت کے تحت فطرت کے اقتضاء سے ہوتا ہے اور انسانی اجتماع فطرت، عقل اور غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ابن خلدون آب و ہوا کو انسانی معاشرے پر سب سے زیادہ اثر کرنے والا عنصر قرار دیتا ہے۔ آب و ہوا کے انسانی ذہن، جسم، اخلاق، قوموں، مملکتوں، تمدنوں اور علوم کی نشوونما پر گہرے اثرات ہوتے ہیں۔ ابن خلدون نے معاشرتی اتحاد، اس کی مختلف صورتیں اور معاشرے کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ معاشی زندگی، تعلیمی ادارے، تعلیمی انجمنیں، خبر رسانی کے ذرائع، خاندان، حکومت اور مذہب کی تفصیل و توضیح کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے اور عمرانیات کو تمام اجتماعی علوم کا منبع قرار دیا ہے۔

اگرچہ دور جدید کے مغربی مفکرین اور فلاسفہ نے عمرانیاتی تصورات ابن خلدون سے اخذ کر کے عمرانیات کو اجتماع کے مطالعہ کا ایک لازمی علم بنا دیا ہے۔ مگر سب ہی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ دور جدید کی سائنٹیفک عمرانیات کا بانی اور آدم اول ابن خلدون ہے۔

تاریخ کا ہمیشہ ہی سے علم الانسان اور عمرانیت کے ساتھ تعلق قائم رہا ہے۔ ایچ۔ سی۔ ڈربی کے مطابق "تاریخ عمرانیات کے لیے اساس کی حیثیت رکھتی ہے۔" چنانچہ تاریخ ایسا مطالعہ ہے جو انسانی تجربات کے جملہ پہلوؤں کو مربوط کرتا ہے۔ ماہر عمرانیات کو اتنے وسیع حلقہ افراد سے براہ راست واسطہ نہیں پڑتا جتنے وسیع حلقہ افراد اور معاشرتی سرگرمیوں سے مورخ کو معاملہ درپیش ہوتا ہے۔ مورخین ایک روشن اور دلچسپ کتاب کی مانند ہوتے ہیں اور ماہر عمرانیات دلچسپی سے خالی کتاب کی طرح ہوتے ہیں۔

کرونالوجی

Chronology

کرونالوجی تاریخی واقعات کو سلسلہ وار تاریخی ترتیب (Date) کے ساتھ پیش کرنے کا علم ہے۔ اس کو وقت ناپنے والا آلہ یا عمل کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً" اس عمل کو دور حاضر سے شروع کر کے پیچھے کی طرف لے چلیں تو اس طریقے میں کم از کم نوجوانوں کے جذبات کے لیے اچھے احساسات موجود ہیں۔ یہی طریقہ ہے جس سے ہر کوئی اپنے نسب کی ابتداء کا کھوج لگاتا ہے۔ اپنے والدین سے شروع کریں پھر دادا، دادی کے سلسلے کو لیتے ہوئے پیچھے کی طرف چلتے جائیں یہاں تک کہ مورث اعلیٰ کو معین کر لیں۔ یہی طریقہ ہے جس کے مطابق قانون دان "روایتاً" کام لیتے ہیں۔ پیش نظر مقدمے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے سلسلے میں اس سے پہلے مقدمے کو دیکھتے ہیں اور پھر زیادہ دور کی مثالوں پر چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم کئی اداروں کا مطالعہ کر سکتے ہیں مثلاً" سیاسی جماعتیں' صدارت' کارپوریشن' لیبر یونین' یونیورسٹی اور شعبہ تاریخ وغیرہ۔ ہم ان اداروں کے موجودہ کردار سے واقف ہو کر ان کی اصل و ابتداء پر پہنچ جائیں گے۔

واقعات کی تاریخ وار ترتیب کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ابتدا سے شروع کریں۔ لیکن یہ امر اتنا آسان نہیں جتنا بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے مثلاً" آپ کہاں سے شروع کریں گے؟ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب پورے یقین کے ساتھ انسانی تاریخ کی ابتداء ۴۰۰۴ قبل مسیح سے ہوتی تھی کیوں کہ عام روایت کے مطابق آدم و حوا کے باغ عدن سے نکلنے کی یہی تاریخ تھی۔ صدیوں تک تاریخ دان اپنی تاریخی ترتیب کا آغاز اسی کے مطابق موزوں کرنے کی کوشش میں لگے رہے اور اٹھارویں صدی تک واقعات کی تاریخ وار ترتیب کا یہی سلسلہ مقبول عام رہا۔ اٹھارویں صدی کے شروع میں **سائنسدان** اور تاریخ دان تاریخ کے آغاز کو چند لاکھ سال پیچھے لے گئے جسے مبہم طور پر قبل از تاریخ کا دور کہا جاتا ہے۔ قبل از تاریخ کے دور کو سمجھنے کے لیے بشریات' ارضیات' آثار قدیمہ اور بہت سے دیگر علوم کی ضرورت ہے یہ حقیقت ہے کہ صرف چند مورخ ہی ان علوم سے آگاہ ہوتے ہیں۔ تاہم مؤرخ کو قبل از تاریخ کے دور کے بارے میں کچھ نہ کچھ علم ضرور ہونا چاہیۓ۔ ہمیں اپنی تاریخ کا آغاز فوراً" تہذیبوں کے عہد سے نہیں شروع کر دینا چاہیۓ۔

مورخ ماضی کے بکھرے ہوئے حوادث و واقعات کو یکجا کر کے حال کی زنجیر کے ساتھ باندھتا ہے تاکہ اس کی کڑی از خود مستقبل کے ساتھ مل جائے۔ مورخ ماضی' حال اور مستقبل کو ایک ہی زنجیر کی کڑیوں میں باندھ کر تاریخ کی عمارت قائم کرتا ہے۔ ہر قوم اپنے کیلنڈر کی ترتیب و تشکیل بھی واقعات کی ترتیب وار میزان کے پلڑے میں رکھ کر کرتی ہے اور ہر مورخ اپنی قوم کی تاریخ بھی واقعات کی تاریخ وار ترتیب کی مناسبت سے بیان کرتا ہے۔

مورخ منتشر واقعات اور دستاویزات کو موضوعات اور ادوار کے لحاظ سے سن وار یا تاریخ وار جدول کے ساتھ یکجا کر کے مربوط صورت میں پیش کرتا ہے۔ مورخ کو واقعات کا سن وار حصول اس وقت مشکل ہو جاتا ہے جب کوئی قوم نیا کیلنڈر اپناتی ہے اور نئے سن کا آغاز کرتی ہے مثلاً" برطانیہ اور آئرلینڈ نے عیسوی کیلنڈر کو ۱۷۵۱ء میں اختیار کیا جبکہ دوسرے یورپی ممالک عیسوی کیلنڈر کو ان سے بہت عرصہ پہلے اختیار کر چکے تھے۔ عربوں کا ہجری کیلنڈر عیسوی اور مصری کیلنڈروں کے ساتھ تاریخوں اور سنوں کے تقابل میں بسا اوقات واقعات کی ترتیب میں مشکلات کا باعث بنتا ہے۔ گویا کرونالوجی تاریخی واقعات' حقائق اور دستاویزات کو تسلسل سے تاریخ وار جدول کے ساتھ مربوط اور منظم پیرائے میں بیان کرنے کے عمل کا نام ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آٹھواں باب

حوالہ جات

(۱) لانگ لائیس، "انٹروڈکشن ٹو دی سٹڈی آف ہسٹری" ص ۴۳
(۲) ایضاً، ص ۴۰-۴۳
(۳) E. A Freeman, The Methods of Historical Study, (London, 1885)
(۴) ویبسٹر ڈکشنری۔
(۵) آکسفورڈ انگلش ڈکشنری
(۶) افلاطون کا کہنا ہے کہ یونانیوں نے اپنی یہ آبادیاں اس طرح بسائیں کہ جس طرح مینڈک تالاب کے گرد بنا لیتے ہیں۔
(۷) دی لیسنز آف ہسٹری، ص ۳۰-۳۲
(۸) اے۔ بی کیتھ، ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر، ص ۵۲۱-۵۱۷
(۹) البیرونی، القانون، ص ۵۳۶
(۱۰) مانٹسیکو (۱۷۵۵-۱۶۸۹) فرانسیسی قانون دان، فلسفی اور مورخ تھا۔
(۱۱) بکل (۱۸۶۲-۱۸۲۱) انگریز مورخ تھا۔
(۱۲) Troy, Mycenae and Tiryns
(۱۳) Asia Minor
(۱۴) Herculaneum
(۱۵) Pompeii
(۱۶) History of Ancient Art
(۱۷) John Aubrey (۱۶۲۶ء-۱۶۹۷ء)
(۱۸) William Stukeley (۱۶۸۷ء-۱۷۶۵ء)
(۱۹) Cunnington and Colt Hoare
(۲۰) Ruskin's Stone of Venice
(۲۱) الیس۔ ایم جعفر، "ہسٹری آف ہسٹری" (صادق سنز پبلشرز، پشاور، ۱۹۶۱) ص ۴۴۸
(۲۲) محمد اقبال بھٹہ ۔ روزنامہ مشرق، "اسلامی خطاطی" ۵ دسمبر ۱۹۸۵
(۲۳) رگ وید، یجروید، سام وید اور اتھروید
(۲۴) پورانوں کی تعداد ۱۸ ہے۔
(۲۵) مہاتما بدھ نے پیروکاروں کو وقتاً فوقتاً جو اپدیش دیتے تھے انہیں ان کے جانشینوں نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بڑی دیانتداری کے ساتھ وینا پتیاکا (Vinay Pitaka) کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔ اسی طرح سوتا پتیاکا (Suta Pitaka) اور ابھی دم پتیاکا (Abhidham Pitaka) میں فلسفیانہ مباحث کے ساتھ تاریخی واقعات بھی بیان کئے ہیں۔

(۲۶) چندر گپت موریہ کے دربار میں یونانی حکمران سیلوکس کا سفیر تھا۔ اس نے ہندوستان کے حالات اپنی مشہور کتاب "اندیکا" میں تحریر کیے ہیں۔

(۲۷) فاہیان ۴۱۴-۳۹۹ء میں چندر گپت اور بکرماجیت کے زمانے میں ہندوستان آیا۔

(۲۸) ہیون تسانگ راجہ ہرش کے زمانہ میں 15 برس تک ہندوستان میں رہا۔

(۲۹) عمر ابوالنصر، "حضرت ابوبکر صدیقؓ" (لاہور، ۱۹۶۰ء) ص، ۱۰۱

(۳۰) ضیاء الدین برنی، "تاریخ فیروز شاہی" اردو ترجمہ (لاہور، ۱۹۶۹) ص، ۷۷

(۳۱) ایضاً، ص، ۸۵

(۳۲) ایضاً، ص، ۸۹-۹۰

(۳۳) ایضاً، ص، ۹۱-۹۲

(۳۴) محمد حبیب و بیگم افسر عمر، "ضیا الدین برنی: سلاطین دہلی کا سیاسی نظریہ" (دہلی، ۱۹۷۹) ص، ۲۰۲-۲۰۴

(۳۵) ایضاً، ص، ۱۹۰

(۳۶) ایضاً، ص، ۱۹۹

(۳۷) ایضاً، ص، ۷۷

(۳۸) ایضاً، ص، ۲۰۵

(۳۹) آئین اکبری، حصہ دوم، ص، ۲۳۵

(۴۰) ایضاً، ص، ۵۷۲

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نواں باب

تنقید نگاری

CRITICISM

تعریف

جب تک ہم تنقید کے صحیح مفہوم سے واقف نہ ہوں گے اس لفظ کی تعریفوں کے تضاد سے غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہمیشہ باقی رہے گا۔

لفظ تنقید یونانی زبان کے لفظ Kritikos سے مشتق ہے جس کے معنی کسی شئے کا اندازہ لگانا یا اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا یا کسی شئے کے بارے میں مقتدرانہ رائے دینا یا صائب رائے قائم کرنا ہے[1]۔

تنقید کے لغوی معنی جانچ اور پرکھ کے ہیں یعنی کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنا ہے۔ اس کے عام معنی نقد و نظر، تبصرہ اور نکتہ چینی کرنا ہے۔ تنقید سے مراد کسی شئے کے محاسن و معائب کو ساتھ ساتھ اس طرح دکھانا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ اگر کہیں سرزنش کی ضرورت ہو تو اس خوبصورتی اور عمدگی سے اس ناگوار فرض کو ادا کرنا کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ گویا نقاد کا فرض ہے کہ وہ تنقید سے "تخلیقی اور تعمیری کام لے' نہ کہ تخریبی اور تعزیری۔" بعض نقاد تو یہاں تک کہتے ہیں کہ نقاد کو معائب کی طرف جانا ہی نہیں چاہیے۔ لیکن ہم ایسی تنقید کو صحیح تنقید ماننے کے لیے تیار نہیں کہ جس میں کسی تصنیف کے حسن و قبح کو عمدگی سے نہ دکھایا جائے۔ بعض اوقات کچھ غلط فہمیوں کی بنا پر ہمارے اکثر تنقید نگار تنقید کرتے وقت ذاتیات کی بحث میں پڑ جاتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ایسی تنقید جس میں ذاتی قضیوں کی بحث ہو صحیح تنقید نہیں کہلائی جا سکتی۔ کیونکہ تعصب و تنگ نظری سے آلودہ ہو کر تنقید کا تاریخ نویسی سے تعلق باقی نہیں رہتا۔

قدیم یونانی حکماء کے مطابق: "فن تنقید کے ذریعے جمالیاتی ذوق و احساسات کے خصائل و اقدار کو پرکھا یا سمجھا اور اندازہ لگایا جاتا ہے[2]۔" ادب ہو کہ فن یا کوئی شئے ہو تنقید ان کی خصوصیات کے بارے میں صائب رائے کا اظہار کرتی ہے۔ میتھیو آرنلڈ (Mathew Arnold) کے خیال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مطابق تنقید سے مراد:

"کائنات کے بارے میں جو کچھ سمجھا اور جانا جاتا ہے یا اس کے بارے میں جاننے کی ایک غیر دلچسپ کوشش اور پروپیگنڈا ہے۔"

اصل میں تنقید وہ آلہ ہے جس کے ذریعے کسی شئے کو، جو حسن و خوبصورتی میں جامع اور مکمل ہو اس میں کوئی نقص پایا جاتا ہو تو انصاف کے ساتھ تنقید کی بدولت اسے کاملیت عطا کرنا ہوتا ہے۔

یہاں ہم چند مغربی مفکرین کی تنقید کی تعریف کے بارے میں آرا پیش کرتے ہیں جن کے مطالعہ سے بخوبی سمجھ میں آ جائے گا کہ وہ تنقید سے کیا مراد لیتے ہیں:

۱۔ **رابرٹسن**: تنقید انسانی معلومات کے تمام شعبوں کے متعلق صرف مقابلہ کرنے یا خیالات کے ٹکرانے کو کہتے ہیں۔

۲۔ **کاڈکن**: کسی کام کے کرنے کے دو طریقوں کے درمیان موازنہ کرنا اصلی تنقید ہے۔

۳۔ **ولیم ہنری ہڈسن**: تنقید وہ ادب ہے جو ادب کے متعلق لکھا گیا ہو، خواہ اس میں مصنف کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی گئی ہو، خواہ تعریف و توصیف کی یا تجزیہ و تشریح کی۔

۴۔ **اناطول فرانس**: بہترین تنقید وہ ہے جس میں نقاد ان کیفیات کو بیان کرتا ہے جن کو اس کی روح کسی ادبی کارنامے سے حاصل کرتی ہے۔

۵۔ **چارلس سوبرن**: سب سے مشکل اور اہم کام جو نقاد کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ کسی تصنیف کے ادبی محاسن کو پہچانے اور پھر یہ معلوم کرے کہ مصنف کی صناعی سے وہ کیونکر محاسن بن گئے۔

۶۔ **میتھیو آرنلڈ**: اپنی معلومات کے ذریعہ شگفتہ اور صحیح خیالات پیدا کرنا تنقید ہے۔

۷۔ **سروالٹر رالے**: مردہ مصنفوں اور ان کے ادبی کارناموں کو زندہ کرنا تنقید ہے۔

ان خیالات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تنقید کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ حقیقتاً فن تنقید اس قدر وسیع ہے کہ اس کی کوئی جامع تعریف نہیں ہو سکتی۔ چونکہ تنقید کا مادہ ہر انسان کی فطرت میں ودیعت ہے اس لیے ہر شخص ہر چیز کے متعلق کچھ نہ کچھ رائے ضرور رکھتا ہے۔ لیکن یاد رہے تاریخی تنقید محض رائے کے اظہار سے بالاتر ہے۔ اس کے لیے وسیع علم، وسعت نظر اور حقائق شناسی کی ضرورت ہے اور اسکے ساتھ حسن بیان اور عمدہ اسلوب تحریر بھی لازم ہے تاکہ اپنی رائے کو نہایت جامع، موزوں اور مناسب الفاظ میں ظاہر کیا جا سکے۔ تنقید کے اس اصول کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحت ایک عالمانہ اور عامیانہ تنقید میں جو فرق ہو سکتا ہے۔ اس پر بحث کرنا بیکار ہے۔

تنقید کیا ہے؟

قدرت نے انسان اور حیوان کو اچھی اور بری چیزوں میں تمیز کرنے کی قوت عطا فرمائی ہے۔ چونکہ حیوانات الفاظ میں اپنے احساسات کو ظاہر کرنے سے قاصر ہیں اس لیے وہ اپنی حرکات و سکنات کے ذریعہ دلی نفرت اور رغبت کا اظہار کرتے ہیں۔ انسان اپنی قوت گویائی اور حرکات و سکنات دونوں کو کام میں لا کر اپنے دلی جذبات اور طبعی میلان دکھاتے ہیں۔ جوں جوں قوت تمیز ترقی کرتی ہے' احساسات بھی تیز ہو جاتے ہیں۔ گویا قوت تمیز میں نفاست اور تکلف بڑھتا جاتا ہے۔ فن تنقید انہی احساسات ممیزہ کی سریع الاثری کا مرہون منت ہے۔ مورخ محقق' عالم اور پڑھا لکھا انسان اپنی فراست و ذکاوت کی مدد سے انسان کے کارناموں' حالات و واقعات اور حوادث کی خوبیوں اور خامیوں سے بحث کر کے اور ان پر غور و فکر کر کے تاریخی حقائق کو فلسفہ کائنات اور انسانی اعمال و واقعات سے منطبق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

وہ لوگ جو تنقید کا مقصد کسی مصنف اور مورخ کی تاریخ نویسی کی خامیاں' برائیاں اور سقم ظاہر کرنا مراد لیتے ہیں وہ تاریخ نگاری کے فن کو کند چھری سے ذبح کر رہے ہیں۔ اور وہ تنقید نگار جن کا مقصد صرف زیر تنقید تصنیف کی تعریفوں کے پل باندھنا ہے وہ درحقیقت محققوں اور مصنفوں کو گمراہ کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ کس قدر افسوسناک امر ہے کہ غلط تنقید نگاروں کی بدولت اکثر صاحب کمال مورخ محقق اور ادیب جن کی ہمت افزائی لازم ہوتی ہے فن تاریخ نویسی سے متنفر اور رو گرداں ہو جاتے ہیں۔ اور سخن ناشناس' کم فہم اور خوشامدی احباب کی تعریفوں سے بہت سے قصہ گو قسم کے نام نہاد مصنف و مورخ مدارج کمال طے کر لیتے ہیں۔

تاریخ نویسی میں تنقید سے مراد ایسے بنیادی اصول فکر ہیں کہ جن کا مشاہدات' بیانات' حوادث' واقعات اور دستاویزات پر اطلاق کر کے اصلی تصنیف کے لیے صحیح معلومات حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ہم با آسانی دانستہ طور پر ان کی خوبیوں اور خامیوں کو رد نہیں کر سکتے۔ دانستہ طور پر تنقید نگاری منفی اثرات کی حامل ہوتی ہے اور یہ کسی تصنیف کو تباہ کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ یہ ایک قسم کی تصنیفی خودکشی (Textual Suicide) ہے۔ یعنی وہ دستاویزات و تصانیف جو ہمارے اصول فکر' تنقید' تبصرہ اور نکتہ چینی پر پورا نہ اتریں غلط اور غیر حقیقی ہوں گی۔ اور جو تصانیف غلط دستاویزات سے مرتب ہوں گی وہ درحقیقت تاریخ کہلانے کی مستحق نہیں لہذا تاریخ نویسی کے لیے اصول تنقید اٹل اور لازمی ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تصنیف و دستاویزات کے سلسلے میں اصول تنقید' تنقید کے نچلے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

درجے میں چلے جاتے ہیں۔ کیونکہ تصانیف و دستاویزات کی اصلیت و کاملیت پرکھنے کے لیے جو فنی مہارت درکار ہوتی ہے وہ اصول تنقید مہیا نہیں کر سکتے۔ یہ زیادہ تر ان کے حقیقی یا غیر حقیقی ہونے کی شناخت میں مدد کر سکتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دستاویز، تصنیف، تصویر، یا کوئی شئے بالائے تنقید ہے۔ بلکہ یہ تو ان دستاویزوں، تصویروں، تصانیف اور اشیاء کی خارجی و داخلی پیچیدگیاں، مشکلات، خصوصیات اور خوبصورتی کے مختلف مراحل ہوتے ہیں جو قدرتی طور پر ہماری توجہ تجزیہ نگاری کی طرف مبذول کرواتی ہیں۔

فن تنقید ایک ماہرانہ فن ہے۔ انسانی فطرت میں قدرتی طور پر اضدادیت کے عناصر پائے جاتے ہیں جس سے وہ خوبیوں، مہربانیوں، نوازشات، احسانات اور تعریف و توصیف کے پہلوؤں کو بھول کر الزام تراشیوں، بدگمانیوں، برائیوں اور نفرت و حقارت کے تیروں کی بوچھاڑ کر دیتا ہے۔ اور پھر نسلوں اس قسم کے زہر ہلاہل کو اگلتا اور پھیلاتا رہتا ہے مثلاً" ملا عبدالقادر بدایونی اپنی کتاب "منتخب التواریخ" میں مغل حکمران اکبر اعظم کے عہد کے روشن پہلوؤں کو نظرانداز کر کے اس کے خلاف الزامات اور بدگمانیوں کا پروپیگنڈہ کرتا ہے۔ اسی قسم کا منفی تنقید کا رویہ محقق و مورخ کے لیے تاریخی تجزیہ نگاری میں مشکلات پیدا کرتا ہے۔

کسی فن، علم، ادب، شے اور واقعہ کی حقانیت جاننے کے لیے فن تنقید کے اصولوں سے واقفیت رکھنا ضروری ہے۔ جدید علوم کی صداقت، حقانیت اور معقولیت کو جاننے کے لیے فن تنقید ناگزیر ہے۔ تنقید کا بہترین معیار وہ ہے کہ جس میں زیر نظر تصنیف، دستاویز، تصویر، مضمون، بیان، موضوع، مشاہدے اور ہر شے کے ہر رخ اور ہر حالت کو تنقید کے ہر پہلو اور زاویئے کے ساتھ پرکھا جائے حتیٰ کہ اس کو کاملیت حاصل ہو جائے۔ بہرحال آج کل تنقید کرنے کے دو طریقے رائج ہیں:

۱۔ تنقید نگار کسی تحقیقی کارنامے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور آخر کار کسی خاص دل خوش کن یا یاس انگیز نتیجے پر پہنچ جاتا ہے۔

۲۔ کسی تصنیف کا شروع سے آخر تک بغور جائزہ لینے کے بعد متفرق واقعات کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ پہلی قسم کے تنقید پر محقق، مورخ اور ادیب کا کام نہیں۔ اس قسم کی تنقید کے لیے وسعت علم و نظر، شعور و تخیل اور منظم حسن بیان کی ضرورت ہے۔ لیکن دوسری قسم کی تنقید پر آسانی سے خامہ فرسائی کی جا سکتی ہے۔ عام طور پر یورپ اور امریکہ میں تحقیقات کو پرکھنے کے لیے یہی دو طریقے رائج ہیں اور ہمارے ہاں بھی نقاد عام طور پر انہی طریقوں کی پیروی کرتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ارتقائے تنقید

علوم و فنون کی تحقیقات اور مبادیات میں جو شرف یونان اور اہل یونان کو حاصل ہے وہ کسی اور ملک کو نہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ہر نئے علم اور فن کی ابتداء یونان سے ہوتی تھی' باقی ممالک اس سے استفادہ حاصل کرتے اور یونانیوں کے قدم بقدم چلنے پر فخر کرتے تھے۔ گویا یونان ہی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کا منبع خیال کیا جاتا تھا۔ یونانیوں نے اس دور میں زندگی کے ہر شعبے میں تحقیق و تنقید کے قدم بڑھائے اور کامیابیاں حاصل کیں۔ اسی دور میں (ہیروڈوٹس) تاریخ میں تحقیقاتی تحریک کا آغاز ہوا اور اس تحریک و تحقیق نے یہاں تک ترقی کی کہ تمام متمدن اقوام عالم اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ اب بھی جب تاریخ میں تنقید نگاری کا آغاز کیا جاتا ہے تو تحقیقات کا سلسلہ ہمیشہ یونانی مورخوں کے پیش کردہ نظریوں سے ملایا جاتا ہے۔ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ جو متعدد اصول تنقید سقراط' افلاطون اور ارسطو نے آج سے سینکڑوں سال پیشتر مرتب و وضع کیے اب تک انتہائی وقعت و اہمیت رکھتے ہیں بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ اس وقت سے آج تک جس قدر تاریخی تنقید کی عمارات تعمیر کی گئی ہیں ان کی بنیاد انہی فلسفیوں کے فراہم کردہ مسالوں سے پختہ نظر آتی ہے۔

تنقید کا جب تاریخی جائزہ لیتے ہیں تو سقراط اس فن کا موجد نظر آتا ہے۔ اس کے بعد بقراط' ارسطو' فنیز[4]' افلاطون[5] اور ارسطو[6] کی تصانیف اس فن کی بنیاد بنیں۔ انہوں نے اپنے زمانے میں اس فن کو روشناس کرایا' اس کے متعدد اصول و قاعدے مرتب کئے اور اپنے عہد کے واقعات اور ادب کو تنقیدی اصولوں کے مطابق پیش کیا۔ اس کے بعد تمام یونانی مورخوں اور ادیبوں نے اپنے زمانے کے ادب و تاریخ کو تنقیدی نقطہ نظر کے ساتھ پیش کیا۔ تیسری صدی عیسوی میں اسکندریہ میں ایک "مکتبہ تنقیدی گرائمر" (School of Critic Grammarians) کے نام سے قائم تھا جس میں کرٹیس کے زینوڈوٹس (Zenodotus of Crates) اور ارسٹارکس (Aristarchus) فن تنقید کا درس دیتے تھے۔ مگر افسوس کہ فن تنقید کے ان اساتذہ کی تحریریں زمانے کی نذر ہو گئیں اور ہم تک نہ پہنچ سکیں۔

عہد روما ادبی و تاریخی تنقید میں کوئی خاص مقام نہ پیدا کر سکا۔ اگرچہ عہد روما کے چند نامور نقاد ہیں کہ جنھوں نے اپنے زمانے کے ادب و تاریخ کو تنقیدی اصولوں کے مطابق پیش کیا۔ عہد روما کے دور عروج میں سسرو[7] (Cicero) اور ہیرڈک[8] (Horace) کی تنقید نگاری کے فن میں مہارت کی بہترین مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ آگسٹس کے عہد کا مشہور مدبر نقاد سینکا[9] (Seneca) ہے۔ عہد روما کا سب سے عظیم اور مشہور تنقید نگار کونٹلین (Quintilian) ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس کا عہد روما کی ادبی دنیا میں کوئی ثانی نہیں گزرا۔

اہل یورپ نے یونانی اور رومی اصول تنقید نگاری کو من و عن اپنایا اور بعد میں اپنے فکر سے اس میں مزید اضافہ کیا۔ پندرھویں صدی تک یورپی تنقید نگاری زیادہ تر روایت اور بالواسطہ تھی۔ لیکن تحریک احیائے علوم کی شروع میں اٹلی میں "تحریک انسانیت کے نقادوں[11]" (Humanistic Critios) نے مثبت تنقید نگاری کا آغاز کیا۔

انگلستان میں ۱۵۵۳ء میں پہلا ادبی نقاد تھامس ولسن[12] تھا۔ اس کے بعد انگلستان میں ورڈز ورتھ (Wordsworth) شیلے (Shelly) اور کیٹس (Keats) نے فن تنقید میں گرانقدر اضافہ کیا۔ فرانس میں والٹیئر[13] (Voltaire) اور بیفن (Buffon) نے فن تنقید نگاری کو کمال و عروج بخشا۔ کہا جاتا ہے کہ ان نقادوں کی شخصیات خود ہی تنقید نگاری کا بہترین اصول و قاعدہ تھیں۔

عباسی خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں جب عربوں نے علوم و فنون اور ادب و فلسفہ کے ساتھ ساتھ یونانیوں کی کتابوں سے تاریخ نگاری کے اصول اور قوانین نقد و نظر وغیرہ تراجم کے ذریعے حاصل کئے تو ان کی توجہ فن تنقید نگاری کی طرف اور زیادہ بڑھ گئی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ڈھنگ پر اور عربی تاریخ نگاری کے مزاج کے مطابق اصول تنقید اپنائے۔ لہٰذا اسلامی تاریخ نگاری سے متعلق ان کے بنیادی اصول وہی یونان کے تھے، جن پر انہوں نے عربی فن تنقید کی سربفلک عمارتیں بلند کی تھیں۔

یورپ کے علماء نے افلاطون اور ارسطو کے مرتب کئے ہوئے تنقید کے جامع اصولوں پر تنقید نگاری کی عالیشان عمارتیں کھڑی کر لیں لیکن مشرق کے قدامت پسند باشندے اپنی قدامت پرستی اور ناواقفیت کی بدولت محض ارسطو کے قائم کردہ اصولوں پر ہی قائم رہنا اپنے لیے باعث فخر سمجھے۔ گذشتہ دو سو سالوں میں جب مغرب کی علمی روشنی سے مشرق میں چراغ جلائے گئے اور علم و ادب کے دریا کی رو نے ادھر کا رخ کیا تو تاریخ و تنقید کے میدان میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ جب انگریزی تعلیم نے مشرق کی تاریخ نگاری پر اثر ڈالا اور فن تنقید کو اس سے روشناس کرایا تو انگریزی تعلیم یافتہ مورخوں کا طبقہ مغربی طرز پر تاریخ پر تنقید کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ بے شک تاریخ نگاری کی ترقی کے ساتھ ساتھ فن تنقید یا تاریخی تنقید نگاری نے بھی ضرور ترقی کی لیکن ابھی ضرورت ہے کہ مشرق کے مورخ اس فن کی طرف پوری توجہ صرف کریں۔

ہمارے ملک پاکستان میں فن تنقید اور تاریخ نگاری کو بہت ہی آسان خیال کیا جاتا ہے حالانکہ فن تنقید اور فن تاریخ نگاری مشکل ترین فنون میں شمار ہوتے ہیں۔ اگرچہ تاریخ کا دامن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انسان کے ساتھ اس کی تخلیق کے ساتھ ہی منسلک و وابستہ ہے اور انسانی تاریخ کے وسیع سمندر میں جو کم و بیش دس ہزار سالوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس بحرِ بے کنار کی تہوں میں ایسی بے شمار کتابیں موجود ہیں جن میں تنقید کے پرانے اور نئے اصولوں پر بحث و تمحیص کی گئی ہے۔ ہمارے ہاں فن تنقید شروع سے لے کر اب تک تنگ نظری، تعصب، شخصیت پرستی، موقع پرستی اور نا منصفانہ جانبداری کا شکار رہا ہے اور ہے۔ اس کی وجہ شائد زیادہ تر یہ ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے تنقید نگاری کے فرائض انجام دیئے ہیں یا دے رہے ہیں عام طور پر علم تنقید نگاری کی اساس اور ترقی یافتہ اصولوں سے پوری طرح واقف نہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے جس قدر تاریخی اور ادبی تذکرے مرتب ہوئے بدقسمتی سے ان کی تنقیدیں عموماً" قدیم روایتوں، حکایتوں، مصلحتوں اور اصولوں کے اثرات سے یک طرفہ تھیں۔ اگر اس وقت کے ماحول کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان ایام میں لکیر کے فقیر ہونے ہی سے صحت واقعات کی سندیں ملتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے کی تاریخی تنقیدات نقادوں کی تنگ نظری کی غمازی کرتی ہیں لہٰذا اس زمانے کے بہت سے اچھے مورخوں کا اپنے ہم عصروں میں نمایاں ہو کر نہ چمکنا اس دعوے کی روشن دلیل ہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے ساتھ جب زندگی اور علوم و فنون کے ہر شعبہ میں انقلاب آیا تو نقد و نظر کا نقطہ نظر بھی تبدیل ہوا۔ تاریخ نگاروں اور ادیبوں میں تنقید کا شوق بڑھا اور فن تنقید روایتی قیود سے آزاد ہوا تو انگریزی تعلیمات اور تنقید نگاری کے اثرات مشرقی روایات میں پیوستہ ہوئے۔

۱۸۷۰ء میں سرسید احمد خان نے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا اور اس کے ذریعے ہندوستان کے قدیمی علوم و فنون کو زندہ رکھنے کی کوششیں کیں۔ اس رسالے کے مقاصد بہت وسیع اور جامع تھے۔ تنقید نگاری کے میدان میں یہ رسالہ آزاد خیالی کا علمبردار تھا، بلکہ ہر شعبے میں اپنے بانیوں کی وسعت نظر اور روشن خیالی ثابت کرتا تھا۔ مولانا حالی کی زندگی پر اس رسالے کے بانی سرسید احمد خان کے خیالات کا سب سے گہرا اثر پڑا۔ وہ خوبیاں جو فطرت نے مولانا حالی کے دل و دماغ میں ودیعت کر رکھی تھیں سرسید احمد خان کی آبیاریوں اور ہمت افزائیوں سے بار آور ہوئیں اور انہوں نے تنقیدی نقطہ نظر سے متعدد تصانیف کا ادب میں اضافہ کیا۔ سرسید احمد خان کا رسالہ اسباب بغاوت ہند تنقید نگاری کے میدان میں انقلابی خصوصیات کا حامل تھا۔ اس رسالہ میں سرسید نے نہایت جرات مندی کے ساتھ انگریزوں پر تنقید کی ہے۔

سرسید احمد خان کی خطبات احمدیہ جو انہوں نے سرولیم میور کی متعصبانہ کتاب "لائف آف محمد" کے ردعمل میں اپنے جذبہ اسلام کے تحت تحریر کی، اس نے تنقیدی حلقوں پر گہرے اثرات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھوڑے۔ جسٹس امیر علی کی "ہسٹری آف سیرا سینز" (History of Seracenes) میں عیسائیوں کے اسلام کے خلاف حملوں اور تنقید کا اصول تحقیق و تنقید کی روشنی میں مدلل اور منصفانہ جوابات دیئے۔

حالی کی تنقید نگاری نے "یادگار غالب" سے جنم لیا اور وہ شعر و شاعری، حیات سعدی اور حیات جاوید وغیرہ پر ختم ہوئی۔ اس زمانے میں شبلی نعمانی بھی افق تنقید پر ظاہر ہوئے۔ ان کی ذات میں مذہبی تقدس، تاریخ نگاری اور شوق ادبیات مجتمع تھے۔ اگر ان مصنفوں کے تنقیدی کارنامے سامنے رکھے جائیں تو ادب و تاریخ کے میدان میں فن تنقید ایک مستقل فن کی حیثیت سے نظر آئے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں ادب و تاریخ میں ابھی تک فن تنقید کو وہ مقام حاصل نہیں جو مغربی ممالک میں ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ مورخ اور ادیب اس فن کی طرف متوجہ ہوں اور اپنی تاریخ نگاری کے علمی خزانوں میں مغربی تاریخ نگاری سے تنقیدی علم کی دولت کو منتقل کریں۔ مغرب میں یہ فن بہت ترقی کر چکا ہے اور ان کے ہاں اس فن کی تربیت اور تحصیل کے لیے بے شمار مستقل تصانیف موجود ہیں۔

تنقید کے مقاصد

تنقید کا بہترین مقصد یہ ہے کہ نقاد زیر بحث تاریخی واقعات، تصنیف اور کارنامے کی صداقت کی تحقیق کرے اور معلومات و حقائق کا مقابلہ جو یہ تاریخی یا ادبی کارنامے ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں، عام انسانی حالات سے کر کے دیکھے کہ فلسفہ حیات سے ان کا کیا تعلق ہے؟ اور یہ بھی معلوم کرے کہ زیر تنقید تصنیف، واقعات اور کارنامے تحقیق و تفتیش کے معیار پر پورے بھی اترتے ہیں یا نہیں؟ گویا ان میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو ایک تحقیقی کارنامے، واقعات اور تصانیف میں ہونا ضروری ہیں۔ اس سلسلے میں محققین نے چند اصول اور قواعد یک جا کیے ہیں جن پر سب مورخ اور ادیب متفق ہیں کہ تحقیق حقائق کے لیے یہ ضرور مفید ہو سکتے ہیں۔

محققین، مورخین، انشا پردازوں اور ناقدوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ تحقیق کا منشا یہ ہے کہ جب کوئی تلاش حقائق کا سلسلہ شروع کرے تو ساری دنیا کے تفکرات اور کشاکش حیات کے بکھیڑوں کو بھول جائے اور جتنی دیر اس کے مطالعہ میں مستغرق رہے اپنے آپ کو بھولا رہے۔ بجنسہٖ یہی مقصد تاریخی تنقید نگاری کا ہے کہ جب کوئی نقاد کسی تاریخی یا ادبی کارنامہ پر تنقید کرنے بیٹھے تو اس کا تعلق عالم مادیات سے منقطع ہو جائے اور وہ عالم محسوسات میں ایک آزاد اور خوش نوا طائر کی مانند اڑتا پھرے۔ ظاہر ہے اس قسم کی پرواز میں جو مسرت اور انبساط حاصل ہو گا وہ نقاد کا دل ہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقاصد وہی ہو سکتے ہیں جو تخلیق کے ہیں۔ یعنی طرح طرح کی کیفیتوں سے گزرنا' مصنف کے خیالات کی رو میں بے بس ہو کہ بہے جانا وغیرہ وغیرہ۔ فن تنقید تخلیق تصنیف سے مشکل فن ہے۔ ہر پڑھا لکھا شخص مصنف یا ادیب بن سکتا ہے۔ مگر نقاد نہیں بن سکتا۔

کسی مصنف کے کام کو تحقیقی معیار سے جانچنا اور اس میں ان خوبیوں اور خامیوں کو دکھانا جو عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں تنقید نگار ہی کا کام ہے۔ اگر نقاد مصنفوں کے کارنامے نہ دکھائیں تو بہت سے مصنف گمنام رہ جائیں۔ قابل نقاد اکثر اوقات ان حقائق تک پہنچ جاتے ہیں جو اصل مصنف کے دل و دماغ میں بھی نہیں گزرتے۔

تنقید نگار مصنف کے کام کا باقاعدہ تجزیہ کر کے اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ مصنف کس پائے کا ہے۔ اس نے اپنے موضوع کے کونسے حصے کو نمایاں کر کے دکھایا ہے اور کونسا حصہ ناقدوں کے لیے دھندلکے میں چھوڑ دیا ہے۔ اس کے ظاہر الفاظ سے کیا مراد ہے اور اندرونی طور پر کس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے[15]۔ نقاد کا فرض یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کا ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ وہ غلط فہمیوں کا ازالہ کرے' جو کسی تاریخی، تحقیقی اور ادبی کارنامے کے متعلق کسی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں[16]۔

تنقید کا بہترین فائدہ یہ ہے کہ جن مورخوں' مصنفوں اور ادیبوں کی تحقیقی' تاریخی اور ادبی کاوشوں سے ہم واقف ہونا چاہتے ہیں تو صرف نقادوں کی تنقیدیں پڑھ کر یعنی بغیر ذاتی محنت اور تحقیق کے ہم ان سے پوری واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر ہمیں بذات خود ہر مصنف کے متعلق چھان بین کرنی پڑے تو مختصر سی زندگی میں ہم بہت کم مصنفین کی تحقیقاتی عظمت سے واقف ہو سکیں گے۔

تنقید جہاں مورخوں کو صحیح تحقیقی راستے پر گامزن رکھتی ہے اور بھٹکنے سے بچاتی ہے وہاں ایسے قصہ گو قسم کے لوگوں کو مورخ، مصنف اور ادیب بننے سے روکتی ہے جو خواہ مخواہ ان کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں۔

صحیح تنقید ان تحقیقی مصنفین کی طبیعتوں کو اکساتی ہے جن کے دل و دماغ میں تحقیقی اور ادبی جوہر پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن نقلی مصنفین ان کو ابھرنے کا موقع نہیں دیتے۔

صحیح تنقید کے ذریعے صحیح مذاق تاریخ و ادب پیدا ہوتا ہے۔ تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ ہر قوم کی تاریخ ہوتی ہے جو ان کی اصلی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے۔ جب اس قوم کی تاریخ بگڑتی ہے تو وہ قوم بھی بگڑتی ہے اور اگر قوم زوال پذیر ہوتی ہے تو اس کے ماضی کی تاریخ اسے آئینہ دکھاتی ہے اور اپنے آباؤ اجداد کی ازمنہ رفتہ کے جاہ و جلال کے ایام کا عکس پیش کرتی ہے۔ ایسے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نازک موقع پر تنقید نگار ہی کام آتے ہیں اور قوم کو اس کے ایام ماضی کی یاد دلا کر اسے پستی کی طرف جانے سے روکتے ہیں۔

تنقید کے ذریعے ایسے قصہ گو قسم کے کم علم، نقلی اور فرضی مورخوں اور مصنفوں کو روکا جا سکتا ہے جو جہالت اور خود غرضی سے غلط اعتقادات اور باطل خیالات و واقعات کی اشاعت کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں یا جو مذہبی تعصب یا ذاتی بغض و عناد کی بنا پر تفرقہ بازی کو ہوا دے کر قومی سلامتی اور قومی تاریخ کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

اصول تنقید

چونکہ تنقید عام طور پر مختلف جذبات و احساسات اور خیالات و نظریات کے تحت کی جاتی ہے اس لیے نقادوں کا نظریہ تنقید بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں پر تنقید نگاری کے چند اساسی اصول بیان کئے جاتے ہیں۔

۱- سب سے پہلے زیر تنقید تاریخی واقعات کی ظاہری شکل و صورت اور اسباب کا اچھی طرح جائزہ لے کر معلوم کرنا چاہئے کہ مصنف اپنے تحقیقی کارنامے کے ظاہری خدوخال اور واقعات و حقائق کے اسباب احسن طریقے پر معلوم کر سکا ہے یا نہیں؟ مثلاً" اگر کسی نے کوئی واقعہ بیان کیا ہے یا تحریر کیا ہے تو مصنف کے حقائق کے تعین میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کی بدولت وہ واقعہ پیش آیا۔ کیا مصنف نے اس مخصوص قسم کے واقعہ کے لوازمات و وجوہات کی نگہداری بھی کی ہے یا نہیں؟

۲- نقاد کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ متقدمین کے ماضی کے تاریخی کارناموں کو زمانہ حال کے مورخوں کی تاریخی تصانیف سے منطبق کرنا بڑی بھاری غلطی ہے کیونکہ ہر تاریخی تصنیف اپنے زمانے کے خیالات اور حالات و واقعات کا آئینہ ہوتی ہے اور ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ نقاد کا کام فقط اتنا ہے کہ وہ ان تصانیف کی خوبیوں اور خامیوں کو تلاش کرے جو تحقیقی تشنگی کو دور کر کے حقائق کو اس کے اصلی مقام پر متعین کرنے میں مدد دے۔

۳- نقاد کو چاہئے کہ وہ موضوع کے لحاظ سے زبان اور اسلوب بیان کے فرق و تعلق کو معلوم کرے کیونکہ ہر موضوع اور بحث کے لیے ایک خاص انداز بیان اور مخصوص زبان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ موضوع اور زبان کا فرق و تعلق زماں و مکاں اور جغرافیائی احساسات کو اجاگر کرتا ہے۔

۴- مصنف کے ذاتی حالات، ماحول اور اس کے ماخذوں پر پورا عبور ہونا بھی ضروری ہے تاکہ مصنف کی دیانتداری اور اس کی علمی قابلیت کا اندازہ ہو سکے۔ اگر نقاد زیر تنقید کارناموں، واقعات کے ماخذوں اور اسباب سے ناواقف ہو گا تو ... تمیز نہیں کر سکے گا بلکہ وہ مصنف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے زور بیان کی رو میں بہتا چلا جائے گا۔ ہر قدم پر اس کے ساتھ لڑکھڑائے گا اور ایک طوفان زدہ اور شکست خوردہ انسان کی طرح نتیجہ پر پہنچے گا۔

۵۔ تنقید نگاری کا آخری اصول یہ ہے کہ تصنیف کی تاریخی تکمیل پر نظر رکھی جائے۔ نقاد کی کامیابی کا دار و مدار اسی مخصوص اصول پر ہے۔ نقاد کا فرض ہے کہ وہ تحقیق کے ان اصولوں اور پہلوؤں کا جائزہ لیں جو اپنی حقانیت اور صداقت سے دماغ کو متاثر کرسکتے ہیں۔ اور یہ بھی دیکھئے کہ اسلوب بیان میں کہیں حقانیت و صداقت کا کوئی پہلو تو ملیا میٹ نہیں ہوگیا۔ مصنف نے تصنیف کے خارجی اور داخلی پہلوؤں کو کس حد تک مدنظر رکھا ہے۔ جہاں تفصیل کی ضرورت ہے وہاں تشریح و توضیح سے کام لیا گیا ہے یا نہیں۔ کہیں واقعات کی بے جا تفصیل تو نہیں دی گئی۔ مصنف تاریخی شعور سے حقائق کے خلاء کو پورا کرنے کی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔ زیر تنقید تصنیف میں تناقص بیان تو نہیں۔ متضاد بیانات و واقعات سے مصنف کی ذاتی کمزوریاں ظاہر ہوتی ہیں اور ان کے اثرات سے قارئین شکوک و شبہات میں پڑ جاتے ہیں۔

تنقید نگار کے فرائض

تنقید کے مقاصد و اصول سمجھ لینے کے بعد تنقید نگار کے فرائض بھی کسی نہ کسی حد تک واضح ہو جاتے ہیں لیکن پھر بھی سطور ذیل میں ہم تنقید نگار کے کچھ نہ کچھ فرائض مقرر کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

۱۔ جیسے ایک کامیاب طبیب کی کامیابی کا راز اس کی ذہانت' فراست اور فنی قابلیت میں مضمر ہے اسی طرح نقاد کی کامیابی اس کی خداداد تنقیدی قابلیت پر منحصر ہے۔

۲۔ نقاد کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ مورخ و مصنف کی علمی و تحقیقی قابلیت کو تلاش کرے' اس کے پوشیدہ جوہروں کو چمکائے اور اس کے مخصوص نقطہ نظر سے اس کے خیالات کی ترجمانی کرے۔

۳۔ نقاد کو چاہئے کہ وہ ایک کامیاب مقرر کی طرح عوام کو مخاطب کرے اور وہ مورخ' مصنف اور ادیب سے مخاطب نہ ہو اس طریق کار سے ذاتیات کی بحث چھڑ جانے کا اندیشہ پیدا نہیں ہوتا۔

۴۔ نقاد بننے کے لیے وسیع مطالعہ' اعلیٰ ظرف' صائب رائے' پختہ شعور' تاریخی شعور' صحیح ادبی ذوق' منطقی سوچ' اور دقیقہ رس طبیعت کی ضرورت ہے۔

۵۔ نقاد کا کام یہ نہیں کہ وہ کھوٹے کھرے ہی کو جانچتا رہے یا مورخ' مصنف اور ادیب کو جھٹلائے اور کہیں اس کی گوشمالی کرے۔ اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اس کی تحقیق' تصنیف اور تاریخی و ادبی کارنامے کی وضاحت کرکے خود خوش ہو اور دوسروں کو اپنی خوشی میں شریک کرے۔ زیر تنقید تحقیقی کارنامے کو اجاگر کرکے قارئین کے دل و دماغ پر مصنف اور اس کی تصنیف کے بارے میں پہلے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے زیادہ گہرے اور نمایاں نقوش پیدا کر دے۔

۶- چونکہ تنقیدی اصول نقادوں کی چھان بین اور تحقیقات سے مرتب ہوتے ہیں اس لیے تنقید نگار کا سب سے اہم فرض یہ ہے کہ پوری پوری تحقیق و تفتیش کے بعد فیصلے صادر کرے۔ اپنی رائے کو ظاہر کرنے سے پہلے مصنف کی سماجی' مذہبی' سیاسی' جغرافیائی اور نظریاتی کیفیتوں کا گہرائی کے ساتھ تجزیہ کرے۔ اور مصنف کے خیالات سے بھی پوری آگاہی ہونی چاہیے تاکہ اس کے مخصوص نقطہ نظر سے موضوع کے ہر پہلو پر نظر ڈال سکے۔

۷- تنقید نگار پر لازم ہے کہ پرانے تنقید نگاروں کی تحقیقات اور خیالات سے استفادہ کرے۔ مثل مشہور ہے چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اگر مختلف قسم کی آراء سامنے ہوں تو نقاد بہت جلد اور آسانی سے کسی خاص نتیجے پر پہنچ سکتا ہے۔

۸- نقاد کو تاریخ و ادب کے ہر شعبے سے واقف ہونا چاہیے جملہ علوم اور اصناف سخن کی واقفیت تنقید نگاری کا اصل اصول ہے۔

۹- تاریخ و ادب سے پوری پوری واقفیت ہونے سے زمانہ ماضی کے مختلف ادوار کی مختلف تحریکوں' نظریوں اور علم و ادب کی نشوونما اور مختلف اقوام کے عروج و زوال کے اسباب پیش نظر رہتے ہیں۔

۱۰- جس فن کی تصنیف پر تنقید کی جائے اس فن سے کماحقہ' واقفیت ہونی چاہیے۔ کوئی ایسی بات قلم سے نہیں نکلنی چاہیے جو صدا بصحرا ثابت ہو اور تنقید کی اہمیت اور نقاد کی شخصیت کو نقصان پہنچائے۔

۱۱- تنقیدی رائے ہر قسم کے تعصب اور تکلف سے پاک ہونی چاہیے۔ گویا نقاد کا فرض ہے کہ وہ ہمیشہ غیر جانبدار رہے اور تنقید کرنے سے پہلے اپنے ذاتی تعلقات کو بھول جائے۔ زیر تنقید تصنیف کی خوبیاں اور خامیاں دونوں سامنے رہیں تاکہ کسی مسئلے اور واقعے کی تہہ تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔

۱۲- نقاد کا لہجہ اور زبان نہایت نرم' شائستہ اور ملائم ہونی چاہیے۔ سخت تنقیدی لہجہ اختیار کرنے سے اکثر اوقات عوام مصنف سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ یوں بعض اوقات بعض حساس مصنف تحقیق و تخلیق کے کام سے متنفر اور روگرداں ہو کر اس سے علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ تنقید کا بہترین اصول یہ ہے کہ مصنف کو اس کی کمزوریوں سے ایک ہمدرد دوست کی طرح آگاہ کیا جائے اور نقاد کو اپنے قلم اور طبیعت پر قادر ہونا چاہیے۔

۱۳- تنقید نگار کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس کی تنقید کو پرکھنے اور جانچنے والے موجود ہیں۔ تنقید سے نقاد کی قابلیت' علمیت اور اس کے خیالات و نظریات کی بلندی و پستی ظاہر ہوتی ہے اس لیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تنقید نگار کا ہر فیصلہ سو فیصد درست اور منصفانہ ہونا چاہئے۔

نقطہ نظر

افسوس ہے کہ ہند و پاکستان کی سرزمین میں تاریخ کے میدان میں فن تنقید نگاری نے ابھی تک مستقل فن کی حیثیت اختیار نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس خطہ میں رسمی' قصہ گو اور خوشامدی درباری قسم کے مورخ نما افراد کی بہتات و آؤ بھگت رہی ہے۔ یہ رسمی مورخ نما قصہ گو صاحب اقتدار لوگوں کے شب و روز کی ذاتی تعریفوں اور ان کے کارناموں کی خوبیوں کو گنوانے اور تحریر کرنے میں مصروف رہے۔ نیز برصغیر کی گرم مرطوب آب و ہوا بھی یہاں کے لوگوں کے خصائل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ خصوصاً" صاحب اقتدار لوگوں میں تو حقائق اور تنقید کا سامنا کرنے کا حوصلہ اور برداشت کا مادہ بہت کم ہوتا ہے۔ اس لیے دور شاہی تو کجا جدید جمہوری ادوار میں بھی علم و ادب اور تاریخ کے میدان میں فن تنقید نگاری یورپی ممالک کی طرز پر نشوونما نہیں پا سکا۔

اس مفید فن پر صرف اردو ادب میں گذشتہ صدی کی چند تصنیفات ہیں اور موجودہ صدی میں بھی اس موضوع پر بہت کم کام ہوا ہے۔ تاریخ کے میدان میں فن تنقید نگاری پر تو کوئی بھی قابل ذکر کاوش نہیں کی گئی اور نہ ہی اس موضوع پر کوئی مستقل تصنیف تحریر کی گئی ہے۔ درحقیقت یہ کام ان لوگوں کا ہے جو مشرقی اور مغربی علوم پر کامل عبور اور پوری دستگاہ رکھتے ہیں۔ انہی معدودے چند حضرات کی کوششوں سے تاریخ پر ہمارے فن تنقید کے نظریوں میں کچھ انقلاب پیدا ہوا ہے۔ ورنہ ہمارے عام تنقید نگار اور تاریخ نگار تو تنقید کا مفہوم سمجھنے سے بھی قاصر ہیں۔

تاریخ نگاروں کو تو بہت جلد فن تنقید کی طرف متوجہ و راغب ہونا چاہئے۔ ہر ملک و قوم کی ترقی اس کی تاریخ کے عروج پر منحصر ہے اور تاریخ کے عروج و زوال میں فن تنقید کا بہت دخل ہے۔ تنقید جہاں مردہ قوموں کے کارناموں کو زندہ کرتی ہے۔ وہاں زندہ قوموں کے خوابیدہ احساسات کو بھی بیدار کرتی ہے۔ تنقید سے حق و نیکی کی شناخت اور غلط و باطل خیالات و احساسات کی بیخ کنی سے شعوری ارتقاء کی منزلیں طے ہوتی ہیں اور مردہ قومیں زندہ قوموں میں شمار ہونے لگتی ہیں۔ تنقید کے ذریعے مورخوں اور تاریخ پسند طبیعتوں میں صحیح تاریخی ذوق و شعور پیدا ہوتا ہے جس کا اثر براہ راست ملکی تہذیب و تمدن پر پڑتا ہے۔

اگر یہ سچ ہے کہ ہر قوم کی تاریخ اس قوم کی زندگی کا آئینہ و تفسیر ہوتی ہے اور قومی عروج و زوال تاریخی کارناموں میں مضمر ہے تو فن تنقید نگاری سے پوری طرح واقف ہونا ہر مورخ و مصنف کا فرض ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نواں باب

حوالہ جات

۱- انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا' ص' ۴۶۸

۲- نصیر احمد ناصر' تاریخ جمالیات (مجلس ترقی ادب' لاہور' ۱۹۶۲ء)' جلد اول' ص' ۴۵-۳۷

۳- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو' ملا عبدالقادر بدایونی' منتخب التواریخ' (غلام علی اینڈ سنز' لاہور' ۱۹۶۲ء)

۴- جارج سارٹن (اردو ترجمہ از سید نذیر نیازی)' مقدمہ تاریخ سائنس (مجلس ترقی ادب' لاہور' ۱۹۵۷ء) ص' ۴۳۴-۴۳۳

۵- ایضاً" ص' ۲۵۷-۲۵۴

۶- ایضاً" ص' ۲۹۶-۲۹۳' مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔

R. Mckeon, ed Introduction to Aristotle;

W. D. Ross, ed., Aristotle; Betty Radice, ed., The Ethics of Aristotle.

۷- مقدمہ تاریخ سائنس ص' ۲۷۴ ملاحظہ ہو Cicero, On the Good Life;

Cicero's Selected Political Speeches., Cicero's Letters To His Friends

۸- تاریخ جمالیات' جلد اول' ص' ۱۴۲ ملاحظہ ہو Art of Poetry of Horace.

۹- مقدمہ تاریخ سائنس ص' ۵۶۷-۵۶۶

۱۰- ایضاً" ۵۵۴-۵۵۳ تاریخ جمالیات' جلد اول' ص' ۱۴۶

۱۱- اس تحریک کا بانی ایک شخص پیڑ راک تھا۔ اس کا نام نہ صرف احیائے علوم کے دور کے علم و ادب کے اٹلی میں بلکہ آج کی مہذب دنیا کے ادب اور انسانی دماغ کی تاریخ میں ستارے کی طرح چمکتا ہے۔ پیٹر راک احیائے علوم کے دور میں وہ پہلا شخص تھا جس نے پرانے یونانی لٹریچر کو خوبصورتی کے ساتھ سمجھا اور اکٹھا کیا۔ اس نے ہاتھ سے لکھی ہوئی دو سو پرانی یونانی کتابیں اکٹھی کیں جن میں سسرو کے خطوط' ہومر' ارسطو' سینکا اور دیگر بہت سے یونانی مورخوں' ادیبوں اور فلسفیوں کی کتابیں تھیں۔ اس نے ان کا لاطینی زبان میں ترجمہ کرایا۔ اس طرح اس نے یونانی ادب کا علم از سرنو یورپ میں پھیلانا شروع کیا۔ اس نے بہت سی لائبیریریاں قائم کیں۔ اس کی اس تحریک میں یورپ کے سوداگر' شاہزادے اور پوپ اس کے حامی و مددگار ہو گئے۔

۱۲- Thomas Wilson, Art of Rhetoric, (London, 1553)

۱۳- تاریخ جمالیات' جلد اول' ص' ۴۱۶ ملاحظہ ہو' Voltair's Candide,

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Zadig, Philosophical Dictionary and Philosophical Letters.

۱۴- مولانا شبلی نعمانی کی اہم تنقیدی تصانیف:

۱- المامون: مامون الرشید کے عہد کا تنقیدی جائزہ (۱۸۸۷ء)

۲- سیرت النعمان: امام ابو حنیفہ کے احوال کا جائزہ (۱۸۸۳ء)

۳- الفاروق: حضرت عمر فاروق پر معیاری کتاب (۱۸۸۹ء)

۴- الغزالی: امام غزالی اور ان کے افکار پر (۱۹۰۲ء)

۵- الکلام: علم الکلام (۱۹۰۴ء)

۶- سوانح مولانا روم (۱۹۰۵ء)

۷- شعر العجم: (پہلا حصہ ۱۹۰۸ء میں طبع ہوا اور آخری حصہ ان کی وفات کے بعد)

۸- سیرت النبیؐ: (چھ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ مکمل شبلی کی تحریر ہے۔ بقیہ حصے مولانا سید سلیمان ندوی نے مکمل کیے)

۱۵- بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ مصنف نے بالواسطہ انداز بیان اختیار کیا ہوتا ہے یعنی تشبیہہ و استعارہ سے کام لیا ہوتا ہے۔ یہاں نقاد کا کام پیچیدہ ہو جاتا ہے اور اسے ماہر زبان ہونا پڑتا ہے تا کہ وہ تشبیہہ و استعارہ اور مسجع و مقفع عبارت کو جاننے کے لیے اپنی زبان دانی کی مہارت بروئے کار لا سکے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، صادق علی گل، سرگذشت تاریخ، ص۔ ۸۵

۱۶- بعض اوقات نیم خواندہ نقول نویس کم علمی کی وجہ سے "سہوا" مسودے میں غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایسے مسودوں کی غلطیوں کا پتہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے کہ جہاں پر غلطیاں "قصداً" کی گئی ہوں۔ "سہوا" یا اتفاقی غلطیاں غیر ارادی طور پر سرزد ہوتی ہیں۔ "مثلاً" نقل نویس کا چند سطروں کا چھوڑ جانا یا مصنف کی ہدایات کو صحیح طور پر نہ سننا، ملاحظہ ہو سرگذشت تاریخ، ص ۸۷

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دسواں باب

مصنف و تصنیف
AUTHORSHIP

لانگ لائیس کا کہنا ہے کہ دستاویزات کے بغیر تاریخ کا کوئی وجود نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ دستاویزات کے بغیر تاریخ نگاری ممکن نہیں۔ دستاویزات تاریخ کی روح ہوتی ہیں اور صحیح دستاویزات سے صحیح تاریخ وجود میں آتی ہے۔ دستاویزات سے درست حقائق اخذ کرنے کے لیے چند اصول و قواعد موجود ہیں جنہیں بروئے کار لا کر صحیح تاریخ نویسی کی جا سکتی ہے۔ اخذِ معلومات کا یہ طریقہ یا اصول بالواسطہ طریقہ ہائے تاریخ نویسی کہلاتا ہے۔ اس میں داخلی تنقید' خارجی تنقید' مصنف کا تجزیہ' نصابی تنقید اور تصنیف کی خارجی تنقید و تجزیہ کے ذرائع کو عمل میں لا کر مستند حقائق اخذ کر کے ایک حقیقی تصنیف حاصل کی جاتی ہے۔

دستاویزات سے استفادہ کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایک خاص مہارت کی ضرورت ہوتی ہے جسے ہم دستاویزات کا تنقیدی تجزیہ کہہ سکتے ہیں۔ اگر ہم دستاویزات کے متن و مندرجات پر مکمل بھروسہ و انحصار کریں اور ان امور کو نظرانداز کر دیں جن کی بنا پر یہ احاطہء تحریر میں آئیں تو تصنیف کے اخذ کردہ حقائق مشکوک ہو جائیں گے۔ اسی لیے دستاویزات کی علت و معلول کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ اور یہی جائزہ دستاویزات کے لیے تنقیدی تجزیے کی حیثیت رکھتا ہے۔

تاریخ نویسی کا طریق کار فطری علوم کی طرح براہ راست اور بلا واسطہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک بالواسطہ طریق کار ہے۔ جس کا انحصار مشاہدات و بیانات پر مشتمل ہے۔ مشاہدات کو عقلی دلائل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اور مورخ عقلی دلائل کے ذریعے تاریخ کے خاموش خاکوں سے حقائق کو اخذ کرتا ہے۔ کسی نامکمل دستاویز سے حقیقت تک رسائی کرنے اور اس سے نتائج اخذ کرنے کا صرف یہی ایک ذریعہ اور طریق کار ہے کہ جس سے ماضی کے پوشیدہ حقائق منظرعام پر آ جاتے ہیں اور ان دستاویزوں کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔ یہی تنقیدی تجزیہ کا مقصد ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

INTERNAL CRITICISM داخلی تنقید

داخلی تنقید سے مراد مصنف کے خیالات و نظریات' عقائد' مشاہدات' عہد' مقام اسلوب مرتبے' ماحول اور کردار کے بارے میں صحیح اندازہ لگانا ہے۔ یعنی یہ مصنف کے وہ فکری مذہبی' معاشی اور معاشرتی رجحانات ہوتے ہیں جو کسی تصنیف پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ داخلی تنقید میں ہم تصنیف کی بجائے مصنف کے کردار و احوال کا جائزہ لیتے ہیں۔ اگر ان امور کو نظر انداز کر کے تصنیف کے حقائق تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی تو نتائج کا کسی حد تک غلط ہونے کا امکان ہے۔ کیونکہ وہ تصنیف جو مصنف نے دریافت یا خلق کی ہوتی ہے اس میں درج احوال غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ مصنف متعصب' تنگ نظر' ثناء خواں لالچی آزاد اور بے غرض ہو سکتا ہے۔ مصنف کی تحریر کے ہر رخ کو سمجھنے کے لیے اس کے کردار و احوال کو ناقدانہ نظر سے پرکھنا ضروری ہے تاکہ حقیقی اور درست تصنیف و حقائق میسر آ سکیں۔ مورخ پر تنقید و تحقیق کے اصولوں کو داخلی تنقید کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں دو امور پیش نظر رکھے جاتے ہیں۔

مثبت تنقید :

مثبت تنقید سے مسودے کی حدود کا تعین و تجزیہ کیا جاتا ہے تاکہ اندازہ لگایا جا سکے کہ "متن" سے مصنف کی کیا مراد ہے۔

منفی تنقید :

مصنف کے فکری رجحانات کا اندازہ لگانے کے لیے منفی تنقید کا سہارا لیا جاتا ہے۔ تاکہ مصنف کے بیانات و مشاہدات کی تصدیق ہو سکے اور ان حالات کا تجزیہ ہو سکے جن کے زیر اثر اس نے تصنیف کی۔

تاہم دستاویزات سے حقائق مرتب کرنے کے لیے مصنف و تصنیف پر داخلی و خارجی تنقید ضروری ہے۔ ورنہ صحیح تاریخ کی جگہ محض قصے' کہانیوں' افسانوں اور داستانوں کے غیر حقیقی اور بے سروپا مجموعے مرتب ہوں گے۔ داخلی تنقید میں ماخذوں' دستاویزوں' اور تصانیف کے بارے میں یہ اطمینان کیا جاتا ہے کہ یہ اسلوب متن' معانی اور مطالب کے لحاظ سے حقیقی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ حقیقی مصنف' موجد یا فنکار کی تخلیق ہیں۔ یا ان کا سن اشاعت و ساخت ان کے اصلی و حقیقی ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔ بالآخر یہ کہ کیا دیگر مشاہدات و بیانات اور حالات و واقعات اصول تحقیق و تنقید کی روشنی میں ان دستاویزات کے حقیقی ہونے کی تصدیق کرتے ہیں؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مصنف کا تجزیہ ANALYSIS OF AUTHOR

مصنف کسی بات یا کتاب بنانے اور لکھنے والے کو کہتے ہیں۔ مصنف جو مضمون یا کتاب لکھتا ہے اسے تصنیف کہتے ہیں۔ جب ہم کسی مضمون یا کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس مصنف کے ساتھ دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب ہم مصنف کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں تو اس کی علمی حیثیت' پیشہ' معاشرتی مقام اور دستاویز لکھی جانے کی جگہ و تاریخ کے بارے میں اپنے ذہن میں ایک خاکہ قائم کر لیتے ہیں۔ دور جدید کی تصانیف میں بالعموم مصنف کا نام' جگہ' تاریخ اور دستخط رقم ہوتے ہیں۔ بعض تصانیف پر تو مصنف کے مختصر حالات زندگی بھی تحریر ہوتے ہیں۔ لیکن دور قدیم یا عہد وسطیٰ کے مصنفین میں ایسا رواج نہ تھا۔ بعض تصانیف پر تو سرے سے کوئی نام موجود نہیں ہوتا تھا۔ رسمی طور پر کچھ تعارفی الفاظ لکھ دیئے جاتے۔ جس سے قاری ایک عجیب الجھن میں مبتلا ہو جاتا کہ وہ زیر نظر تصنیف کے مصنف کے ساتھ کس طرح تعارف پیدا کرے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کوئی کتاب یا دستاویز اصل مصنف کی بجائے کسی اور فرد کے نام سے منسوب ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مصنف نے یہ عمل کسی مجبوری یا مصلحت کے پیش نظر انجام دیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایسا کیا ہو۔ یا اپنے پیر و مرشد کے احترام و عقیدت کے تحت ایسا کیا ہو۔ بعض دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی فرد شہرہَ آفاق شخصیتوں کے نظریات و خیالات کو قلمبند کر کے ان ہی کے نام سے منسوب کر دیتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض تصانیف میں اخلاق سوز زبان و عبارت درج ہوتی ہے اور ان کے فروغ کی مذہب' معاشرہ' ریاست اور حکومت اجازت نہیں دیتی۔ اکثر اوقات ایسی تصانیف پر مصنف' ناشر اور اشاعتی ادارے کا نام درج نہیں ہوتا۔ بسا اوقات آمرانہ حکومتیں یا بعض حکومتیں ہنگامی حالات کی بنا پر بنیادی حقوق معطل یا ضبط کر لیتی ہیں جس سے تحریر و تقریر کی آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں بعض سیاسی' انقلابی' قومی اور مذہبی حلقے یا بعض افراد درپردہ تصنیف و تحریر کے ذریعے اپنا نام و تعارف ظاہر کیے بغیر لوگوں تک اپنے خیالات و نظریات اور پیغامات پہنچاتے ہیں تاکہ وہ حکومت کی باز پرس اور گرفت سے محفوظ رہیں۔ ایسی تصانیف سے حقیقی مصنف کا پتہ نہیں چلتا۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ محض نام ہی حقیقی مصنف ہونے کا ثبوت نہیں ہوتا بلکہ محقق کا یہ فرض ہے کہ وہ دستاویزات و تصنیفات پر لکھے ہوئے نام کو من و عن حقیقی مصنف تسلیم کرنے کی بجائے اصول تحقیق و تنقید کے مطابق حقیقی مصنف کا کھوج لگائے۔ جب محقق کا اس قسم کی دستاویزات و تصانیف سے واسطہ پڑتا ہے جن پر حقیقی مصنف کا نام درج نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتا تو وہ ایک مشکل میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایسے امور پر غور کرتا ہے جن پر عمل پیرا ہو کر مطلوبہ دستاویز و تصنیف کے حقیقی مصنف کو معلوم کر سکے۔ اس سلسلہ میں وہ مندرجہ ذیل ذرائع کو عمل میں لاتا ہے۔

۱۔ داخلی تنقید کا سہارا لیتا ہے۔

۲۔ مصنف کی دیانتداری کا جائزہ لیتا ہے۔

۳۔ تصنیف کے مواد کی صحت کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے۔

۴۔ مصنف کے اسلوب' تحریر اور دیگر تصانیف کا مطالعہ کرتا ہے۔

۵۔ مصنف کے ملی' مذہبی' اور سیاسی رجحانات و خیالات کا مشاہدہ کرتا ہے کہ کہیں اس نے جذبات و عقائد کی بنا پر تو ایسا نہیں کیا؟

۶۔ اس عہد کے لسانی تقاضوں' تراکیب و محاورات اور علاقائی لسانی اثرات کا مطالعہ کرتا ہے۔ چونکہ کوئی زبان بھی جامع اور مکمل نہیں ہوتی اور لسانی تقاضے ہر زمانے میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ زبان' علاقہ در علاقہ بدلتی جاتی ہے۔ محقق کو یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ اس عہد میں اس خطہ یا علاقہ میں کون سی زبان رائج تھی اور ان الفاظ کا مطلب کیا لیا جاتا تھا۔ چونکہ ہر مصنف زبان اور اس کے کچھ الفاظ کو مخصوص انداز و پیرائے میں استعمال کرتا ہے لہٰذا محقق کو یہ اندازہ لگانا ہوتا ہے کہ مصنف کی کسی خاص لفظ سے کیا مراد ہے؟

۷۔ بعض اوقات مصنف بالواسطہ اسلوب اختیار کرتا ہے اور تشبیہ[1] و استعارہ[2] سے کام لیتا ہے یہاں محقق کا کام کافی پیچیدہ ہو جاتا ہے اور اسے ماہر زبان ہونا پڑتا ہے تاکہ وہ مسجع و مقفیٰ تحریر کو سمجھنے کے لیے اپنی لسانی مہارت کو بروئے کار لا سکے اور مصنف کی توصیفی زبان کا اندازہ لگا سکے۔ تحقیق کا یہ اصول محقق کو مصنف کے زیادہ قریب لے جاتا ہے اور وہ مصنف کے اس تصور کو سمجھ لیتا ہے جو تحریر کے وقت اس کے ذہن میں تھا۔

۸۔ مصنف کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس دور کے پورے سرو سامان اور حالات و واقعات سے آگاہ ہو۔ مثلاً لباس کیا تھا؟ محاورے کون کون سے بولے جاتے تھے؟ اور لب و لہجہ کا انداز کیا تھا؟ اس طریقے سے ماضی کو از سر نو زندہ کیا جاتا ہے۔ جیسے کوئی کھیل پیش کرنے والا ملکہ الزبتھ کے زمانے کا کھیل پیش کرے تو اس عہد کی ذہنی کیفیت واضح ہو سکتی ہے۔

۹۔ بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ کوئی دستاویز یا کتاب ایک سے زائد اہل قلم کی کاوشوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ حالات کچھ اس قسم کے پیدا ہو جاتے ہیں کہ ایک فرد اپنے تصنیفی کام کو ادھورا چھوڑ کر فوت ہو جاتا ہے اور اس کی تصنیف کے بقیہ حصے کو اس کا کوئی شاگرد یا دوست مکمل کرتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ چونکہ وہ مصنف کے خیالات و نظریات سے آگاہ ہوتا ہے اور اس سے استفادہ بھی کیا ہوتا ہے لہٰذا اس کے اسلوب کے مطابق لکھنے کی کوشش کرتا ہے مثلاً عبدالحمید لاہوری کے "بادشاہ نامہ" کے تیسرے حصے کو اس کے شاگرد محمد وارث نے اور مولانا شبلی نعمانی کی "سیرت النبیؐ" کے آخری حصے کو ان کے شاگرد سلیمان ندوی نے مرحومین کے اسلوب میں تحریر کرنے کی کوشش کی۔

۱۰۔ جب ہمیں ایسی صورت حال پیش آ جائے جہاں واضح طور پر یہ معلوم نہ ہو سکے کہ پہلے مصنف نے تصنیف کو کہاں ختم کیا اور دوسرے نے تصنیف کا کہاں سے آغاز کیا تو ایسی دستاویزات میں دونوں مصنفین کی حدود کا تعین کافی دشوار کام بن جاتا ہے۔ یہاں پر محقق کو اپنی بہترین تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کی بناء پر تقریباً غیر محسوس سے اختلافی جزئیات کا تجزیہ کر کے صحیح صورت حال معلوم کر کے مصنفین کی اصلی حدود کا تعین کرنا ہوتا ہے۔

مورخ الکیفجی کا کہنا ہے کہ:

"مورخ کو بھی وہی شرائط پوری کرنا پڑتی ہیں جو محدثین کے لیے لازم ہیں۔"

یعنی مورخ کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ ذہین، حق پسند، صاحب ایمان اور باکردار ہو۔ السخاویؒ کے مطابق مورخ کے لیے یہ شرائط لازم ہیں کہ

"مورخ کو دیگر علوم سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ مورخ میں ورع یعنی پرہیزگاری، پارسائی اور خوف خدا ہو۔ ورنہ خطرہ ہے کہ وہ قیاس کا شکار ہو گا جس کے متعلق حدیث نبویؐ ہے کہ

"قیاس آرائی سے خبردار رہو کیونکہ قیاس سب سے بڑا جھوٹ ہے۔"

اسی طرح ابن خلدون نے اپنے "مقدمہ" میں کچھ اصول مورخ کے لیے وضع کیے ہیں۔ اس نے مورخوں کو تنبیہہ کی کہ وہ جلد بازی سے گریز کریں اور ہر واقعہ کو اپنی تاریخ میں درج کرنے سے پہلے پرکھیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:

"مورخ کے لیے لازم ہے کہ وہ ملکی، سیاسی قواعد و موجودات کے طبائع سے واقفیت رکھتا ہو۔ قومیں، زمین و زمان، عادات و اخلاق، سیرت، مذہب و ملت اور دیگر حالات میں جن انقلابی دوروں سے گزرتی رہتی ہیں ان سے بھی وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شناسا ہو اور قابلیت رکھتا ہو کہ حاضر و موجود کو غیب سے ملا کر دیکھے کہ ان میں اتفاق ہے یا اختلاف۔ اتفاق کا بھی سبب تلاش کرے اور اختلاف کی وجہ بھی دریافت کرے، سلطنتوں اور قوموں کے اصول، ان کی ابتداء اور ان کے عروج و زوال کے اسباب و دواعی کی معلومات بھی بہم پہنچائے اور جو اشخاص ان امور میں ذمہ وار شخصیت رکھتے ہوں ان کے حالات و اخبار سے بھی شناسائی رکھتا ہو تاکہ وہ ان معلومات کے تحت ہر خبر کے سبب کا سراغ لگا سکے اور جو خبر اس تک نقل کر کے پہنچی ہے اگر وہ اس کے قواعد و اصول پر پوری اترتی ہے تو اس کو صحیح جانے ورنہ اس کو کھوٹی جان کر نظر انداز کر دے۔"[۴]

اب ہم مصنف کی دیانتداری، عقل سلیم اور حقائق نگاری کا جائزہ لیتے ہیں۔ مورخ کو نہایت ہی منکسر المزاج ہونا چاہیے۔ ہر روز اس کے سامنے اس کی لاعلمی کی درجنوں شہادتیں پیش ہوتی ہیں عموماً وہ اپنی فراہم کردہ معلومات کے ذخیرے کی صحیح تعبیر میں ناکام ثابت ہوتا ہے اور یہ ناکامی اس کے لیے کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔ وہ ایک لحاظ سے اپنی فراہم کردہ معلومات کا غلام ہوتا ہے۔ دوسرا کوئی مصنف اس غلامی کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ بڑے بڑے مورخ اس رائے سے پورا پورا اتفاق کریں گے کہ وہ ہمیشہ اپنی پابندیوں اور مشکلات سے آگاہ ہوتے ہیں جن میں رہ کر وہ کام کرتے ہیں اور ان ترغیبات و خطرات سے بھی ناواقف نہیں ہوتے جن سے دوچار رہتے ہیں۔ لیکن عوام ان پابندیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بعض مصنفین و مورخین ان سے آگاہ ہی نہیں ہوتے یا اپنے پیشے میں مضمر مشکلات کو خاطر میں نہیں لاتے۔ دیانت ایسی چیز ہے جسے تاریخ میں ناگزیر سمجھنا چاہیے۔ سائنس، فن، اور دیگر علوم میں بھی یہ بے حد ضروری ہے اس کے متعلق زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ تاہم دیانت کا کوئی آفاقی معیار نہیں۔ دیانتدار شخص تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ زندہ ہے۔ وہ فکر و خیال پیش کرنے میں زیادہ آزاد ہوتا ہے۔ وہ حق بات کہنے اور بیان کرنے میں اختلاف رائے رکھتا ہے۔ اس کا یہ اختلاف رائے تاریخ کے لیے باعث رحمت ہوتا ہے۔

مورخ کو اپنی وسعت کی مطابق دیانتدار ہونا چاہیے۔ یعنی اسے دانستہ کسی شہادت کو توڑ مروڑ کر پیش نہیں کرنا چاہیے۔ ادبی نقطہ نگاہ سے بھی ہیرا پھیری کی صورت پیدا نہیں ہونے دینی چاہیے۔ یہ امر بے حد ضروری ہے کہ مذہبی، نسلی، لسانی، جماعتی یا قومی تصورات و نظریات جو پہلے سے موجود ہیں سچائی کے راستے میں حائل نہ ہوں اور ہر مسئلہ کو ہر ممکن نقطہ نگاہ سے جانچ پڑتال کر کے لکھا جائے۔ ہر ممکن شہادت کی تلاش پر خاص وقت صرف کیا جائے۔ جب تک تمام مہیا وسائل ختم نہ ہو جائیں مورخ کو اس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھنا چاہیے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ مورخ خدا نہیں اور آخری فیصلہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب ہم مصنف کے دیانتدارانہ خیالات و نظریات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ مصنف ان مشاہدات و نظریات کو ہم تک پہنچانے میں کس حد تک مخلص تھا۔ جن حالات کا اس نے ذکر کیا ہے کیا وہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے اس نے بیان کیے ہیں یا جیسے اس نے انہیں پایا؟

مصنف نے جو کچھ بیان کیا ہے ممکن ہے وہ غلط ہو اور ان بیانات پر اس کو بھی یقین نہ ہو یا جس امر پر اسے یقین ہے وہ اس انداز سے واقع نہ ہوا ہو کیوں کہ مصنف بھی تو غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ یہاں پر چند سوالات کی روشنی میں ہم کسی مسخ شدہ مسودے کی حقیقت کا اندازہ لگانے اور اس سے مثبت نتائج اخذ کرنے کا جائزہ لیتے ہیں۔

۱- کیا یہ حادثہ یا واقعہ مصنف کی زندگی کے دوران وقوع پذیر ہوا تھا؟

۲- کیا وہ واقعات کی پوری نوعیت سے آگاہ تھا اور انہیں تحریر کرنے میں مخلص بھی تھا؟

۳- کیا مصنف قابل اعتماد بھی ہے؟

۴- کیا مصنف نے حقائق کو تو مسخ نہیں کیا؟

۵- کیا مصنف کے پیش نظر کوئی مجبوریاں یا مصلحتیں تو نہ تھیں جو اسے حقائق سے دور لے گئیں؟

۶- کیا مصنف نے زبان کو غلط تو نہیں سمجھا؟

۷- کیا اسے زبان پر پورا عبور حاصل تھا؟

داخلی تنقید کے ان اصولوں کے تحت مصنف کی دیانت، اخلاص اور عقل سلیم کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ وہ حالات جن کی بناء پر مصنف حقائق کو مسخ کرنے کا باعث بنتا ہے درج ذیل ہیں:

۱- جب مصنف کے پیش نظر ملی، مذہبی، سیاسی یا معاشرتی مصلحت ہو تو مصنف حالات کو ایسے رنگ میں پیش کرتا ہے اور توقع کرتا ہے کہ ان کی بناء پر قاری کوئی خاص عمل کرے یا کوئی خاص عمل نہ کرے۔

۲- مصنف ذاتی یا اجتماعی مفادات میں ایسا گرفتار تھا کہ وہ حقائق کو مسخ کرنے پر مجبور ہو گیا۔

۳- مصنف نے حالات کا اندازہ سفلی جذبات سے لگایا اور اپنے دوستوں اور عزیز و اقارب کو ان کے مخالفین کے مقابل بہتر انداز میں پیش کیا۔

۴- مصنف انفرادی یا اجتماعی دباؤ میں آکر حقائق کو مسخ کر گیا۔

۵- مصنف سستی شہرت چاہتا تھا اور عوام کو خوش کرنا چاہتا تھا لہٰذا وہ اخلاق اور مروجہ رسومات کو نظر انداز کرتے ہوئے حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کر گیا۔ یہاں پر ہمیں حالات و عوام کے گرد و پیش کا بھی جائزہ لینا ہو گا۔

۶- مصنف جب لوگوں کو سطحی اور لفظی طور پر خوش کرنے کے لیے حقائق کو بگاڑ کر پیش کرتا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس صورت میں دستاویزات کے مسخ ہونے کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(الف) کہانی میں بگاڑ:

یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب مصنف اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی بناء پر مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے۔

(ب) ڈرامائی بگاڑ:

یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب مصنف کسی دوسرے شخص یا ذرائع سے کہانی سن کر واقعہ کو ڈرامائی شکل دیتا ہے۔ یہ مصنف کی دانستہ کوشش ہوتی ہے جبکہ اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔

(ج) نظمیہ بگاڑ:

یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی پرانی نظم یا دستاویز سے کسی واقعہ کو تھوڑے بہت رد و بدل کے ساتھ نظمیہ یا دیگر صورت میں ڈھال کر اپنے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔

اب ہم مسخ شدہ حقائق کا اندازہ لگانے کے لیے مصنف کا دیگر پہلوؤں سے جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ مصنف اس قابل ضرور تھا کہ وہ حقائق کو صحیح رخ میں پیش کرتا اور ان کا اندازہ' مشاہدہ اور ادراک صحیح طور پر کرتا لیکن کسی دباؤ یا داخلی جذبے کے تحت وہ ایسا نہ کر سکا۔ ہو سکتا ہے وہ تنگ نظر یا متعصب تھا یا ہمیں اس امر کا جائزہ لینا ہو گا کہ تحریر لکھنے سے پہلے مصنف کے عقائد اور خیالات و نظریات کس قسم کے تھے؟

۲۔ مصنف کو ایسا مقام و حیثیت حاصل تھی کہ وہ دستاویزات اور حقائق و واقعات کا درست جائزہ لے سکا؟

۳۔ مصنف کو جب دستاویزات' حقائق کے مشاہدے کا موقع ملا تو اس نے تحقیق کے مقررہ اصولوں کے تحت مشاہدہ نہ کیا۔

۴۔ بعض حقائق ایسے ہوتے ہیں جو مشاہدہ میں زیادہ آتے ہیں مثلاً خفیہ چالیں اور معاشرتی رسم و رواج وغیرہ۔ مصنف بعض اوقات ان کا مشاہدہ تو ایک جگہ کرتا ہے لیکن اس کا اطلاق سب پر کرتا ہے۔

۵۔ تاریخ میں بہت سا مواد ایسا ہوتا ہے جس کا مشاہدہ براہ راست نہیں ہوتا۔ جب کوئی دستاویز یا تصنیف براہ راست مشاہدے کے بعد لکھی جائے تب ہمیں ان براہ راست مشاہدہ کنندگان کا جائزہ لینا ہو گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۔ بعض اوقات مصنف کے بارے میں ہماری تحقیق گمنام بیان پر ختم ہو گی۔ ایسے بیان محض زبانی ہوتے ہیں اور بعض اوقات ان کے زمرے میں داستانیں بھی آ جاتی ہیں۔ ان داستانوں میں ایسے عقائد کا بیان ہوتا ہے جو تاریخی یا مذہبی شخصیات سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ ان کا تاریخ سے کوئی زیادہ تعلق نہیں ہوتا اور انہیں محض رسمی کہانی ہی سمجھنا چاہیے۔ تاہم مصنف کو ان بیانات سے یہ فائدہ ضرور حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس عہد کے لوگوں کے عقائد و نظریات اور رسوم و رواجات سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

۷۔ جہاں تک گمنام بیانات کا تعلق ہے ہم انہیں نظرانداز نہیں کر سکتے کیونکہ ان کا تعلق حقائق کی خارجی حیثیت سے ہوتا ہے۔ تاریخ کے حقائق چونکہ زمان و مکاں کی قیود و حدود میں بکھرے ہوتے ہیں اور تاریخ کو یہ منتشر تفصیلی حقائق درکار ہوتے ہیں جنہیں تاریخ خود منظم و مرتب صورت میں پیش کرتی ہے۔

مورخ اور تعصب

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہم مصنف کو اپنے عہد کے معیار پر کبھی نہ پرکھیں کیونکہ بعض زمانوں اور بعض جگہوں میں لوگ انہی بیانات' داستانوں' رسومات اور عقائد و نظریات پر یقین رکھتے تھے جو ہمیں اب اپنے ذہنی شعور و آگہی کے برعکس نظر آتے ہیں۔ مصنف حقائق کے درست ہونے کے لئے ہمارے ذہنی معیار کو مدنظر نہیں رکھ سکتا۔ چنانچہ مسودات کی داخلی تنقید میں ہم زمانہ' جگہ اور اس کی ترتیب کے حالات کو نہیں دیکھتے بلکہ مصنف کی سماجی حیثیت' مجلسی حقائق' خاندان' دلچسپیاں' جذبات' تعصبات' نظریات' کام کرنے کا طریقہ' علم حاصل کرنے کے ذرائع' تہذیب' اخلاق' آداب اور ذہنی کمزوریوں کو بھی مدنظر رکھتے ہیں۔ انہی پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر ہم تصنیفات و مسودات کی تاریخی حیثیت و نوعیت کا تجزیہ کرتے ہیں۔

ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ تاریخ نہ تو میکانکی ہے اور نہ سائنٹیفک۔ مورخ انسان ہوتا ہے لہٰذا اس سے غلطیاں بھی سرزد ہوتی ہیں۔ معیاری تاریخ جو کامل معروضی ہو اور ہر جذبے سے پاک ہو کر لکھی جائے ناممکن ہے۔ موضوع کے انتخاب میں پسند کا دخل ہوتا ہے۔ مواد کی تنظیم و ترتیب میں ایک گونہ تعصب کارفرما ہوتا ہے۔ مواد کی تعبیر میں بھی دانستہ یا غیر دانستہ مورخ کے تعصب کی جھلک نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ مورخ اپنے وقت نسل' عقیدے' طبقے' اور ملک کا باشندہ ہوتے ہوئے ان تمام عناصر کا قیدی ہوتا ہے لہٰذا اس کے جذبات تعصب سے پاک نہیں ہوتے۔

چند مورخ تاریخ لکھتے ہوئے اور پڑھاتے ہوئے علمی شعور کی قوت سے کام لے کر تعصب سے الگ رہتے ہیں اور معقولیت و معروضیت کے اعلیٰ درجے پر پہنچ جاتے ہیں۔ بہت کم مورخ اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سخت معیار پر پورے اترتے ہیں۔ بعض مورخ ایسے بھی ہیں جو محض مخالفت یا کسی امر کو دانستہ تسلیم کرنے کی بناء پر حقائق کے ساتھ تعصب سے کام لیتے ہیں اس قسم کے رسمی مورخ بالعموم انتہا پسند مذہبی اور قومی جذبات سے وابستہ ہوتے ہیں جو جوش مخالفت میں حقائق کا خون کر دیتے ہیں۔ ایسے انتہا پسند رسمی مورخین کا دل' ذہن مزاج ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ کس فریق کا حامی تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ حقائق کا انتخاب اور ترتیب خواہ اس کا تعلق تاریخ کے کسی دور یا مقام سے ہو یا دنیا کے کسی ملک و نسل سے ہو وہ لازمی طور پر انتخاب کرنے والے یا ترتیب دینے والے مورخ یا مصنف کی ذہنی کیفیت کا مظہر ہوتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی مورخ اپنے مخصوص مذہبی یا قومی جذبات و رجحانات سے آزاد ہو کر ایسی تاریخ لکھے جس میں قومی علاقوں اور وفاداریوں کے بارے میں کوئی اشارہ موجود نہ ہو اور مذہبی جذبات کی پرچھائیاں بھی اس پر نہ پڑتی ہوں؟ ہمیں اعتراف کر لینا چاہئے کہ زیادہ تر مورخ تعصب سے کام لیتے ہیں اور تاریخ کو اپنے نظریاتی مقاصد کے لیے بطور پروپیگنڈہ استعمال کرتے ہیں۔

اب چند مسائل یہ پیدا ہوتے ہیں کہ کیا مورخ کو تاریخی عملیات کے بارے میں ذاتی' قومی یا مذہبی مصلحتوں کو سختی سے نظرانداز کر کے خود کسی فیصلے پر پہنچنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ کیا مورخ کو وسیع ماضی کے واقعات و مشاہدات کے بارے میں فیصلے کی عدالت قائم کرنی چاہئے یا نہیں؟ کیا مورخ ایک غیر جانبدار وقائع نگار جج کی حیثیت سے اپنے فرائض بجا لا کر ماضی کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرنے کا حق دار ہے۔ ایسا فیصلہ صادر کرنے کے پیچھے تحفظات موجود ہیں؟ آیا ان فیصلوں کی نوعیت و حیثیت اخلاقی ہو گی یا سیکولر؟ پھر ہمیں ان خطرات کا بھی اندازہ کر لینا چاہئے جو اخلاقی غیر جانبداری میں مضمر ہیں۔ اس طرح ان خطرات کا موازنہ بھی ضروری ہے جو اخلاقی خود سری اور تنگ نظری سے صادر ہوتے ہیں۔

ابتدائی مورخین کی نسلیں تاریخی امور کے متعلق فیصلے کرنے میں آزاد و خود مختار تھیں۔ یونانی مورخ ہیروڈوٹس' تھیوسی ڈائیڈر فیصلہ صادر کرنے میں مطلق آزاد تھے۔ ان مورخین کے جانشینوں نے بھی مشہور آدمیوں کی مذمت یا مدح سرائی کے آزادانہ طور پر فیصلے صادر کرنے کی رسم کو جاری رکھا۔ لوی (Livy) مطالعہ تاریخ کرنے والوں کو آگاہ کرتا ہے کہ جس طرح اہل روما اپنی اعلیٰ خوبیوں کی بدولت عظمت کی منزلوں پر پہنچے اور جب ان خوبیوں کو زوال آیا تو کس طرح خود روما تباہ ہو گیا۔ تاریخ روما سے جو اخلاقی سبق پیدا ہوتے ہیں قابل غور ہیں۔

ٹیسی ٹس کے خیال میں تاریخ ہر اچھے برے اعمال کو پیش کرتی ہے۔ مورخ کو چاہئے کہ ہر برے عمل کو اس انداز میں پیش کرے کہ آنے والی نسلیں اس کی مذمت کرتی رہیں اور نیکی کو حاصل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتی رہیں۔

پلوٹارک نے تاریخ میں ساٹھ کے قریب اخلاقی سبق گنوائے ہیں اور وہ تاریخ کو اخلاقی غیر جانبداری کی شکل میں پیش کرنے میں کامیاب رہا۔ قرون وسطیٰ کے مورخین نے تاریخ میں اخلاقی غیر جانبداری کے معیار کی پابندیوں کو برقرار رکھا۔ اس سلسلے میں گبن، ہیوم، رابرٹ سن، رولن موٹلے، والٹیر، کارلائل، رینال اور لارڈ ایکٹن کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔

انیسویں صدی میں مورخین نے تاریخی واقعات کے بیان میں انتہائی احتیاط سے کام لے کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا یعنی واقعات کے بیان میں ہلکی سی رائے زنی بھی نہ کی جائے اور ان کو من وعن مرتب کر دیا جائے۔ واقعات کو اس طرح ترتیب دیا جائے جو زیادہ سے زیادہ صحیح معلوم ہوں[5]۔ غرضیکہ مورخین کو چاہئے کہ وہ ماضی کو سمجھیں اور اس کے ساتھ انصاف کریں اور بحیثیت مجموعی حال کے ساتھ بھی بے انصافی نہ کی جائے۔ مورخ کا اصل منصب فیصلے کرنا نہیں بلکہ سمجھنا ہے کہ فلاں واقعہ کیونکر پیش آیا؟ اگر وہ تعصب و بد دیانتی سے کام لے کر صریح اخلاقی فیصلے سے احتراز کرتا ہے۔ تو یقیناً خفیہ فیصلے کا مجرم ہو گا اور اپنے ہم عصروں، ہمسروں اور بعد کی نسلوں کا احترام و اعتماد کھو بیٹھے گا۔ چونکہ مورخ خود تو ماضی کے کسی واقعہ کا ذمہ دار نہیں لہٰذا اسے وہ سب کچھ قبول کر لینا چاہئے جو اصل واقعات میں مضمر ہے۔ اس نکتے کی وضاحت چارلز اے بیرڈ نے یوں بیان کی ہے کہ:

> ”تاریخ سائنس نہیں اور نہ مورخ سائنس دان ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ وہ طبعی سائنس کے مفروضات کی غلامی چھوڑ دے اور اپنے اصل موضوع پر آ جائے یعنی تاریخ بحیثیت حقیقت[6]“

تاریخ میں انسانوں کے ساتھ اس طرح برتاؤ نہیں کیا جا سکتا جس طرح کائنات میں مادی اشیاء کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مورخ کے اسلوب، طریقوں اور فیصلوں کے وہ معیار متعین نہیں کیے جاسکتے جو ٹھوس طبعی سائنس کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔

بیسویں صدی میں افراد و اقوام کی رائے یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے پوری متعلقہ شہادت کبھی میسر نہیں آتی اور تاریخی فیصلوں کے لیے کوئی عالمی معیار بھی موجود نہیں۔ لہٰذا مورخ جب کوئی فیصلہ صادر کرتا ہے تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے گویا اس رائے کے اظہار کے لیے مجبور ہو گیا۔

مورخ خدا نہیں کہ واقعہ کی اصل حقیقت سے آگاہ ہو اور زندہ اور مردوں کے متعلق فیصلے صادر کرے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ واقعات کو سمجھے نہ کہ وہ کسی کی خدمت کرے، کسی کی مداح سرائی کرے، کسی کو مجرم ٹھہرائے، اور کسی کو معاف کر دے۔ مورخ معصوم عن الخطاء نہیں۔ وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرے انسانوں کی مانند انسان ہے' جو اپنی خامیوں اور نارسائیوں کا اعتراف کرتا ہے۔ اس پر دباؤ پڑتے ہیں اور وہ دوسرے انسانوں کی طرح دباؤ قبول کر لیتا ہے اور ترغیبات کا شکار ہو جاتا ہے۔ دانستہ یا غیر دانستہ کسی نہ کسی فریق کا ساتھی بن جاتا ہے' جو دوسرے افراد کے لیے باعث رنج و پریشانی بن جاتی ہے۔ مورخ بھی مذہبی پیشوا' سالاروں' ججوں اور مدبروں کی طرح اپنی نسل' قوم' مذہب' معاشرے' طبقے' میراث اور تعلیم کی حاصل رنگ آمیز مخلوق ہوتا ہے۔ وہ ان ترغیبات' خامیوں اور معاشرتی اثرات سے مکمل آزاد نہیں ہو سکتا جن کی آغوش میں اس کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ وہ غیر جانبداری کی انتہائی بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتا۔ جہاں وہ ماضی و حال کے واقعات کا جج بن کر فیصلے صادر کرتا ہے وہاں اسے پیشہ ورانہ تربیت' روایت اور نمونوں کا سہارا بھی میسر نہیں ہوتا جو واقعات و مشاہدات کو تحریر و مرتب کرنے میں اس کے معاون و رفیق بنیں۔ لہٰذا اس کے فیصلے نیم اخلاقی فیصلے ہوتے ہیں۔ لیکن انہیں پورے اخلاقی فیصلوں کا مستعار لباس پہنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ معاملات ملے جلے سے ہوتے ہیں۔ جزواً مذہبی تعصب' جزواً سیاسی عداوت اور جزواً قومی مبالغہ آرائی اور فخرو مباہات سے مزین و آراستہ ہوتے ہیں۔ مورخ انہی باعث آزار تاثرات' عزائم' خام خیالیوں اور مبالغہ آرائیوں سے خالی نہیں ہوتا۔ جب وہ پیشہ ور مورخ کا لباس پہنتا ہے تو خاصی ذی وقار اور عظیم القدر شخصیت بن جاتا ہے اور جب وہ اخلاقی جج کا لباس پہن کر کسی کی مذمت کر ڈالتا ہے اور کسی کو جرم سے پاک قرار دیتا ہے' تو اخلاقی اعتبار سے اس کی ثالثی کا کردار برہنہ ہو جاتا ہے۔ ایسے مورخ کو عموماً تاریخی حس سے محروم سمجھا جاتا ہے اور وہ پیشہ ورانہ فرائض میں غفلت کا مجرم ہوتا ہے۔ ای۔ ایچ۔ کار نے اس مسئلے کا ذکر بڑے اچھے انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> "تاریخ اس وقت تک لکھی ہی نہیں جا سکتی جب تک مورخ ان لوگوں کے متعلق کسی نہ کسی قسم کا ربط و ضبط دل میں نہ پیدا کرے جن کے متعلق لکھنا مقصود ہے۔"

اگر کوئی مورخ اپنے زمانے میں کسی واقعہ کو خاص اہمیت دیتا ہے تو یہ اہمیت مورخ کے اپنے ذاتی عقائد اور تعصبات کی بناء پر ہوتی ہے۔ انگریز مورخوں نے "معرکہ پلاسی" کو اہمیت دی کیونکہ اس معرکے کا نتیجہ انگریزوں کی خواہش کے مطابق تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ ہر مورخ کا کوئی نہ کوئی مذہب بھی ہوتا ہے' اس لیے وہ ان واقعات کو نہیں لکھتا جو اس کے مذہبی عقائد کے خلاف پڑتے ہوں۔ عیسائی مورخ کے لیے یہ جاننا مشکل ہے کہ حضرت عیسیٰؑ صلیب پر فوت نہیں ہوئے۔ لیکن مسلمان مورخ از روے قرآن یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جو شخص صلیب پر فوت ہوا وہ حضرت عیسیٰؑ نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا نے پہلے ہی زمین سے آسمان کی طرف اٹھا لیا تھا۔

اس کے علاوہ مورخ ان واقعات کو حذف کر دیتے ہیں جو ان کے عقائد کے خلاف پڑتے ہیں۔ اگر وہ لکھتا ہے تو ان واقعات کو توڑ مروڑ کر لکھتا ہے۔ الغرض محض حقائق کی بناء پر تاریخ نگاری مشکل کام ہے۔

مورخ اپنی چھان بین وسیع اور گہری کرتا جائے گا تو اسے تحقیق کے سوالات کے زیادہ سے زیادہ جوابات یا حقائق مسلسل طور پر ملتے جائیں گے اور تاریخی واقعات کی تعداد اور وسعت میں حد درجہ اضافہ ہوتا جائے گا۔

تاریخ کو سب سے بڑا چیلنج مصنف اور مورخ کی تاویل کا ہے۔

تاویل کا سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ تاویل میں تاویل کنندہ کی نیت کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ ہر مورخ اپنی عقل سے نہیں بلکہ اپنے جذبات کی بناء پر واقعات کی تاویل کرتا ہے۔ یہ فطرت انسانی کی خوبی بھی ہے اور خرابی بھی۔ اگر انسان میں قوت تاویل نہ ہوتی تو انسانی علم محدود رہتا لیکن انسان تاویل کا اس حد تک خوگر ہے کہ وہ آسمانی کتابوں کی بھی تاویل کرتا ہے۔ زبور' توریت' انجیل' قرآن اور ویدوں کی سینکڑوں تفسیریں لکھی جا چکی ہیں اس طرح سے حضرت انسان نے آسمانی صحیفوں پر بھی دسترس کی ہے۔

خارجی تنقید (EXTERNAL CRITICISM)

خارجی تنقید سے مراد کسی مسودے' دستاویز اور تصنیف کی ظاہری حالت کی جانچ پڑتال کرنا ہے۔ خارجی تنقید کے ذریعے ہم تصنیفات کی خارجی خصوصیات کا مشاہدہ و تجزیہ کرتے ہیں۔ اس میں ہم اس امر کا جائزہ لیتے ہیں کہ دستاویزات و تصنیفات جیسا کہ یہ نظر آ رہی ہیں کیا اپنی تخلیق کے وقت بھی یہ اسی حالت میں تھیں؟ ان کی زبان' ترتیب' اسلوب' محاورات کے تاثر کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ کہیں ان میں کسی قسم کا تغیر تو نہیں ہوا؟ تصنیف کی موجودہ نقول میں اغلاط یا ردوبدل تو نہیں ہوا؟ کیا نقول اپنی اصل سے مماثلث و مشابہت رکھتی ہیں؟ علاوہ ازیں اس امر کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے کہ ان کو زمانے کی دست برد سے محفوظ کیسے رکھا گیا؟ اس کی صحیح حالت کو جانچنے کے لیے اس کے ماخذوں کو بھی تلاش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں دستاویزات کے حقیقی یا غیر حقیقی ہونے کی بھی پڑتال کی جاتی ہے۔ اور بالاخر یہ جائزہ بھی لیا جاتا ہے کہ کیا یہ دستاویزات اپنے عہد کے لسانی اور ادبی اسلوب کے معیار پر پورا اترتی ہیں؟

خارجی تنقید میں مورخ اور محقق اس امر کی تسلی کرتا ہے کہ دستاویزات و تصانیف کا ماخذ کب' کہاں' کیسے' کیوں اور کس وساطت سے حاصل ہوا؟ اگر ثانوی نقل ہے تو اصل کو کیسے حاصل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا جا سکتا ہے؟

نصابی تنقید (TEXTUAL CRITICISM)

نصابی تنقید سے مراد نصاب سے متعلق کتابیں یعنی وہ کتابیں جو کسی خاص درس، مضمون یا موضوع کے لیے مقرر ہوں۔ نصابی تنقید سے مراد مندرجات دستاویز کی تصحیح کے علاوہ جملہ حاصل شدہ بہترین دستاویز کا حصول ہے۔ بعض اوقات دوران تصنیف کچھ ایسی دانستہ یا غیر دانستہ غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں جن کی بنا پر عبارت کا اصل مفہوم بدل جاتا ہے اور ایسی تصنیف یا مضمون مرتب ہو جاتا ہے جو مصنف کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا نصابی تنقید کے ذریعے ہم دستاویزات کی حقیقت و اصلیت جاننے کے لیے ان غلطیوں کی نشاندہی کر کے تصنیف کو غلطیوں سے پاک صاف کر کے صحیح ترین تصنیف یا دستاویز حاصل کرتے ہیں۔

مسئلہ یہ نہیں کہ کتاب کیسے تصنیف کی جاتی ہے۔ رسمی طور پر مصنف مسودہ تحریر کرتا ہے اس کی درستی کرتا ہے اور پبلشر اسے شائع کر دیتا ہے۔ یہ رسمی طریقۂ تصنیف بہت سی غلطیوں کا باعث بنتا ہے۔ ان غلطیوں کی بنا پر بعض اوقات کسی مسودے یا تصنیف سے ایسے مطالب نکلتے ہیں جو مصنف کے خیالات کی ترجمانی نہیں کرتے۔ اب سوال یہ ہے کہ مسودے کو کس طرح غلطیوں سے پاک و صاف کیا جائے؟ یا اسے دوبارہ کس طرح درست طور پر منظم و مرتب کیا جائے کہ غلطیوں کا قلع قمع ہو جائے؟ بہترین تصنیف یا مسودے کے حصول کے مندرجہ ذیل چند اصول ہیں۔

۱۔ اول یہ تحقیق کرنی چاہیے کہ جس قدیم مسودے کو استعمال کیا جا رہا ہے وہ کن حالات میں محفوظ رہا۔ جب قدیم مسودات کی نقل تیار کی جاتی ہے تو نقل میں بہت سی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں لہٰذا یہ محقق کا کام ہے کہ وہ زیر نظر نقل سے غلطیوں کی درستی کے لیے اصل مسودے کی طرف رجوع کرے۔

۲۔ یہ مشکل اس وقت آسان ہو جاتی ہے کہ جب مصنف کا اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا مسودہ ہمارے زیر نظر ہو لیکن نقل کا مقابلہ اور تصحیح قدرے مشکل کام ہے کیونکہ ایسے نقول نویس بہت ہی کم دیکھنے میں آئے ہیں جو نقل کرتے ہوئے غلطیوں کے مرتکب نہ ہوئے ہوں۔

۳۔ اس صورت میں جب کہ اصل مسودہ گم ہو چکا ہو اور اس کی صرف ایک ہی نقل موجود ہو تو اس صورت حال میں، نہایت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ایسی صورت میں یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نقل میں غلطیاں بھی موجود ہوں۔ تو ایسے مسودے کو دوبارہ صحیح حالت میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ اصل اور نقل میں فرق کی وجوہات کو معلوم کیا جائے، کہ کن وجوہات کی بنا پر یہ غلطیاں واقع ہوئیں۔ کیا یہ غلطیاں "سہواً" ہوئیں یا "قصداً" کی گئیں۔ بعض اوقات کم فہم اور نیم خواندہ نقل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نویس مسودے کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا اور وہ مسودے کو اپنی اہلیت کے مطابق درست کرتا جاتا ہے۔ لہٰذا ایسے مسودے کی غلطیوں کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے جہاں غلطیاں قصداً کی گئی ہوں یا اندازے ہی غلط لگائے گئے ہوں۔

۴۔ بعض اوقات مسودات میں اتفاقی غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں جیسا کہ نقل نویس نے بات یا عبارت صحیح طور پر نہ سنی ہو یا غیرارادی طور پر اس سے غلطی سرزد ہو جائے یا اس کا عبارت کی چند سطروں کو چھوڑ جانا۔ جب کہ ایک نایاب مسودے سے استفادہ کیا جا رہا ہو تو ایسی غلطیاں ناقابل تلافی ہوتی ہیں۔ لیکن ان اتفاقی غلطیوں کو کوئی بھی محقق جو اس اسلوب سے آگاہ ہو آسانی کے ساتھ معلوم کر سکتا ہے مثلاً مبہم خیالات و الفاظ' حروف' غلط نقل' عبارت کا بے ربط ہونا یا گرائمر کی ایسی دیگر غلطیاں۔ انہیں مسودے پر نظر ثانی کے دوران میں آسانی سے معلوم کر کے درست کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ مشکوک مسودے کی تصحیح کے لیے خاص مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً زبان پر پوری دسترس ہو۔ مختلف اسالیب تحریر میں خصوصی مہارت ہو اور نقل نویسوں سے سرزد ہونے والی اغلاط کا ماہر ہو۔

۶۔ کسی کمزور مسودے کو درست کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ترکیب کو برقرار رکھا جائے۔ بے جا الفاظ و عبارت کے تکرار یا اختصار سے بچتے ہوئے اعراب کو درست کر کے ایک کمزور مسودے کو بہترین مسودہ بنایا جا سکتا ہے۔ یہاں پر اس بات کو مدنظر رکھیں کہ مسودے کو درست کرنے والے کی زیادہ سرگرمی اور خود اعتمادی کی وجہ سے مسودے کی بے جا کانٹ چھانٹ یا اضافہ بہترین اور غلطیوں سے پاک مسودے کو بھی مورخ کی نظروں میں مشکوک بنا سکتے ہیں۔ اس لیے محقق کا فرض ہے کہ وہ مسودے میں اضافہ و ترمیم کرتے وقت اصل مسودے اور ترامیم و اضافے والے مسودے کے درمیان فرق کو قائم رکھے۔

۷۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اصل مسودہ گم ہو چکا ہے اور اس کی بہت سی کاپیاں موجود ہیں جو آپس میں مختلف ہوتی ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کون سی کاپی قابل اعتماد ہے؟

۱۔ کیا وہ کاپی جو سب سے پہلے میسر آئی؟

۲۔ یا جو سب سے پرانی ہے؟

۳۔ یا وہ کاپی جسے سب سے زیادہ لوگوں نے پڑھا اور استعمال کیا؟ ایسی صورت میں جب کاپیوں پر ان کی نقول کی تاریخ کا اندراج بھی ہے کون سی کاپی قابل اعتماد ہو گی؟ اس سلسلہ میں تینوں طریقوں کو ہم رد کر دیتے ہیں چونکہ دستاویزات کی تصدیق کا معقول طریقہ یہ ہے کہ ہم جائزہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیں کہ ان نقول کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ اگر سب نقول جو اصل سے حاصل کی گئی ہیں ان میں ایک ہی قسم کی غلطی پائی جاتی ہے تو ہم فرض کر سکتے ہیں کہ ان سب کا ماخذ ایک ہی ہے کیونکہ غلطیوں کی مشابہت اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ سب کا منبع ایک ہی ہے۔ اس اصول تحقیق کے مطابق ہم ایک جیسی مشابہت اور غلطیاں رکھنے والی نقول کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح ہمارے پاس اصل ثانوی منفرد نقل رہ جاتی ہے کہ جس میں مختلف قسم کی اغلاط پائی جاتی ہیں۔ اب ہم ان نقول کا شجرہ بنائیں اور موازنہ و مقابلہ کرنے سے اصل نقل کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔

۸۔ جب غیر مطبوعہ مسودوں کو منفی ترتیب دی جاتی ہے تو ہم مختلف ذرائع سے اصل متن کا موازنہ و مقابلہ کر کے اصل متن کو بحال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ان تمام ذرائع میں اتفاق ہو اور وہ ایک جیسا متن پیش کرتے ہوں تو اصل اور اطمینان بخش متن کو بحال کرنے میں دقت پیش نہیں آتی۔ اگر ان ذرائع میں کوئی فرق ہو تو محقق اصل متن کے بارے میں خود فیصلہ کرتا ہے۔ متن کو جتنا بھی ممکن ہو بہتر بنائیں۔ مصنف کے دستخط موجود ہوتے ہیں لیکن ایسے بہت سے قدیم مسودے ہیں جو ان خصوصیات سے محروم ہیں۔

۹۔ بعض اوقات کسی غیر معروف تصنیف کو فرضی نام سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات مسودات کی تصحیح ہی نہیں بلکہ جعلی تحریروں اور فرضی نام کے مصنفوں کی بھی شناخت ضروری ہوتی ہے۔

۱۰۔ تصنیف کی تفتیش سے متعلق سب سے اہم طریقہ مسودے کا داخلی تجزیہ ہے۔ اس ذریعہ سے ہمیں تصنیف کے مصنف کا زمانہ، مقام، معاشرتی اثرات، ماحول، مرتبہ اور کردار کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

نصابی تنقید ہمیشہ جاری رہتی ہے جس کی بدولت ہم یہ کھوج لگاتے ہیں کہ ماضی کی دستاویزات میں کون کون سی غلطیاں تھیں۔ اغلاط کی نشاندہی کرتے وقت ہمیں ذاتی ہمدردیوں، نظریات اور جذبات کو بالائے طاق رکھنا ہو گا۔ چاہے وہ قرون اولیٰ، وسطیٰ اور جدید کے مذہبی مسودات تصانیف یا شاعری کے متعلق ہی کیوں نہ ہو۔ تاریخی تنقید انہی اعلیٰ نمونوں، اصولوں اور قاعدوں کے مطابق کام کرتی ہے۔ ایسی تنقید نگاری نہایت مفید و ناگزیر ہوتی ہے مگر اس میں چند خامیاں ہیں مثلاً جب کوئی محقق یا نقاد بطور منصف، دستاویزات اور مصنف کے ساتھ انصاف کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ مصنف کے خیال و تصور کے اندر جھانکے۔ بعض اوقات تو وہ اس کے انوکھے اسلوب پر حیران و ششدر رہ جاتا ہے کہ مصنف کے کام کا کس طرح موازنہ و مقابلہ اور فکری وزن کیا جائے۔ کیا تنقید نگاری کے ذریعے اس کے انوکھے پن کو سراہا جائے یا رد کیا جائے یا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ دبایا جائے؟ وہ بطور محقق اور منصف' مصنف کی تصنیف کو تولتا ہے' اندازہ لگاتا ہے' اور اس کی اصلیت کا فیصلہ کرتا ہے۔ نصابی تنقید کے اصول و معیار ارسطو کے زمانے سے لیکر آج تک برقرار و زندہ ہیں۔ ان اصول و قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی مگر مختلف ادوار میں مختلف اصولوں نے جنم لیا ہے جس سے مختلف زاویہ ہائے نگاہ کی تکمیل ہوئی ہے جہاں تک تخلیقی کام کا تعلق ہے وہاں نصابی تنقید کے اصولوں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں ولیم بلیک (William Blake) دانتے' کیٹس' ملٹن' حافظ اور علامہ اقبال کی تخلیقات کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

تصنیف کی خارجی تنقید و تجزیہ

(External Criticism and Analysis of Text)

تصنیف کے خارجی تجزیئے سے مراد تصنیف کے بارے میں ایسی شہادتوں' بیانات اور مشاہدات کا حصول ہے جن سے کسی تصنیف کے حقیقی ہونے کی تصدیق ہو سکے یا تنقید و تجزیئے کا ایسا طریقہ جس کی بدولت مسودات' تصنیفات اور دستاویزات میں صداقت قائم کی جا سکے۔ جب کسی تصنیف کے مصنف کے حالات زندگی دستیاب نہ ہوں یا اس کے حوالہ جات' ماخذ میسر نہ ہوں تو دستاویز کی صداقت و حقیقت کے بارے میں شکوک ابھرتے ہیں اور ایسے شکوک کا پیدا ہونا ایک فطری عمل ہے۔ لہٰذا بذریعہ نصابی تنقید متن کی بحالی' بذریعہ اصول تحقیق جھوٹی دستاویزات و تصانیف کو رد کرنا اور بذریعہ دستاویزات کی تقسیم مواد کو منظم و مرتب کر کے ایک مکمل تصنیف میں ڈھالنے کے عمل کو تصنیف کی خارجی تنقید یا تصنیف کی ناقدانہ تفتیش کا نام دیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں تصنیف کے خارجی تجزیہ کے لیے مندرجہ ذیل امور پر عمل کرتے ہیں:

۱- ابھی تک تصنیف کے جس مسئلہ پر ہم نے بات کی ہے وہ ایک ہی مصنف کی تصانیف سے متعلق ہے مگر جہاں پر کسی تصنیف کے ایک سے زائد مصنف ہوں تو اصول تحقیق کا مسئلہ پیچیدہ سا ہو جاتا ہے اور اس سلسلہ میں "محقات[9]" اور "بقیہ[10]" کے دو اصول تحقیق ہماری مدد کرتے ہیں۔

۲- ایسی تصنیفات و دستاویزات جنہیں ایک سے زائد افراد نے لکھا ہوتا ہے یا مرتب کیا ہوتا ہے اور ہم ان کے اسلوب نگارش سے بھی واقف نہیں ہوتے' یہ مسئلہ پیدا کر دیتا ہے کہ ایک تحریر کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں پر ختم ہوئی؟ اور دوسرے مصنف نے کہاں سے لکھنا شروع کیا اور کہاں پر ختم کیا؟ لہٰذا کسی تصنیف کے ایک سے زائد مصنفین سے یہ ابہام و امکان پیدا ہو سکتا ہے کہ کسی خاص تحریر کو ایسے مصنف سے منسوب کر دیا جائے جو درحقیقت اس کا مصنف نہیں ہوتا۔ اس طرح سے حقیقی مصنف کو اس کی اصل تصنیف سے محروم کر دیئے جانے کا اغلب امکان ہوتا ہے۔

۳- ایسی تصنیفات جن میں محقات (اضافی الفاظ و اصطلاحات) اور بقیئے (مشہور شخصیات) نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتے تو ان کے متن کو آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر وہ تصنیفات جن میں محقات اور بقیے ہوں گے انہیں داخلی تنقید کے ذریعے سمجھا جائے گا۔ علاوہ ازیں ان تصنیفات و دستاویزات کے اسلوب و بیان کا بھی جائزہ لینا ہو گا کہ کیا سب کا اسلوب ایک ہی جیسا ہے' اور ان کا بیان (مشاہدات و خیالات) شروع سے آخر تک مماثلث رکھتا ہے۔

۴۔ ہر ملک کے تصنیفی ضابطوں کے مطابق "ادبی سرقہ" "قانوناً" منع ہے۔ مگر بہت سے لوگ دیدہ دلیری اور ہیرا پھیری سے دوسروں کی تصنیفات یا ان کی تصنیفات کے زیادہ مواد کو "قینچی اور گوند ریسرچ" کے تحت اپنی تحقیق ظاہر کرتے ہیں۔ اس نقل اور کانٹ چھانٹ سے اصلی مصنف کی حق تلفی ہوتی ہے اور اسے کسی قسم کا کریڈٹ نہیں ملتا۔ ایسی تصانیف سے داخلی و خارجی تنقید کے ذریعے اصلی و نقلی تحریر کے علاوہ اصلی و نقلی مصنف کو بھی ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ یہاں یہ ضروری امر ہے کہ ایسی جعلی تصنیف اور نقلی مصنف کی ناقدانہ تفتیش کے لیے جتنے بھی ممکن ذرائع تحقیق ہوں انہیں عمل میں لایا جائے' اور ان ذرائع کو تلاش کیا جائے جو اس تصنیف کے مصنف نے استعمال کیے۔

۵۔ ایک جیسے ماخذوں' مطالعوں' تحریروں اور مشاہدوں سے وجود میں آنے والی تصانیف میں غلطیاں بھی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ان کا آسانی سے پتہ چل جاتا ہے۔ ان میں کسی قسم کے ردو بدل' ترمیم و اضافہ اور ترتیب و تشکیل کے فرق کو بھی آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ تصانیف و دستاویزات کسی مرحلہ پر ایک دوسرے سے مواد اخذ و نقل کرتی ہیں تو تصنیف کی خارجی تنقید کے اصول سے اس کو بھی بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ بسا اوقات کسی تصنیف کو مرتب کرنے کے لیے جعلی دستاویزات یا جھوٹی نسبتوں' شہادتوں' روایتوں اور مشاہدوں کا استعمال کیا جاتا ہے یا ادھوری عبارت' پیراگراف اور سطور و آیات کو استعمال کیا جاتا ہے تاکہ اپنے مطلب نظریئے اور خیالات کی تشہیر و تلقین کی جائے۔ اس صورت میں اصل ماخذوں اور شہادتوں کی کڑیاں ملانے اور ڈھونڈنے سے صحیح صورت حال اور اصل متن واضح ہو جاتا ہے۔

تصنیف کے یہ خارجی اصول تحقیق ہیں جن کی ناقدانہ تفتیش سے حقیقی تصنیف و دستاویز کو حاصل کر کے جعلی و نقلی دستاویزات' تصانیف کے علاوہ جعلی و نقلی مصنفین و مورخین سے بھی چھٹکارا حاصل کیا جاتا ہے۔

اکثر اوقات تصنیف کی داخلی و خارجی تنقید کا کام دو مختلف افراد سرانجام دیتے ہیں۔ عموماً داخلی تنقید کا کام محقق اور نقاد کے ذمے ہوتا ہے جب کہ خارجی تنقید کا کام مورخ و مصنف بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتا ہے۔ بعض اوقات تصنیف کی داخلی و خارجی تنقید کا کام ایک ہی فرد یعنی محقق و مورخ سرانجام دیتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خارجی تنقید میں مصنف کا کام صرف ابتدائی ہوتا ہے اور ناقدانہ تفتیش کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔

تصنیف کا خارجی تجزیہ کرنے کے لیے محقق اور مصنف کی ذہنی و فکری صلاحیت بلند ہونی چاہیے۔ عمرانی علوم پر گہری نظر اور بہتر قوت فیصلہ ہونی چاہیے۔ اسے ماہر لسانیات بھی ہونا چاہیے تا کہ متبادلات سے پیدا ہونے والی غلطیوں کا ازالہ اور حقیقی عبارت کا پتہ چل سکے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دسواں باب

حوالہ جات

۱- تشبیہہ سے مراد ایک چیز کو دوسری چیز کے مانند قرار دینا یا مشابہت دینا- تشبیہہ میں یوں ہوتا ہے کہ مصنف بالواسطہ انداز بیان اختیار کرتا ہے تو بیان پر محقق کا کام پیچیدہ ہو جاتا ہے اور اسے پیچیدہ ماہر زبان ہونا پڑتا ہے تاکہ مسجع و مقفیٰ عبارت کو اپنی زبان دانی کی مہارت سے سمجھ سکے- ایسی زبان کا استعمال ہندوؤں' بدھوؤں کی مذہبی کتابوں اور ایران و عرب کی جنگی و قبائلی داستانوں میں کثرت سے ہوا-

۲- استعارہ کے معانی مانگ لینا ہے- اور علم بیان کی اصطلاح میں مجاز کی ایک قسم جس میں کسی لفظ کے مجازی اور حقیقی معانی کے درمیان تشبیہہ کا علاقہ ہوتا ہے اور بغیر حروف تشبیہہ کے حقیقی معانی کو مجازی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ علی نافع شیر ہے تو مطلب یہ ہے کہ علی نافع شیر کی طرح بہادر ہے یا درشہوار فرشتہ ہے تو مراد یہ ہے کہ درشہوار فرشتوں کی طرح نیک و پاکیزہ ہے- اسی طرح اور بہت سے الفاظ ہیں جو حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوتے- اس قسم کی زبان عموماً مذہبی رسومات اور ذاتی خط و کتابت میں استعمال ہوتی ہے-

۳- السخاوی (۱۴۲۷ء - ۱۴۹۷ء)

۴- علامہ عبدالرحمٰن بن خلدون "مقدمہ ابن خلدون" حصہ اول ص' ۲۱۹ - ۲۱۸

۵- "دی ایجوکیشن آف ہنری ایڈمز" ص' ۳۸۲

۶- چارلز اے بیرڈ' ہسٹاریکل اینو ٹیلبلٹی" ص' ۵۳ - ۵۲

۷- ای- ایچ- کار' "وٹ از ہسٹری" ص' ۲۷

۸- لانگ لائیس' "انٹروڈکشن ٹو دی سٹڈی آف ہسٹری" ص' ۹۰

۹- محقات سے مراد جان بوجھ کر یا اتفاقی طور پر الفاظ یا اصطلاحات کا اندراج ہے-

۱۰- بقیہ سے مراد بہت ہی مشہور شخصیات ہیں-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گیارھواں باب

مواد کی ماہیئت و مسائل

THE PROBLEMS OF SUBSTANCE AND ITS QUALITIES

تاریخ ایک مرتب و مربوط اور منظم علم کا نام ہے۔ لیکن اس کا مواد سادہ و ہموار نہیں جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ بلکہ منتشر اور غیر منظم ہوتا ہے مثلاً" اگر آپ انگلستان کے میگنا کارٹا[1] اور عوام کی آزادی یا بسمارک کے ماتحت جرمنی کا اتحاد یا ماوزے تنگ کی قیادت میں چین میں کمیونزم کی اصلاحات پر کوئی مضمون یا تصنیف مرتب کرنا چاہیں تو آپ کو منتشر مشاہدات و حقائق کو کسی نہ کسی معقول نظم و ترتیب کے مطابق اکٹھا کرنا ہو گا۔ تب کہیں جا کر آپ کا مضمون یا تاریخ مرتب ہو گی۔ ہنری ایڈمز امریکی تاریخ کا ایک مشہور مؤرخ ہے وہ تاریخ کے مواد و اقدار کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "میں نے امریکی تاریخ کی بارہ جلدیں شائع کیں۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں اپنے دل کی تسلی کر لوں کہ ہر معیار کے مطابق حقائق مرتب ہو گئے ہیں اور یہ کہ میں انسانی تحریک کے بارے میں بھی مطمئن ہو جاؤں؟ مجھے اعتراف ہے کہ نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ دوسرے لوگ اس کے متعلق کچھ اور ہی رائے رکھتے تھے اور کوئی ایک بھی ایسا نہ ملا کہ جس نے اس کے معیار کے متعلق حتمی رائے دی ہو۔ آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تاریخی مواد کی بہتر ترتیب بھی کسی نتیجے پر نہ پہنچا سکی ہے۔ نیز ان کے معاشرے کی ترتیب بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا سکتی کہ جب تک وقت کا معاملہ مصنوعی اور فکر کا حاصل انتشار کے سوا کچھ نہیں[2]۔

تاریخی مواد کی مشکلات کے پیش نظر ہنری ایڈمز نے تاریخ لکھنا چھوڑ دی اور لکھا کہ میرے ناول "ایتھر" کے کوئی نو صفحے میری "تاریخ امریکہ" کی نو جلدوں سے زیادہ قیمتی ہیں۔ اگرچہ مورخ ہنری ایڈمز کے اس انتہا پسند نظریئے سے متفق نہیں کیوں کہ تاریخی مواد کی قدر و اہمیت ایک جداگانہ مسئلہ ہے اور تاریخ نویسی دوسرا مسئلہ ہے۔ تاریخی مواد کے بعض مسائل مندرجہ ذیل ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱- اتفاقات

بعض اوقات تاریخی مواد کا انتشار اور غیر مرتبہ تنظیم کی مشکلات مورخ کو دل شکستہ سا کر دیتی ہیں مثلاً ایک معاملہ اتفاقات کا ہے۔ ماہر کیمیا' ماہر طبعیات یا ماہر حیاتیات و نباتیات کو اپنے تجربات کے لیے جن اشیاء کی ضرورت ہو لے سکتا ہے۔ لیکن مورخ اپنا پورا کام اس مواد کی بنا پر کرتا ہے جو اتفاقات سے اسے دستیاب ہو جائے۔ تاریخ میں ہم جو کچھ جان سکتے ہیں یا بیان کر سکتے ہیں وہ درحقیقت حقائق کا بہت چھوٹا سا حصہ ہے جو تاریخ میں پیش آیا۔ علاوہ ازیں جو کچھ مواد ہمیں میسر آیا وہ سراسر منتشر و متفرق معلومات' بیانات' دستاویزات' تصانیف اور مشاہدات تھے جو اتفاق سے ہمیں مل گئے۔ ہم نے انہیں مرتب کر کے ایک باقاعدہ منظم تاریخ کی صورت میں پیش کر دیا۔ ہماری تاریخ کے متعلق معلومات ویسی ہی ہیں جیسا برف کے تودے کو سمندر میں دیکھا جائے تو اس کا جو حصہ پانی سے اوپر اٹھا ہوتا ہے اس سے زیادہ حصہ پانی کے اندر ہوتا ہے۔ ماضی کی تاریخ کا بہت سا مواد گم ہو چکا ہے اور جو موجود ہے وہ منتشر ہے اور ہمیں آسانی کے ساتھ میسر نہیں ہے محض اس لیے کہ اسے کبھی مرتب ہی نہیں کیا گیا۔ وہ گردش زمانہ کی نذر ہو گیا۔ آگ' پانی' موسم اور لاپروائی کی بنا پر گم ہو گیا یا دانستہ طور پر اسے تباہ و برباد کر دیا گیا[۲]۔ ہم کس طرح جان سکتے ہیں یا کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے ہاتھ آیا ہے وہ تاریخ ماضی کے کسی عنوان کے متعلق سب سے زیادہ اہم اور درست حقائق و مواد ہے؟

۲- تحریفات

تاریخی مواد کی اہمیت و ماہیئت کا دوسرا مسئلہ تحریف کا ہے یعنی ماضی کا جو ریکارڈ و مواد دستیاب ہے ہم اسے تاریخ کہتے ہیں اور اس نامکمل مواد سے تاریخ مرتب کرتے وقت ہم سمجھتے ہیں کہ یہ پورے ماضی پر حاوی ہے۔ علاوہ ازیں بہت سی غیر یورپی اقوام و معاشروں کے متعلق تاریخی مواد یا تو گم ہو چکا ہے یا ناپید ہے۔ مثلاً اہل افریقہ کے متعلق اور امریکہ کے اصل باشندوں "ریڈ انڈین" کے متعلق اور قدیم ہندوستان اور چین کے متعلق ہمارا تاریخی ریکارڈ نامکمل ہے۔

تاریخی ریکارڈ کے بارے میں ہمارا رویہ یہ ہے کہ جو ہمیں میسر آتا ہے اور اس میں سے جو واقعات و حوادث ہمیں پسند آتے ہیں انہیں اپنی مرضی کی تاویل دے کر تاریخ قرار دے دیتے ہیں۔ اور پھر اس کا پروپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں جبکہ یہ تاریخ سراسر ناقص اور خود ساختہ ہوتی ہے[۳]۔ ہمیں ایسی تحریفات سے پرہیز کرنا چاہئے اور تاریخ کے لیے مشکلات پیدا نہیں کرنی چاہئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳- تحریری ریکارڈ

یہ حقیقت ہے کہ تاریخ زیادہ تر تحریری ریکارڈ پر مبنی ہے- یہاں پر شاید ہم مبالغے سے کام لیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ جن لوگوں نے ریکارڈ محفوظ رکھے انہوں نے ان لوگوں کے خیالات و نظریات کو سامنے لانے پر توجہ نہ دی کہ جن کے ریکارڈ یا تو موجود نہیں یا متفرق و منتشر اور اتفاقی ہیں اور ان سے باقاعدگی کے ساتھ یا حتمی معلومات دستیاب نہیں ہو سکتیں- اور ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ تاریخ کے تحریری ریکارڈ پر بھی تحریفات کا رنگ چڑھا ہوا ہے[۵]-

۴- تعصب و تنگ نظری

قریباً" ہر فکر و ملت کا مورخ اپنی تاریخ کے اندازے درست رکھتا ہے اور دوسروں کے فکر و ملت کے اندازے غلط ثابت کرتا ہے- مثلاً" وہ مورخ جو یہودیوں کے حق میں ہو گا وہ عربوں کے خلاف ہو گا جو سوشلزم اور کیمونزم کے نظریات کا حامی ہو گا وہ نظام سرمایہ داری رکھنے والے ممالک اور امریکہ کے خلاف ہو گا- جسے فلسطینی مسلمانوں سے الفت ہو گی وہ اسرائیلی یہودیوں کو اچھا نہ سمجھے گا- علیٰ ہذا القیاس مورخین کی تنگ نظری اور تعصب کا قصہ بڑھتا چلا جائے گا- مورخین کے تعصب و تنگ نظری کی مثال ایسے ہے کہ جس طرح آنکھوں والے ' اندھے' بہرے اور گونگے افرد خواب دیکھتے ہیں- اسی طرح ہر عام مورخ اپنی فکر و صلاحیت کے مطابق تاریخ کی زیادہ سے زیادہ درست تعبیر پیش کرتا ہے- قومیت اور رنگ و نسل کی تنگ نظری سے ہم سب آگاہ ہیں اور ہم میں سے اکثر اس بارے میں کوشش بھی کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم تعصب اور تنگ نظری کا شکار ہو جاتے ہیں-

۵- ڈرامائی واقعات

عام لوگوں کے لیے تاریخی واقعات ڈرامائی اور خوش منظر ہوتے ہیں اور وہ سنسنی خیز حوادث سے متاثر ہوتے ہیں- روزمرہ کے اخبارات و رسائل اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ کس طرح ڈرامائی اور بے تکے واقعات کی منظر کشی کرتے ہیں- خانقاہوں کے راہبوں نے وقائع نگاری کے جو ریکارڈ ہمارے لیے چھوڑے ہیں وہ روزمرہ کی عام زندگی کی غمازی نہیں کرتے- انہوں نے صرف اہم ' غیر معمولی اور معجزنما واقعات و حوادث کو تحریر کیا یا جن واقعات میں ڈرامائی اور سنسنی خیز معلومات پوشیدہ ہوتی ہیں مثلاً" زلزلوں' جنگوں' قدرتی آفات' طوفانوں' بیماریوں' بادشاہوں' امراء اور رؤساء کے واقعات تحریر کیے ہیں یا پھر اپنے اور مخصوص خاندانوں میں پیدائش ' اموات' شادی اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیگر دلچسپ واقعات لکھے ہیں۔ عام سطحی اور قصہ گو قسم کے مورخ بھی تو ان رومانوں ' ڈرامائی اور سنسنی خیز واقعات سے متاثر ہوتے ہیں۔ وہ بادشاہوں ' امراء ' روساء اور دیگر بڑے آدمیوں کے واقعات پڑھتے ہیں' بیان کرتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک غریب اور عام لوگوں کے واقعات غیر رومانی' غیر ڈرامائی' معمولی اور مختصر ہوتے ہیں۔ اور ہم ہیں کہ اس قسم کے مواد اور ریکارڈ سے تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ یعنی ہم ڈرامائی' حیرت انگیز اور سنسنی خیز واقعات کے ریکارڈ کو تاریخ کہتے ہیں۔

۶۔ پسندیدگی و ناپسندیدگی

بعض مورخین کے مطابق تاریخ کو عظیم ہستیاں جنم دیتی ہیں اور یہ انہی کے شب و روز کے واقعات کی کہانی ہے اور وہی تاریخ ساز ہستیاں ہیں۔ بعض مورخین کا اصرار ہے کہ تاریخ قوموں کے عروج و زوال کی کہانی ہے۔ خاص قوموں نے خاص عہدوں میں تاریخ سازی کی ہے مثلاً" یہودیوں نے دسویں اور نویں صدی قبل مسیح میں' یونانیوں نے پانچویں سے تیسری صدی قبل مسیح میں' رومیوں نے دوسری اور پہلی صدی قبل مسیح میں' عیسائیوں نے تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں' مسلمانوں نے پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں' ترکوں نے تیرھوں اور چودھویں صدی میں' اہل سپین نے سولھویں اور سترھویں صدی' اہل فرانس نے اٹھارھویں صدی میں (خصوصاً" انقلاب فرانس کے دوران) اہل برطانیہ نے انیسویں صدی میں اور امریکہ اور روس نے بیسویں صدی کے دوران اپنی اپنی قوموں کی تاریخ سازی کی ہے۔ یہ بیان شاید زیادہ حقیقت پسندانہ نہیں لگتا کیونکہ ہر قوم کا ہر فرد ہر دور میں تاریخ سازی کرتا ہے۔ آقا بھی اور غلام بھی' بادشاہ بھی اور عوام بھی برابر طور پر تاریخ سازی میں اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن وہ مواد جسے ہم تاریخ کہتے ہیں دراصل وہ واقعات ہیں جو ہمیں زیادہ متاثر و اپیل کرتے ہیں یا جن کے بارے میں ہم زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں یا جن کے بارے میں ہماری معلومات زیادہ ہیں اور ان کے بارے میں ہم لکھنا پسند کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہم پسند کرتے ہیں وہی لکھتے ہیں۔ اور جو کچھ لکھتے ہیں وہی تاریخ ہے گویا کہ تاریخ مورخ کی پسند و ناپسند کی کہانی ہے۔

ہم عادتاً" ماضی پر اپنے نقطہ نگاہ سے نظر ڈالتے ہیں۔ اپنی ذہنی ' مذہبی اور معاشرتی اقدار و معیار کے مطابق اسے پرکھتے ہیں۔ اپنے لفظوں اور فکر و خیال کے مطابق تازہ و زندہ کرتے ہیں۔ جب زمانہ ماضی کی زبان میں کوئی چیز پڑھتے ہیں تو اسے دور حاضر کی زبان کا لباس پہناتے ہیں اور یہ فرض کر لیتے ہیں کہ جو کچھ پیش آیا وہ ماضی کے کسی دور میں پیش آیا۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر "ماضی" کسی نہ کسی زمانے میں حال تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حقیقت یہ ہے کہ ہم غیر شعوری طور پر فرض کر لیتے ہیں کہ ماضی ہمارے لیے بنایا گیا تھا۔ ہمارے لیے اسی وقت تک اہم و دلچسپ ہے جب تک یہ ہمارے موجودہ مفاد کو پورا کرے اور ہماری مرضی کے مطابق نتائج مرتب کرے۔ یہ کس قدر عجیب مفروضہ ہے کہ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ کے لوگ بھی اپنی نگاہوں میں قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ ہی کے لوگ تھے یا دور احیائے علوم کا آدمی اگر ان تصورات کے مطابق زندگی بسر نہ کرے جو ہم نے اس کے لیے فرض و قائم کر رکھے ہیں تو وہ اپنی حقیقی حیثیت کھو بیٹھے گا۔ کیا ہمارے آباء و اجداد جانتے تھے کہ وہ ہمارے آباء و اجداد ہوں گے؟ ہمارے لیے یہ احساس پیدا کرنا کتنا مشکل ہے کہ زمانہ ماضی ان لوگوں کے لیے بھی اسی طرح زمانہ ماضی تھا جس طرح ہمارے لیے زمانہ حال ہے اور وہ اسی ماضی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور وہ ہماری روحانی و اخلاقی اصلاح کے لیے نہیں جیتے تھے جس طرح ہم بعد میں آنے والی نسلوں کی روحانی و اخلاقی اصلاح کے لیے نہیں جیتے۔

۷۔ تاریخ کی مصنوعی اور غیر منطقی تقسیم

ہم نے محض اپنی سہولت کے لیے تاریخ کو نظریاتی طور پر ادوار میں تقسیم کر رکھا ہے۔ مگر یہ امر قابل توجہ ہے کہ یہ تقسیم ہر لحاظ سے مصنوعی اور غیر منطقی ہے۔ تاریخی واقعات ایک بہتا ہوا دھارا ہیں اور انہیں مختلف مصنوعی حصوں میں تقسیم کرنا ممکن ہی نہیں۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخی حالات کی بہتی ہوئی رو کو اچانک طور پر تبدیل کرنا کسی واقعہ کے رونما ہونے سے ممکن نہیں بلکہ یہ تبدیلی ارتقائی طور پر رونما ہوتی ہے۔ اور اس کا پس منظر ماضی سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ جس کی حد فاصل عمل تقسیم سے بالاتر ہوتی ہے۔

ہم تاریخ میں جن رسمی خاکوں، تخصیص اور تقسیم کے عادی ہو چکے ہیں یہ تاریخ کے خاکے، تخصیص اور تقسیم نہیں بلکہ ہمارے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ تاریخ کی علاقائی، معاشرتی، مذہبی اور قومی ترتیب ہماری بنائی ہوئی ہے۔ ہم اپنی مطالعاتی سہولت کے لیے تاریخ کو مختلف حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں مثلاً" زمانہ قبل از تاریخ، عہد قدیم، عہد وسطیٰ، عہد حاضر وغیرہ جب کہ ادوار کی اس تقسیم کی کوئی وجہ موجود نہیں۔ اسی طرح ہم تاریخ ہندوستان کو مختلف حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں مثلاً" کول عہد، دراوڑ عہد، مسلمانوں کا عہد، استعماری عہد، تقسیم کا عہد اور ہندوستان و پاکستان کی موجودہ حیثیت وغیرہ۔ اسی طرح امریکہ کی تاریخ کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے مثلاً" ابتدائی دور، استعماری دور، دور انقلاب، صدارتی دور اور پھر جارج واشنگٹن سے لیکر موجود صدر بل کلنٹن کے دور تک کی تقسیم وغیرہ۔ غرضیکہ تقسیم کے یہ مختلف نمونے ہیں۔ مگر تاریخ کا سلسلہ بلا تقسیم و تخصیص جاری و ساری ہے اور تاریخ کی یہ مصنوعی اور غیر منطقی تقسیم ہم اپنی سہولت و ضرورت کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مطابق کرتے ہیں۔ تاریخ کی رفتار کا معاملہ پہلے سے مقدر نہیں ہو چکا۔ زندگی جیسی پہلے سے چلی آ رہی تھی ویسی ہی اب ہے۔ یہ گردش زمانہ' تہذیبوں کے عروج و زوال' زمانے کی تکنیکی ترقی' جنگ کی گرم بازاری اور ہنگامہ ہائے شب و روز' ماضی کو سمجھنے کے لیے ذہنی چیلنج ہیں۔ ماضی کو سمجھنے کے لیے جو ذہنی چیلنج پیش آتا ہے وہ حال اور مستقبل کو سمجھنے کے لیے پیش آنے والے چیلنج کے مقابلے میں کسی حیثیت میں بھی کم تر نہیں ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں ایک نمایاں فرق ہے وہ یہ کہ اگر ہم حال کو سمجھ لیں تو اس پر قابو پا سکتے ہیں لیکن ماضی پر قابو پانا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب گیارہواں

حوالہ جات

(۱) میگنا کارٹا یعنی حقوق کا وہ منشور اعظم جو انگلستان کے بادشاہ جان (John) سے امراء اور آرچ بشپ کینٹربری نے ۱۵ جون ۱۲۱۵ء کو حاصل کیا۔ یہاں سے انگلستان میں عوام کی آزادی' پارلیمنٹ کی حکومت اور بادشاہ کے اختیارات میں کمی کا آغاز ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو آرتھر ماروک ' دی نیچر آف ہسٹری' ص' ۳۳۶-۳۳۱

(۲) "دی ایجوکیشن آف ہنری ایڈمیز" بوسٹن' ص' ۳۸۲

(۳) اسکندریہ اور بغداد کی لابریریوں کی تباہی و بربادی اور پھر جنگ عظیم اول و دوم کی تباہ کاریاں وغیرہ۔

(۴) رچرڈ براؤن ' "لرننگ ہسٹری" ص' ۱۵ - ۱۳

(۵) ایضاً ص ۴۶ - ۴۵

(۶) تھامس کارلائل آن ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ ص' ۲ - ۱

(۷) وائی کو سمنسکی' پروفیسر ٹائن بی فلاسفی آف ہسٹری (ماسکو' ۱۹۶۵) ص' ۲۶ - ۱۱

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بارھواں باب

اصول تحقیق
RESEARCH TECHNIQUE

محقق تاریخ گر ہوتا ہے۔ وہ بغیر تحقیق کے کوئی واقعہ اپنی تاریخوں میں درج نہیں کرتا۔ جن واقعات کو وہ داخل تاریخ کر رہا ہوتا ہے ان کے پیدا کرنے میں اس نے برابر حصہ لیا ہوتا ہے۔ مشہور یونانی مورخ پولی بیس اس سلسلے میں بیان کرتا ہے:

"میں کہتا ہوں کہ تاریخ ٹھیک طریقے سے نہیں لکھی جا سکتی جب تک یا تو وہ لوگ تاریخ نگاری کریں جو عملی تجربہ رکھتے ہیں یا مورخوں کو یقین کامل ہو کہ تاریخ نگاری کے لیے عملی تجربہ ضروری ہے۔ جب تک یہ نہ ہو گا تب تک تاریخ نگاری میں فاش غلطیاں ہوتی رہیں گی[1]۔"

پولی بیس اصول تحقیق بیان کرتے ہوئے محقق کے لیے تصویر راہنمائی پیش کرتے ہوئے کہتا ہے:

"تاریخی تحقیق کے معاملے میں جن مورخوں کو عملی تجربہ نہیں ہوتا وہ غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایسے ناتجربہ کار مورخ کس طرح بتا سکتے ہیں کہ فوجیں کس طرح چالیں چلتی ہیں، شہروں کا محاصرہ کس طرح کیا جاتا ہے اور بحری لڑائیاں کس طرح لڑی جاتی ہیں۔ اگر انہیں یہ باتیں بتا دی جائیں تو ان کی تفصیلات کو یہ لوگ کس طرح سمجھ سکتے ہیں[2]؟"

پولی بیس تاریخ نگاری کے لیے محقق پر سخت شرائط عائد کرتا ہے تاکہ ان کو پیش نظر رکھ کر ایک بے غرض تاریخ لکھی جائے۔ محقق کا دل ایسا حساس ہوتا ہے کہ وہ اینٹ، خاک اور مٹی کی صدا بھی سنتا ہے۔ جب محقق تحقیقات کرتا ہے تو اس کے سامنے حقائق کے نئے نئے دروازے کھل جاتے ہیں۔ وہ ایک دروازے سے نکل کر دوسرا دروازہ کھولتا ہے اور انسانوں کو رموز حقائق سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آشنا کرتا ہے۔

تاریخ نگاری کے لیے اصول تحقیق کوئی خاص بھید نہیں ہیں۔ اور نہ ہی یہ کوئی متعارف خصوصیات ہیں یہ چند اہم بنیادی قاعدے، اصول فارمولے اور مطلوبات ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر اگر تاریخی مواد کو منظم و مرتب اور جمع کیا جائے تو عمدہ اور مفید تاریخ معرض وجود میں آتی ہے۔

یوں تو اکثر بڑے بڑے مورخ رسمی اصول تحقیق کے جدید قاعدوں سے نا آشنا تھے مگر انہوں نے تاریخ کے راستوں کی ایسی نشاندہی کی کہ ان کے اسلوب وقائع نویسی تاریخ نگاری کے لیے اصول و نمونہ بن گئے۔ زمانہ گذشتہ کے بڑے بڑے مورخ مثلاً ہیرو ڈوٹس، تھیوس ڈائڈز، لیوی، پولی بیس، ٹیسی ٹس، پلوٹارک، والٹیئر، بالنگ بروک، ہیوم، میکالے، بین کرافٹ، گیزو، گرانٹ وگ، ہیگل، مارکس، کارلائل، اسپینگلر، ونسٹن چرچل، طبری، واقدی، بلا ذری، مسعودی، ابن خلدون اور دیگر بہت سے محقق پیشہ ور مورخ نہ تھے۔ سب کے سب کسی نہ کسی عوامی معاملے میں مصروف تھے۔ پیشہ ورانہ تاریخ نگاری زمانہ جدید کا معاملہ ہے۔ تاریخ نگاری کے لیے اصول تحقیق انیسویں صدی میں سائنٹیفک اور ٹیکنیکل تاریخ کی تصنیفات کے ساتھ وجود میں آئے۔ یہ رسمی اصول تحقیق کوئی مخفی اور پراسرار شئے نہیں کہ جن کے نہ ہونے سے تاریخ نگاری نہیں ہو سکتی بلکہ یہ چند قاعدے اور مطلوبات ہیں جن کی روشنی میں بہتر طور پر تاریخ نگاری کی جا سکتی ہے۔ یہ مندرجہ ذیل عناصر پر مشتمل ہیں۔

۱۔ موضوع
۲۔ اسلوب
۳۔ قوت متخیلہ
۴۔ وسیع مطالعہ
۵۔ محنت و استقلال
۶۔ فن تحریر
۷۔ زبان
۸۔ پیراگراف
۹۔ عنوان
۱۰۔ ترتیب
۱۱۔ ماخذوں کی تقسیم
۱۲۔ نکتہ چینی میں احتیاط
۱۳۔ تمہید اور اختتام
۱۴۔ نظر ثانی

۱۔ موضوع

جسٹس ہومز نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہر وہ موضوع اہم ہے جس کا مطالعہ پورے ذوق و شوق سے کیا جائے۔ ایک روشن خیال اور تاریخی شعور کا حامل مورخ تو مسحور کن کتابیں لکھ سکتا ہے۔ مگر ایک غبی ذہن اور تنگ نظر شخص ہملٹ[۲] اور الف لیلیٰ کی کہانیوں سے بھی لطف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اندوز نہیں ہو سکتا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے کہ ہمارے زیر مطالعہ کون سی کتاب ہے؟ یہاں موضوع کی اہمیت اور پڑھنے والے کی ذہنی صلاحیتوں کا معاملہ زیر غور ہے۔ یعنی صاحب علم کیا لکھتا ہے یا کیا پڑھتا ہے؟ اگرچہ تاریخی موضوع بالعموم یکساں حیثیت کے حامل ہوتے ہیں لیکن بعض دوسروں کی بہ نسبت زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ یوں تو تاریخ کے تمام ادوار دلچسپ اور اہم ہیں لیکن جو اہمیت یورپ میں احیائے علوم کے دور، انگلستان میں الزبتھ کے دور اور انقلاب فرانس کو معلومات کی بہتات اور متنوع ہونے کے اعتبار سے حاصل ہے۔ یقیناً وہ کسی اور موضوع کو حاصل نہیں۔ تاریخ کے طالب علموں کے لیے تاریخ یورپ کے یہ ادوار خاص طور پر نہایت پر جوش اور ولولہ انگیز ہیں۔ موضوعات کی پسندیدگی کا معیار صدیوں سے ایسا ہی چلا آ رہا ہے۔ موضوع کی حیثیت و اہمیت کا یہی معیار اعلیٰ درجے کے ادب میں بھی سرایت کر گیا ہے۔

ہر موضوع ایک جداگانہ حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کا اپنا حسن، معیار، پرکھ اور دلچسپی کی خصوصیات ہوتی ہیں۔مثلاً" دور احیائے علوم اور امریکی خانہ جنگی کا مطالعہ نسلوں سے قابل توجہ رہا ہے۔ صدیوں سے مورخین کی توجہ کا مرکز اسی نوع کے مضامین و موضوعات رہے ہیں اور تاریخ کا طالب علم ایسی کتابوں سے ڈھیروں مفید معلومات حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح ہم آرٹ کے ان ادوار کا مطالعہ شوق سے کرتے ہیں جن میں بڑے بڑے فنکار پیدا ہوئے مثلاً" لیونارڈو، رافیل، مائیکل انجلو وغیرہ۔ اگر ہم تاریخ کے ان ادوار کا مطالعہ کرنے کو ترجیح دیں کہ جن میں بڑے بڑے مورخ پیدا ہوئے یا بڑے بڑے مورخوں کے دلوں میں تاریخ لکھنے کا جذبہ پیدا ہوا تو ہم حق بجانب ہوں گے۔

تاریخ کا مجموعہ بہت عظیم الشان ہے۔ کم و بیش بیس ہزار جلدیں صرف انقلاب فرانس سے متعلق ہیں۔ تقریباً" اتنی ہی کتابیں امریکی خانہ جنگی کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ اگر کوئی شیکسپیئر اور اس کے عہد کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنا چاہے تو اسے کم از کم اڑھائی لاکھ جلدیں پڑھنا پڑیں گی۔ تاریخ کے ہر دور کے متعلق معلومات حاصل کرنے یا ہر ملک کی تاریخ پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دیوانہ بنا لے۔ یہ ایسے بڑے اور وسیع موضوع ہیں جن کے متعلق پوری معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک سال نہیں بلکہ ایک زندگی درکار ہے۔

تاریخ کا مطالعہ ہمیشہ منظم و مرتب طریق پر کرنا چاہیئے۔ متفرق و بلا امتیاز طریق پر پڑھنے کا مطلب وقت کے ضیاع کے سوا اور کچھ نہیں اور ایسا مطالعہ آخر میں دلچسپی بھی زائل کر دیتا ہے۔ دوسرے مضامین کے طرح تاریخ میں بھی ترتیب، تنظیم اور قواعد کی پابندی حد درجہ لازم ہے۔مثلاً"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو شخص پیانو چھوڑ کر سارنگی' پھر بانسری اور طبلہ' و ڈھولک اختیار کرے گا وہ کسی ایک فن میں بھی کمال پیدا نہ کر سکے گا۔ وہ موسیقار نہ بن سکے گا۔ جو شخص فرانسیسی' جرمن' اطالوی' ہسپانوی' عربی اور ترکی زبان یکے بعد دیگرے اختیار کرتا چلا جائے گا تو کسی ایک میں بھی مہارت حاصل نہ کر سکے گا اور اس کے لیے ماہر لسانیات بننے کی نوبت کبھی نہیں آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اپنے مطالعہ کے لیے مخصوص و مطلوب موضوع کو منظم و مرتب طریق سے چننا ہو گا۔ یہاں پر اصل مطلوب شے یہ ہے کہ نظم و ترتیب اور سنجیدگی کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مستند اور ٹھوس کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ مانے ہوئے عظیم علماء و مورخین کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ سطحی اور عام بازاری کتابوں کے مطالعہ سے پرہیز کیا جائے۔ تتلی کی طرح ہر جاذب شئے پر جا بیٹھنا اور کچھ رس چوس کر دوسرے پھول پر جا بیٹھنا ایسا طریقہ ہے جو وقتی جذبوں پر مبنی ہوتا ہے۔ انسان ایسی سطحی کتابوں سے جلد ہی اکتا جاتا ہے کیونکہ وہ علم و فن کے راز افشا نہیں کرتیں۔ ثانوی درجے کی کتابیں غیر وابستہ' کم فہم اور کم علم لوگوں کی نقالی ہوتی ہیں۔ انہوں نے اصلی ماخذوں کا سہارا نہیں لیا ہوتا۔ یہ صرف نام و نمود اور چل چلاؤ کا سلسلہ ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ کو تاریخ کی ٹھوس تصانیف پر توجہ دینا ہو گی اور زیر نظر موضوع پر اس کے ماہر عالم یا مورخ کی حقیقی تخلیقات پڑھنا ہوں گی۔ موضوع کے اصل ماخذ کی طرف متوجہ ہوں۔ یعنی مکاتیب' روزنامچوں اور یادداشتوں کا وسیع ذخیرہ جو اصل موضوع کے شرکاء و علماء نے وراثت میں چھوڑا۔ پھر اخبار نویسوں اور سیاحوں کے دلچسپ بیانات' بہت سے فن کاروں کی روئدادیں ان کے علاوہ ہیں۔ اس کے علاوہ سرکاری دستاویزات' سیاسی' سفارتی اور فوجی ریکارڈوں کے زبردست انبار جو اتنے زیادہ ہیں کہ ایک مورخ ان پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ ماضی کے ریکارڈ کی ان بھول بھلیوں میں سے جو ماخذ کے متعلق موجود ہیں راستہ پیدا کرنے کا کام بڑا حوصلہ فرسا ہے۔ لیکن یہ امر باعث اطمینان ہے کہ آپ سے پہلے بہت سے لوگ ان سب دستاویزات و ماخذوں کا جائزہ لے چکے ہیں۔ انہوں نے موضوع باندھ دیئے ہیں۔ نقشے مرتب کر دیئے ہیں اور راستوں کی نشاندہی کر دی ہے۔ آپ کو موضوعات کے بحر بیکراں میں ادھر ادھر بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ آپ کی راہنمائی کے لیے عظیم مورخین کی تصنیفات موجود ہیں۔ ان مورخین کی راہنمائی میں آپ کو دماغ کھپانے کی ضرورت نہ رہے گی۔ صحیح موضوع کے انتخاب پر مورخ ریکارڈوں کے اندھیرے میں بے مقصد سرگرداں نہیں رہنے دے گا۔ وہ آپ کو سینکڑوں کتابیں (Bibliography) اور حوالہ جات مہیا کرے گا۔ وہ آپ کو مختلف نظریات اور اس کی توضیحات سے آگاہ کرے گا بلکہ وہ اس سلسلہ میں آپ کو نوٹ اور حوالے بھی مہیا کرے گا۔ تاکہ آپ خود صحیح نتائج پر پہنچ جائیں۔ اب اصل مطلوب شئے یہ ہے کہ آپ صحیح موضوع کا انتخاب کریں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور سطحی درجے کی تصانیف سے اجتناب کریں۔ اب آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کسی موضوع کے متعلق پوری معلومات حاصل کرنا ایک دو برس کا کام نہیں بلکہ ایک زندگی کا کام ہے۔ لیکن یہ ہر بڑے اور وسیع موضوع کے متعلق حقیقتاً درست ہے۔

موضوع کے انتخاب کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ ہمیشہ خاص سے عام کی طرف توجہ کی جائے۔ عام سے خاص کی طرف رخ کرنا ہرگز مناسب نہیں۔ جن سطحی کتابوں میں عام چیزیں جمع کر دی جائیں یا کسی چیز کا خاکہ یا ہر چیز کا سرسری جائزہ ہو وہ دماغ کو یقیناً زنگ آلود کر دینے والی ہوتی ہے۔ تاریخ کا طریقہ سائنس کا طریقہ ہے یعنی استنباطی۔ یہ قانون کا بھی قاعدہ ہے یعنی ہر مقدمے کے حالات کا مطالعہ کیا جائے۔ آرٹ میں بھی اس طریقے سے کام لیا جاتا ہے یعنی تشریح الاعضا کے مطالعے سے آغاز کیا جاتا ہے پھر رنگوں کے معاملے میں مہارت پیدا کی جاتی ہے یا پتھر کی وضع قطع' ہیئت اور نوعیت دیکھی جاتی ہے۔ غرض کہ آپ اپنا موضوع خاص سے شروع کریں یعنی کسی فرد یا کسی واقعے یا کسی ادارے کا مطالعہ پیش نظر رکھیں اور ان سے عمومی موضوعات پر توجہ کریں۔ اگر آپ پاکستان کے دستور سے دلچسپی رکھتے ہیں تو صحیح صورت یہ ہے کہ اصل دستور کا مطالعہ کریں۔ پھر دستوری ارتقاء و مراحل کی تاریخ جانیں۔ ۱۹۵۶ء' ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء اور پھر جنرل ضیاء الحق کے مارشلائی دور کی ترمیمیں' وضاحتیں اور توضیحات کا جائزہ لیں۔ پھر بے نظیر اور نواز شریف کے ادوار میں اس پر بحثیں ہوئی انہیں پرکھیں۔ اس طرح سے آپ دستور سازی اور سیاسی فلسفے کے موضوعات سے آگاہ ہوں گے۔ اس سلسلہ میں مختلف ترامیم' اعلانات' مارشلائی قوانین' صدارتی خطبات اور عدالتی آراء پاکستان میں دستوری نظام کی پیچیدگیوں اور الجھنوں کو واضح کر دیں گی جو ہمارے دستوری قانون اور تاریخ کا جوہر ہیں۔ اس طرح آپ پاکستانی دستوری نظام سے بخوبی آشنا ہو جائیں گے۔ ساتھ ہی پاکستانی سیاسیات' اقتصادیات اور معاشرے کے بیشتر مسائل کے موضوعات سے بھی شناسا ہو جائیں گے۔

اصول تاریخ نگاری میں موضوع کا انتخاب بنیادی اور لازمی حیثیت رکھتا ہے۔ موضوع کا انتخاب اسی انداز میں کیجئے جس انداز میں آپ ایک دوست یا مثلاً" بیوی کا انتخاب کرتے ہیں[9]۔ موضوع کی حیثیت ایسی ہوتی ہے کہ جس کے ساتھ خاص مدت تک آپ کو زندگی بسر کرنا ہو گی۔ ممکن ہے کئی سال لگ جائیں۔ لہٰذا اپنے سفر کے لیے اچھے ساتھی کا انتخاب کرنا چاہئے۔ آپ ایسا موضوع منتخب کریں جس کے ساتھ آپ کو دلچسپی ہو اور جو آپ کے دل میں ولولہ پیدا کر دے۔ بہ حیثیت مجموعی مناسب یہ ہے کہ ایسا موضوع منتخب کریں جو آپ کے ذوق و شوق کے مطابق ہو اور جس کے ساتھ آپ کو ہمدردی ہو۔ اگرچہ یہ کوئی بنیادی اور ضروری چیز نہیں۔ آپ امام حسین علیہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

السلام اور واقعہ کربلا کو نہایت موثر انداز میں لکھ سکتے ہیں[1]۔ آپ ہٹلر کے متعلق لکھ سکتے ہیں اگرچہ اس کی نازیت سے آپ کو اتفاق نہ ہو۔غالباً" بہتر یہ ہو گا کہ ایسے افراد واقعہ کربلا کے موضوع پر لکھنے سے احتراز کریں جو باطل پرست خیالات کے حامل ہیں[11] یا یزیدی گروہ کو حق پر سمجھتے ہیں[12]۔ اسی طرح اگر آپ یہودی ہیں تو مناسب ہو گا کہ آپ ہٹلر کے متعلق لکھنے سے احتراز کریں۔

سوانحی موضوعات کے لیے آپ کسی شخصیت کو منتخب کریں جس کے ساتھ آپ کو دلچسپی اور ہمدردی ہو کیونکہ آپ اس شخصیت کے ساتھ گہری رفاقت ہرگز نہ چاہیں گے جو آپ کو دل سے ناپسند ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا تاریخی کردار کیوں نہ ہو۔ ایسے مخصی سوانح نگاروں کی مثالیں ملتی ہیں جنہیں اپنے موضوع پر ناپسندیدگی تھی یا وہ رفتہ رفتہ ناپسندیدگی پر آ گئے[13]۔ بہترین سوانح نگار ہمیشہ اپنے موضوع کے متعلق قدر و منزلت اور ہمدردی کا اظہار کرتے رہے۔ بعض کو ان شخصیتوں سے دلی محبت تھی جن کے سوانح انہوں نے لکھے۔ ہر مذہب و ملت میں مذہبی اور سیاسی شخصیات کی لکھی جانے والی سوانح نگاریاں عمدہ مثالیں پیش کر سکتی ہیں۔

جب آپ کو اپنی پسند اور ذوق و شوق کا موضوع مل جائے' آپ اس کے متعلق دریافت کر لیں کہ نئی باتیں کہنے کے لیے موجود ہیں اور معلومات آپ کی دسترس میں ہیں نیز مواد کا ذخیرہ اچھا ہے تو آپ لکھنا شروع کر سکتے ہیں۔

آپ کا موضوع نہ تو بہت بڑا ہونا چاہئے نہ بہت معمولی۔ یہ نہ تو زیادہ فرسودہ ہونا چاہئے اور نہ زیادہ غیر معروف۔ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ کے پیش نظر جتنا وقت اور جتنی گنجائش ہے اسے پورا کیا جا سکے۔ یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ مورخوں کے گروہ پے در پے اسے چھوڑ چھوڑ کر نہ چھوڑ چکے ہوں۔ علاوہ ازیں یہ اتنا نادر اور عجیب و غریب بھی نہ ہونا چاہئے کہ جس کے ساتھ آپ کے علاوہ کوئی دوسرا دلچسپی ہی نہ لے۔ ایک ضروری بات یہ بھی ہے کہ اس کے متعلق ماخذ مخفی دسترس میں نہ ہوں بلکہ آپ کی دسترس میں ہوں۔ ایسا کوئی موضوع منتخب نہ کریں کہ جس کے ماخذ کم اور ناقابل اعتماد ہوں۔ یا جس کے متعلق بنیادی دستاویزیں استعمال نہ کی جا سکیں مثلاً خفیہ کام کرنے والے اداروں کے متعلق تاریخ میں اگر کوئی باب لکھنا ہو مثلاً "سی۔ آئی۔ اے[14]" کے متعلق یا ماخذ کسی ایسے خاندان کے قبضے میں ہوں جو انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا خواہاں ہو۔ یا وہ ماخذ جو امریکہ' برطانیہ' روس' جرمنی' فرانس' سپین اور آسٹریلیا کے محافظ خانوں (Archives) میں ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کسی وجہ سے ان میں سے کسی ملک جا رہے ہوں۔ اگر آپ پاکستان میں رہتے ہیں تو بالخصوص کسی ایسے موضوع کا انتخاب نہ کیجئے کہ جس کے مطالعہ کے لیے آپ کو اسرائیل یا بھارت جانا پڑے۔ آپ ایسے ممالک' جگہوں اور مقامات کا انتخاب کر سکتے ہیں جہاں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آسانی کے ساتھ جا سکتے ہوں اور جو آپ کی دسترس میں ہوں۔

۲۔ اسلوب

اس کے بعد تاریخ نویسی کا مرحلہ آتا ہے۔ یوں تو تاریخ نویسی کے بھی اتنے ہی طریقے اور نمونہ جات ہیں جتنی تاریخ کی اقسام یا جتنے مورخ ہیں۔ اس لحاظ سے کوئی حتمی فارمولا' قاعدہ طریقہ یا نمونہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کو تاریخ نویسی کے لیے اپنے طریقہ کار اور نمونہ کا انتخاب خود کرنا ہو گا۔ اس کے لیے خود غور و فکر اور محنت کرنا ہو گی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ تاریخ نویسی کے لیے کوئی نمونہ موجود نہیں۔ یوں تو بیشمار نمونے موجود ہیں مثلاً گبن کا شاندار اسلوب' کارلائل کا خطیبانہ اسلوب' میکالے کا متوازن زیر و بم کا اسلوب' ماہن کا پر زور مردانہ اسلوب' پیرنگٹن کا روشن اسلوب' فلپ گوڈیلاؔ کا پر لطف اسلوب' ڈینیئس بروگن کا تلمیحی اسلوب یا پال ہیرزرڈ کا اسلوب موجود ہیں۔ آپ اپنے لیے کوئی بھی اسلوب اختیار کر سکتے ہیں۔ اسلوب تحریر شخصیت کا عکاس ہوتا ہے۔ آپ کا اسلوب بھی ایسا ہونا چاہئے جس میں آپ کی شخصیت جھلکتی نظر آئے۔ عمدہ طرز بیان غیردلچسپ موضوع کو بھی دلچسپ بنا دیتا ہے۔

تاہم اسلوب تاریخ نگاری کوئی منفرد' جداگانہ اور ساکن شئے نہیں ہے۔ آپ کا اسلوب موضوع کی مناسبت پر مبنی ہونا چاہئے۔ آپ یقیناً اپنے مواد کی ترتیب کے لیے رسمی قسم کا ایک ہی نمونہ پسند نہیں کریں گے اور نہ ہی ہر قسم کے موضوع کے لیے وہی رسمی نمونہ اختیار کریں گے۔ ظاہر ہے کہ تمام مردوں اور عورتوں کو تمام اوقات میں ایک ہی قسم کا لباس نہیں پہنایا جا سکتا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو اسلوب یونانی فتوحات کے لیے اختیار کیا گیا وہی اسلوب زوال روما کی تاریخ کے لیے نہیں اپنایا جا سکتا۔ پندرھویں صدی کے احیائے علوم کے اسلوب یقیناً قدیم یونانی و رومی اسلوب اور بیسویں صدی کے جدید اسلوب سے مختلف اور الگ تھلگ ہیں۔ ایک اسلوب ہر موضوع کے لیے بہتر نہیں ہوتا۔ ہر موضوع کے الگ الگ تقاضے ہوتے ہیں۔ اور ہر ایک کے لیے جداگانہ طریق ناگزیر ہے۔ روشن خیال مورخ و محقق یہ نکتہ بخوبی سمجھتے ہیں اور موضوع کی مناسبت سے اپنا اسلوب اسی طرح بدل لیتے ہیں جس طرح پیشہ ور درزی یا فوٹو گرافر بدل لیتے ہیں مثلاً ”ٹامس ہیٹو مورخ بھی تھا اور ناول نگار بھی۔ اس نے سٹیفن کرین کی سوانح اور ”دی ماڈ ٹریکیڈ“ پر مقالے کے لیے الگ الگ اسلوب تحریر اختیار کیے۔ مارلے نے ”والٹیئر“ اور ”گلیڈ سٹون“ کے مختلف تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسے اسلوب اختیار کیے جو مناسب تھے ہنری ایڈمز نے ”ہسٹری“ اور ایجوکیشن کے لیے الگ الگ انداز اختیار کیے۔ ایجوکیشن کے لیے اس کا انداز جداگانہ تھا جو زیادہ تلمیحی اور زیادہ پرلطف و خوش کن تھا جبکہ ہسٹری کے لیے اس کا انداز زیادہ پرجوش اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

متوازن ہے۔

۳۔ قوت متخیلہ

قوت متخیلہ اس قدر ترتیب یافتہ ہو کہ جس موضوع پر غور کیا جائے اس میں تسلسل اور تسلسل میں باقاعدگی قائم رہے۔ اگر کوئی شخص اپنے خیالات قلمبند کرنے کی کوشش کرے لیکن خیالات میں تسلسل اور باقاعدگی نہ ہو تو اس کی تحریر دیوانے کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ بر خلاف اس کے اگر کوئی تحریر مسلسل ہو' اس کے نتائج صحیح اور اس کا طریقہ استدلال درست ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس تحریر کو معقول تحریر نہ کہا جائے۔

تخیل ایک ایسی شئے ہے کہ جسے نشوونما نہیں دی جا سکتی۔ یہ تو وہ قوت ہے جو آپ کی فطرت میں ودیعت ہوتی ہے' یا نہیں ہوتی۔ اگر آپ میں یہ قوت موجود ہے تو آپ حقائق کے ایک اچھے جامع ایک عمدہ تجزیہ نگار اور ماضی کے حوادث و واقعات کی بھول بھلیوں میں سے گزرنے کے لیے ایک بہترین مورخ ہو سکتے ہیں لیکن ماضی کو تخلیق کرنے کی صلاحیت نمایاں نہیں کر سکتے۔ مورخ تخیل کی قوت کے ذریعے ازمنہ رفتہ کی عمارات اور دیگر تاریخی آثارات دیکھ کر تاریخی واقعات کو ایسے متحرک کر دیتا ہے کہ ان عمارات میں شہنشاہان وقت درباروں میں کاروبار حکومت سرانجام دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ محلات و شاہی باغات میں شہزادیاں و شہزادگان خراماں خراماں ناز بر انداز نظر آتے ہیں۔ تخیل کے ذریعے ماضی کو زندہ و متحرک پیش کرنے کا کوئی نعم البدل نہیں۔

یوں تو تخیل تاریخ کے لیے اچھی حیثیت نہیں رکھتا۔ ہم جیسے ہی تاریخ میں تخیل کا عنصر شامل کرتے ہیں تاریخ کے ریکارڈ کی دیانت معرض خطرہ میں آ جاتی ہے لیکن ہم تخیل کے عنصر کو تاریخ سے باہر کیونکر رکھ سکتے ہیں؟ تخیل کے بغیر تاریخ ہے کیا؟ تخیل ہر لمحہ ہماری مدد کرتا ہے اور یہی وہ عنصر ہے جو تاریخ کی برہنہ ہڈیوں کو زندگی کا لباس پہناتا ہے۔ یہی ہے جو تاریخ کے بے کیف اور غیر شخصی مواد کے بیشتر حصے میں روشنی اور زندگی کی حرارت پیدا کرتا ہے۔ اس کے ذریعے اعداد کا نامکمل حصہ بھی رنگ اور زندگی سے معمور ہو جاتا ہے۔ تقسیم ہندوستان کا تخیل پیدا کیجئے ہندوستان کے مشرقی حصوں سے مغربی حصوں کی طرف یعنی پاکستان کی طرف بڑھتی ہوئی بیل گاڑیاں جن پر انسانوں کے قافلے نئے علاقوں کی طرف رواں ہیں۔ مرد و زن اور بچے کسی نہ کسی طرف آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ ریلیں ہر طرف جاری ہیں۔ مگر نئے اجالوں کے متلاشی لٹے ہوئے قافلے غموں کے بادل برسات بھری پلکوں پر اٹھائے' عزیز و اقارب کی لاشوں پر سے گزرتے ہوئے انجانے اندیشوں' خطروں اور بے یقینیوں سے دو چار ہیں۔ تقدیر کے ستائے ہوئے ان لوگوں پر روح تخیل بھی ماتم کرتی دکھائی دیتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تخیل کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے جیسے موسیقی کے لیے کان۔ یعنی اگر آپ کو موسیقی کا ذوق و شوق ہے تو بہت اچھا ہے۔ اگر نہیں تو اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن تخیل کو بھی موسیقی یا مصوری کے ذوق و شوق کی طرح نشوونما دی جا سکتی ہے۔ تاریخی تخیل کو کیونکر نشوونما دی جائے گی؟ اسے ادب اور فنون لطیفہ کے ذریعے سے نشوونما دی جا سکتی ہے۔ شیکسپئر نے اپنے شاندار تخیل سے کام لے کر تاریخ روما میں بہترین رنگ بھر دیا۔ ونسٹن چرچل نے کہا تھا کہ میں نے انگلستان کی تاریخ شیکسپئر کے ڈراموں سے سیکھی۔ تخیل کو نشوونما دینے کا ذریعہ فنون لطیفہ کے علاوہ عمارات بھی ہیں۔ کوئی بھی شخص لندن کے قومی نگار خانے میں سے گزرے تو ان مرد و زن کے منظر سے اس کے دل میں ایک خاص غیر محسوس پس منظر پیدا ہو گا جو انگلستان کو انگلستان بنانے کے ذمہ دار تھے۔ ماضی کی عمارات' قلعوں اور قصروں میں پہنچ کر چشم تصور سے انسان پر مسرت انگیز کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جو بیان سے باہر ہے۔

۴۔ وسیع مطالعہ

دماغ میں نئے خیالات اور واقعات و خیالات میں تسلسل پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مطالعہ تاریخ کو زیادہ سے زیادہ وسعت دی جائے۔ لیکن ہمارے نام نہاد مورخ عام طور پر مطالعہ سے جی چراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف و مضامین واقفیت عامہ میں نہ تو اضافہ کرتے ہیں اور نہ ہی واقعات کی گتھیاں سلجھاتے ہیں۔ لہٰذا ان کے محدود مطالعہ کی وجہ سے ان کے خیالات پستی اور تاثرات عامیانہ صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مورخ کے لیے بالغ نظر اور نکتہ رس ہونا نہایت ضروری ہے اور یہ خصوصیات محض وسیع مطالعہ ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ تصانیف و مضامین وہی اچھے کہلائے جا سکتے ہیں جنہیں پڑھ کر کوئی مفید مطلب اور نئی بات حاصل ہو۔ وہ تصانیف و مضامین جو وسیع مطالعہ اور گہری تحقیقات کا نتیجہ ہوتے ہیں ان کی دلچسپی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔

۵۔ محنت و استقلال

تاریخ نگاری کے اصول تحقیق میں محنت و استقلال کے تقاضے خاصے سخت اور بنیادی ہیں۔ محنت کا یہ مطلب نہیں کہ "تاریخ قدیم روما" کے مورخ تھیوڈور مومسن[16] کی طرح ایسے مصروف ہو جائیں کہ کسی دیگر امر کا احساس نہ رہے۔ مومسن تاریخ لکھنے پر روزانہ اٹھارہ گھنٹے صرف کرتا تھا اور اس نے شکایت کی کہ شادی کے دن اسے صرف بارہ گھنٹے کام کرنے کا موقع ملا۔ یہی حال جرمن مورخ لیوپولڈ فان رانکے کا ہے جو اسی سال کی عمر تک بھی برابر تصنیف و تالیف میں مصروف رہا۔ بلکہ پچاس سال کی عمر میں "ہسٹری آف دی ورلڈ" لکھنے کا کام شروع کیا اور زندگی کے آئندہ پانچ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سالوں میں اس کی سات جلدیں مرتب کر دیں۔ عظیم مورخ علامہ جریر الطبری تصنیف و تالیف میں اس قدر مصروف رہتے تھے کہ چالیس برس تک ہر روز تقریباً چالیس صفحات لکھتے رہے۔

دوسرے بہت سے علوم و فنون کی طرح تاریخ نگاری میں بھی صبر' انہماک اور ان تھک محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ محنت کا زیادہ حصہ ذہنی اور جسمانی طور پر تھکا دینے والا ہوتا ہے لہٰذا آپ کو زیادہ دیر تک کام کرنے کا عادی بن جانا چاہیے۔ ایسے مواد' ماخذ اور ریکارڈ سے بھی واسطہ پڑتا ہے کہ جو آخر میں بالکل بے سود ثابت ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایسے ڈھیروں اخباروں اور رسالوں کا مطالعہ بھی کرنا پڑتا ہے کہ جن سے معمولی سی معلومات حاصل ہوتی ہیں یا بالکل نہیں ہوتیں۔ کبھی کبھی تو ایسے بد خط مسودوں سے واسطہ پڑتا ہے کہ جن کا پڑھنا مشکل ہوتا ہے لیکن امید ہوتی ہے کہ شائد کوئی مطلوبہ یا مفید معلومات مل جائیں۔ یا کوئی ایسا نکتہ میسر آ جائے کہ جس سے درپیش مسئلہ حل ہو جائے۔ کبھی تو مورخ کو رائل کمشنوں کی روئدادوں' عدالتوں کے فیصلوں' امریکی کانگریس کی رپورٹوں' برطانوی ہاؤس آف کامن کی کارروائیوں اور ملکی قانون ساز اسمبلیوں کے مباحث سے گزرنا پڑتا ہے کہ جن کی حیثیت الفاظ کے گھنے جنگلوں کی سی ہوتی ہے۔ اس لیے تاریخ نگاری اور تحقیق کا کام کوئی آسان امر نہیں ہے۔ اگر آپ کوئی نئی تازہ' نادیدہ اور قیمتی و نایاب معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو ضرور محنت و استقلال کی عادت ڈالنا پڑے گی۔ اگر آپ تاریخ نگاری کے لیے محنت و استقلال پر تیار نہیں تو بہتر یہ ہو گا کہ آپ تاریخ کو چھوڑ کر کوئی زیادہ آسان پیشہ اختیار کر لیں۔

۶- فنِ تحریر

اصول تحقیق میں یہ ضروری اصول ہے کہ تحریر صاف اور واضح ہونی چاہیے۔ تحریر کے لیے خاص تربیت مفید ہے اور ایسی تربیت ہر کام کے لیے مفید ہوتی ہے مثلاً" کھانا پکانا' سلائی کڑھائی کرنا' تصویریں کھینچنا' اور موٹر چلانا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن تاریخ نویسی کے لیے یہ تربیت لازمی نہیں مگر ضروری خیال کی جاتی ہے۔

انشا پردازی ایک لطیف فن ہے اور یہ اُن لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو اپنے خیالات اور تاثرات کو نہایت اچھے اور موزوں الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش مسلسل جاری رکھتے ہیں۔ اگر آپ کو کسی باکمال مصنف کا قلمی مسودہ دیکھنے کا اتفاق ہو تو آسانی سے اندازہ ہو سکے گا کہ وہ ہر لفظ کی نشست' آواز' اثر اور موزونیت پر کس قدر عرق ریزی کرتا ہے۔ کسی لفظ کو آگے پیچھے کر کے فقرے کا زور بڑھاتا ہے۔ کہیں کانٹ چھانٹ کر کے فقرے پر فقرہ اور لفظ پہ لفظ چڑھاتا اور اپنے طرز بیان کی موزونیت اور دل نشینی میں اضافہ کرتا ہے۔ غرض ایک ایک لفظ پر پسینہ بہاتا اور آنکھوں کا تیل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ٹپکاتا ہے۔ تب کہیں جا کر ایسا مضمون تیار ہوتا ہے جو قبول عام کی سند پاتا ہے۔ ہمارے دور کے عام مورخ، مصنّفین اور انشا پرداز اس قسم کی عرق ریزی سے گریز کرتے ہیں اور جو کچھ اپنے قلم سے لکھ دیں اسے پتھر کی لکیر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب نہ تو پہلے جیسے باکمال مورخ، مصنف اور انشا پرداز پیدا ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی تحریروں میں پرانے مورخین، مصنّفین اور انشا پردازوں کی تحریروں کا سا زور و خوبی ہے۔

تاریخ کے ہر طالب علم کو لکھنے کی کچھ نہ کچھ مشق ضروری کرنی چاہئے۔ بلند پایہ مورخین اور مصنّفین کی عمدہ تصانیف، ان کا دلنشیں انداز بیان اور دل پذیر طرز تحریر کو اپنے دماغ میں محفوظ رکھنے سے بھی خاطر خواہ فائدہ ہو سکتا ہے۔ اس سے خیالات کی ترتیب اور عبارت کا زور نمونہ بہتر ہو سکتا ہے۔ اگر اس قسم کی مشق کچھ عرصے تک جاری رہے تو اچھا راہنما مل جائے گا جس سے تاریخ نگاری میں بہت آسانی آ سکتی ہے۔

۷- زبان

جس طرح مختلف قابلیت کے لوگوں سے بات چیت کرتے وقت ان کی قابلیت اور علمیت کو مد نظر رکھ کر گفتگو کی جاتی ہے اسی طرح تصنیف و تالیف اور تاریخ نگاری کا کمال بھی یہی ہے کہ ہر موضوع کی اہمیت کے مطابق زبان استعمال کی جائے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ ہماری تصنیف و مضمون کس قابلیت کے لوگوں سے تعلق رکھتا ہے۔ بعض اوقات بیان و عبارت کو شاندار بنانے کے لیے پر شکوہ الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے اور کبھی نہایت نرم اور نازک الفاظ استعمال کر کے مقصد حاصل کیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر ہر موضوع اور ہر بحث کے لیے ایک جیسی زبان سے کام لیا جائے تو خاطر خواہ اثر پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے محقق اور مصنف پر لازم ہے کہ اپنے موضوع کی اہمیت کے مطابق الفاظ صرف کرے۔ اس سے نہ صرف تصنیف و مضمون کی دلچسپی اور شان بڑھتی ہے بلکہ محقق اور مصنف کے زور قلم کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ جب مصنف زبان اور زور بیان کا باقاعدہ خیال رکھتا ہے تو اس کی تحقیق کی شان دوبالا ہو جاتی ہے۔

جس زبان میں مضمون لکھنا ہو اس زبان میں سوچنے کی عادت ہو۔ اگر آپ کی معلومات اور زور بیان زبان کے متعلق پختہ نہیں تو ایسے موضوعات کا انتخاب نظر انداز کر دیجئے جن پر غور و خوض کے لیے کم از کم نصف درجن غیر ملکی زبانوں کا علم ضروری ہو۔ جس زبان کی تحریر آپ کے زیر مطالعہ ہو اس کا پورا علم ہونا ضروری ہے۔ اگر آپ کو زبان پر پورا عبور حاصل نہیں تو آپ تحریر کے غلط اور ادھورے مطالب و توضیحات پیش کریں گے۔ حقائق کا خون کر ڈالیں گے اور آپ کا یہ جرم ناقابل معافی ہے۔ محقق و مورخ کو زیر تحقیق دستاویزات کی زبان پر کامل عبور حاصل ہونا چاہئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگر آپ کی نظر کمزور ہے تو ایسا موضوع نہ منتخب کیجئے کہ جس کے مطالعہ کے لیے پندرہویں یا سولھویں صدی کے مخطوطات کا مطالعہ کرنا پڑے۔ اس طرح ایسے لوگوں کی تحریروں یا لکھی ہوئی دستاویزوں سے احتراز کیجئے کہ جن کے خط بڑے برے تھے اور انہیں آسانی کے ساتھ پڑھا نہیں جا سکتا۔

محققین و مصنفین کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر عربی' فارسی' انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے مشکل الفاظ اپنی تحریروں میں پیوست کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس تحریر سے ان کی قابلیت ٹپکتی ہے۔ یاد رکھیں غیر مانوس الفاظ چاہے وہ سنسکرت' ہندی' عربی' فارسی' انگریزی اور فرانسیسی کے ہوں تصنیف و مضمون کی علمی حیثیت کو گہنا دیتے ہیں۔ پڑھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی سخت یا ناگوار چیز بار بار کام و دہن اور دل و دماغ میں اٹکتی ہے۔ اور تاریخی مطالعہ کا لطف بدمزہ کر دیتی ہے۔ محقق' مورخ' مصنف اور ادیب کی تعریف اور قابلیت یہ ہے کہ وہ ادق سے ادق مضمون کو بھی ایسی صاف و عام زبان میں لکھے کہ جس سے پڑھنے والا یہ سمجھے کہ جو کچھ وہ پڑھ رہا ہے وہ اس کے اپنے دل کی آواز ہے۔ گویا روانی کا یہ عالم ہو کہ کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہ آئے تا کہ طبیعت بدمزہ ہو کر دلچسپی کا سلسلہ منقطع نہ ہونے پائے۔ اس کے علاوہ مصنف کو صحیح اور سلیس مفرد و مرکب فقرے بنانے میں بھی کافی دستگاہ ہونی چاہئے۔ پیچیدہ اور غیر مانوس فقرے عام طور پر طبیعت پر گراں گزرتے ہیں اور عبارت کے لطف و روانی کو خراب کر دیتے ہیں۔ اس کمال کے حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مصنف اپنے مطالعہ کو وسعت دے اور الفاظ و محاورات کے ذخیرے میں اضافہ کرنے کی کوشش ہمیشہ جاری رکھے۔

۸- پیراگراف

ہمیشہ خیال رہے کہ عبارت کو مختلف پیراگرافوں میں تقسیم کر کے لکھنا چاہئے۔ ہر بحث اور خیال کو الگ الگ پیراگراف میں لکھا جائے تاکہ زیر بحث موضوع کے مختلف پہلو ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ رہیں۔ اگر یہ احتیاط نہ برتی جائے تو پورا مضمون ایک مسلسل تحریر بن جاتا ہے جس کو دیکھتے ہی پڑھنے والا اسا جاتا ہے۔ پیراگراف مرتب کرنے سے ایک طرف مضمون کے مختلف پہلو نمایاں رہتے ہیں اور دوسری جانب ظاہری جاذبیت بڑھ جاتی ہے۔ پیراگرافوں کا تسلسل خیالات کو دھکیلتا مضمون نگار کو اصل مقصد کی طرف لے جاتا ہے۔ اس ترتیب سے نہ صرف موضوع کی خشکی اور بدمزگی دور ہو جاتی ہے بلکہ پڑھنے والا خیال کی رو میں بغیر اکتائے بہتا چلا جاتا ہے اور آخر کار اس منزل پر پہنچ کر دم لیتا ہے جہاں مصنف اور مضمون نگار اسے پہنچانا چاہتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۹- عنوان

اگر ہر پیراگراف کا کوئی دلچسپ اور جاذب عنوان بھی قائم کر دیا جائے تو مضمون کی دلچسپی میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے- عنوانات قائم کرنے کا طریقہ' خشک اور طویل مضامین میں بہت دلچسپی پیدا کر سکتا ہے- عنوان قائم کرنا بڑا مشکل کام ہے- اس کے لیے خاص تجربے اور ذہانت کی ضرورت ہے- ویسے عنوان تو ہر شخص قائم کر سکتا ہے- لیکن ان کی خوبی یہ ہونی چاہیے کہ عنوان پر نظر پڑتے ہی ان کی بحث کو پڑھنے کا شوق دل میں پیدا ہو اور انسان ان سطور کو پڑھنے پر مجبور ہو جائے-

امتحانی مضامین میں عنوان قائم کرنے سے بہت فائدے پہنچ سکتے ہیں مثلاً" ممتحن کو عنوان دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان عنوانات کے تحت کس قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اور ہونہار مضمون نگار کے خیالات کس قدر وسیع ہیں- جاذب اور دلچسپ عنوانات کسی مضمون کے متعلق عمدہ رائے قائم کرنے میں مدد دیتے ہیں اور زیادہ مارکس دینے کی پر زور سفارش کرتے ہیں-

۱۰- ترتیب

منتشر مواد کو تسلسل کے ساتھ ترتیب دینا بھی تو ایک قسم کی دماغی ورزش ہے- جو شخص یہ ریاضت کرتا ہے وہ ضرور تاریخ نگار بن سکتا ہے-

آپ کو وقت اور قوت موضوع کے گرد و پیش کے متعلق مطالعے میں ضائع نہ کرنی چاہیے- گرد و پیش یا پس منظر کا مطالعہ عموماً" موضوع پر نہ پہنچنے کا ایک عذر ہوتا ہے- یہ خوشگوار بھی ہو سکتا ہے' اسے اچھا بھی سمجھا جا سکتا ہے اور اس کا ذخیرہ لامتناہی ہے- ایک کیمیا دان کبھی مطلوبہ شئے کے گرد و پیش سے نہیں الجھتا- ایک قانون دان کو جب کسی خاص مقدمے سے بحث ہو تو قانون کے گرد و پیش میں نہیں گھومتا- آپ کو چاہیے کہ سیدھے اپنے موضوع میں ڈوب جائیں- آپ جتنا اس کا مطالعہ کرتے جائیں گے- آپ کی سمجھ اتنی ہی گہرائی میں اترتی جائے گی اور آپ اس مسئلہ کے حل کے اتنے ہی قریب آتے جائیں گے- موضوع کے گرد و پیش سے بہتر شناسائی ہوتی جائے گی اور ہر شئے رفتہ رفتہ اپنے اصلی مقام پر آتی جائے گی- حوادث و واقعات کو براہ راست سمجھنے کا یہی طبعی طریقہ ہے-

دوسرا عملی طریقہ یہ ہے کہ اپنے مضمون یا مقالے کے لیے بنیادی معلومات فوراً" اکٹھی کرنا شروع کر دیں- ان کا کوئی نہ کوئی چارٹ' خاکہ یا نقشہ ترتیب دیتے جائیں- فرض کریں کہ آپ کو اپنے مضمون کی اہمیت یا حصے کی ترتیب کے متعلق کچھ زیادہ علم نہیں- جب آپ موضوع پر کام کرنا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شروع کر دیں گے اور معلومات اکٹھی کرنا شروع کر دیں گے تو ان سوالوں کا جواب آپ کو خود بخود مل جائے گا۔ یہ نہ سمجھیں کہ اس موضوع اور مضمون کے لیے ہر چیز پڑھنی ضروری ہے یا ہر چیز کے نوٹ لینے چاہیں۔ یا تمام ماخذوں پر نظر رکھنی چاہیے یا تحریر شروع کرنے سے پہلے ہر دستاویز کے ہر صفحے پر نظر ڈالنی چاہیے۔ یہ غیر ضروری سوالات ہیں۔ آپ جتنی جلدی تحریر شروع کر سکتے ہیں اتنا ہی اچھا ہے۔ جب آپ نوٹ لینا شروع کر دیں گے تو آپ پر دوران تحریر یہ واضح ہوتا جائے گا کہ آپ کی معلومات میں کہاں کہاں خلل ہے۔ انہیں ساتھ ہی ساتھ پر کرتے جائیں۔

تیسرے طریقہ کا تعلق ذخیرہ معلومات کی ترتیب سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے موضوع اور مضمون کے متعلق مطالعہ کے ساتھ ہی ساتھ نوٹ لیتے جائیں۔ اس طریقہ سے آہستہ آہستہ اصل موضوع کے متعلق آپ کا نقطہ نظر اور تحریر ایک خوشگوار بدل بن جائے گی۔ نوٹ لیتے وقت اگر آپ نے احتیاط سے کام نہ لیا اور ہر چیز کے نوٹ لیتے گئے تو نوٹ (Note) کے ان ڈھیروں کی حیثیت افیون کی سی ہو جائے گی۔ کچھ عرصہ پہلے نوٹ لیتے رہنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ دستاویزات کے ان ڈھیروں سے تحریرات کے بڑے بڑے ذخیرے نقل کر لیے جائیں کہ کسی وقت کام میں آئیں گے یا کسی شخص کو یہ کام سونپ دیا جائے کہ وہ محنت و مشقت سے تحریرات کے نوٹ اکٹھے کر لے۔ مگر اب جدید سائنسی دور میں فوٹو کاپی مشینوں کی ایجاد سے یہ صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔ نوٹ لینے کا طریقہ اب فنی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اب تحقیق کرنے والا مصنف اپنے پورے ذخیرے کے فوٹو یا مائیکرو فلمیں لے سکتا ہے۔ زمانہ ماضی سے یہ طریقہ بدرجہا بہتر اور غلطی سے مبرا ہے۔ اب پہلے کی بہ نسبت سو فیصد معلومات بڑی صحت و درستی سے نقل کرا سکتا ہے۔ وہ ان معلومات کو کمپیوٹر میں داخل (Feed) کر سکتا ہے۔ ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کر سکتا ہے۔ غرضیکہ اپنے وقت کو بچا سکتا ہے۔ اب ہر جگہ جا کر ہر چیز کو دیکھنا ضروری نہیں رہا۔ آپ اپنی مطلوبہ دستاویزات اور معلومات کی فوٹو کاپی یا مائیکرو فلم منگوا کر اپنی تحقیق کو پوری تندہی کے ساتھ جاری رکھ سکتے ہیں۔ اہل قلم کی یہ کس قدر خوش نصیبی ہے کہ اب وہ پہلی نسلوں کے مقابلہ میں دگنا لکھ سکتے ہیں یا ان سے ایسی امید رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن کس قدر عجیب اور افسوس ناک بات ہے کہ وہ گزرے ہوئے لوگوں کے مقابلہ میں نصف بھی نہیں لکھ سکے۔

عہد جدید میں تحقیق کے لیے میکانکی ٹیکنیک کے ہم بے حد ممنون ہیں کہ مشینیں ہمارے لیے نقل و کتابت کی خدمت انجام دیتی ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھیں کہ مشینیں آپ کے لیے سوچ نہیں سکتیں جو کچھ آپ کو کرنا ہے وہ مشینیں نہیں کر سکتیں۔ وین وائک بروکس امریکہ کی ادبی تاریخوں کا ایک عظیم مصنف ہے۔ اس نے سب کچھ اپنے ہاتھ سے تحریر و نقل کیا۔ وہ لکھنے والوں کو ملازم رکھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سکتا تھا یا نقل کرنے والی مشین خرید سکتا تھا لیکن اس نے یہی بہتر خیال کیا کہ اپنا کام خود کرے اور وہ جانتا تھا تحریر و نقل کے دوران ہر صاحب علم کو مزید کچھ جاننے کا موقع ملتا ہے۔ اگر آپ کوئی چیز اپنے ہاتھ سے تحریر یا نقل کریں گے تو اسے یاد رکھیں گے۔ بروکس اس اصول سے بخوبی آگاہ تھا کہ نقل و تحریر کے دوران جو افکار و خیالات پیدا ہوتے ہیں وہ اصل شئے سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ کوئی بھی مشین نقل کے دوران آپ کے لیے یہ افکار و تصورات مہیا نہیں کر سکتی اور اس روح کا بدل کچھ نہیں ہو سکتا جو اپنے موضوع کے متعلق مواد سے براہ راست تازہ اور غیر پیچیدہ ربط و تعلق کی بنا پر پیدا ہو سکتی ہے۔

۱۱- ماخذوں کی تقسیم

ماخذوں کی تقسیم سے مراد یہ ہے کہ پیش نظر موضوع کے مواد کو کس طرح جمع یا استعمال کر کے ایک باقاعدہ تصنیف کی صورت میں ڈھالا جائے۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل چند قاعدے اور اصول بیان کئے گئے ہیں جنھیں اپنا کر مطلوبہ مواد سے اصل تصنیف حاصل کی جا سکتی ہے:

پہلا طریقہ تو نقل کا ہے جس میں مواد کو بلاواسطہ نقل کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ چند مشکلات کا باعث بنتا ہے کیونکہ مواد مختلف ٹکڑوں، حصوں، کتابوں، رسالوں، اخبارات اور دستاویزات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر کسی موضوع کے مطابق تمام مطلوبہ مواد کا ڈھیر لگا دیا جائے تو یہ وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے کیونکہ پہلے تو آپ نے دستاویزات کے مختلف حصوں اور ٹکڑوں کو نقل کرنے اور اکٹھا کرنے پر وقت صرف کیا اور بعد میں ان حصوں اور ٹکڑوں سے خاص موضوع پر لکھنا شروع کیا تو یہ طریقہ تصنیف کے کام کو طویل و دشوار بنا دیتا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہی سے ایک باقاعدہ منصوبے کے مطابق خاص موضوع پر مواد کو کسی نوٹ بک میں مختلف عنوانات کے تحت جمع کیا جائے۔ اس سلسلہ میں نوٹ بک کو عنوانات کے تحت مختلف حصوں میں تقسیم کرنا ہو گا۔ مواد کو اکٹھا کرنے کا یہ قدیمی اور رسمی طریقہ خاصا منظم و باقاعدہ اور مفید ہے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ دستاویزات کا مطالعہ کرتے ہوئے مواد کو ذہن نشین کر لیا جائے اور اپنے ذہن کی یادداشت پر بھروسہ کیا جائے۔ مگر یہ طریقہ زیادہ کامیاب و منظم نہیں کیونکہ سبھی لوگ ایک جیسے ذہین و فطین نہیں ہوتے اور نہ ہی تمام افراد کی یادداشتیں برابر ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی یادداشتوں میں کمی و بیشی اور اتار چڑھاؤ رہتا ہے اور پھر ضروری نہیں کہ سارا مواد آپ کو من و عن ازبر ہو جائے۔ یادداشتوں پر مشتمل مواد عموماً ناقص، نامکمل اور تحریف کا شکار ہوتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ مواد کو مختلف کارڈوں اور کاغذوں کے ٹکڑوں پر اکٹھا کیا جائے۔ کارڈوں پر مختلف عنوانات کے تحت مواد اکٹھا کرنے کا طریقہ زیادہ مناسب اور بہتر ہے۔ کارڈوں کو مختلف حروف تہجی، عنوانات یا موضوعات کے مطابق ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سے کسی ایک کارڈ کو باقاعدہ ترتیب سے علیحدہ کر کے دوسری جگہ پر رکھنا اور استعمال کرنا نہایت آسان ہے۔ چنانچہ جب ایک کارڈ کو دوسری جگہ کسی اور مناسب موضوع کے لیے استعمال کرنے کی ضرورت ہو تو یہ طریقہ بہت آسان و مفید ہے۔ اس طریقہ میں کارڈ کے گم ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ بالفرض محال اگر کوئی ایک کارڈ گم ہو بھی جائے تو زیادہ نقصان نہیں ہوتا۔ دوسرے کارڈوں کی مدد سے مطلوبہ معلومات کے خلاء کو عقل سلیم کے ساتھ پر کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ کارڈوں کو ایک باقاعدہ ترتیب کے ساتھ کسی مناسب بکس یا ڈبہ میں محفوظ جگہ پر رکھا جائے تاکہ ان کے گم ہو جانے کا احتمال کم از کم ہو۔

ماخذ کر جمع کرنے کا پانچواں طریقہ یہ ہے کہ انہیں کمپیوٹر کی یادداشت میں جمع (Feed) کر دیا جائے۔ بعد میں موضوعات کی مناسبت سے مواد کو تقسیم کر کے تصنیف کی صورت میں ڈھالا جائے۔ آج کل سب سے زیادہ مقبول یہی طریقہ ہے۔

چھٹا طریقہ یہ ہے کہ آپ اسے ٹیپ ریکارڈر پر ریکارڈ کرتے جائیں اور بوقت ضرورت مطلوبہ ٹیپ سے مواد کو موضوعات کی مناسبت سے نقل و مرتب کرتے جائیں اور اپنی مطلوبہ تصنیف کو باقاعدہ مرتب کر لیں۔ یہ طریقہ بالعموم انٹرویوز کے سلسلہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ کو زیادہ طور پر صحافی حضرات اور ابلاغیات کے ادارے اپناتے ہیں۔

ساتواں طریقہ مائیکرو فلم اور مائیکرو فش کے استعمال کا ہے۔ یعنی آپ مطلوبہ مواد کی مائیکرو فلمیں یا مائیکرو فش تیار کروالیں یا حاصل کر لیں۔ ان کا مائیکرو فلم ریڈر یا مائیکرو فش ریڈر پر مطالعہ کریں اور مطلوبہ موضوعات کے مطابق اپنی تصنیف کو ترتیب دیں۔

آٹھواں طریقہ جغرافیائی طریقہ ہے۔ اس طریقہ کے مطابق مواد کو ان کی تاریخ (Dates) اور مقام کے مطابق اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔ اگر دستاویزات میں تاریخیں (Dates) درج نہ کی گئی ہوں تو انہیں جغرافیائی مناسبت یعنی جگہوں یا مقامات کی مناسبت سے منظم و مرتب کیا جا سکتا ہے۔

تحقیق کے ان طریقوں میں سے کوئی سا طریقہ بھی اپنی پسند اور موضوع کی مناسبت کے مطابق اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہر طریقہ کار کا ایک ہی حاصل ہے یعنی صحیح تصنیف کا حصول۔

۱۲- نکتہ چینی میں احتیاط

ہر محقق و مصنف کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ کسی حال میں بھی بازاری اور سوقیانہ الفاظ و

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محاورات استعمال نہ کرے، تاکہ اس کی تصنیف و مضمون میں ابتذال پیدا نہ ہونے پائے۔ نکتہ چینی کرتے ہوئے بعض مصنف بڑی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس قسم کی عادات تاریخ نویسی کے سراسر خلاف ہیں۔ ان سے محض اخلاقی معیار ہی پست نہیں ہوتا بلکہ تصنیف و مضمون کی تنقیدی حیثیت بھی متعصبانہ ہو جاتی ہے۔ تنقیدی مضامین لکھتے وقت مصنفین کو اپنی طبیعت اور قلم پر قادر ہونا چاہئے تاکہ پڑھنے والے کے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ یہ مضمون کسی خاص جذبے کے تحت لکھا گیا ہے۔ ایسے مضامین میں زبان نہایت شائستہ، نرم اور ملائم ہونی چاہئے۔ تاکہ نقاد پر جانب داری کا الزام عائد نہ ہو۔ اس سلسلے میں پاک زبان، پاکیزہ خیالات، عقل سلیم، اعتدال، توازن، معاملہ فہمی، ذہانت، کشادہ دلی، رواداری، احساسات، تناسب اور خوش طبعی کے عناصر عمدہ تاریخ نویسی کے لیے لازمی سامان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان عناصر کے بغیر علم و فن کے زیادہ تر کارنامے بے اثر و رائیگاں چلے جاتے ہیں۔ مصنف اپنی تحریریں اعتدال کے ضابطوں اور توازن کی صفات کے ذریعہ حوادث و واقعات کی وجوہات اور ثبوتوں کو غیر محسوس پس منظر میں مقصدیت کے ساتھ بیان کر سکتا ہے۔ مثلاً" لنکن کے قتل کی سازش میں اس کے وزیر جنگ سٹانٹن[18] کا نام عقل سلیم کے ساتھ مناسب نکتہ چینی کے ساتھ لے سکتے ہیں۔ ورنہ سٹانٹن پر شدید نکتہ چینی ہمارے بیانات کو متعصبانہ بنا دے گی اور سٹانٹن معصوم، بے گناہ دکھائی دینے لگے گا اور بلا وجہ ہماری ہمدردیاں اپنے ساتھ وابستہ کر لے گا۔

۱۳۔ تمہید و اختتام

اس ضروری بات سے ہر مورخ و مصنف واقف ہے کہ کسی تصنیف و مضمون کے آغاز اور اختتام میں بہت فرق ہوتا ہے۔ یعنی جو پیراگراف کسی مضمون کے شروع میں تمہید کا کام دے سکتا ہے آخری اور اختتامی پیراگراف کا مطلب ادا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح خاتمے کا پیراگراف بھی تمہیدی پیراگراف کا بدل نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ عام طور پر تمہید میں تصنیف یا مضمون کی عمومی کیفیت سے بحث کی جاتی ہے۔ درمیان کے حصوں میں اس کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں اور اسی طرح بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اختتام پر کبھی تصنیف و مضمون کو کسی خاص انجام کی طرف ڈھال کر نصیحت آمیز پرزور فقروں پر ختم کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات آخری پیراگراف میں نہایت مختصر جامع اور زور دار الفاظ میں مضمون کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے مضمون تمام کرتے ہیں۔ آج کل یہی طریقہ مطبوع اور مرغوب ہے کیونکہ اس طرح مضمون و تصنیف کا سارا خاکہ دوبارہ ذہن میں پھر جاتا ہے۔ اور اس کا خاطر خواہ اثر باقی رہتا ہے۔

تجربہ [illegible] تصنیف و مضمون کو ختم کرنے میں اتنی دقتیں پیدا نہیں ہوتیں جتنی کہ تصنیف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

و مضمون کی تمہید میں پیش آتی ہیں۔ بعض اوقات کئی کئی گھنٹے اس فکر میں ضائع ہو جاتے ہیں کہ تصنیف و مضمون کو کس طرح شروع کیا جائے۔ یہ مشکل عام طور پر ایسے مورخین و مصنفین کو زیادہ پریشان کرتی ہے جن کے پاس خیالات اور ضروری مواد کا ذخیرہ کم ہوتا ہے اور جن کا مطالعہ محدود ہوتا ہے۔ اس مشکل کا بہترین حل یہ ہے کہ زیر بحث موضوع کے متعلق کچھ نوٹ لکھ لیے جائیں اور کچھ مختصر حوالہ جات لکھ کر سامنے رکھ لیے جائیں' پھر ان کو ایک خاص ترتیب سے پھیلا کر اپنے الفاظ میں ان پر بلا تکلف بحث کی جائے اور آخر میں ان سب کو سمیٹتے ہوئے مضمون کو ختم کر دیا جائے۔

بعض نو آموز مضمون نگار اپنے موضوع کی تمہید اس قدر لمبی چوڑی لکھ جاتے ہیں کہ اصل مضمون کا اس سے کوئی معقول تعلق باقی نہیں رہتا۔ کہنہ مشق مورخ مصنف اور مضمون نگار نہایت شاندار انداز سے اپنی تصنیف اور مضمون کو اٹھاتے ہیں اور اختتام پر اپنی طبیعت اور قابلیت کا پورا زور صرف کرتے ہیں۔

آج کل مصنف' مورخ اور مضمون نگار مضمون کو بلا تکلف شروع کر دیتے ہیں۔ گویا تمہید پر زیادہ وقت ضائع نہیں کرتے۔ اس طریقے پر عمل کرنے سے وقت ضرور بچتا ہے۔ لیکن تصنیف و مضمون میں وہ لطف اور زور پیدا نہیں ہوتا جو عمدہ اور پر زور تمہید سے مخصوص ہے۔ میرا خیال ہے کہ تاریخ نگاری اور مضمون نگاری میں تمہید کو بہت اہمیت دینی چاہیے۔ اگر اس اہم فرض پر تھوڑا سا وقت زیادہ خرچ ہو جائے تو اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ عام طور پر اچھی تمہید تصنیف و مضمون کی اہمیت کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ اور اس کے اثر سے پڑھنے والا کسی نہ کسی حد تک مرعوب ہو جاتا ہے۔ جو لوگ انسانی جذبات اور دماغی کیفیات سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ پہلا اور آخری تاثر زندگی کے ہر شعبے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بعینہ یہی کیفیت تصانیف و مضامین کی ہوتی ہے۔ ان کی ابتداء و انتہا اچھی ہو تو پڑھنے والے کا دل ان سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔

۱۴۔ نظر ثانی

تصنیف اور مضمون لکھنے کے بعد اسے دوبارہ دیکھنا بے حد ضروری ہے۔ میرے نزدیک نظر ثانی مصنف کا ایمان ہونا چاہیے۔ نظر ثانی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ تصنیف یا مضمون میں اگر کوئی غلطی یا سقم باقی رہ جائے تو وہ نظر ثانی میں درست ہو جاتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ خیالات کی رو میں بعض غیر ضروری باتیں اور واقعات درمیان میں آ جاتے ہیں یا کوئی ضروری نکتہ اور واقعہ چھوٹ جاتا ہے۔ بعض اوقات کوئی خاص لفظ یا فقرہ یا زبان پر چڑھا ہوا مخصوص محاورہ یا جملہ بار بار استعمال ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بعض واقعات بھی مکرر آ جاتے ہیں۔ نظر ثانی اس قسم کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دں کی تلافی کرنے کا موقعہ بہم پہنچاتی ہے۔ ایسے مضامین و تصانیف جو نظر ثانی سے محروم رہ یں ان میں اس قسم کی بہت سی خرابیاں باقی رہ جاتی ہیں اور وہ تاریخ نویس، مضمون نگار، اور مصنف کی تصنیف، مضمون کی قدر و اہمیت کو نقصان پہنچاتی ہیں۔

نظر ثانی سے تصنیف و مضمون کی تصحیح ہوتی ہے۔ موضوع کے متعلق بہت سی نئی نئی باتیں اور واقعات کے اچھوتے پہلو سامنے آتے ہیں۔ اگر مصنف دوبارہ لکھنے کی زحمت گوارا کرے تو تصنیف و مضمون میں اور بھی چار چاند لگ جاتے ہیں۔ بطور طالب علم تحقیق سیکھنے اور مقالہ تحریر کرنے کی نو مشقی کے زمانے میں اگر کوئی مناسب راہنما یا کوئی اچھا استاد نہ ملے تو اپنے مقالے یا مضمون کی اصلاح کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے یا تو کئی بار لکھا جائے اور ہر بار اس پر نظر ثانی کا عمل دہرایا جائے یا پھر اسے لکھ کر رکھ دیا جائے جب وہ مضمون دماغ سے بالکل اتر جائے تو اس پر نظر ثانی کر لی جائے۔ ایسا کرنے سے اپنے مقالے اور مضمون کے محاسن اور کمزوریاں خود بخود نظر آنے لگتی ہیں۔ اور بہت سی خامیوں کی اصلاح انسان خود ہی کر لیتا ہے۔ یہ طریقہء اصلاح تحقیق اگرچہ دیر طلب ہے لیکن نہایت مفید ہے۔ اچھے اچھے مورخین و مصنفین ہمیشہ یہی کرتے آئے ہیں۔ اگر آپ کو گذشتہ صدی کے مشہور مورخ و مصنف کا قلمی مسودہ دیکھنے کا اتفاق ہو تو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کس طرح انی تحریروں میں بار بار کانٹ چھانٹ کرتے رہے ہیں۔ مشہور مورخ گبن نے اپنی تاریخ سلطنت روما کا عروج و زوال کا مسودہ کئی بار لکھا اور ہر بار اس پر نظر ثانی کا عمل دہرایا۔

صحیح تاریخ نویسی اور تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ نظر ثانی اور تصحیح کے کام پر کافی زیادہ وقت صرف کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ سقم دور ہو جائیں اور محقق، مورخ کی جانکاہی، عرق ریزی، قابلیت اور فن تاریخ نگاری کا سکہ پڑھنے والوں کے دلوں پر مستقل طور پر ثبت ہو جائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بارھواں باب

حوالہ جات

۱- F. Rosenthal, History of Muslim Historiography, (E. J. Brill, Leiden, 1952), P. 410.

۲- تاریخ طبری' جلد اول ص' ۲۰۸ ۱۶۹

۳- شیکسپیئر کا مشہور ڈرامہ

۴- سترھویں صدی کے مشرقی ادب کی افسانوی کہانیاں۔

۵- انقلاب فرانس پر کم و بیش بیس ہزار کتب موجود ہیں۔

۶- اٹلی کا مشہور مصور (۱۴۲۵ء - ۱۵۱۹ء)

۷- اٹلی کا مشہور مصور (۱۴۸۳ء ۱۵۲۰ء)

۸- اٹلی کا مشہور مصور اور فنکار ہے۔ (۱۴۷۵ء - ۱۵۶۹ء)

۹- یہ مغربی نقطہ نظر ہے۔

۱۰ واقعہ کربلا تاریخ اسلام میں عظیم اثرات کا حامل ہے۔ کربلا کے لق و دق صحرا میں بہتر (۷۲) توحید پرست بوڑھوں' جوانوں اور بچوں نے اڑھائی لاکھ پر مشتمل شیطانی قوتوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر کے "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی تیغ کا علم قیامت تک کے لیے بلند کر دیا بقول علامہ اقبال ؒ

نقش الا اللہ بر صحرا نوشت
سطر عنوان نجات مانوشت
رمز قرآن از حسین آموختیم
ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم

۱۱ بات... خیالات رکھنے والے افراد وہ غیر مسلم افراد ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر نہ تو ایمان رکھتے ہیں اور نہ ہی انہیں نبی آخر الزماں تسلیم کرتے ہیں۔

۱۲ یزیدی گروہ ... ایسے لوگ ہیں جو یزید کو امام' اس کے افعال کو جائز اور اسے حق پر سمجھتے ہیں بقول علامہ اقبال

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
این دو قوت از حیات آید پدید

۱۳ فروڈ کے متعلق یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کارنا... کو ناپسند کرتا تھا حالانکہ حقیقت یہ نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی۔ لٹن سٹریچی (۱۸۸۰ء - ۱۹۳۲ء) نے عہد وکٹوریہ کے مشاہیر کی سوانح تحریر کیں حالانہ انہیں بیکار سمجھتا تھا۔ اسی طرح پیکسٹن ہن نے ولیم جیننگز برائن (۱۸۶۰ء - ۱۹۲۵ء) کے متعلق حقائق چھپانے کی کوشش نہیں کی لیکن ایسی مثالیں مستثنیٰ ہیں۔

۱۴۔ سی۔ آئی۔ اے امریکہ کا خفیہ محکمہ اطلاعات ہے جس کی شاخیں دنیا کے ہر ملک میں بتائی جاتی ہیں۔

۱۵۔ انگریز مورخ (۱۸۸۹ء - ۱۹۴۴ء)

۱۶۔ جرمن مورخ (۱۸۱۷ء - ۱۹۱۳ء)

۱۷۔ تاریخ طبری، جلد اول ص۔ ۲۳

۱۸۔ سٹانٹن (۱۸۱۴ء - ۱۸۶۹ء) یہ شخص امریکی صدر لنکن کا سخت مخالف تھا لیکن خانہ جنگی کے دوران لنکن نے اسے وزیر جنگ بنا لیا۔ تاہم یہ لنکن کی برابر مخالفت کرتا رہا۔ جھگڑالو آدمی تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیرھواں باب

منطقِ تجزیہ نگاری و تاریخی تحقیق

LOGIC OF HISTORICAL ANALYSIS AND JUDGEMENT

تحقیقی منطق کا مفہوم

ہم اپنی روز مرہ زندگی میں کسی بات یا دعویٰ کو صحیح یا غلط ثابت کرنے کے لیے جو دلائل پیش کرتے ہیں اسے منطق کہتے ہیں۔ ہمارے دلائل کبھی صحیح ہوتے ہیں اور کبھی غلط۔ اگر لوگ منطقی ہوں تو ہمارے صحیح دلائل کو قبول کر لیتے ہیں اور غلط دلائل کو رد کر دیتے ہیں۔ غلط اور صحیح دلائل کا موازنہ کر کے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ کونسے اصول و قوانین ہیں جن کے مطابق ہمیں استدلال کرنا چاہیے۔ انہی اصولوں کے مجموعے کا نام منطق ہے۔

جب ہم کسی مسئلے کے متعلق استدلال کرتے ہیں تو اس کے متعلق سوچتے ہیں اور فکر سے کام لیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ منطق کا تعلق فکر (Thought) سے ہے یعنی منطق کا موضوع فکر ہے۔ تاریخ بھی فکر سے بحث کرتی ہے۔ علم تاریخ میں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ ہم کس طرح سوچتے ہیں اور ہمارے افعال و اعمال کس فکر کا نتیجہ ہیں؟ ماضی کے انسانوں کے افعال و اعمال کیا تھے اور وہ کس طرح سوچتے تھے؟ ماضی کے فکر کو کس طریق استدلال کے ساتھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ماضی کے سلسلوں، تہذیبوں اور معاشروں کا نئی فکر اور نئے حالات کے مطابق کس طرح جائزہ لینا چاہیے؟ کیا ماضی پر حال کے ضابطوں اور اقدار کا نفاذ کیا جا سکتا ہے؟ کیا وسیع طور پر پھیلے ہوئے ماضی کو جبراً" حال کی تنگ نظروں، نقطہ نگاہ اور اخلاقی فیصلوں کے دائروں میں صحیح طور پر سمجھا، سوچا اور دیکھا جا سکتا ہے؟ تاریخی تجزیہ نگاری اور تحقیقات کی یہی منطق ہے جو حال و ماضی کے حوادث و واقعات کے متعلق مربوط، مکمل اور صحیح واقفیت دیتی ہے۔ تاریخی تحقیقات کے منطق کے ذریعے ہم تصنیف اور مصنف کے عمل و فکر کی صحت یا عدم صحت کو بھی دیکھتے ہیں تاکہ حقیقی تصنیف حاصل کی جا سکے اور غیر حقیقی مصنف و تصنیف سے بچا جا سکے۔ قوانین منطق ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے؟ یہ تو اصولِ تحقیق کا ایک طریقہ ہے جسے توڑا جا سکتا ہے۔ اگر ہم اصول منطق کی خلاف ورزی کریں گے یعنی غلط استدلال کریں گے تو ہمیں کوئی سزا بھگتنا نہیں پڑے گی بلکہ غیر معیاری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نتائج حاصل کریں گے اور ہماری فکر و تاریخ حقائق کے مطابق نہیں ہوگی۔ چنانچہ تحقیقاتی منطق سے مراد یہی ہے کہ ہمارا تاریخی فکر حقائق کے مطابق ہو' ان کی تصدیق کرے اور فکر میں خود اپنی بھی تردید نہ پائی جائے۔

حقائق کی پڑتال اور حصول کے سلسلے میں انسان اپنی استدلالی قابلیت استعمال کرتا ہے۔ کسی خاص واقعہ یا حادثہ کی حقیقت جاننے کے لیے وہ بہت سارے واقعات و حادثات کو سامنے رکھ کر یہ منطق پیش کرتا ہے کہ جو بات سب کے نزدیک درست مان لی گئی ہے وہی زیر نظر واقعہ یا حادثہ کے بارے میں درست ہوگی۔ یہ ایک قسم کی دلیل ہے۔ اس دلیل کے ذریعے محقق مفروضوں یا قیاس کے ایسے نمونے مہیا کرتا ہے جس سے مسئلہ کے بارے میں نتیجہ خیز شہادت وجود میں آ جائے۔ اسی شہادت کی بنا پر وہ اپنے اخذ شدہ نتیجے کے صحیح ہونے کا اطمینان کرتا ہے' بنیادی حقائق یکجا کرتا ہے اور منطقی تجزیہ نگاری سے چھان بین کر کے حقائق کی تصدیق کرتا ہے۔ خاص واقعات کے بارے میں خصوصی شہادتیں اکٹھی کرتا ہے تاکہ وہ عام حقائق و واقعات کے عمومی ہونے کو قیاسی طور پر ثابت کر سکے۔ حقائق کے بارے میں نئی راہیں تلاش کرتا ہے اور ان سے نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ تحقیقی منطق اساتذہ' وکلاء اور سائنس دان وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ تاریخی تحقیق کا اصول سب سے پہلے یونانیوں نے دریافت کیا اور اپنایا۔ پانچویں صدی قبل مسیح کے یونان نے تہذیب کی کئی منزلیں طے کر لی تھیں۔ یونانی فلسفی حیات و کائنات کا مشاہدہ کر رہے تھے اور ان کے بارے میں اپنے نظریات بیان کر رہے تھے۔ عقل و شعور کی ایک معیاری سطح حاصل کر لینے کے بعد وہ تنقیدی و تحقیقی طریق کار کو بھی استعمال کرنے لگے۔ لہٰذا افلاطون وہ پہلا محقق ہے جس نے "ریاست" (Republic) قانون' (Law) اخلاق اور مابعد الطبیعیات کے علاوہ اپنے استاد سقراط کے خیالات کو جمع کر کے تحقیقی راہنمائی کے سلسلے میں چند اصول وضع کیے اور ان پر بحث کی۔ افلاطون نے انسانی معاشرے کی ضروریات کے تحت پوری انسانی زندگی کا ایک نظام وضع کرنے کی کوشش کی۔ ارسطو نے انسانی علوم کی تنظیم نو کا کام شروع کیا اور تحقیق کے طریق کار کو منطق کے ساتھ پیش کیا۔

یونانیوں کا نظریہ تحقیق یہ تھا کہ اس وقت تک کوئی بات تسلیم نہ کی جائے جب تک اس کے لیے معقول ثبوت نہ مل جائے یا دلیل نہ دی جائے۔ اب مفروضوں کی جگہ منطق نے لے لی اور کسی شے کو سمجھنے کے لیے اس کا تجزیہ ضروری قرار دیا گیا۔ تجربی نفسیات کے زیر اثر تنقید نے ذہن کی تجزیہ کاری کا کام شروع کیا تاکہ جذبات و احساسات کو سمجھنے کے لیے چند اصول وضع کیے جا سکیں۔ اور ان کی مدد سے نفس سلیم کے متعلق کوئی معیار تحقیق قائم کیا جا سکے۔ اس طریق کار نے ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انقلاب برپا کر دیا۔ اب ہر شخص سچی اور صحیح بات کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگا۔ انہوں نے یہ طریق کار اختیار کیا کہ پہلے اصل مسئلہ کو سمجھا جائے' اس کے بعد اسے حل کرنے کے لیے مختلف دلائل یا مفروضے قائم کیے جائیں۔ بعد ازاں ان دلائل یا مفروضوں کو ثابت کرنے کے لیے ذاتی مشاہدوں' لوگوں کی آراء اور تحریری دستاویز و مواد سے استفادہ کیا جائے۔ چنانچہ ان معلومات ہی کے ذریعے ان مفروضوں کی جانچ پڑتال کرکے صحیح نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

عہد روما کے ناقدوں نے یونانیوں کے تحقیق و تجزیہ نگاری کے نمونوں کی تقلید و نشوونما کی۔ عربوں نے انہیں نہ صرف جلا بخشی بلکہ تحقیق و تجزیہ نگاری کے اعلیٰ قوانین بھی وضع کیے۔

تجزیہ نگاری اور نظریاتی منطق

انسانی زندگی کے طبعی' معاشی اور معاشرتی حالات و واقعات ایسے لاتعداد پیچیدہ حقائق فراہم کرتے ہیں کہ ان کے صحیح حل اور پیچیدگی کو سمجھنے اور آسان بنانے کے لیے نظریات و حقائق کے مابین استدلال اور استنباط کے ایسے راستے معلوم کرنے پڑتے ہیں کہ جن کی بدولت زندگی کے حقائق و نتائج کی تشریح و توضیح کے لیے عام ذہن کی بجائے تحقیقی ذہن برسر عمل آجاتا ہے۔ اس طرح محقق ذہنی و فکری رسائی سے مسائل کا حل تلاش کرتا ہے۔ ویسے تو انسانی تجسس اور جستجو کا میدان اتنا وسیع و عریض ہے کہ میکانکی قیود میں نہیں آسکتا مگرخالصتاً" سائنسی نقطہ نظر سے زمانہ حال کے محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تحقیق کی حدود کا تعین کرے۔ باقاعدہ تحقیق کا عمل ایک ایسے واضح اور محدود مسئلہ کی تشکیل کا مرہون منت ہے جس کی بنیادیں مصدقہ علوم میں پائی جاتی ہیں۔ مبتدی کے لیے ضروری ہے کہ وہ بنیادی طور پر مسئلہ کا انتخاب و تحقیقی نقطہ نگاہ سے اس کی تشکیل اس طرح کرے کہ اس کی غیر ضروری وسعت خود بخود سکڑتی جائے۔ مسئلہ کے تجزیہ و تحقیق کے لیے مندرجہ ذیل راہنما اصول ضروری ہیں۔

(۱) کسی موضوع' مضمون اور تصنیف کی تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بارے میں صحیح قسم کی معلومات موجود ہوں اور اس کی نظریاتی منطق موجود ہو۔

(۲) محقق کو علم ہونا چاہئے کہ وہ زیر نظر موضوع کے بارے میں کتنا اور کیا جانتا ہے؟

(۳) زیر غور موضوع پر اس سے پہلے کتنا اور کیا کیا کام کیا گیا ہے؟

(۴) کیا موجودہ موضوع اپنی نوعیت میں جداگانہ یا عام قسم کا ہے؟

(۵) دوسرے محققین نے اس موضوع پر کیا تحقیق پیش کی ہے اور ان کا رویہ و نظریہ اس موضوع کے بارے میں کیا رہا ہے؟

(۶) کیا پیش رو محققین نے اس موضوع سے کچھ نتائج اخذ کیے ہیں اور ان نتائج کی روشنی میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوئی تجاویز پیش کی ہیں؟
(۷) کیا اس موضوع میں تحقیق کے لیے مزید گنجائش موجود ہے؟
(۸) کیا زیر نظر موضوع پر حوالہ جات کے لیے کتب اور دیگر مواد موجود ہے؟

تحقیقی منطق کے مقاصد

تحقیقی منطق اپنی نوعیت کے اعتبار سے مختلف پہلوؤں کا حامل ہے۔ ان میں سے تین پہلو خاص طور پر نمایاں ہیں۔

(۱) تحقیقی منطق کا پہلا مقصد تو کسی نظریے کی نشوونما یا ارتقاء ہے۔ ایسی تحقیق کی سب سے بڑی افادیت قدرت کی پیدا کردہ اشیاء کو تفصیل سے بیان کرنا اور شائد ایسا بیان سائنسی طریقوں سے ہی ممکن ہو۔

(۲) اس کا دوسرا مقصد حقائق کو ایک جگہ اکٹھا کرنا ہے۔ یہ تحقیق بیانیہ ضرورت کو بھی پورا کرتی ہے۔

(۳) تحقیقی منطق کا تیسرا مقصد یہ ہے کہ اس کا تعلق فوری اور عملی مسائل سے ہو یا وہ محقق کو بہتر طور پر سمجھنے یا عمل کرنے میں مدد دے سکے۔ محقق کو سائنٹیفک طریقہ تحقیق استعمال کرنا چاہیے تاکہ غلطیوں سے مبرا نتائج حاصل کر سکے۔

تاریخی تحقیق و تجزیہ نگاری کی منطق کی خصوصیات

تاریخی تحقیق کے طریقے میں حقائق کو جمع کرنا، منتخب کرنا، ان کی درجہ بندی کرنا، ان کا جائزہ لینا اور تصدیق کرنا ہوتا ہے۔ ان واقعات و حادثات کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے۔ اس تحقیق کا نمایاں مقصد صحیح معلومات کا حصول اور سچائی کی تلاش ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے محقق کو تاریخی دستاویزات، کتب اور دیگر ریکارڈ کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح ماضی کے مسائل و حقائق دریافت کرنا تاریخی تحقیق کی خصوصیت ہے۔

تحقیق کا اولین مقصد ابتدائی ذرائع اور مواد سے نئی معلومات حاصل کرنا ہوتا ہے۔ جو کچھ پہلے سے معلوم ہو یا جو لکھا جا چکا ہو، اس کو دوبارہ تزئین و ترتیب سے از سر نو بیان کر دینا تحقیق نہیں بلکہ نقل کہلاتا ہے۔ تحقیق میں سائنسی رجحانات نے منطقی طریقہ کو اپنایا ہے۔ چونکہ تحقیق میں کسی مسئلہ، منصوبہ، نظریے اور واقعے کے بارے میں ماہرانہ طور پر باقاعدہ تفتیش ہوتی ہے۔ محقق پہلے سے طے کردہ مسئلہ اور منصوبہ کو اپنے طریقہ کار کے مطابق آگے بڑھاتا ہے، مواد اکٹھا کرتا ہے، اسے ترتیب دیتا ہے۔ مختلف حصوں میں مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کرتا ہے اور باقاعدہ ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منطقی عمل کے ساتھ لکھتا ہے۔

محقق تحقیقی کام کے لیے مختلف ذرائع اور آلات کی مدد حاصل کرتا ہے۔ فراہم شدہ مواد کی تصدیق کے لیے ہر ممکن کوشش کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ محقق کی ہمیشہ یہ کوشش ہونی چاہئے کہ زیر تحقیق موضوع پر ذاتی احساس، تعصب، خواہش اور خیالات کو شامل نہ کرے۔ محقق پیش نظر مسئلہ کے حل کے لیے مفروضے قائم کرتا ہے۔ جب تک وہ ان مفروضات کو حقائق کی روشنی میں پرکھ نہیں لیتا، اسے مفروضے میں اعانت کرنے والے مواد کے تجسس کو روکنا چاہئے۔ ترغیب دینے یا ثابت کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہونی چاہئے بلکہ مفروضے کو ثابت کرنے کی بجائے اس کی جانچ اور پرکھ ہونی چاہئے۔ تحقیق ساف تخیل اور منطق کو اجاگر کرنے میں بہت مدد دیتی ہے اور یہ چیز تجزیہ کے دوران انسانی احساس اور جذبات کو اثر انداز ہونے نہیں دیتی۔

تحقیق کا انداز غیر جانبدارانہ ہونا چاہئے۔ اپنے ذاتی فیصلے اور تعصب کو بروئے کار نہ لانا چاہئے تاکہ مواد اور منطق کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں۔ تحقیق نہایت احتیاط سے لکھی اور بیان کی جانی چاہئے۔ تمام مستند حوالہ جات کو احتیاط سے دستاویزات کی شکل میں منتقل کر دینا چاہئے تاکہ صحیح اصول و نتائج مرتب کیے جائیں۔ تحقیق سے جو نتائج و اصول نکلیں ان کا موازنہ ان نتائج و اصولوں سے کیا جائے جو مواد کے تجزیئے سے حاصل ہوں۔

کسی بھی تحقیق کی افادیت اور خصوصیت جو کہ اس کے مسائل، طریق کار، مواد کا تجزیہ اور متوقع نتائج سے تعبیر ہے، کو ایک جامع خاکہ (Design) کے ذریعے واضح کیا جا سکتا ہے۔

تاریخی تحقیق اور تجزیہ نگاری کی بنیاد وہ تجسس اور تفتیش کا مادہ ہے جس کے ذریعے کسی واقعے کی حقیقت جاننے کے بعد اسباب یعنی واقعات کی علل و معلول کا تعین کیا جا سکے۔

تحقیقی مواد کے ماخذ

تاریخی تحقیق میں تجزیہ کے لیے مواد تیار نہیں کیا جاتا بلکہ وہ پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ مواد کے حصول کے لیے دو قسم کے ماخذ استعمال میں لائے جاتے ہیں۔

(۱) ابتدائی ماخذ (Primary Sources): ابتدائی ماخذ واقعات کی وہ دستاویزات ہوتی ہیں جو مصنف، مورخ اور مبصر نے خود دیکھی، سنی اور تحریر کی ہوتی ہیں یعنی وہ واقعات کا چشم دید گواہ ہوتا ہے اور واقعات کے متعلق اصلی شواہد بہم پہنچاتا ہے۔ یہ ماخذ قابل اعتماد ہوتے ہیں اور تاریخی حقائق پر آسانی سے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

(۲) ثانوی ماخذ (Secondary Sources): ثانوی ماخذ واقعات کے بارے میں دیگر لوگوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی اطلاعات' بیانات اور سنی سنائی باتوں پر مبنی واقعات کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ یہ چشم دید شواہد نہیں ہوتے بلکہ دیگر ذرائع اور لوگوں سے ان کے اصلی ہونے کی تصدیق کرنا پڑتی ہے۔ کسی پہلے دور کے بارے میں دوسرے دور میں لکھی جانے والی تاریخ کی کتب ثانوی ماخذ شمار ہوتی ہیں۔

تاریخی ماخذ اور مواد عام طور پر قومی' محافظ خانوں (National Archives)' لائبریریوں' عجائب گھروں' ذاتی کتب خانوں' اہل علم شخصیات اور محققین سے دستیاب ہوتے ہیں۔ مختلف اداروں اور شخصیات نے مختلف موضوعات پر تاریخی مواد کے بارے میں کتابیں' نادر علمی تحریریں' تصویریں' فائلیں' رجسٹر اور دستاویزات محفوظ رکھی ہوتی ہیں۲۔

اصلی اور حقیقی ماخذوں کے حصول کا مقصد واقعات کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنا ہوتا ہے تاکہ حقائق کی نشاندہی اور وضاحت ممکن ہو جائے۔

تاریخی تجزیہ نگاری

تاریخی تجزیہ نگاری سے مراد تاریخ کو تعصب' طرفداری اور حقائق کی غلط تعبیر سے روک کر اس میں صداقت پسندی پیدا کی جائے۔ تاریخ میں کسی رجحان کا دریافت کر لینا آسان امر ہے لیکن یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ تاریخ میں حقائق کا خون کیوں کیا جا رہا ہے؟ حقائق کو تعصب کے ساتھ کیوں پیش کیا جا رہا ہے؟ یا حقائق کی غلط تعبیر کر کے پروپیگنڈے کے ساتھ کیوں پیش کیا جا رہا ہے؟ ہمیں ایسے اظہار رائے سے گریز کرنا ہوگا اور ان کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ بیشتر تاریخی پروپیگنڈا یا حقائق کی غلط تعبیر و تشریح تاریخ کے اعلیٰ درجے تک نہیں پہنچتا مثلاً" نازی مورخوں نے آریائی نسل کی برتری اور ہٹلر کے جرمنی کی معصومیت ثابت کرنے کے لیے جو کچھ تاریخ کے رنگ میں پیش کیا وہ قابل توجہ نہیں۔ اسی طرح کیمونسٹ مورخوں نے کیمونزم کے نظریات کی اشاعت اور انہیں حق بجانب ثابت کرنے کے لیے جو کچھ تحریر کیا وہ قابل توجہ نہیں۔ دوسری جانب نظام سرمایہ داری کے حامی مورخوں نے مسئلہ تقدیر' دولت خدائی عطیہ اور آزاد مارکیٹ کے اصول تجارت کی لوٹ کھسوٹ کے اثبات کو مذہبی جذبات کی معصومیت کے رنگ میں پیش کیے وہ بھی قابل توجہ نہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے ہاں مذہبی و قومی نظریات کی حامل جو مقبول تاریخیں سب سے بڑھ کر اثر و رسوخ کی حامل جاتی ہیں وہ تاریخی تجزیہ نگاری اور اصول منطق پر پوری نہیں اترتیں' وہ محض پروپیگنڈہ ہیں۔ ہم اصول منطق اور تجزیہ نگاری سے پروپیگنڈے یا طرفداری کے اجزاء کو با آسانی دریافت کر سکتے ہیں اور انہیں تاریخی مواد و حقائق سے الگ کر سکتے ہیں۔

تاریخ ایک غیر سائنسی علم ہے جس میں حقائق و مشاہدات کو آسانی کے ساتھ جانبدارانہ طور پر پیش کیا جا سکتا [redacted] کا اسلوب نگارش عمومی طور پر موضوعی ہوتا ہے اور اس میں بیانات'

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مشاہدات' واقعات اور دیگر نظریات کو غلط طریقے پر پیش کرنے کا رجحان با آسانی پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات کچھ موضوعات کی حیثیت پروپیگنڈے کی سی بن جاتی ہیں۔ اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں کہ تاریخ نگاری میں مورخ کی شخصیت' افکار اور احساسات کا دلچسپ عکس نظر آتا ہے خواہ انہیں اچھا سمجھیں یا برا مگر تاریخ میں مکمل طور پر غیر جانبدارانہ مذہبی' قومی' سیاسی اور اقتصادی نظریات پیش نہیں کیے جا سکتے۔ تاریخ پر تعصب' تنگ نظری' تحریفات اور پسند و ناپسندیدگی کا ایک رجحان ہے جو بہت قوی اور چھایا ہوا ہے۔ یہاں پر نہ کامل غیرجانبدار انصاف ہے اور نہ ہی مکمل غیرجانبدار افکار و خیالات ہیں۔ جبکہ تاریخ کا مطالعہ ہر لحاظ سے ہمہ گیر اور آفاقی ہونا چاہیے۔ اس میں قوم پرستی' قومی مفاد' تعصبات اور جذبات کا عکس نمودار نہیں ہونا چاہیے۔

سوال یہ ہے کہ مورخ کو ماضی کے متعلق بحث کرتے ہوئے کیا نظریہ اختیار کرنا چاہیے؟ ظاہر ہے کہ ماضی کے معاشرے اور تہذیبیں ہمارے اپنے دور کے معاشروں اور تہذیبوں سے بالکل مختلف اور جداگانہ تھیں۔ کیا مورخ اپنے عہد کی اقدار اور معیار کے مطابق ماضی کی تہذیبوں اور معاشروں کا تجزیہ کرے گا یا ان معیاروں اور قدروں سے کام لینے کی کوشش کرے گا جو ان لوگوں اور ان کے دور کی تھیں جن سے وہ بحث کر رہا ہے؟

بادی النظر میں تجزیہ نگاری کا یہ مسئلہ نہایت آسان دکھائی دیتا ہے۔ اس کا مناسب طریقہ تو یہی ہے کہ ماضی کی جس تہذیب و معاشرت کو سمجھنے کی ہم کوشش کر رہے ہیں' اسے پرکھنے کے لیے اسی قوم کے معیار' پیمانے اور اقدار کو اختیار کیا جائے۔ قدیم ہندوستان کی تہذیب و معاشرت کو سمجھنے کے لیے دور حاضر کے انگلستان یا امریکہ کے معیار کو استعمال نہ کیا جائے۔ اسی طرح قدیم ایرانیوں' مصریوں' یونانیوں اور چینیوں کو سمجھنے کے لیے ہمیں بیسویں صدی کے تقاضوں کو استعمال نہ کرنا ہو گا بلکہ انہی کے پیمانے استعمال کرنے ہوں گے۔ اور نہ ہی ہمارے جدید ذہنی' فکری اور سائنسی معیار پرانی اقدار پر پورا اتر سکتے ہیں۔ ہم جن لوگوں کا مطالعہ کر رہے ہوں' ان کے دلوں اور روحوں میں گھسنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمیں ماضی کے اندر اس طرح گم ہو جانا چاہیے کہ ہم اس تہذیب و معاشرت کا حصہ بن جائیں تاکہ ان کی آنکھوں سے دیکھ سکیں' ان کے کانوں سے سن سکیں' ان کے اسلوب فکر کے مطابق سوچ سکیں اور انہی کے احساسات و جذبات اپنے اندر پیدا کر سکیں۔ ہم تاریخی تجزیہ نگاری کا حق اسی طرح ادا کر سکتے ہیں کہ اپنے حال سے آزاد ہو کر ماضی میں از سر نو داخل ہو جائیں یعنی کہ اپنی شخصیت و ہستی کو بھول کر ہم زمانہ ماضی کے کرداروں میں جذب ہو جائیں اور حال و ماضی کی حد بندیاں ختم کر دیں۔ انہی تدابیر سے ہم وہ سب کچھ جاننے اور محسوس کرنے کی کوشش کریں گے جو ان لوگوں کے قلب و ذہن میں تھا۔ اصل حقائق حاصل کرنے کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے تجزیہ نگاری ایک بہترین طریقہ ہے۔ اس طریقہ سے ہم ماضی کو حقیقتاً" گرفت میں لے سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں اور وہی کچھ جان سکتے ہیں جو وہ لوگ جانتے تھے۔

جب ہم عہد ماضی کے ادب اور یادگاروں کو ان کے قلب و روح میں اتر کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے صحیح راہ عمل اختیار کی ہے ورنہ ہم قرون اولیٰ کے مسلمانوں یا عہد قدیم کے یونانیوں یا عہد وسطیٰ کے یورپین یا اٹھارھویں صدی کے امریکہ کے اصلی باشندوں کے بارے میں سوچنے، فیصلہ کرنے اور گفتگو کرنے کے حقدار نہیں کیونکہ ہم تو ان لوگوں کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

یقیناً" ہم ماضی کو اسی صورت میں بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ جب ہمارے پاس ماضی کے شواہد و مواد کا ریکارڈ وسیع طور پر موجود ہو اور ماضی کا تعلق بھی قریب سے ہو اور ہم اس تہذیب و معاشرے سے بھی ایک حد تک آشنا ہوں۔ لیکن ماضی بعید کے بہت پرانے اور غیر متعارف معاشرے کے افکار و احساسات میں کیسے داخل ہو سکتے ہیں مثلاً" وادی سندھ کی قدیم تہذیب' موہنجو ڈارو اور ہڑپہ کے لوگوں کو کیسے سمجھ سکتے ہیں جن کے بارے میں ہماری معلومات کا ریکارڈ جزوی حیثیت رکھتا ہے۔

حال کی آنکھوں سے ماضی کو دیکھنے اور سمجھنے کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن یہ یاد رکھیں کہ خواہ ہم کتنی ہی کوشش کر دیکھیں یعنی ہمارے بس میں جو کچھ ہے اس کو بروئے کار لانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں پھر بھی ہم ماضی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کی زبان کو اپنا لباس پہناتے ہیں۔ ان چیزوں کو پسندیدہ سمجھتے ہیں جو ہمارے نزدیک پسندیدہ ہیں اور انہی واقعات کو اہمیت دیتے ہیں جو ہمارے نزدیک اہم ہیں۔ اس تجزیہ سے توضیح ہوتی ہے کہ "کیوں ہر نسل ماضی کی تاریخ از سر نو لکھتی ہے؟" ظاہر ہے کہ مختلف نسلوں کے اخلاقی معیار مختلف ہوتے ہیں۔ ماضی پر اپنے اخلاقی معیاروں کو زبردستی ٹھونسنا اپنے ذہنی تحکم اور غرور کی ایک شکل ہے۔ ہم اپنے ثانوی نظام میں ماضی پر نظر تعاقب اور شہری حقوق سے محرومی وغیرہ کے امور کو نہیں مانتے۔ ہمیں اپنے نظریات کا اطلاق ماضی پر نہ کرنا چاہئے۔ بہتر یہ ہے کہ ماضی کے متعلق اخلاقی راستبازی کی حماقت اور غرور سے احتراز کیا جائے۔ ہم فیصلے صادر نہ کریں ورنہ آنے والی نسلیں ہمارے متعلق فیصلے صادر کریں گی۔

ماضی کے متعلق جو ریکارڈ ہمارے سامنے ہے وہ حد درجہ جزوی' متفرق' متعصبانہ اور جانبدارانہ ہے۔ ہر فرد مہیا تاریخی حقائق کی اہمیت کے متعلق مختلف الرائے ہے۔ ہر نسل ماضی کی تاریخ اپنی ضرورتوں، سوچوں اور نقطہ نگاہ کے مطابق از سر نو لکھتی ہے۔ جو مورخ تاریخ نگاری کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نوعیت‘ فلسفے اور تحقیقی اصولوں سے دلچسپی رکھتے ہیں‘ وہ تاریخ میں ان مسائل‘ معاملات‘ ناگزیر طور پر نامکمل، تنگ نظر اور موضوعی نقطہ نگاہ کے بارے میں تلاش حق میں خصوصی دلچسپی لیتے آئے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ سے اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ ہم یا ہمارے بعد آنے والے مورخین انسان کی کہانی کا کوئی بھی اہم حصہ بیان نہیں کر سکتے۔ وہ اکثر اعتراف کر چکے ہیں کہ دنیا کے متعلق خواہ وہ ماضی کی دنیا ہو یا حال کی‘ ان کا محیطی نقطہ نگاہ ان کے تجرباتی محاذوں کی بنا پر محدود رہ گیا ہے۔ خواہ وہ قومی ہوں یا علاقائی یا مذہبی یا فلسفیانہ یا مجلسی یا اقتصادی وغیرہ۔ انہوں نے بارہا تسلیم کیا ہے کہ ہمارے انفرادی مدرکات ایسے فلٹر بنے رہے ہیں جن سے محرکات اور مواد چھن جاتے ہیں اور انہوں نے مان لیا ہے‘ بعض نے بہ آسانی اور بعض نے مشکل سے‘ کہ تاریخ بھی بدلتی رہتی ہے۔ تاریخ نگاری کا سلسلہ وقتاً ” فوقتاً“ بدلتا رہتا ہے اور مختلف بیانات و تجزیات میں نئے تصورات داخل ہو جاتے ہیں لہٰذا ممکن ہے کہ حقائق میں اضافہ ہو جائے یا انہیں حذف کر دیا جائے یا وہ بدل جائیں لہٰذا کرہ ارض کے معاملات‘ معاصرانہ واقعات وسائل، انسانی غلطیاں‘ کمزوریاں‘ اندازے اور پیدا ہونے والے انسانی مسائل کے متعلق سعی و تلاش اور غور و فکر کی صلاحیتیں اور سرگرمیاں بڑھ جاتی ہیں۔

تاریخی تجزیہ نگاری کے سلسلے میں محقق کو منطق‘ حقائق کی دریافت اور از سر نو دریافت کے متعلق کچھ احساسات دیتا ہے جو تاریخ کا جزو بن جاتے ہیں اور ان کی بنا پر تاریخ کے نئے پہلو بین‘ تحریر‘ مطالعے‘ تعبیر‘ تعلیم اور بحث و نظر کا کام تخلیقی انداز میں ہو گا۔ ایک اعتبار سے تاریخ ایک ایسا سلسلہ ہے جو برابر جاری ہے اور اس کا اختتام کوئی نہیں۔

تاریخ ایسی خوشبو ہے جس کی مہک قاری کے دماغ تک پہنچ جانی چاہئے۔ مورخ کو چاہیے کہ ادبی اور تاریخی تحریرات کے ذریعے قاری کے دل میں مطالعے کے لیے زندگی بخش قوت اور شعلہ حیات پیدا کرے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیرھواں باب

حوالہ جات
تاریخی حقائق اور تحقیق

(۱) ڈو بولڈ بی وین ڈیلن' انڈر سٹینڈنگ ایجوکیشنل ریسرچ (نیویارک' ۱۹۶۲)ص' ۴۳-۴۹

(۲) آرتھر مارک' دی نیچر آف ہسٹری (میکملن 'لندن ۱۹۸۹) ص' ۱۹۸-۱۹۹

(۳) وہ تاریخی کتب جو بہت اثر و رسوخ کی حامل تھیں لیکن محض پروپیگنڈہ تھیں مثلاً"

کلارنیڈن'	"ہسٹری آف دی ری بلیئن"
رینال'	"فلو سو فیکل ہسٹری آف دی انڈیز"
فریڈرک میسن'	"بائیو گرافی آف نپولین"
ہنری ولسن'	رائز اینڈ فال آف دی سلیو پاور ان امریکا"
بیرڈ'	"امریکن فارن پالیسی بیٹوین دی وارز"
پیرنگٹن'	"مین کرنٹس آف امریکن تھاٹ"
چرچل'	"ورلڈ کرائیسس"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چودھواں باب

تاریخی حقائق اور تحقیق

HISTORICAL RELATIVISM AND HISTORICITY

اسلوب حقائق نگاری

اسلوب حقائق نگاری کا مطلب یہ نہیں کہ اسلوب تحریر بہت عمدہ ہو۔ تاریخ کا اسلوب تحریر عموماً" بہت عمدہ ہوتا ہے۔ بہترین اسلوب تحریر وہ ہے جو سادہ، صاف اور بے لاگ ہو جیسے لنکن اور چرچل کی تصانیف سیاسیات کے دائرے میں اور گبن کی تصانیف تاریخ کے دائرے میں۔ اسلوب حقائق نگاری کا مطلب یہ ہے کہ بیان کا انداز عمدہ، رنگ اچھا، آہنگ بلند اور اس میں حرکت کا پہلو بھی ہو۔ یہ دراصل وضع و ترتیب کی ہمواری، کوشش کی مرکزیت اور تعمیری اتحاد و ہم آہنگی کا معاملہ ہوتا ہے۔ تاریخی اسلوب تحریر کے لیے بڑے بڑے مورخوں کی تحریر پڑھیے جو تاریخ نگاری کے استاد تھے۔ ہر قوم کی تاریخ میں ماہر اسلوب نگار موجود ہیں جن سے رہنما اصول سیکھے جا سکتے ہیں۔ جب تک تاریخ کا اسلوبِ تحریر موثر نہ ہو گا اس کا دلچسپی سے مطالعہ نہ کیا جائے گا۔ ایلن نیونز تاریخ کے اسلوب اور درست رویہ کی یوں تشریح کرتا ہے:

> دنیا مکمل طور پر سائنسی نظریات و معلومات کے فقدان کو فراموش کر سکتی ہے مگر تاریخ کے منصفانہ، درست اور عمدہ اسلوب تحریر کے فقدان کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ تاریخ میں اور ہر تصنیف میں سب سے بڑا محافظ اسلوب تحریر ہے۔ جس کتاب کا اسلوب تحریر ہر اعتبار سے منصفانہ اور عمدہ ہو گا اس میں تاریخ کے بعض غیر مناسب حصے آ سکتے ہیں لیکن وہ نسل در نسل متواتر پڑھی جائے گی۔ یہ گمان بالکل بے سود ہے کہ لارڈ کلیرنڈن انگریزی خانہ جنگی کے بیان میں بہت جانبدار ہے۔ باوجود اس کے یہ کتاب صدیوں تک پڑھی جائے گی، صرف اس لیے کہ اس کا اسلوب تحریر پر مغز، پر معنی، فصیحانہ اور اثر انگیز ہے۔ اس میں انسانوں اور واقعات کی نہایت عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ موٹلے نیدر لینڈ میں سپین کی بد انتظامی کے بارے میں زیادہ معقول رویہ اختیار نہیں کرتا۔ لیکن لوگ موٹلے کی کتاب برابر پڑھ رہے ہیں۔ اگر کسی مورخ کو انتخاب پر مجبور کر دیا جائے تو شہرت اسے اعلیٰ درجے کا اسلوب تحریر اختیار کرنے پر مجبور کرے گی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ارسطو کا انداز نگارش تو وہ نہیں اپنائے گا۔ وہ اپالو دیوتا کا انتخاب کرے گا' منروا کا انتخاب نہیں کرے گا یا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں کو منتخب کرے۔

جسٹس ہومز کا کہنا ہے کہ زندگی ایک عمدہ تصویر کشی ہے۔ حساب کی کسی رقم کا جمع کر لینا نہیں۔ یہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ نگاری تصویر کشی ہے' فوٹو گرافی نہیں۔ دنیا کا کوئی فوٹوگراف وہ اثر پیدا نہیں کر سکتا جو تصور تصویر میں پیدا کر سکتا ہے مثلاً" قتل' چاند اور خانہ کعبہ کی تصویروں سے جو اثرات پیدا ہو سکتے ہیں وہ محض فوٹو گراف دے دینے سے نہیں ہو سکتے۔ کسی شئے یا واقعہ کی حقانیت کے بارے میں درست اعداد و شمار جمع کرنا کافی نہیں ہوتا۔ اگر یہی کافی ہوتا تو امریکہ میں اعداد و شمار کا جو شمارہ شائع ہوتا ہے وہ تاریخ کی بہترین کتاب ہوتا۔ تاریخی اور معاشرتی اکائیوں اور اداروں کے اعداد و شمار کے ڈھیر جمع کر لینا کافی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو تمام اخباروں کا فراہم کردہ سرمایہ معلومات تاریخ کا بہترین خزانہ تھا۔ مختلف کہانیوں اور داستانوں کو اکٹھا کر لینا کافی نہیں۔ یہ کام تو رسالے اور مصور بخوبی انجام دیتے ہیں۔ اعداد و شمار تاریخ کا ایک حصہ ہیں' مکمل جسم نہیں۔ تاریخ کا جسم مکمل کرنے کے لیے تمام عناصر و اجزا کی تفصیلات درکار ہوتی ہیں۔ جیسے کوئی مصور تصویر کے لیے مختلف رنگوں' اجزا اور سامان سے تخیل کو معنویت دیکر تصویر کو عمل میں لاتا ہے' اسی طرح تاریخ نگار بھی اپنے موضوع کے ہر جزو کی معنویت و حقانیت کی روح تخلیق کرتا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ تاریخ نگاری کے لیے عمدہ الفاظ' خوبصورت جملے' دل آویز محاورے' شاندار فقرے اور مشکل اسلوب کا اظہار کوئی بہتر نمونہ تاریخ نہیں پیش کر سکتا۔ جب کوئی مورخ اچھے انداز میں تاریخ نگاری کرتا ہے تو وہ خود بخود ادیبانہ رنگ پیدا کرتا ہے۔ وہ ادبیت کے مکتب میں داخل نہیں ہو جاتا۔ اور نہ ہی کوئی مورخ پسند کرتا ہے کہ وہ ادبی تاریخ یا تاریخ بطور ادب پیش کرے۔ اگر کسی مورخ کا انداز دلچسپ نہیں تو وہ مورخ کے درجہ سے نہیں گر جاتا۔ اس کا مقصد تو تاریخی حقانیت پیش کرنا ہوتا ہے۔ یہ دراصل ایک قسم کا فلسفے کا مسئلہ ہے۔

حقائق نگار مورخ دراصل ماضی کو منصفانہ طور پر از سر نو پیش کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ گویا ایک لحاظ سے اسے فنکار سمجھنا چاہیئے جو اپنی ذہنی صلاحیتوں سے کام لیکر ایسے واقعات و حوادث کی حقیقت کو از سرنو تازہ و زندہ کرنا چاہتا ہے جو ماضی میں موجود تھے مگر اب مٹ چکے ہیں یا فراموش کر دیئے گئے ہیں۔ یا وقت کی تہوں کے نیچے دب گئے ہیں۔ وہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والے میں ایسے احساسات و جذبات بیدار کرتا ہے کہ وہ گم گشتہ ماضی کا نظارہ مورخ کی آنکھوں سے دیکھ لے۔ حقانیت نگار مورخ ایک فنکار' مصور اور ڈرامہ نگار کی مانند ایک لمحے کے لیے نہایت شاندار ماضی کے حسین و خوبصورت مناظر سامنے لے آتا ہے اور بعض اوقات ماضی کے المیہ واقعات کو آنکھوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے سامنے ایسے لاتا ہے کہ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں دواں ہو جاتا ہے۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں حقائق نگار ایک ایسی تصویر کھینچتا ہے جو بالکل متعارف معلوم ہوتی ہے۔ وہ برسوں اور صدیوں کے فاصلوں کو مٹا کر مطالعہ کرنے والے کو اس واقعہ میں شامل کر لیتا ہے مثلاً" حمید بن مسلم "تاریخ مقاتل" میں کربلا میں امام عالی مقام امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے دردناک واقعات، سپاہ یزیدی کے اسیران کربلا پر وحشیانہ مظالم اور کوفہ و شام کے بازاروں اور درباروں میں خاندان رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم پہ ایسے پُر درد مناظر پیش کرتا ہے کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر لے آتا ہے کہ پڑھنے والے بے اختیار گھٹنوں کے بل جھک جاتے ہیں اور آنسوؤں کے سیل رواں کے ساتھ پوری طرح ان کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ مورخ تو دنیا میں موجود نہیں ہوتا مگر حوادث تاریخ جو وہ قلمبند کر چکا ہوتا ہے ایسے احساسات پیدا کرتا ہے گویا کہ تاریخ کے واقعات ہم اس کی زبان سے سن رہے ہوتے ہیں جیسے کہ ان کو بیان کرنے والا خود بیان کر رہا ہے۔

حقائق نگار مورخ کے حقیقت پسندانہ مقاصد کے لیے محض اسلوب تحریر کا نہیں بلکہ فلسفہ تاریخ کا زیادہ گہرا اور بنیادی عمل دخل ہے۔ حقائق نگار مورخ کو صرف ماضی کی یاد تازہ کرنا ہی مقصود نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ پڑھنے والے کے جذبات و تخیل کو ابھارنا چاہتا ہے اور نہ ہی وہ کوئی ڈرامائی، مصورانہ یا فنکارانہ ہیجان پیدا کرنا چاہتا ہے بلکہ وہ قاری کے عقل و احساسات کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ وہ ماضی کو تازہ نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس کی وضاحت پیش کرتا ہے۔ وہ مسائل کو برانگیختہ نہیں بلکہ ان کا حل پیش کرتا ہے۔ وہ انصاف کے آئینوں پر ظلم و بربریت کی حقیقی تصویر دکھاتا ہے۔ مثلاً" یزیدیوں نے امام حسین علیہ السلام پر کیوں کر ظاہری فتح پائی؟

واٹرلو کے میدان میں نپولین بونا پارٹ کو کیوں کر شکست ہوئی؟ جنگ عظیم دوئم میں امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر کیوں کر ایٹم بم گرائے؟

یہ اور اس قسم کے بہت سے تاریخی مسائل ہمارے ہر مورخ نے حل کیے ہیں حالانکہ ان کا اسلوب تاریخ نگاری بھی بڑا عمدہ تھا لیکن ان کے پیش نظر مسائل کا حل نہ تھا۔ یہاں پر مسائل کی توجیہات و حل کو پیش کرنے کے لیے اور "کیوں" کے بارے میں مطمئن کرنے کے لیے حقائق نگار مورخ سائنٹیفک مورخ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ اپنی تصویر میں حقیقت کا رنگ پیدا کرنے کے لیے مقامی معاشرتی شعور اور ذہنی بیداری سے کام لیتا ہے اور یوں فلسفی مورخ کا روپ بھی اختیار کر لیتا ہے۔

یہاں پر ماہیت تاریخ کا مسئلہ درپیش نہیں بلکہ نوعیت تاریخ کا مسئلہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیاسی و ادبی اور مذہبی و جمالیاتی تاریخ کا رسمی مورخ ماضی کو تاریکیوں کے سمندر سے نکال کر سطح پر لاتا ہے اور از سرنو زندہ کرتا ہے۔ اسے صرف ماضی سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ ماضی کے واقعات کے اتار چڑھاؤ کی کیفیتوں سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اسے درباروں کے حسین مناظر، پرشکوہ محلات و شاہی عمارات، شاہی رعب و دبدبہ، بہادریوں، عظیم الشان جلوسوں، فرمانوں، درباریوں کے قصوں سے دل بستگی ہوتی ہے۔ ان کے زنانہ و مردانہ کرداروں سے خاص تعلق ہوتا ہے۔ اس کا کردار اور روپ صرف ایک درباری قصہ گو مورخ کا سا رہ جاتا ہے۔ اور وہ تاریخ کی منصفانہ حقائق نگاری کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اس نظریہ پر بحث کرتے ہوئے جارج میکالے ٹریویلین کہتا ہے:

"ماضی کا سب سے بڑا سبق اور تاریخ کا اعلیٰ ترین موضوع انسان کا ارتقاء نہیں بلکہ وہ ہے جو کچھ اس نے حاصل کیا"

حقائق نگار مورخ یا سائنٹیفک مورخ یا فلسفی مورخ تاریخ کو ارتقائی عمل کا ایک جزو سمجھتا ہے اور یہی نقطہ نگاہ اس کے لیے دلچسپی کا مرکز ہوتا ہے۔ ہربرٹ بٹر فیلڈ کے الفاظ میں اس کے نزدیک:

"صرف وہی چیزیں قابل توجہ ہوتی ہیں جو صرف اس لیے اہمیت حاصل کرتی ہیں کہ انہوں نے ہمیں دوسری اشیاء کی منزل تک پہنچایا ہے۔"

گویا کہ حقائق نگار یا فلسفی مورخ یا سائنٹیفک مورخ تاریخ کے مختلف اعمال و کردار کو نمایاں کرتے ہیں۔ تاریخ کا جائزہ اگر اس کے بیان کی روشنی میں لیا جائے یا فلسفے کی حیثیت میں یا سائنس یا آرٹ کی حیثیت میں تو ان میں تاریخ کا جو بھی روپ ہو اس کا مقصد درست اور منصفانہ حقائق نگاری ہے۔ تاریخ ہمیں حقائق نگاری کے معیار، قدریں اور اصول بتاتی ہے جو عہد بہ عہد اور معاشرہ بہ معاشرہ بدلتے رہے بلکہ ایک نسل کے بعد دوسری نسل میں بھی ان کے اندر بڑی تبدیلی آتی گئی اور یہ سب کچھ تسلسل کے ساتھ آفاقی طور پر ہر معاشرے میں ہوا۔

تاریخی حقائق کے مقاصد

مختلف محققین نے تاریخی حقائق کے مقصد کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

(1) تاریخی حقائق کسی خاص تنقیدی نقطہ ہائے نگاہ کے حامل ہوتے ہیں اور نئے حقائق کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دریافت کی صحیح تشریح کرتے ہیں۔

(۲) تاریخی حقائق ایک فکری لائحہ عمل ہے جو کسی واقعہ کے معلوم کرنے میں اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کا آغاز سوالات سے ہوتا ہے جس سے معلومات حاصل کی جاتی ہیں پھر اس میں حقائق کی نوعیت کی پڑتال کے لیے مفروضات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

(۳) محققین کی رائے میں تاریخی حقائق ایسے مسائل کے حل کے لیے ایک محتاط اور تنقیدی جستجو ہے جو انسان کے لیے ہمیشہ سے پریشانی کا باعث بنے رہے۔

(۴) تاریخی حقائق تجسس کی پیداوار ہوتے ہیں اور ان کی تلاش میں مسائل کی تہہ تک پہنچنا ان کی افزائش کے لیے ضروری ہوتا ہے جو کہ حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں اور ہمارے طرز عمل میں نکھار پیدا کرتے ہیں۔

(۵) تاریخی حقائق سائنسی طریق تحقیق کی خاص شکل ہیں۔ ان کا نتیجہ حادثات و واقعات اور انسانی کردار کی بہتر عکاسی کی صورت میں ملتا ہے۔

(۶) تاریخی حقائق مکمل طور پر منطقی طریق کار ہے۔ اس میں اندازے اور گمان کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

(۷) تاریخی حقائق مشاہدات و تجربات سے حاصل ہونے والے مدلل مواد اور پوشیدہ حقائق و واقعات کو بے نقاب کرتے ہیں۔

(۸) تاریخی حقائق کسی مواد کو مقدار کے سانچے میں ڈھالتے ہیں جو بالآخر اصول و نتائج کی صورت میں محقق پر عیاں ہوتے ہیں۔

(۹) تاریخی حقائق تاریخی طور سے ایک نظریاتی اور عملی کام کو تیز کرنے کا ذریعہ ہیں۔

(۱۰) تاریخی حقائق ذاتی تجسس کی تسلی کرتے ہیں جس میں باضابطہ جستجو اپنے ماحول کے حالات کو قابو میں لاتی ہے۔

(۱۱) تاریخی حقائق دراصل سچائی کا نام ہے اور واقعات کی منزل کا تعین ان کا اصل مقصد ہے۔ اس سے مراد تلاش حق بھی ہے۔ اس میں صرف حقیقت کا جاننا ہی کافی نہیں بلکہ بامقصد حقیقت کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔

(۱۲) یہ مسائل کے حل کا ایک ایسا نظریاتی طریقہ ہے کہ جس میں سوچنے کا طرز عمل، تجاویز، اور آلات کا استعمال انعکاسی فکر، تنقیدی پہلو لیے ہوئے سرگرم عمل ہوتا ہے۔

تاریخی حقائق کے ان مقاصد سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسانی زندگی کا حقیقت و واقعات سے بہت گہرا تعلق ہے۔ تاریخی حقائق دراصل محنت طلب تفتیش اور منطقی فکر کے عمل کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نام ہے اور اس عمل کا تعلق ہر اس مسئلہ سے ہے جو انسانی زندگی اور اس کے روزمرہ معمول سے متعلق ہے۔ بلامقصد انسانی سرگرمیوں اور حالات و واقعات کی تحقیق و تفتیش اور جانچ پڑتال کو ہم تاریخی حقائق کا نام نہیں دیں گے کیونکہ ان کا مقصد تو کسی نظریے اور بنیاد کا کھوج لگانا ہے۔ نئے خیالات کو واضح طور پر متعین کرنے میں انسان کی راہنمائی کرنا ہے اور یہ مقاصد زندگی کو سمجھنے اور حاصل کرنے میں انسان کی مدد کرتے ہیں۔ ان کے نتائج کا اطلاق مستقبل پر ہوتا ہے اور یہ مظاہر قدرت کے متعلق پیشین گوئی بھی کرتے ہیں۔

حقائق کا تعین

Determination of Facts

حقیقت کی جمع حقائق ہے۔ اس کے معنی کسی شئے کی اصلیت، صداقت، ماہیت اور کیفیت سے آگاہ ہونا ہے۔ یا تاریخ میں حقائق سے مراد واقعات و حوادث کی سرگزشت، اصلیت و صداقت کا علم ہے۔ عمومی طور پر اس سے مراد ماضی کی دستاویزات، مخطوطوں، رپورٹوں، کتابوں اور دیگر تاریخی آثارات کی روشنی میں حقیقی تاریخ (Original History) کا مرتب و قلمبند کرنا ہے۔ اس میں تاریخ کے غیر مرتب خام مواد کو مرتب کر کے کوئی حقیقت، نتیجہ، نظریہ یا فلسفہ کا تعین کرنا ہوتا ہے۔

حقائق کو منظم کر دیا جائے تو تاریخ بن جاتی ہے۔ تاریخ میں سب سے اہم شے حقائق کی فراہمی ہے۔ بعض اوقات جو حقائق ایک شخص کو معلوم ہوتے ہیں وہ دوسرے کو بالکل لاتعلق نظر آتے ہیں۔ اگر ہم حقائق کو مربوط و منظم صورت میں حاصل کرنا چاہتے ہیں تو واقعات و مشاہدات سے حقائق کی فراہمی بذریعہ اصول فن تحقیق و تنقید حاصل ہو سکتی ہے۔ ہمارے پاس مخطوطے، ریکارڈ، دستاویزات، بیانات، کتابیں اور دیگر مواد و ماخذ ہوتے ہیں جو کتب خانوں، محافظ خانوں، ناظموں، سرکاری ملازموں، عدالتوں، قانون ساز اسمبلیوں اور سفارتی دستاویزوں میں موجود ہوتی ہیں۔ مورخ اور محقق ان تمام امور اور دستاویزات کا تاریخی نقطہ نظر سے جائزہ لیتا ہے۔ اس مواد میں اس کو بہت سی ایسی اشیاء نظر آتی ہیں جو عام آدمی کی نگاہ سے پوشیدہ ہوتی ہیں۔ شائد بعض ایسی اشیاء بھی جو تصویر بناتے وقت مصور کے ذہن میں بھی نہ تھیں۔ چونکہ تاریخی حقائق جزوی اور موضوعی ہوتے ہیں اور بخوبی گرفت میں نہیں آتے صرف مورخ اور نقاد ہی ان پر گرفت کر سکتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حقائق کی حیثیت موضوعی ہوتی ہے۔ ان کا وجود مورخ کے دل میں ہوتا ہے۔ اور ہر مورخ کے تعلق میں ان کا کردار بدل جاتا ہے مثلاً" فرانسیسی مورخ کے نزدیک "فرانس و پروشیا" کی جنگ کے سلسلے میں حقائق جو حیثیت رکھتے ہیں جرمن مورخ کے دل میں انکی حیثیت بالکل دوسری ہے۔ اسرائیلی ریاست کی تخلیق کے سلسلے میں یہودیوں اور عربوں کا نقطہ نگاہ متضاد ہے۔گویا حقائق کی حیثیت وہی ہے مگر ان کی تاویل و تشریح مورخین کی قومی' مذہبی اور معاشرتی اقدار و رجحانات کے مطابق ہوتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حقائق کو ہم کیسے جان سکتے ہیں؟ اور حقائق کی فراہمی کیسے ممکن ہے؟ آپ حقائق کو کسی ایک شکل میں منظم نہیں کر سکتے۔ جب تک کہ ان کے تعلق اور فراہمی کے بارے میں کوئی نظریہ قائم نہ کرلیں۔ یہ ظاہر ہے کہ حقائق کی تعبیر آپ کے انتخاب کردہ نمونے کی بنا پر ہوتی ہے۔ وہ نمونہ جو آپ نے اپنے سامنے رکھا ہوتا ہے۔

پہلی چیز جو حقائق کے تعین میں درکار ہے وہ متعلقہ حقائق کی فراہمی ہے۔ لیکن یہ امر واضح رہے کہ جو حقائق ایک شخص کو معلوم ہوتے ہیں وہ دوسرے کو بالکل بے تعلق نظر آئیں گے۔ دوسری چیز ان حقائق کی ترتیب و تنظیم ہے تاکہ یہ ایک مربوط شکل اختیار کر سکیں یہاں پر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ کوئی دو شکلیں لازماً" یکساں نہیں ہو سکتیں۔ مرسیدہ یہ عمل ایک دوسرے کے ساتھ ملتے جلتے ہیں۔ جو مورخ تجربہ کار ہے اسے عموماً" یہ احساس نہیں ہوتا کہ آخری فیصلے پر پہنچنے کے لیے کون کون سے قدم اٹھائے گئے۔ یہاں کسی خاندان کے جھگڑے کے متعلق محض دو کہانیاں سامنے رکھ لیجئے وہ کبھی ایک جیسی نہ ہوں گی۔ پھر ہم کیوں کر توقع رکھ سکتے ہیں کہ حقائق ہمیشہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ۱۲ اگست ۱۹۹۰ء کو عراق کے کویت پر قبضے اور ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ء میں امریکہ اور اس کے پینتیس اتحادیوں کی عراق کے خلاف جنگ کے متعلق پینتیس بیانات یا جنگ کے آغاز و مقاصد کے متعلق مختلف تعبیرات ایک جیسی ہوں گی؟ یہاں پر حقائق کی صداقت کو کیسے قائم کریں گے؟ کیونکہ تاریخ کوئی ایسی چیز نہیں جو انسان سے الگ حیثیت رکھتی ہو۔ یہ ایسی چیز ہے جو انسانی افکار و نظریات کو ہمارے سامنے لاتی ہے۔

حقائق کا تعین اور تنظیم و فراہمی کسی ایک مورخ کے ضبط و نظم میں نہیں آسکتی۔ مورخ حقائق کے تعین میں جن معلومات سے کام لیتا ہے انہیں مہیا کرنے کے ذمہ دار دوسرے افراد ہوتے ہیں جن پر وہ انحصار کرتا ہے۔ اس کے سامنے ایک ہی حقیقت یا واقعہ کے بارے میں مختلف نمونے مختلف شکلوں میں موجود ہوتے ہیں۔ ان کی تعبیر یا تعین یا انتخاب آپ اپنی پسند کے مطابق کریں گے جو آپ کے سامنے رکھا ہوا ہے۔ کوئی مورخ حقائق کے تعین میں زیادہ آگے نہیں جا سکتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حقائق کی معلومات کی فراہمی کا کام برسوں اور صدیوں سے اس کے لیے فراہم کیا جاتا رہا۔ اس کام کے ذمہ دار زیادہ طور پر وہ مورخ اور عالم تاریخ تھے یا وہ لوگ جو محافظ خانوں (Archives) کے ناظم تھے جہاں مخطوطے اور ریکارڈ محفوظ رکھے جاتے ہیں یا بعض کتب خانوں کے علم دوست ناظموں نے مخطوطے' دستاویزیں اور کتابیں جمع کرلیں۔ انہیں منظم کر کے بہ اعتبار اصناف الگ الگ کرلیا اور محفوظ رکھ لیا۔ بعض جگہوں پر بعض سرکاری ملازموں نے سرکاری اور ذاتی حیثیت سے عدالتوں' قانون ساز اسمبلیوں اور سفارتی سرگرمیوں کے ریکارڈ جمع کرلیے۔ بعض جگہوں پر بعض ایڈیٹروں نے دستاویزات اور ریکارڈ کو محفوظ کیا اور اب دور حاضر میں ان مورخوں' علماء' ناظموں اور علم دوست افراد کی کاوشوں اور محنت سے فراہم کئے گئے ریکارڈ کو سامنے رکھ کر حقائق کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ یہ ریکارڈ سالہا سال کی محنت کا نچوڑ ہوتے ہیں۔

حقائق کی ترتیب و تعین کے لیے اعلیٰ درجے کی ذہانت و محنت اور صحیح قوت فیصلہ درکار ہوتی ہے۔ دور قدیم سے لیکر دور حاضر تک سب سے بڑے مورخ وہی ہوئے جو حقائق کی تعبیر و تعین میں سب سے بڑے تھے۔ ان مورخوں نے حقائق کی تعبیر و تعین کے لیے ہمیشہ خاص کوششیں کیں۔ گویا انہوں نے تاریخ کے غیر مرتب خام مواد سے کوئی نہ کوئی معانی یعنی حقائق اخذ کرنے کے لیے پوری پوری تحقیق و جستجو کی یا اس پر کسی نہ کسی نظریے یا فلسفے کی مہر لگا دی۔ بڑے بڑے مورخوں اور مفکروں مثلاً" گبن' ہیوم' میکالے' ونسٹن چرچل' لارڈ ایکٹن' موٹیسیکو' روسو' والنیٹر' برک ہارٹ' ہیگل' اسپنگلر' مارکس' کارلائل' ٹائن بی اور ابن خلدون نے انتہائی درجے کی محنت و ذہانت سے حقائق کی تعبیر و تعین کر کے تاریخ کو ایک فلسفہ اور نظریہ دیا۔ حقائق کے تعین کے لیے ہنرمندانہ تنظیم' محنت' قوت فیصلہ' جدت' تخیل' فنکاری اور ذہانت درکار ہے۔ ہر تاریخی تصنیف کی قدر و اہمیت اس کے مواد کی تعبیر و تعین پر موقوف ہے[1]۔

کسی تصنیف کے مصنف اور داخلی تنقید کے بعد محقق حقائق کی تلاش کا کام شروع کرتا ہے۔ حقائق کو زیادہ منظم صورت میں حاصل کرنے کے لیے سائنسی اصول مشاہدہ کا سہارا لیا جاتا ہے کیوں کہ ہر سائنس کا اصول ہے کہ مشاہدے کے بعد نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے اور سائنسی نتیجہ محض ایک مشاہدے سے اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی ذہن تب ہی اطمینان محسوس کرتا ہے کہ جب کسی حقیقت کے لیے ایک سے زائد خود مختار مشاہدے حاصل نہ کرلیے جائیں۔ ان مشاہدوں کو ایک دوسرے کی تصدیق کرنی چاہیئے یا جن کی تصدیق بہت سے دیگر مشاہدے کریں گے۔ مورخ کے لیے یہی حقائق قابل اعتماد ہوں گے۔

کوئی بیان جسے مشاہدے کی حقانیت کے ساتھ غیر جانبدارانہ طور پر رقم کیا گیا ہو تاریخی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بیان کی حیثیت رکھتا ہے۔ مورخ اس کی تصدیق کے لیے اور بھی مشاہدات کر سکتا ہے۔ ان مشاہدوں میں غلطی کا امکان بھی ہو سکتا ہے۔ ہم انہیں اس وقت تک مکمل اور حتمی قرار نہیں دے سکتے جب تک دیگر تمام مشاہدے اس کی تصدیق نہ کریں۔ کیونکہ ہر صاحب مشاہدہ اپنے نظریئے کے مطابق مشاہدہ کرتا ہے اور پھر ان مشاہدوں کو اپنی پسند و ناپسند کا رنگ دے کر تحریر کرتا ہے۔ لیکن حقائق کے معلوم کرنے اور حقائق کے تعین میں کسی نے بھی غلطی نہیں کی۔[۳]

حقائق کو معلوم کرنے اور تعین کرنے میں غلطیاں عموماً" ذاتی نوعیت کی ہوتی ہیں جبکہ مشاہدہ اگر درست طور پر کیا ہو تو ہمیشہ درست ہی رہتا ہے۔ حقائق کا تعین کرنے کے بعد ہمارا کام حقائق کے انتخاب کا رہ جاتا ہے یعنی کہ مختلف مشاہدات و حقائق میں سے حقیقی حقائق کا انتخاب کیسے کیا جائے؟ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل امور مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

(۱) جب ایک ہی فرد نے واقعات و حوادث کا مشاہدہ کیا ہو تو ہم اس کے مشاہدہ کو مکمل طور پر قبول کرنے سے اجتناب کریں گے اور نہ ہی اس کے مشاہدات و بیانات سے کوئی حتمی نتیجہ اخذ کریں گے۔ یہاں پر ہمیں حقائق کی نوعیت کا بھی جائزہ لینا ہو گا۔ اور ایسے منفرد بیانات و مشاہدات کو مصنف کے نام کا حوالہ دے کر لکھ دیا جائے گا کہ ان کی تصدیق کہیں اور نہیں ہوتی۔

(۲) جب ایک واقعہ کے بارے میں مختلف مشاہدات و بیانات ہوں تو ان میں سے متضاد نوعیت کے بیانات و مشاہدات کو داخلی و خارجی تنقید کے ذریعے حقائق کے دائرہ کار سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ ہم انہیں بیانات و مشاہدات مشکوک نظر آئیں اور کوئی بھی ان میں سے معیار تنقید پر پورا نہ اترے تو ہم انہیں قبول کرنے سے اجتناب کریں گے یا انہیں مشکوک صحت مشاہدات لکھ دیں گے۔

(۳) اگر تمام مشاہدات و بیانات یکساں و متفقہ ہوں تب ہمیں یہ جائزہ لینا ہو گا کہ کیا ان کے ماخذ و بنیاد آزاد و خود مختار مشاہدے پر مبنی ہے؟ یا کیا یہ بیانات و مشاہدات ایک ہی ذرائع سے حاصل و نقل کیے گئے ہیں؟ ان امور کا جائزہ لینے کے بعد ہمیں حقائق کا تعین کرنا ہو گا۔

مصنف کے بیانات و مشاہدات جب تحقیقی و تنقیدی میزان سے گزرنے کے بعد حقائق کی حیثیت اختیار کرتے ہیں تو انہیں مناسب ترتیب و تدوین کے بعد تاریخی کتاب کی صورت دے دی جاتی ہے۔ اگرچہ تحقیق و تنقید کا طریقہ کافی دشوار، طویل اور محنت طلب ہے مگر محقق کو حقائق کے تعین کے لیے جانفشانی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں معمولی سی لغزش بھی حقائق کے تعین و تلاش میں کافی دشواریاں پیدا کر سکتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب حقائق کو مرتب کیا جاتا ہے تو ان کی عمومی حالت مختلف امور آشکار کرتی ہے۔

(۱) تاریخی حقائق کی ترتیب کے دوران مسودے سے ہم طرز تحریر، زبان، انشاء، عقائد و نظریات، روایات اور واقعات کی نوعیت کا جائزہ لیتے ہیں۔

(۲) تاریخی حقائق اپنے عہد اور اس کی اقدار کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان اقدار کا اطلاق صدیوں تک قوموں پر ہوتا ہے مثلاً" قوموں کے عقائد اور رسوم و رواجات وغیرہ۔

(۳) تاریخی حقائق مقامی ہوتے ہیں ان کا تعلق مخصوص وقت اور ملک سے ہوتا ہے۔ اگر وقت اور مقام کو خارج کر دیں تو حقائق کا تاریخی کردار ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہم انہیں وقت اور مقام کے مطابق اکٹھا کرتے ہیں۔

(۴) حقائق اپنے آپ کو تنقیدی امکان کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ جب یہ براہ راست مشاہدے میں ہوتے ہیں تو خود تفتیش و تحقیق کا جواز و سوال پیدا کر لیتے ہیں اور ایک تحقیقی فارمولے کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ محقق اصول تحقیق کے مطابق ان کا تجزیہ کر کے نتائج پیش کرتے ہیں۔

(۵) مصنف مادی آثارات و شواہد کا جائزہ و تجزیہ طبعی مشاہدے کے مطابق کرتا ہے۔ اس طرح ۔۔ مادی حقائق کا تعین ہم مصنف کے ذاتی علم اور تصورات و احساسات کے ذریعے کرتے ہیں۔

حقائق اور مشکلات

تاریخ ثابت شدہ حقائق سے مرتب کی جاتی ہے لیکن بعض حقائق اس قسم کے ہوتے ہیں کہ انہیں شامل تاریخ نہیں کیا جا سکتا۔ جب انہیں تحقیق و تنقید کے اصولوں کے مطابق پرکھا جاتا ہے تو بعض معلومات سے خالی ہو جاتے ہیں جن سے مربوط قسم کی تاریخ وضع کرنا بہت مشکل ہے۔ اگر صرف حقائق کو ہی جوڑا جائے تو حالات و واقعات میں واضح خلاء پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے محقق کو ایک معیاری تاریخ مرتب کرنے میں بڑی دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ایسے حالات میں محقق مخصوص تعمیری دلائل کا طریقہ کار اپنا کر ضمنی حقائق تلاش کرتا ہے جو حقیقی حقائق سے مختلف نہیں ہوتے۔ محقق تعمیری بحث میں غیر ثقہ مشاہدات سے اجتناب کر کے خارجی و داخلی تنقید کا سہارا لیتا ہے۔

جب ہم تاریخی حقائق کی درجہ بندی کرتے ہیں تو بعض دستاویزات و مسودات خالی جگہوں کو پر کرنے میں مدد نہیں دیتے۔ بہت سے سوالات ایسے ہوتے ہیں جن کا دستاویزات براہ راست جواب دیتی ہیں۔ ایسی چیزیں [illegible] علوم میں شامل ہوتی ہیں تو [illegible] مشاہدات ان وقفوں کو پر کرتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں۔ لیکن تاریخ میں جب ہمیں ایسے ذرائع میسر نہیں آتے تو ہم بذریعہ تاریخی دلائل اپنا علم بڑھاتے ہیں اور ایسے حقائق سے ابتداء کرتے ہیں جن کا ہمیں علم ہوتا ہے۔ اگر تاریخ میں یہ تعمیری دلائل درست ہوں تو علم تاریخ حاصل کرنے کے لیے یہ بہترین ذریعہ ہے۔

ایک نقطہ نگاہ کے مطابق حقائق محدود ہیں۔ دوسرے نقطہ نگاہ کے مطابق یہ بے شمار اور لاتعداد ہیں ماضی کے سلسلے میں وسیع علاقے موجود ہیں۔ جن کے متعلق ہمیں بہت کم حقائق معلوم ہیں۔ ماضی کے بہت سے انسانی معاشروں یا ان کے بہت بڑے حصوں کے متعلق ہمارا علم محدود ہے۔ مثلاً" کولمبس سے پہلے کے امریکہ کے باشندوں کے بارے میں بہت تھوڑا علم ہے۔ اسکندر اعظم کی فتح ہندوستان سے پیشتر یہاں کی قوموں کے متعلق بہت کم معلومات ہیں۔ اسی طرح افریقہ اور ایشیاء کی دیگر اقوام کے بارے میں بہت کم آگاہی ہے۔ ماضی قدیم کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ ماضی قریب کے بارے میں زیادہ علم ہے۔ ان حقائق کی بنا پر ہم دنیائے قدیم کو کس طرح یقین کے ساتھ تعمیر کر سکتے ہیں۔ ہمارا علم زیادہ تر ان چھوٹے علاقوں کے متعلق زیادہ یقینی حقائق پر مبنی ہے جو بحیرہ روم کے ارد گرد واقع ہیں۔ ان کے متعلق حقائق کو ہم اعتماد کے ساتھ تاریخ قدیم قرار دیتے ہیں۔ ہم امریکی علاقوں کی تاریخ قدیم یقین کی بنا پر نہیں لکھ سکتے کیونکہ ان کے ماضی کے حقائق معلوم نہیں۔ ماضی بعید کے حقائق کا انحصار کچھ پرانی داستانوں اور کچھ آثار قدیمہ پر ہے۔ دس ہزار سالہ انسانی تاریخ میں سے ہمارا زیادہ سے زیادہ علم پانچ صدیوں کے حقائق و معلومات پر مشتمل ہے۔ حقیقت ہے کہ یہ بہت محدود علم ہے۔ دور حاضر میں بھی ہمیں عام لوگوں، غریبوں اور مزدوروں کی زندگیوں کے متعلق اول تو کچھ معلوم نہیں ہے کیونکہ ان کے بارے میں ہمارے پاس کوئی تحریری ریکارڈ، معلومات اور حقائق موجود نہیں ہیں۔ اگر کچھ تھوڑا بہت معلوم ہے تو وہ سطحی، غیر یقینی اور نامکمل ہے۔ اسی طرح ہر قوم و نسل کی ایک بڑی اکثریت کے بارے میں ہم قابل اعتماد حقائق سے یکسر محروم ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ہم ماضی کے متعلق حقائق کی بنا پر مکمل اور صحیح معلومات شاذ و نادر ہی حاصل کر سکتے ہیں؟ اس حقیقت کا تعلق ماضی قریب کے ریکارڈ سے بھی ہے جو لوگ اس صورت حال سے آگاہ نہیں وہ تاریخ میں تمام حقائق کو درست مان لیتے ہیں جیسے علم کیمیا اور طبیعیات میں ہر چیز کو درست تسلیم کیا جاتا ہے لیکن جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے جب آپ ماضی کے حقائق کو مرتب کرنا شروع کرتے ہیں تو جلد ہی آپ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ مختلف حقائق کی صحت کس قدر مشکوک ہے اور وہ کتنے ناقابل حصول ہیں مثلاً" ہمیں معلوم نہیں کہ ماضی میں لوگ پیدائش و اموات کا حساب کیسے رکھا کرتے تھے اور حکومتیں شہروں اور آبادیوں کی گنتی کا شمار کیسے کرواتی تھیں؟ جنگیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیونکر ہوتی تھیں اور جنگوں کے مقتولین و مجروحین کے اعداد و شمار کیا تھے؟ ہمیں پیداوار کی مقدار، جنسوں کی قیمت، دیہی صنعتوں اور تجارت کے متعلق بھی زیادہ حقائق کا علم نہیں۔ اگرچہ دور حاضر کی تاریخ میں بھی اکثر اعداد و شمار ہماری مدد نہیں کرتے مثلاً" تقسیم ہندوستان اور تخلیق پاکستان کے وقت مقتول مہاجرین کی ٹھیک تعداد کیا تھی؟ کس قدر مسلمان خواتین ہندوؤں اور سکھوں کے جبر کا نشانہ بنیں؟ اور مہاجر مسلمانوں کا اس تقسیم میں کل مالی نقصان کتنا ہوا؟ یہ حقائق دریافت طلب ہیں اور ہم حقائق کی تلاش میں قیاسات سے مدد لیتے ہیں۔

تاریخی حقائق جزوی اور موضوعی ہوتے ہیں اور آسانی کے ساتھ گرفت میں نہیں آتے۔ لیکن یہ حقیقت ان میں اکثر علوم کے بارے میں درست ہے جن کا واسطہ انسان اور اس کی سرگرمیوں سے ہے مثلاً" فن، اخلاق، قانون اور سیاسیات وغیرہ۔ ہمیں یہ توقع نہ رکھنی چاہئے کہ بہت سے دوسرے علوم سے تعلق رکھنے والوں کے مقابلے میں مورخ کے لیے حقائق کے حصول کی منزل آسان ہو جائے گی۔ جو لوگ ماضی کے قوانین، اصولوں اور یادگاروں کو فکر و جذبات کے ذریعے اپنے عہد کے حقائق کے ساتھ مناسبت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ ان کی گرفت میں نہیں آتے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حقائق واقعی گرفت میں نہیں آتے تو کیا ہم تاریخ نگاری کو ترک کر دیں؟ یہ بیان مبالغہ آمیزی پر مبنی ہے۔ حقائق کے حصول کی مشکلات اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ ہمیں حقائق کی تلاش کا کام جاری رکھنا چاہئے اور حقائق کے حصول کے اصولوں، قاعدوں اور بنیادوں کے مطابق کام کرنا چاہئے۔ تاریخ کے عام ڈھانچے کو قبول کرتے ہوئے اس میں حقائق نگاری کرتے رہنا چاہئے کیونکہ ہمیں اس ڈھانچے کو فعال و متحرک بنانے کے لیے، اس میں زندگی کی حرارت بھرنے کے لیے حقائق کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم سے پہلے بھی مورخین کو حقائق کے حصول میں مشکلات درپیش تھیں۔ ان سب مشکلات کے باوجود انہوں نے ہمیں اعلیٰ درجے کی تاریخ عطا کی ہے۔ گبن، میکالے، رانکے، مومسن، میٹ لینڈ، ہنری ایڈمز، کارلائل، ٹائن بی اور برٹرنڈرسل ان سب کو حقائق کی مشکلات کا احساس تھا لیکن سب نے تاریخ کی عظیم کتابیں مرتب کیں۔ جن کی بدولت لوگوں کے فکر و خیالات میں تبدیلی و وسعت پیدا ہوئی اور نسلوں کی روحوں میں تازگی آئی۔ مورخ کو یونانی تاریخ ادب کے ان مشہور شعروں کو ذہن میں رکھ کر حقائق نگاری پر عمل پیرا ہونا ہو گا۔

"تباہ شدہ جہاز کا ملاح جو اس ساحل پر دفن ہوا
تمہیں آواز دیتا ہے کہ (اپنے جہازوں کے) بادبان کھول دو
بے شک ہم تباہ ہو گئے لیکن بہت سی کشتیاں کنارے
پر پہنچ گئیں طوفانوں سے گزرتی ہوئی۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چودھواں باب

حوالہ جات

1. Allan Nevins, The Gateway To History, (London, ۱۹۳۸) PP, ۳۵۰ - ۳۵۱

2. Deobold B. Van Dalen, Understanding Educational Research, (New York, ۱۹۶۲), PP, ۴۵ - ۴۹

3. Arthur Marwick, The Nature of History, (London, ۱۹۸۹), PP, ۱۹۴ - ۱۹۸

4. غیر سرکاری اندازوں کے مطابق ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہندوستان کے وقت مہاجر خاندانوں کی پچانوے ہزار کے لگ بھگ مسلمان خواتین کو ہندوؤں اور سکھوں نے جبراً" روک لیا۔ وہ دوبارہ' کبھی بھی اپنے بچھڑے ہوئے خاندانوں سے نہیں مل سکیں۔ پاکستان کی نئی نسل اس حقیقت سے کم آگاہی رکھتی ہے اور پرانی نسل اس ناقابل فراموش حقیقت کو درحقیقت فراموش کر چکی ہے۔ یہ تلخ تاریخی حقائق قصہ پارنیہ بن کر ماضی کی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پندرھواں باب

فلسفہ تاریخ

Philosophy of History

تاریخ کا مختلف پہلوؤں اور نقطہ نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے فلسفہ کو سمجھا جائے کہ فلسفہ کیا ہے؟ فلسفہ تاریخ سے کیا مراد ہے؟ اور کیا تاریخ ایک فلسفہ ہے؟

فلسفہ کے لغوی معنی تو علم و حکمت اور دانائی کے ہیں۔ عام طور پر جب ہم کسی مسئلے اور واقعہ کے بارے میں سوچتے ہیں' فکر سے کام لیتے ہیں' اسے صحیح یا غلط ثابت کرنے کے لیے دلائل' اصول اور قوانین کا سہارا لیتے ہیں تو فکر و دلائل کے انہی اصولوں کو فلسفہ کہتے ہیں۔ یعنی افکار جب تنظیم پاتے ہیں تو فلسفہ کہلاتے ہیں۔ گویا فلسفہ کا تعلق فکر (Thought) سے ہے اور علم تاریخ بھی فکر سے بحث کرتا ہے۔ مگر دونوں کے نقطہ ء نظر میں فرق ہے۔ علم تاریخ کا کام یہ دیکھنا ہے کہ ہم کس طرح سوچتے ہیں؟ جبکہ فلسفہ کا کام یہ دیکھنا ہے کہ کس طرح سوچنا چاہئے؟ یا ہماری فکر و استدلال کو کیسا ہونا چاہئے؟

فلسفہ صحیح فکر کے قوانین کا مطالعہ کرتا ہے۔ قوانین صحیح فکر وہ ہوتے ہیں جنہیں دانستہ یا نادانستہ طور پر بدلا نہ جا سکتا ہو مگر توڑا جا سکتا ہو۔ اسی لیے فلسفہ کا سہارا لیتے ہیں۔ صحیح قوانین فکر آج بھی ایسے ہی اٹل ہیں جیسے کہ آج سے ہزاروں سال پہلے تھے اور آئندہ بھی ایسے ہی اٹل رہیں گے مثلاً یہ ایک قانون فکر ہے کہ ایک ہی شئے میں دو متضاد صفات (Contradictory attributes) ایک ہی وقت میں نہیں پائی جا سکتیں مثلاً ایک رنگ بیک وقت سیاہ اور سفید نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص ایک ہی وقت میں مسلم اور غیر مسلم نہیں ہو سکتا۔ غرضیکہ قوانین فکر توڑے جا سکتے ہیں' بدلے نہیں جا سکتے۔ انسانی اور معاشرتی اعمال و افعال کے قوانین توڑے بھی جا سکتے ہیں اور بدلے بھی جا سکتے ہیں مگر قوانین فطرت نہ توڑے جا سکتے ہیں اور نہ ہی بدلے جا سکتے ہیں۔

تاریخ کا تعلق صحتِ حقائق سے ہوتا ہے اور فکر کا تعلق بھی حقائق سے ہوتا ہے۔ صحت فکر کے لیے لازمی ہے کہ فکر میں خود اپنی تردید نہ پائی جائے۔ لہٰذا اگر ہماری فکر حقائق کے مطابق نہیں تو غلط ہے۔ فکر کا حقیقت کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ جس طرح تمام علوم اپنے حقائق (Facts) کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی طرح تاریخ انسانی سرگرمیوں کے اسباب یا حقائق کو دریافت کرنے میں دلچسپی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رکھتی ہے۔ ان حقائق کو معلوم کرنے کے لیے اصول فکر سے بھی کام لیتی ہے تاکہ حقائق کو درست اور صحیح طور پر معلوم کیا جائے۔ فکر کے اصولوں کو ہم اپنی روز مرہ زندگی میں استعمال کرتے ہیں۔ اپنی اور دوسروں کی غلطیاں نکالتے ہیں۔ لہٰذا فلسفہ تاریخ کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ہم غلطیوں سے بچ سکتے ہیں۔

فلسفہ تاریخ کی اصطلاح خاصی مبہم ہے۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں یا دو میں سے ایک۔ اول کا مطلب وہ فلسفہ ہے جو تاریخ کا مطالعہ کرنے والا اپنے ساتھ لاتا ہے یعنی تاریخ کی اپنے افکار و نظریات کے مطابق ایسی تعبیر پیش کرتا ہے کہ جس کے متعلق اسے اعتماد ہوتا ہے کہ تاریخ اس کے نظریات کے مطابق ڈھل جائے گی یا ان سے تطابق پیدا کرے گی۔ دوسرا اس سے مراد وہ فلسفہ ہے جو تاریخ کا مطالعہ کرنے والا اس سے حاصل کرتا ہے اور اس کے ساتھ وہ خود تطابق پیدا کرتا ہے۔

تاریخ کے ہر دور میں فلسفی مورخین نے تاریخ کے فلسفیانہ نظریات پیش کئے مثلاً سینٹ آگسٹائن نے تاریخ کو تقدیر کے تابع قرار دیا۔ یعنی تاریخ انسان کے ساتھ خدا کی مرضی کے مطابق کام کرتی ہے۔ ہیگل نے تاریخ کے متعلق اضدادیت کا تصوراتی فلسفہ پیش کیا۔ کارل مارکس نے تاریخ کو مادی مقاصد کے لیے جدوجہد کی کہانی قرار دیا۔ **اسپنگلیر** نے تاریخ کے نامیاتی قوانین کا تصور ایسے انداز میں پیش کیا کہ تاریخ ایک دائرہ کے اندر گردش کرتی دکھائی دیتی ہے۔ آرنلڈ ٹائن بی نے تاریخ کو تہذیبوں کے ظہور، نشوونما اور انتشار کے قدرتی آفاقی اصولوں کی شکل میں پیش کیا۔

ہم تاریخ کے ان مختلف فلسفوں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ فلسفہ تاریخ حد درجہ وسیع اور انتہائی پر پیچ ہے۔ اس کا مقصد تاریخ کے مواد کو ایک منظم فارمولے کی شکل میں پیش کرنا ہے تاکہ تاریخ کو درپیش مسائل کا کوئی حل نکالا جائے۔

ہم تاریخ پر اپنا ارادہ اور حکم مسلط نہیں کر سکتے اور نہ ہی اسے مجبور کر سکتے ہیں کہ یہ ہمارے نظریات کو قبول کرے اور ان کے مطابق چلے۔ فلسفہ تاریخ کے ریکارڈ میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے یہ نتیجہ نکالیں کہ ہمیں کبھی تاریخ کا ایسا مفہوم بھی مل سکے گا کہ جس پر سب مورخ متفق ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخی فلسفوں کی تعدد اور علماء تاریخ کا اس کے معانی پر عدم اتفاق یہ ظاہر کرتا ہے کہ فلسفہ تاریخ سے پیدا نہیں ہوا، بلکہ تاریخی حالات سے پیدا ہوا یا فلسفی مورخوں کے مزاج سے معرض وجود میں آیا۔ صدیوں سے فلسفی مورخ اب تک کسی ایسے فلسفہ پر نہیں پہنچ سکے کہ جس پر عموماً" سب کا اتفاق ہو۔ ہم تاریخ سے کوئی ایسی توقع کیوں رکھیں کہ یہ کسی ایسے مستند فلسفے کو پیش کرے کہ جس کے غور و فکر سے کسی مشترکہ نتیجہ یا مقصد پر پہنچ سکیں۔ جب کہ ہم مذہب، سیاسیات، یا تعلیم کے مستند فلسفے مہیا نہیں کر سکے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جی- ایم ٹریویلین کا کہنا ہے کہ:

"فلسفہ ایسی چیز نہیں کہ جسے آپ داخل تاریخ کریں بلکہ یہ چیز تو آپ کو تاریخ سے لینی چاہئے- اگر ہم تاریخ پر اپنے ارادے مسلط نہیں کر سکتے تو ہمیں یہ جائزہ لینا ہو گا کہ آیا تاریخ ہم پر فلسفیانہ نظریات عائد کر سکتی ہے-"

فلسفہ تاریخ درحقیقت ایک فکر اور اسلوب گفتار ہے- یہ کوئی مادی شے نہیں کہ جس سے نمونے ترتیب پاتے ہیں- یہ وہ حکیمانہ منشور اور اصول ہیں کہ جن سے تاریخ کے معمے حل ہوتے ہیں بلکہ نتائج نکلتے ہیں- جب ہم فلسفہ تاریخ کی بات کرتے ہیں تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تاریخ کے کسی دور کا ایسا وسیع مطالعہ اور گہرا غور و فکر پیش کریں جو بعض حقائق اور ان کے نتائج کو سامنے لے آتا ہے، جو خاص مقصد اور قدر و قیمت کے ہوتے ہیں بشرطیکہ مورخ سیاسی فلسفے کا شعور رکھتا ہو اور اسے سمجھتا ہو- اگرچہ فلسفہ تاریخ کے فیصلے اور معاملات سائنسی نقطہ نگاہ سے پختہ نہیں سمجھے جا سکتے مگر ان کی حیثیت ایک سند کی سی ہو سکتی ہے جو مورخ کے تاریخی شعور، شہرت اور پیشہ ورانہ کردار کے اعتبار سے متعین ہو گی- یہ صورت حال ان تمام غیر سائنسی علوم کی بھی ہے جن کے ساتھ صدیوں سے اعلیٰ تعلیم یافتہ، حکیم و دانا اور عالم و فاضل لوگ وابستہ ہیں جو ایسے معاملات پر متفق ہوں جنہیں عمومیت کی سند حاصل ہو تو کیا ہم ان کے درجہ احترام (علوم و افراد) کے مطابق انہیں حق بجانب نہ سمجھیں گے-

جب ہمیں کوئی ایسی چیز مل جاتی ہے جس کے متعلق ہم عملی تجربہ کر سکتے ہیں تو وہ چیز فوراً سائنس کے زمرے میں داخل ہو جاتی ہے- لہٰذا ہم ایسی باتوں اور حقائق کو فلسفہ کا نام دیتے ہیں جن کے اسباب ہمیں معلوم نہیں ہوتے- انہیں فکر و قیاس سے معلوم کرنا ہوتا ہے مثلاً سبب تخلیق کائنات ایسا معاملہ ہے جس کا سراغ ہم ابھی تک نہیں لگا سکے کیونکہ ہم کسی عملی تجربہ گاہ میں جا کر دوسری کائنات نہیں پیدا کر سکتے- اس لیے سبب کائنات کے معاملے میں ہمیں قیاس پر اکتفا کرنا پڑے گا- لہٰذا فلسفے کا دارومدار انسان کے فکر اور حافظے پر ہے-

سترھویں صدی میں ایک انگریز مفکر لارڈ بالنگ بروک (۱۶۷۸-۱۷۵۱ء) نے کہا تھا کہ

"واقعات ماضی کے مطالعہ کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ ایک ایسا فلسفہ ہے جو مثالوں کے ذریعے سے تعلیم دیتا ہے-" ہیروڈوٹس سے لیکر ٹائن بی تک تمام بڑے بڑے مورخوں کی یہی رائے ہے کہ تاریخ فلسفہ بھی ہے- عہد نامہ قدیم کی کہانیوں میں بھی تاریخ فلسفہ ہی تھی- دور حاضر کے اکثر مورخوں نے بھی بالنگ بروک کا یہ [illegible]یم لیا ہے-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مونٹیسکو[1]، والٹیئر[2]، گبن[3]، ڈیوڈ ہیوم[4]، ہیگل[5] اور ٹائن بی[6] نے بھی تاریخ کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ کچھ مورخین نے زمانہ حال میں تاریخ کے فلسفیانہ دعویٰ سے اختلاف کیا ہے لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو پائے کیونکہ فلسفہ سامنے کے دروازے سے باہر نکلا اور پچھلے دروازے سے پھر آہستہ آہستہ اندر گھس آیا۔ لوگ تاریخ کے فلسفیانہ انداز کو پسند کرتے ہیں۔ اور یہ کوئی اتفاقی امر بھی نہیں کہ ہمارے عہد کے لوگوں میں بھی تاریخ کی فلسفیانہ حیثیت کو مقبولیت حاصل ہے بلکہ بابائے تاریخ ہیروڈوٹس سے لیکر آج تک سبھی تاریخ کی فلسفیانہ رائے سے متفق ہیں۔ دور حاضر میں ایچ۔ جی ویلز، ای۔ ایچ کار، چرچل، ٹائن بی، **اسپنگلر**، جارج برینڈس، بنی ڈیٹو کروچے اور دیگر بہت سے جرمن، فرانسیسی، برطانوی اور امریکی مورخوں نے تاریخ کو فلسفے ہی کی حیثیت میں لکھا ہے۔

مسلمان مورخین میں ابن خلدون نے تاریخ کو فلسفہ کے رنگ میں نہ صرف قلم بند کیا بلکہ فلسفہ تاریخ کے اصول بھی وضع کیے۔ **اسپنگلر** اور ٹائن بی نے ابن خلدون کے ہی وضع کردہ فلسفہ تاریخ کو بنیاد بنا کر تہذیبوں کے عروج و زوال کا نظریہ پیش کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بہت کم مورخ فلسفی ہوئے ہیں جنھوں نے تاریخ کو فلسفیانہ اسلوب میں تحریر کیا ہے۔ اکثر مورخین کا انحصار رسمی تاریخ نویسی پر رہا ہے۔ وہ تاریخ میں سادہ سے سبق دیتے رہے ہیں مثلاً یہودی مورخ، یہودی مذہب کی دوسرے مذاہب پر برتری، عیسائی مورخین کے نزدیک مسیحیت کی برتری اور مسلمان مورخین دین اسلام کی دوسرے مذاہب پر برتری کا درس دیتے ہیں۔ اسی طرح رسمی مورخ، رسمی تاریخ میں بدی پر نیکی کی فتح، ایثار و قربانی کے درس، بے وفائی و برائی کے خطرات، فرقہ واریت اور عدم رواداری، بادشاہوں کے کردار کی عظمت و برائیاں، انسان کی بد عملی و بدافعالی، انسانی جذبات پر پابندیاں یا آزادی، سلطنتوں کا عروج و زوال اور اس کے اسباب وغیرہ بیان کرتے رہے ہیں۔ یہ اور اسی قسم کے اور بھی بہت سے سادہ، عام فہم اور مشتبہہ سبق روایتی انداز میں پیش کرتے رہے ہیں۔

رسمی اعتبار سے بہت کم مورخ فلسفی ہوئے ہیں۔ لیکن آج کے دور میں تاریخ نے اپنا دائرہ کار وسیع کر لیا ہے۔ اب اس میں مفکرین، فلسفیوں اور سائنس دانوں کے نظریات و افکار شامل ہو گئے ہیں اور اس میں عقل و دانش کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ تاریخ کا یہی وہ روشن پہلو ہے جو ہمارے لیے زیادہ دلکش اور جاذب نظر ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پندرھواں باب

حوالہ جات

(1) Montesque, Spirit of the Laws; The Grand year and the kindness of Rome

(2) Voltaire, Age of Louis XIV

(3) Gibbon, The Decline and Fall of The Roman Empire.

(4) David Hume, History of England

(5) Hegel, Philosophy of History.

(6) Toynbee, A study of History.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کتابیات

صرف ان کتب کو شامل کیا گیا ہے جن کا حوالہ موجود ہے۔

الحاج مولوی فیروز الدین فیروز اللغات' لاہور' ۱۹۹۰ء

ایڈن اے۔ برٹ' فلسفہ مذہب' (مترجم بشیر احمد ڈار)' لاہور' ۱۹۶۳ء

آرنلڈ جے ٹائن بی' مطالعہ تاریخ' (مترجم غلام رسول مہر)' لاہور' ۱۹۶۳ء

انقلابات عالم' ادارہ تالیف و تصنیف' شیخ غلام علی اینڈ سنز' لاہور' ۱۹۶۰ء

بھائی پرمانند جی' تاریخ یورپ' لاہور' ۱۹۴۰ء

جارج سارٹن' مقدمہ تاریخ سائنس' (مترجم سید نذیر نیازی)' لاہور' ۱۹۵۰ء

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی' تہذیب و تخلیق' اسلام آباد' ۱۹۸۷ء

ڈاکٹر شیخ محمد اکرم' رود کوثر' لاہور' ۱۹۵۴ء

ڈاکٹر مبارک علی' تاریخ کے نظریات' لاہور' سن ندارد

سید علی عباس حسینی' ناول کی تاریخ اور تنقید' لکھنؤ' ۱۹۴۲ء

سید نور احمد' مارشل لاء سے مارشل لاء تک' لاہور' ۱۹۷۰ء

صادق علی گل' سرگذشت تاریخ' لاہور' ۱۹۷۱ء

ضیاء الدین برنی' تاریخ فیروز شاہی' (مترجم ڈاکٹر سید معین الحق)' لاہور' ۱۹۶۷ء

ظہیر الدین بابر' تزک بابری' (مترجم رشید اختر ندوی)' لاہور' ۱۹۶۵ء

علامی ابوالفضل' آئین اکبری' (مترجم مولوی محمد فدا علی صاحب طالب)' لاہور' ۱۹۸۸ء

علامہ عبدالرحمٰن بن خلدون' مقدمہ ابن خلدون' (مترجم مولانا راغب رحمانی دہلوی)' کراچی' ۱۹۷۷ء

علامہ جریر الطبری' تاریخ طبری' (مترجم مولوی سید ابراہیم)' جامعہ عثمانیہ' حیدر آباد' ۱۹۲۹ء

علامہ محمد اقبال' اسرار و رموز' لاہور' ۱۹۴۰ء

علامہ شبلی نعمانی' سیرۃ النبی' لاہور' ۱۹۶۵ء

محمد حبیب و بیگم افسر عمر سلیم خاں' ضیاء الدین برنی: سلاطین دہلی کا سیاسی نظریہ' دہلی' ۱۹۷۹ء

ملا عبدالقادر شاہ بدایونی' منتخب التواریخ' (مترجم محمود احمد فاروقی)' لاہور' ۱۹۶۷ء

نور الدین جہانگیر' تزک جہانگیری' (مترجم اعجاز الحق قدوسی)' لاہور' ۱۹۶۸ء

ول ڈیورانٹ' تاریخ کیا سکھاتی ہے' (مترجم ظفر الحسن پیرزادہ)' لاہور' ۱۹۹۰ء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

BIBLIOGRAPHY

Aristotle, Metaphysics, trans. W.D. Ross, ed. Jonathan Barnes, Princeton, N.J., 1984.

Baker, Ernest, Social Contract, New York, 1960.

Barnes, Harry Elmer, A History of Historical Writing, New York, 1963.

Benjamin, Jules R.A., Students's Guide to History, New York, 1979

Bernal, Science In History, New Jersey, 1952.

Block, Marck, A Student's Guide to History, New Jersey, 1978.

Brightman , E.S., An Introduction to Philosophy, New York, 1951.

Brinton, The World of History, New York, 1962.

Burckhatd, Judgement On History And Historian, New York, 1960.

Burian, R.M., eds., Rationality, Relativism and the Human Sciences, Dordrecht, 1986.

Bury, J., The Idea of Progress, New York, 1956.

Caesar, The civil War, Trans. Jane F. Mitchell, New York, 1980.

Callingwood, R.G., The Indea of History, London, 1966.

Cantor, Norman F., How to Study History, New York, 1967.

Cantor, Norman F. and Schneider, Richard I., How to Study History, New York, 1967.

Carlyle, Thomas, On Heroes, Hero - Worship, and the Heroic in History, New York, 1907.

Carr, E.H., What Is History, London, 1968.

Chambers, Mortimer, Greek And Roman History, Washington. D.C.. 1958.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Childe, V. Gorden, What Is History? New York, 1968.
Childe, V. Gorden, What Happened In History, London, 1972.
Cicero, Selected Political Speches, Trans. Michael Grant, New York, 1969
Conkin, Paul K. and Stromberg, Roland N., the Heritage and Challenge of History, New York, 1971.
Croce, History : Its Theory and Practice, New York, 1958.
Croce, History as the Story of Liberty, New York, 1950.
Crump, C.G., History and Historical Research, London, 1928.
D'arcy, M.C., the Meaning and Matter of History, New York, 1961.
Dray, William H., Philosophy of History, Toronto, 1964
Egner, Robert, ed., The Basic Writings of Bertrand Russell, New Jersey, 1961.
Elton, G.R., The Practice of History, Sydney, 1967.
Fedren, Materialist Conception of History, New York, 1950.
Finberg, H.P.R., Approaches To History, London, 1965.
Fischer, David Hackett, Historians' Fallacies : Towand a Logic of Historical Thought, New York, 1970.
Furet, Francois, In the Worshop of History, Chicago, 1982.
Gasset, Jose Ortega, What Is Philosophy, New York, 1960.
Gardiner, Patrick, ed., Theories of History, New York, 1959.
Gawronsk, Donald V., History : Meaning and Method, Illinois, 1969. Gay, Peter, Style in History, New York, 197

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Gay, Peter, Voltaire's Politics, Princeton, 1965.
Gibbon, Edward, The Decline and Fall of the Roman Empire, New York, 1975.
Goad, Language In History, New York, 1949.
Graff, Henry F. and Barzun Jacques, The Modern Researcher, New York, 1977.
Gottschalk, Louis, Understanding History, New York, 1967.
Guinsburg, Thomas N., The Dimensions of History, Chicago, 1971.
Gustavson, A Preface to History, New York, 1955
Harrison, Frederic, The Meaning of History, London, 1895.
Hegel, G. W. Friedrich, The Philosophy of History, New York, 1956.
Hegel, G. W. Friedrich, Reason in History, New York, 1953.
Hegel, G. W. Friedrich, The Philosophy of History, New York, 1956.
Harrison, Frederic, The Meaning of History, London, 1895.
Heilbroner, Robert L., the Future as History, New York, 1968.
Herdotous, The History, Trans. David Grene, Chicago, 1987.
Hexter, J.H., The History Primer, New York, 1971
Hoffding, Harald, A History of Modern Philosophy, New York, 1955.
Hook, S., The Hero in History, New York, 1950.
Homer, Illied, Trans. Richmond Lattimore, London, 1951.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Homer, Odyssey, Trans. E.V. Rieu, New York, 1980.

Jaffar, S.M., History of History, Peshwar, 1961.

Jaspar, The Origin and goal of History, New York, 1962.

Joad, C.E.M, Guide To Philosophy, London, 1955.

Kant, Immanuel, Critique of Pure Reason, Trans. F. Max Muller, New York, 1971.

Koht, Halydan, Driving Forces in History, New York, 1971.

Kousser, Morgan J., Toward Total Political History, California, 1986.

Kritzeck, Jame S., Anthology of Islamic Literature, New York, 1964.

Kuhun, Thomas, S., The Structure of Scientific Revolutions, Chicago, 1970.

Lands, David S. and Tilly, Charles, ed., History As Social Science, New Jersey, 1971.

Langlois, Ch. V. and Seignobos Ch., Introduction to the Study of History, London, 1898.

Livy, The Early History of Rome, Trans. R.M. Ogilvie, New York, 1971.

Lowith, Meaning In History, New York, 1950.

Ludwig, Emil, Goethe : The History of a Man, London, 1928.

Malin, James C., On the Nature of History, University of Kansas, 1954.

Marwick, Arthur, The Nature of History, New York, 1970.

Marx, Karl, Political Writings, New York, 1974.

McCullagh, Behan, Justifying Historical Description, Cambridge, 1984.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

McNicol, Harry, History, Heritage and Environment London, 1945.
Meyerhoff, Y., The Philosophy of History in our Time, New York, 1937.
Muller, Uses of the Past, London, 1950.
Murrow, Edward R., This I Believe, New York, 1952
Nagel, Ernest, The Structure of Science : Problems in the Logic of Scientific Explanation, New York, 1961.
Nash, Ronald, Ideas of History, New York, 1969.
Nevins, Allen, The Gateway to History, New Jersey, 1962.
Nietzche, Use and Abuse of History, New York, 1960.
Nietzsche, The Philosophy of Nietzsche, ed., Geoffery Clire, New York, 1965.
O' Brien, Writing of History, California, 1971.
Oldroyd, David, The Arch of Knowledge : An Intorductory Study of the History of the Philosophy and Methodology of Science, New York, 1986.
Oman, Sir Charles, On the Writing of History, London, 1939.
Plutach, The Rise and Fall of the Athens, Trans. Ian Scott - Kilvert, New York, 1960.
Plutach, Lives of the Noble Romans, Trans. Edmund Fuller, New York, 1976.
Pitt, Joseph C., ed., Theories of Explanation, Oxford, 1988.
Plutach, Makers of Rome, Trans. Ian Scott - Kilvert, New York, 1965
Polybius, The Rise of the Roman Empire, Trans. F. W. Walbank, New York, 1979.
Popkin, Richard H., The Philosophy of 16th and 17th Centuries, New York, 1966.
محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Redma. 'ay, Voltaire, ed., New .
Rickman, ed., Meaning In History, New York, 1950.
Rouseau, Jean - Jacques, Emile, Trans. P. D. Jimach, New York, 1977.
Rowse, A.L., the Use of History, New York, 1948.
Rowse, A. L., Science and History, New York, 1928.
Russell, Bertrand, A History of Western Philosophy, New York, 1945.
Scott, Ernest, History and Historical Problems, London, 1925.
Seligman, Economic Interpretation of History, Columbia University, Press, 1956.
Shafer, Boyd C., History, Not Art, Not Science, But History : Meaning and Use of History, the Pacific Historical Review, Vol. XXIV, No.2, May, 1960.
Sharodes, Carolin, Clifford Josephson, James, R. Wilson, Reading for Rhetoric, New York, 1967.
Shrodes, Caroline, Smellie, Caroline, Smellie, Why We Read History? London, 1952.
Spengler, Oswald, Decline of the West, London 1928.
Stern, Fritz, ed., the Varieties of History, New York, 1961.
Stinchcombe, Arthur L., Theoretical Methods in Social History, New York, 1978.
Stone, Lawrence, The Past and The Present, Boston, 1981.
Tacitus, On Britain and Germany, Trans. H. mattingly, New Yrok, 1929.
Taylor, Huge, History As A Science, London, 1933.
Teggart, Fredecik J., Theory and Processes of History, Los Angeles, 1960.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

تعارف کتاب

ڈاکٹر صادق علی گِل کی تصنیف "فنِ تاریخ نویسی" اُردو زبان میں فلسفہِ تاریخ کا محققانہ جواب ہے۔ اس کی اہمیت اور جامعیت کا اندازہ پُورے مطالعہ سے ہو سکتا ہے، یہ کتاب ایسے اہم اور وسیع مآخذ پر مبنی ہے کہ اِس کی عظمت تسلیم کرنے میں کیسے تامل ہو سکتا ہے۔ مَیں بڑے فخر کے ساتھ یہ کہوں گا کہ پاکستان میں اُردو زبان میں فلسفہ تاریخ جیسے اہم مضمون پر ان کے سوا کوئی قلم نہ اُٹھا سکا۔ پہلی مرتبہ اس ملک کے ایک دانشور کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وُہ اس وسیع اَور مُشکل موضوع پر منفرد نقطۂ نظر سے منفرد طرز پر ایسی مدلل اَور تفصیلی بحث کرے۔

علمی اعتبار سے اس کتاب کی اہمیت میں کلام کی گنجائش نہیں۔ یہ تصنیف اپنے موضوع کی اہمیت اپنی معنوی خوبی اور فاضل مُصنّف کی محققانہ کاوش کے لحاظ سے بڑی قابلِ قدر تصنیف ہے۔ تاریخ اور تحقیق کے طلباء کے لیے یہ کتاب نہایت مُفید مُعاون اور اہم راہنما ثابت ہوگی۔ اس کی زبان اور اسلوب بیان اِس قدر شگفتہ سلیس اَور دلکش ہے کہ یہ تہذیبِ عالم کی ایک دلچسپ داستان معلوم ہوتی ہے۔

957 ص 100 ف